

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینسٹس

ماہنامہ

ستمبر 2010

نگرانِ عالی
معراجِ حرم



انشائیہ

جون امیلیا

سیلاب کی تباہ کاریوں
پر ایک حساس دل کا نوحہ

11

طاقِ نیالے

20

ماہی کا آئینہ نقشا میرے قیامِ انساؤں
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

12

سپہا کی کھنڈر ہر تھکن کی بھین
شری رام کی جھلک اور خوش مشورے

سہارا

سکا شیف (زیبر)

47

ایک زبردست اور مفاد
پرست انسان کی چالاک

آگہی

ذاتِ کرامت مبارک

65

”علم کی جاگیر دار کی میراث
نہیں آتی ایک چراغِ شمسیر“

درنگی

شہر عباس

111

احسن کا وقت گناہ کر سکھ کے
چند میل پانے والے کا قصہ

واپسی

محی الدین نواب

70

عکس نگار حسن جیوتی کا سلسلہ
ایک عمر انور کی طویل داستان

مہنگی ہمدردی

صہبہ امجد بیگ

132

حسن خالاستے تھکے جان واقعات
اور پیٹ ساجب کی مٹکلیں باتیں

کدوؤں کی چوہی

نجمہ مولائی

121

مختلف پختہ بدلتے
پہرے لگنے کا دلچسپ حال

گمشدہ

عمیر شاہ

165

گھومے ہوئے رستوں اور
چرواہے کے پائے کا عجیب انداز

محفل شعریں

قاریون

174

آپ کی آفتوں کی ایک نئی مثال
آپ کی زندگی آپ کے دل سے ہم آہنگ

میں شہانوں

منقلا امام

169

بے چین اور مغاور پرست
معاشیہ کی ایک نئی جھلک

انٹاری

احمد اقبال

192

جہاں کی تعلیمی اور سیاسی کی دہائی
کھلا ہوا ہے برای ایک نئی نئی کھلی

ورانداز

مہربان محمد

177

جہیز میں تھیلے ہونے والے مخلوق کے
مشہور شہر والے واقعات

حضرت ادریسؑ

رضوانہ مساجد

237

ایک نئی کہانہ کی خوبصورت
بادیں اور زمینی کا انجیل

تحفہ

تلویر ریاض

229

پچھتاہ کی آگ میں جلنے
والے ایک جوان کا دلچسپ قصہ

روشنی

ڈاکٹر سجاد امجد

260

تیری کی جانب سے روشنی کی
چوڑی لہریں والی تحریریں پرواز

مغالطہ

رضوانہ مساجد

249

سنسلی خیر لمحات پر
مشتمل دلچسپ واقعات

سیلاب

جون ایلیا

قطر کے سیلابی غیٹا وغضب نے وہ کچھ کیا جو کہا۔ ہم نے دریاؤں کا کیا بگاڑا تھا، ہم نے مٹیوں کو کب لٹا تھا اور ہم نے گراہوں کی کب برائی کی تھی۔ سیلاب ہماری بستیوں، ہمارے گھروں اور ان میں رہنے والوں کو بے نام و نشان کر گیا۔

میں آواز دیتا ہوں کہ اے بستیو! کیا تم کبھی تھیں، میں صدا دیتا ہوں کہ اے گھر واکیا تم کبھی آباد تھے۔ میں پکارتا ہوں کہ اے تباہ شدہ بستیوں اور آباد گھروں میں رہنے والو! کیا تم کہیں کھو گئے ہو اور لوٹ آؤ گے مگر ستانوں کی بے جسی نہ بولتی ہے، نہ ملتی ہے اور نہ سننے دیتی ہے۔ ان کے پیچوں نے کتنے گھر وندے بنائے ہوں گے، ان کے نوجوانوں نے نہ جانے کتنی آرزوئیں کی ہوں گی اور ان کے یوزرے مردوں اور عورتوں نے اپنے بچوں کی جوانی سے کتنی امیدیں باندھی ہوں گی۔ سب گھر وندے سیلاب کی ہیبت چڑھ گئے، سب آرزوئیں گرداب میں گم ہو گئیں، سب امیدوں کو موجوں نے روند ڈالا۔

ہم تم پر روتے ہیں مگر ہماری آنکھیں بھر پیں اور وہ یوں کہ جن کا بیری پانی ہوا ان کی آنکھوں کا آنسوے گیارشتہ۔ سو ہم روتے ہیں اور ہمارا دنا آنسوؤں کو تر شا ہے۔ وہ تو ہم عاویں تھے جنہیں ہواؤں کے طوفان نے گرد بنا کر اڑا دیا تھا۔ وہ تو مٹو نہیں تھے جنہیں ان کی نافرمانی کی سزا دی گئی تھی۔ وہ حضرت لوط کی امت نہیں تھے جن پر ان کی نافرمانیوں کے باعث عذاب نازل کیا گیا۔ وہ شہروں کے شہر باطل کے شہری نہیں تھے جو اپنی عیاشی کی ہیبت چڑھ گئے۔

ہم انسانی تاریخ کے بارے میں کچھ شدید بد رکھتے ہیں لیکن ہم فطرت کی تاریخ کے بارے میں کم سے کم کچھ نہیں جانتے۔ فطرت اور انسان کے درمیان شاید چھتیس لاکھ برس سے ایک پُر خاش اور پُر پکار جا رہی ہے۔ اگر اس پُر خاش و پُر پکار کے انجام کا مرید نہ لکھا جائے تو قرآن باقرن کے صفحے درکار ہوں گی، وہ مہر قیامت کے زین کی دوسری پریم کیا جائے تو سچ کی منجانیں ختم ہو جائے گی اور مرشد باقی رہے گا۔

ختم بہت زیادہ ہیں اور خوشی بہت کم ہے۔ تاریخ کے حساس انسانوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ اواس رہ کر گزارا ہے۔ زندگی میں خوش رہنے کے لیے بہت زیادہ محنت بلکہ بہت زیادہ بے جسی چاہیے۔ دانش مندوں کے دوسرے گروہ نے یہ کہا ہے کہ انسان مجبور ہے۔ اس کے ہاتھ اور اس کے ہر خود چش نہیں کرتے بلکہ انہیں کوئی اور جنم دیتا ہے۔ وہ کون ہے جو انہیں جنم دیتا ہے؟ وہ کون ہے جس نے تاریخ کے عہد اور تاریخ سے پہلے کے عہد کے تمام انسانوں کو اپنے آئندہ کار کے طور پر استعمال کیا ہے؟ یہ بات معراج رسول ختم جانتے ہو اور نہ میں جانتا ہوں۔ ذکر عذاب ناک سیلاب کا ہو رہا ہے اور اس موقع پر میری تکی میر کا یہ شعر برحق ہے۔

کن خندوں اب تو سونی ہے اے چشم گرید ناک
مڑگاں تو نکول شہر کو سیلاب لے گیا

یہاں تک تو میں نے اپنا دکھ بیان کیا۔ اب معراج رسول اپنا دکھ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ”یہ سیلاب تو ہمارے باپ کا سیلاب تھا، اس سے زیادہ میری سیلاب تھا تو وہ ہیں جو ہمارے اندر تباہی مچا رہے ہیں، ہمارے اندر کا جنم کہیں زیادہ تباہ کن ہے، ہمارے اندر کے گرداب کہیں زیادہ سفاک ہیں۔ فقر کے سیلاب، تعصب کی طغیانی اور انتقام در انتقام کے گرداب۔ ہمارے اندر کے ان سیلابوں نے ہمارے ہندوؤں کو دے دیں اور اب ہم ہر نے ان سیلابوں کے رحم و کرم پر ہیں اور ہم ایک کشتی نوح کی آس لگائے امید کے سانس لے رہے ہیں۔ نہ جانے وہ کتنی نوح کب آئے گی اور ہمیں بچائے گی۔“

یہ تو میں نے معراج رسول کی بات سنائی اب میں اپنی بات کہتا ہوں۔ میں بھی معراج رسول کی طرح ایک کشتی نوح کے انتظار میں ہوں اور اس کے انتقام میں میری چٹائی دھندلی پڑ گئی ہے۔ میں اپنے اندر طوفان برپا کرتے والے تباہ کن یا تھوں کے افسوں میں اپنی امید کو ڈھونڈ رہا ہوں مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی۔ پانی زمینوں کو شاداب اور پودوں کو سرسبز کرتا ہے، کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہم سب کے اندر کے وجود کا پانی ہماری مہر نیرت زمینوں کو شاداب اور ہمارے اور تمہارے پودوں اور پھلوں کو سرسبز کرے گا۔ اس سے قطع نظر کہ کیا ہمارا ہے اور کیا تمہارا ہے۔

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید داغ قابل علاج مرض ہے

پروفیسر

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر اجمل زیدی



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل 30: مئی
9-اگست 30: ستمبر
9-نومبر 30: دسمبر
0300-8566188
2261636

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

لاہور

14-فروری 27: فروری
14-جون 27: جون
14-اکتوبر 27: اکتوبر
0300-8566188

پشاور

14-فروری 27: فروری
14-جون 27: جون
14-اکتوبر 27: اکتوبر
0300-8566188

ملتان

28-مارچ 6: اپریل
28-جولائی 6: اگست
28-نومبر 7: دسمبر
0300-8566188

کراچی

13-مارچ 27: مارچ
13-جولائی 27: جولائی
13-نومبر 27: نومبر
0300-8566188

www.leucodermatologist.com

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

میں اکثر "مناقح احمد پٹی" کے اقتباس دیکھ کر حیرت ہوا کہ آپ کے پاس شاید ہی کئی نکتوں کا خزانہ نہ ہو گیا ہے۔ اور اب آتے ہیں اپنی فیورٹ شکل کی طرف، جی ہاں! "آپ کے خط" کی طرف جہاں رنگ برنگے ہندوؤں نے قبضہ کر لیا تھا کہ وہ اپنا پاپا دے۔ خدا کی پناہ! ہم شکل سے کیا گئے! بدشاہت اور غیروں کے گھٹے چڑھ گئی، دیکھیں تو کسی طرح سینہ تان کر بچت رہے ہیں۔ دشمنان خودی! آپ نے اپنے نام کے ساتھ کر دی کیا ہے یا کر دی، جلدی وضاحت کیجئے کیونکہ کیڑا کا کچھ بچ نہیں ہوتا کہ جب دغا دے جائے اور ہاں جاپوں بکھاری کے ساتھ آپ بھی ہنسی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یعنی آپ کی پیدائش میں ہاںوں، اٹکل کی طرح عمل از عمل۔۔۔ عیداروف کی آپ کا کیا ذہنی قیام ہے جو ہر کسی کو بلاورق دیکھنے لگاتے ہیں معروف ہیں، لیکن اگر آپ کو کسی کوئی مسئلہ یا تو آپ کی خبر نہیں کی یا مرضی نہ تھی اس لئے تو ساتھ ساتھ کہتے ہیں کہ ہنسی میں جیکہ آپ "ہٹ" ہنسی لگتے۔ کہیں اپنی غلطی کی مخالفت کے لیے ہے "مکمل" میں تو نہیں چھپائی یا دوسرے صاحب دیکھ لیتے آپ کو چپ رہنے کا مشورہ اس عاجز سے کہ قوت دیا ہے کہ۔۔۔ جب بھی بولنے لگتے پھاؤ کر بولے، اسی لیے آپ کا چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ اشتقاقی شاہین صاحب! لوگیاں آپ مختلف کرخت کی طرح "وکی" ہیں، نہیں جوش کہ ہر وقت کلی رسالوں سے چمکی رہتے ہیں۔ جناب کے لیے عرض ہے کہ 100 ہندوؤں کی ہر ایک شے میں کچھ صلاحیت حاصل نہیں کر سکتے، کچھ کچھ۔۔۔ پرس تو ہر احمد لکھتے ہیں کہ بہت بڑا سنگین فالت آ رہا ہے جو آپ جیسے پرس کی آپ اب وجود میں آنا شروع ہو گئے ہیں۔ محض حسین جیوان! آپ کے مطابق آپ کے پورے حصے میں وہ جنگ کی بات کی گئی جو آپ دوسروں کو دھک کی بات کہنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ راجا قابو! حیرت ہے کہ آپ اس دور میں بھی پاکستانی نہیں اور وہ بھی نہیں کی دیکھتے ہیں کیونکہ ہم نے تو سنا ہے کہ آج کل پاکستانی نہیں ان پر۔۔۔ بلکہ ہی دیکھنا پسند کرتا ہے۔۔۔ محمد جواد صاحب! اس فرقہ وارانہ صاحب کو کہانی لکھنے کا مشورہ دے کہ آپ شاید اپنی کوئی برائی دشمنی نکل رہے ہیں۔ باقی آپ کا مشورہ دیکھ لیتے ہیں کہ آپ کو چھٹا استعمال کریں مگر آپ کو بھی تو کچھ استعمال کرنا چاہیے مثلاً جاک، بکری، بکرے سب کا دماغ کھانا، ظاہر ہے جو چر جس کے پاس نہ ہوا استعمال ضرور کرے۔ جیہذا! احمد جیوان! لکھنے پر مہار کھانہ دل کرو۔ لکھتے اور تم نے تو اس شکل میں سب کو چھٹا کر دکھایا ہے۔ اب تک لوگ بے فکر ہو جائیں آگئی ہوں ناں! میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔ بس قطعاً کونوں کی سپورٹ کی ضرورت ہے۔" (مکمل مجاز کو ملنا تو چاہتا ہے کہتے ہیں)

عبدالسلام صاحب! بنی بن علیہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے کہتے ہیں۔ "انسانوں پر بھی آسمان کی کتاب ہے کیونکہ انسان کمزور ہوتا ہے اور اس کا آسمان کی کمزوری۔۔۔ اس لیے میں جب بھی تجربہ کرتا ہوں صاف اور کھری بات کرتا ہوں۔ میں نے بھی تجربہ شائع نہ ہونے کا شکوہ نہیں کیا ہے۔ میں لکھتا ہوں گا اور آپ رڈی کے حوالے کرتے رہیں، میں اب دیکھتا ہے کہ "کتنی باتیں رڈی کی تو کھری کا ہے۔ شکل صاحب کی "شہریت" مجھے کچھ خاص نہیں لگی۔۔۔ جس کی جس طرح منظر کشی کی اور میں نے کھری کی میں اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن میرا حال ابھی تک باقی ہے جو میں نے پہلی قسط میں لکھا تھا۔ جب ہم کسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں تو وہ ہمیں دیر لگتی ہے، لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ آگے گزرتی ہے۔؟ اس لیے آج تک میں محبت کا ٹھوم نہیں کھچتا۔۔۔ امرورق رمضان کے چاند چشمن آراؤں کے دیکھ اور حسن کی رعنائیوں سے حزن تھا تو رانی باری مجلس میں پہنچے۔ جیہذا! صاحب! سب سے پہلے تو آپ کو صدارت کی مبارک۔۔۔ آپ کی بات پر ذکر کرنا ہوئی کہ آپ پاکر (سرا) کو اپنا مگر بھتیجی ہیں اور مگر بھانے والی عورت کی نشانی ہے لیکن ایک بات مجھ میں نہیں آتی کہ ابھی تک آپ کے نام کے ساتھ "سائنس ایریا" کیوں لکھا جاتا ہے؟ وہ لکھیں بلوچ صاحب۔ اگلی محنت، محبت اور عاجز سے بھی تو نکلیاں مار دی جالیں ہیں۔ ریاضی ہٹ صاحب!۔۔۔ انسان بھی بے معرفت نہیں ہوا، مشین بنانے سے دیکھ کر تک کہتے انسانوں کو ضرورت ہوتی ہے؟ ملک محمد اور صاحب!۔۔۔ جب یادیں دلوں میں ہوتی ہیں تو شکوہ کیا۔؟ پرس تو ہر احمد صاحب!۔۔۔ پرس ہو کر صرف 2000 حسی پرانی خودی۔۔۔ محض حسین جیوان! صاحب! ہمیں اپنے کفو سے دیکھنے چاہئیں اپنے اباؤ اجداد کو کافی نہیں ملتا ہے آپ نے تاریخ میں پرچی آپ کیے کہہ سکتے ہیں کہ ان کا نتیجہ کی بنی سے اٹھا ہے۔ راجا قابو! قواز ناقص صاحب!۔۔۔ الٹی گاڑی کی۔۔۔ ہنسی ہارنے کے لیے آپ کو سنا سب الفاظ دے لے محمد جواد صاحب!۔۔۔ آخر آپ کو کون سا شکوہ ہے جو آخری بار دیکھو یا عبداروف صاحب! اگر آپ بارہ سال سے سسٹن سے تاری ہیں تو آج میں بارہ سال پہلے کرنی صدارت کسی کے ہاتھ آتی ہے۔ اب کچھ۔۔۔ اللہ ہے۔۔۔ جون ایلیا صاحب نے کتنا گڑا راج کیا، پڑھا لکھا جالے سے قیادہ خطرناک ہے۔ سنی رازگاہ!۔۔۔ اخلاقیات کی موت پر بیٹھے ذرا انہوں میں ہوا کیونکہ عیاش لوگ اس دور میں پڑے ہوئے ہیں۔ بائیس کی ایسے ظیف کا بھی تذکرہ کریں جو ہمارے لیے مشکل راہ ہو۔۔۔ کھرے سکے۔۔۔ ایسے ملک اور دھوکا کھانے والا اور شاید کھرا اسکین ہو جو دوسرا سب دھوکے میں تھا۔ اس کو اتنی بات کچھ میں نہ کہی کہ خدا کی عبادوں جیسے زن، مزدور، زمین، زمان (جو جہاں ہٹ) کوئی کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ اصل منافع یہ کہ ایک بہترین کہانی بھی واقعی وہ نہیں کیجی عجیب و غریب مخلوق (انسان) کو دیکھنے کا شوق تھا۔ آپ کی گرامی میں تو سب سب محکوم پرچوں کے حساب سے ہیں۔ مرگ تقدیر کے سامنے تو ہر انسان بے بس ہے۔ اگھر کوئی کا ایذا کافی خطرناک تھا لیکن ہائپر نے ایسا کچھ نہیں ہونے دیا لیکن کافی محبت بہت نازک ہوتی ہے۔ انڈی چلیز نو! آپ کو پاکستان لا میں تاک کر اپنا کام دیا ہو کیونکہ لاہور سے زیادہ نواہی میں مرہ۔۔۔ واپسی اب پتا چلا کہاں سے واپسی ہو گئی تھی جیہذا باب کی عمر میں۔۔۔ اور اب کھری والی چنانا شروع ہو گئی۔"

جو ہر کسی کو سرفراز فرما دیتی "اے امت کا سسٹن رعنائیوں اور جوتوں کا ایک اور ایسا باب رقم کر گیا۔ ذکر انکھل ایسے ایسے حسین نقوش حقیقت کرتے لگتے ہیں کہ نظر پڑنے ہی آگئیں ہیں کہ شے کا نام نہیں لکھیں آگئے۔ بڑے تو جن ایلیا کی عمر گزیر گئی۔" یہ معنی کے

عنوان سے بڑھ کر کوئیں، ایلیا صاحب! تو اپنا فرض ادا کر رہے ہیں، دیکھتے ہیں نتیجے میں کتنے در کھلتے ہیں۔ گزشتہ دنوں مارچ 2006ء کا سسٹن ہاتھ لگا۔ محکمہ خلو طواں میں ابتر ہوئی ہے سیدہ عین کے لاطر سے اس کے کچے بعد و کچھ کے کا بل کمری، بلک کیٹ، ٹوٹی، چھالوچ، عرشہ، بٹ، خط غزل، آجہ فعلی، اریسٹو بخاری، ورشہ کنول، مکرہ لکھن، عروج خان، عراج بخاری، صدیق، جہا جہا، ادیب، زمان اور بشری افضل کے متروہ جات جیکہ ہر دلوں کے خطوط ہونے کے برابر۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے آخر کہاں تم ہو گئی ہیں؟ سب اب بات اس ماہ کی شکل خطوطاں کی ہو جائے۔ جیہذا رضا صاحب! اول آتے پڑا حیرتوں مہار کاہ۔۔۔ پرس تو پورا پورا کچھ تو لاج رکھ لو لفظ پرس کی۔ عبداروف عدم پر اپنی فضا اٹھاد اور بیٹھا تھا متروہ لکھتے ہیں۔ خصوصاً صنف نازک کے حوالے سے پورا ہی نرم گوشہ رکھتے ہیں اور اس سب کے پیچھے تو جانے کتنا فلسفہ کا فرما ہے۔ دشمنان خودی! آپ بیک لکھ کی کالی سیاہی اور رڈی کی نوکری کی بات کر رہے ہیں، مجھے تو اس ماہ پر بشری پوسٹ کے باوجود دھک داک کی پھر تیاں لے ڈالیں۔۔۔ لکھتے ہیں بلوچ صاحب! مسئلہ دو ماہ سے کچھ بھی جاسوسی ڈائجسٹ میں ایسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لہذا آپ کا لی پیوٹ کہ جانا کچھ میں آتا ہے۔ ریاضی صاحب! اب تو ہمارے بال محنت شور و شر کا شہنشاہ بن گئے ہیں، ساستان، بھائی، دانا، چور دیکھ کر سب شرم سے رہے ہیں۔ آپ کیوں اس میں جب بات مل کی آتی ہے تو سب خاموش ہو جاتے ہیں، عبداروف صاحب! یہ کم عمری کا دھک صنف نازک کو بھی چاہیے۔ آپ کیوں اس میں جیکہ میں پڑ گئے؟ "واکوی" میں مکی ولدین نواب صاحب بالکل سنے اور نہایت دلچسپ موضوع پر لکھ رہے ہیں۔ عیسین عازری کی عمر کے معاملے میں جس طرح ان کی مکی چل رہی ہے اس نے نہایت دلچسپ صورت حال پیدا کر دی ہے۔ "انڈی" کے اختتام سے لگ رہا ہے کہ یہ خبر کوئی ناگزیر جلد رہی ہے۔ میرے خیال میں اب پھر میں بہت ترستے ہو سکے۔ اب رفتی کو داپس پاکستان آ جانا چاہیے۔ اب کچھ بات ہو جائے نرم و نازک ہے یوں سے پھر "خبر" پھر "محبت" کی آخری قسط کی جیکہ کی طرح محض صاحب نے پلاٹ سے لے کر الفاظ کے چناؤ تک نہیں بھی کر سکتیں جیہذا! خصوصاً مکی کا شروع و پختل کردار پوری تحریر کی جان تھا اور مکی کے اسٹینڈ کی وجہ سے ہی پکی اینڈ لکھن ہوا۔ "آکھ بھولی" میں نواب صاحب نے نہایت حساس معاشرتی مسئلہ کو موضوع بنایا۔ آپ کا مکی کی موت کے ساتھ شرط کر دیا گیا ہے سب شکل سے ماورا تھا لہذا یہ خبر بے کچھ خاص رنگ کو جس طرح مرنے کے بعد زندگی کی اور اس کی موت کو کسی کی موت کے ساتھ شرط کر دیا گیا ہے سب شکل سے ماورا تھا لہذا یہ خبر بے کچھ خاص رنگ نہ جاسکی۔ شمس مفراد! اب بہت ہی دلگذا انداز میں لکھتے ہیں، ان کی تحریر میں کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ "آسیب" میں بھی انہوں نے اپنے اسی مخصوص انداز میں لکھا اور اختتام پر جو بیٹا م زیادہ درج تک کو کھنی کر گیا۔ فیصلہ کو رائے نہایت سبب لکھا اور پھر عراج! انداز میں لکھا۔ اختتام پر ہونے کے باطل درج تک لکھا کہ شادی نہ کرنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ "اصل منافع" میں رائے سربا پر داریات سوچ کو دکھایا۔ سربا پر داریات نظام کی بنیاد میں ذاتی فتنے اور معاشرے ہوتی ہے۔ "الوکر" مختصر مگر دل پر اثر کرنے والی تحریر تھی۔ مجبوراً ہی انسان سے خلال اور حرام کا فرق قائم کر دیتی ہیں۔ "ساستان" میں محبت کی نئی قسم پر بحث ہوئی۔ واقعی جب اقتدار ہوں تو انسان سب سے پہلے اپنی کوئی نواہی دے۔ "ہنسی" میں بھی سب کچھ لکھا ہے کہ ساتھ کیا کرنا چاہیے جس کی قیادت کے باطل پر عکس نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اجازت دیں اس امید کے ساتھ خط و ضرور شامل شاعت ہو گا۔

مجاز ذکر سکیم پھر سے لکھتے ہیں۔ "امت کا شمارہ" انہوں میں آ اور جب انش پر لگاؤ مکی تو جانے کیوں یہ سوچ کر دل دکھ سے بھر گیا کہ اس بار یوم اکروہ کی عمر کے سسٹن مراحل سے گزرتے ہوئے سنا ہے ہیں۔ اس بار سب نے ایسی جانی پھیلائی ہے کہ ایک مدت درکار ہو گی نہیں پھر سے اپنے بیرون پر کھڑا ہونے کے لیے اس بار میں نے جتنا بھی سسٹن پڑھا ہے جانے کیوں دے دی ہے پڑھا ہے اس لیے آپ سے سعادت کہ سب سے نہیں کر سکیں گا۔ فقط اپنی یاد۔۔۔ دلانے حاضر کھل، ہو گیا ہوں۔ ہماری حالت پر کوئی پرمیان حال نہیں ہے۔ ایسے میں صیب جالب کی غزل ضرور دیکھنا چاہوں گا۔

ند جان دے دو نہ دل دے دو بس ایک مل دے دو
زیاں جو کمر چکے ہو قوم کا، تم اس کا بل دے دو
بھلا ہو جائے گا طوفاں زدوں کا اس عنایت سے
جہاں سے پانی آتا ہے وہاں ہونے کی شکل دے دو
جہاں ہانڈی سے یہ سسٹن ڈوب جائے گی
خدارا چھوڑ دو پچھلا سکارہ مستقل دے دو
بہت تدریج تو پھر مکی ہماری زندگی کی
اجازت موت کی اب ہم کو بین کے دھول دے دو
فلوٹس دل سے اے لوگو سنا پیغام جالب کا
مری برباد خبر کھینچوں کو آپ و شکل دے دو"

اب ان تارخین کے نام سے جو محکم میں شرکت نہ کر سکے۔
ڈاکٹر خان، جیم، یارخان، ملک محمد انور، واہ، کیٹ، محمد، لاہور، شیریں اقبال پر اچھے خط و خطی منڈی بہاؤ الدین۔ ملک خالد نامعلوم مقام

طافا نسیات

بار پرومہ رخصت ہوا تو وہ سلطنت عثمانیہ کو اپنا ایسا خطرناک جانشین بن گیا جس سے پورا یورپ مدتوں تھر تھر کانپتا رہا۔ درگوت ایک ایسا بے باک کردار جس نے انہوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس ایک شخص میں عروج اور خیر الدین یک جا ہو گئے تھے۔ وہ پہلوان تھا پھر بحری قزاق بن گیا اور بحری قزاقی کے بعد اسلام کی مہینہ شمشیر کا روپ اختیار کیا۔ ترک مؤرخ حاجی خلیفہ نے اس کو یہی لقب دیا تھا اور اس نے اپنے کارناموں سے ثابت کر دیا کہ وہ اس لقب کا حق دار تھا۔ اس کو غیر یقینی کارنامے انجام دینے کا شوق تھا اور اس نے کئی بار وہ کرد کیا یا جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ موت سے آنکھیں لڑا سکتا تھا۔ ناممکن کو ممکن کر دکھانے والا محیر العقول کردار، بہت سی خصوصیات اور اوصاف کا حامل یہ انسان غیروں اور اپنیوں کے لیے یکساں رشک و حسد کا باعث اور سبب بن رہا۔ وہ بلاشبہ آشنا و نا آشنا کا محسوس تھا۔ اپنی تاریخ کا یادگار کردار جسے طاق نسیات کی نذر کر دیا گیا۔

اس کی آئینہ با آئینہ اور سبب اختیار انسانوں کے عبرت اثر و واقعات



خیر الدین باربروسہ کا سوگ کچھ عرصے تک سنایا گیا۔ سلطان سلیمان اس ناقابلِ خلائی موت کے اثرات کا اندازہ بھی لگا رہا تھا۔

چارلس الجزائر کی شکست خوردگی کے بعد جنگ و جدل سے کنارہ کشی اختیار کر چکا تھا۔ اس نے بھی باربروسہ کی موت کی خبر پر توجہ بھی نہیں دی مگر تم کہتے ہو کہ درگوت طرابلس پر بھی توجہ دے گا۔ کیا انہیں یہاں درگوت نے بھیجا ہے؟

دوریا نے جواب دیا۔ ”ترکوں کی خوش قسمتی اور ہماری بد قسمتی کہ انہیں درگوت حاصل ہے اور جب تک وہ موجود ہے ترک بحریہ طاقت ور رہے گی۔“

چارلس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ وہی درگوت ہے جسے ہم نے تین ہزار مونس کے نکلے لے کر چھوڑ دیا تھا؟“

دوریا نے کہا۔ ”افسوس کہ میری مرضی نہیں تھی کہ اسے رہا کیا جائے۔“

چارلس نے صارح رئیس کے حوالے سے بات کی۔ ”یہ نامور عرب ملایا ہمارے کام آسکتا ہے۔“

دوریا نے جواب دیا۔ ”مگر ازم میں کسی عرب یا ترک پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“

دوریا نے اس کے بعد صارح رئیس کو چارلس کے سامنے طلب کر لیا اور اسے ذلیل کر کے پوچھا۔ ”بادشاہ سلامت دریافت فرما رہے ہیں کہ باربروسہ کی موت کے بعد ہم ترکی بحریہ کے خلاف کوئی سوئز کا دروازی کر سکتے ہیں؟“

صارح رئیس نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں کر سکتے لیکن میرے خیال میں ہمیں پوری توجہ تیونس پر دینا چاہیے کیونکہ میں درگوت کی سوچ سے واقف ہوں۔ وہ امیر البحر بننے کے بعد پہلا حملہ تیونس پر کرے گا۔ اس طرح تیونس سے الجزائر تک قبضہ کر کے آپ کو افریقہ کے شمال مغربی ساحلوں سے بے دخل کر دے گا۔“

چارلس نے دوریا سے پوچھا۔ ”تیرا کیا خیال ہے، کیا صارح رئیس کو یہ معلوم کہ تیونس کے قریب ہی طرابلس ہے اور وہ 1510ء سے ہمارے قبضے میں ہے؟ مگر یہاں تیرہ چودہ سال قبل طرابلس کو مالاکہ کے سخی مجاہدین کے قبضے میں دے دیا گیا تھا۔ جب تک طرابلس ہمارے قبضے میں ہے، بحیرہ روم میں ہماری نقل و حرکت پر قدرتی نہیں لگائی جاسکتی۔“

صارح رئیس نے کہا۔ ”درگوت بعض معاملات میں خیر الدین سے برتر ہے۔ وہ تیونس کے بعد طرابلس کو بھی لینے کی کوشش کرے گا۔“

چارلس شراب کے نشے میں مجسم رہا تھا۔ ”یہ عرب ملایا کیا جانتا ہے۔ اس نے تو سونے ہوئے طرابلس کو بیدار کر دیا۔“

دوریا بھی طرابلس کے ذکر سے چونک گیا تھا۔ حیرت سے صارح رئیس سے پوچھا۔ ”دوست اباربروسہ نے تو کبھی طرابلس پر توجہ بھی نہیں دی مگر تم کہتے ہو کہ درگوت طرابلس پر بھی توجہ دے گا۔ کیا انہیں یہاں درگوت نے بھیجا ہے؟“

صارح رئیس دونوں کے سوالات سے تنگ آیا ہوا تھا۔ جھنجھلا کر جواب دیا۔ ”مجھے یہاں کسی نے بھی نہیں بھیجا بلکہ میری بد قسمتی یہاں لے آئی ہے۔“

چارلس نے دوریا کو حکم دیا۔ ”تو اس عرب ملایا کو اپنے ساتھ رکھ۔ فی الحال اس کے مشوروں پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اب صارح رئیس کی حیثیت ایک قیدی جیسی رہ گئی تھی۔ اسے باربروسہ کی موت کا غم تھا اور وہ ان ساحلوں کو برا بھلا کہتا رہتا تھا جن میں اسے عرب بحریہ کا خیال آیا تھا۔

دوریا کا خیال تھا کہ چارلس بحری تیاریاں کرے گا لیکن الجزائر کی ناکامی کے بعد چارلس کو کبھی بدو حاکم سنے کو ملی نہیں اور اپنی ناکامی کا جتنا شدید اثر اس نے لیا تھا اس کے بعد وہ سندریش اترتے ہوئے سخت محسوس کرتا تھا۔

یہاں یہیں وہیں تھا اور سطرلیز میں درگوت نے سلطان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ تیونس سے عیسائیوں کو نکال باہر کیا جائے اور وہاں ایک مضبوط حکومت قائم کی جائے۔

تیونس میں شاہ جدید کی حکومت بھی ختم ہو چکی تھی اور قیروانی کونسل نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔ شاہدان کے سامنے بیٹی پال کا عہد تھا جب یہاں سو بڑوں کی کونسل حکومت کیا کرتی تھی اور وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے اور بیٹی پال کے درمیان اتحاد ہوسالہ زبانی فاصلہ حاصل تھا۔ ان میں وہ باہمی اتحاد بھی نہ تھا بلکہ نامی میں جذبہ حب الوطنی انتہائی شدید ہوا کرتا تھا۔

درگوت نے ان تمام حالات کا جائزہ لیا اور کسی کو بتائے بغیر تیونس روانہ ہو گیا۔

جب درگوت کے جہاز خلق الوید میں داخل ہوئے تو قلعہ دار کو تشویش ہوئی لیکن محاصرہ کیا نہ ہوا تھا اور تھکے دار کو عراقیت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ تیونس کی قیروانی حکمران کونسل نے قلعہ اور شہر پناہ کی فسیلوں کے دروازے بند کر دیے اور مقابلے پر کمر بستہ ہو گئے۔

درگوت بار بار پیغام بھیجتا رہا کہ شہر اس کے حوالے کر دیا جائے اور قلعہ کا چھانگ کھول دیا جائے۔ کونسل آپس میں مشورہ کرتی رہی اور طے پایا کہ درگوت کا مقابلہ کیا جائے۔

درگوت نے کونسل کو خبردار کیا۔ ”میں خیر الدین باربروسہ نہیں ہوں جو درگوت سے کام لیتا تھا۔ اگر میرے کہنے سے بھاگ کھل گیا تو شہر کے لوگ امن وامان کے حق میں کے لیکن اگر میں نے گولہ باری سے دیواریں گرا دیں یا پھر ایک توڑ کر اندر داخل ہوا تو ایک بھی شہری رعایت کا مستحق نہیں ہوگا۔“

حکمران کونسل نے بھاگ کھولنے سے انکار کر دیا اور درگوت نے محاصرہ سخت کر دیا۔ گولہ باری میں شدت اختیار کی گئی اور تیونس کا قلعہ ہیروئی دینا سے منقطع کر دیا گیا۔

درگوت نے تین دن گولہ باری جاری رکھی جس سے تفصیل میں نوٹ پھوت شروع ہو گئی۔

درگوت کے غصے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چوتھے دن وہ محاصرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ تفصیل کے اوپر سے تیر اندازی ہو رہی تھی لیکن وہ تفصیل سے اتنی دور تھا کہ تیر اس کے پاس پہنچنے پہنچنے پر توڑ دیتے تھے۔ وہ ایک درخت کے سائے میں کھڑا ہو کر تفصیل پر فحشانت دے کر طرف دیکھ رہا تھا کہ کسی نے درگوت کا نشانہ لیا اور تیر اس کے سامنے آ کر گرا۔

کسی بھی نتیجے پر پہنچنے والا حاضر دماغ درگوت سوچنے لگا کہ اس پر صرف ایک تیر سے حملہ کیوں ہوا، تیروں کی بوچھاڑ کیوں نہ کی۔

درگوت کے ایک سپاہی نے تیر اٹھا کر درگوت کو دیا۔ تیر کے سوار سے ایک پرچہ بھی تھا۔

سپاہی نے کاغذ کا پڑہ تیر سے اٹک کر لیا تھا مگر پھر اسے بھی درگوت کے حوالے کیا اور درگوت نے بے چینی سے کھول کر پڑھا۔ یہ حکمران کونسل کے کسی گناہم رکن کا مختصر خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”ہماری کونسل کے جملہ ارکان میرے سوا مقابلے اور مزاحمت پر متفق ہیں لیکن میں اسے فضول سمجھتا ہوں۔ آپ آج رات اندھیرے میں صدر بھاگ کر آجائیں۔ آپ کو بھاگ تک کھلا ہوا طے گا لیکن آپ کو شہریوں کو پناہ دینی ہوگی کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔“

وختہ کی جگہ لکھا تھا ایک مخرف رکن کونسل۔ اے تکرانی سلطنت تیونس!

درگوت نے معاملات میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ بدستور تفصیل کا جائزہ لیتا رہا۔

اس نے پہلے کی عبارت کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا کیونکہ ذہن کی کئی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔

شام ہوئی تو اس نے اپنے خاص خاص ساتھیوں کو کچکا گیا اور انہیں بتایا۔ ”آج رات ہم صدر دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کریں گے اس لیے ہمارے سپاہیوں کو اندھیرا ہونے ہی تفصیل کے پتے پہنچ جانا چاہیے۔ تفصیلوں پر متعین سپاہی کسی قدر تاخیر سے متعین جلاتے ہیں اور ہمیں اپنے سپاہیوں کو شعلوں کے روشن ہونے سے پہلے ہی فسیلوں کے نیچے پہنچا دینا ہے تاکہ شعلوں کی روشنی میں وہ دور دور کا جائزہ لیتے رہیں اور ہمارے سپاہی فسیلوں کے ساتھ ساتھ بھاگ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں۔“

اس کے بعد ہم بھاگ کو گرا دینے کی کوشش کریں گے۔“

شام ہوئی پھر شام پر شب کی سپاہی غالب آگئی اور ہر شے دھندلی پڑنے پڑنے تاریکی میں گم ہو گئی۔ درگوت نے نہایت احتیاط سے اپنے سپاہیوں کو فسیلوں کے نیچے پہنچا دیا۔ اس روز فسیلوں پر مشعلیں بھی غائب تھیں اس لیے درگوت کا مسئلہ زیادہ آسان ہو گیا۔ درگوت کی فوج بھاگ کے سامنے پہنچی گئی۔ نصف شب قریب تھی۔

بھاگ کو دھکا دے کر کھولنے کے لیے درگوت سب سے آگے تھا۔ اس کے کئی ساتھیوں نے درگوت کی دلیری پر اعتراف کیا۔ ”جناب! آپ نے اپنے حکم سناھی خیر الدین سے احتیاط کا سبق نہیں لیا۔ آپ کو اپنے ذہن پر کسی صورت بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ آگے بڑھ کر بھاگ پر حملہ آور ہونے کا کام دوسروں کے سپرد کریں اور خود صرف تکرانی یا حکم دیتے رہیں۔“

درگوت نے جواب دیا۔ ”میں نے باربروسہ پر اور ان کو اپنے لیے مثالی کر دیا تھا۔ میں عروج اور خیر الدین دونوں کی تقلید کرتا ہوں۔“

نصف شب کے قریب بھاگ کا ایک ذیلی دروازہ سا کھلا اور کسی نے پوچھا۔ ”درگوت کہاں ہے؟“

درگوت نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں سب سے آگے، تیرے قریب سوچ رہا ہوں، بھاگ کھول دے۔“

دوسری طرف سے کسی نے جواب میں کہا۔ ”بھاگ تو کھل ہی جائے گا مگر پہلے میں تیری زبان سے اس واپمان کے الفاظ سننا چاہتا ہوں۔ دیکھو اور میرے شہریوں کو محفوظ ملنا چاہیے۔“

درگوت نے وعدہ کیا۔ "ہمارا وعدہ ہے کہ شہریوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا۔"

یہاں تک کل گیا اور رات کے اندھیرے میں فوج قلعے میں داخل ہوئی۔ یہاں تک کے اوپر ہلالی پرچم لہرایا گیا اور درگوت نے قلعے کی فوج کو ہٹا کر دیا۔

صبح ہوئی اور شہر کی پیدوار ہوئی۔ زندگی کی چہل چل کا آغاز ہوا۔ دکانیں کھلنے لگیں اور کاروبار زندگی میں جوش و خروش پیدا ہوا تو تیونس کے لوگوں کو تیونس کی ہر گلی اور ہر چوراہے پر ترکوں کا پیرا نظر آیا۔ خاص خاص عمارتوں پر سرخ مفید ہلالی پرچم لہرا رہے تھے۔ حکمران کونسل کے ارکان گرفتار کیے جا رہے تھے۔

کسی بھی فوجی نے کسی شہری کو نقصان نہیں پہنچایا لیکن تیونس کے عربوں نے ترکوں کو کھجارت کی نظر سے دیکھا۔

ان ترکوں سے شہریوں نے پوچھا۔ "تمہیں یہاں کون لایا ہے؟"

ترکوں کی طرف سے جواب ملا۔ "اب تیونس سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ ہے اور خلافت عثمانیہ تیونس کو بھی ملت اسلامیہ کا ایک جزو سمجھتی ہے۔"

دوپہر سے قتل قلعے کے اسی حصے میں جہاں بیٹے کے ارکان کونسل حکومت کیا کرتے تھے، ارکان کے صدر کی جگہ درگوت براجمان تھا۔ اس کے سامنے حکمران کونسل کے ارکان بٹھا دیے گئے۔

وہ شخص جو ارکان کونسل سے الگ ہو گیا تھا، درگوت کی جانبی طرف سے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ "اوستو! اس پر مت حیران ہو کہ جو چند منٹ سے بیدار ہونے کے بعد تم نے اپنے چاروں طرف ترکوں کو کیوں موجود پایا۔ میں تم سے بے پوچہ سلگتا ہوں کہ اللہ نے مجھے تو یقین اور برتری عطا کی ہے کیا تمہارے ہاتھ تو ان ہاتھ ترکوں سے اسے چھین سکتے ہیں؟ خدا کے ان احکام کے مصداق وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت، یاد رکھو جسے اللہ نے عزت دی ہے، تم اس عزت کو چھیننا چاہو گے تو ذلیل ہو جاؤ گے۔ اسی طرح جو خدا کی طرف سے ذلیل کیا جا رہا ہو اور تم اسے عزت دینے کی کوشش کرو گے تب بھی ذلیل کر دیے جاؤ گے اور آج کل اللہ نے ترکوں کو عزت دے رکھی ہے اس لیے ان کی عزت کرو ورنہ ذلیل و خوار ہو جاؤ گے۔ بس مجھے اس سے زیادہ تم سے کچھ نہیں کہتا۔"

یہ ارکان قیروان سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں اپنے عرب نژاد ہونے پر فخر تھا۔ انہوں نے درگوت کی باتیں سنیں

مگر اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ایک رکن نے درگوت سے پوچھا۔ "تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ آج ترکوں کو عزت خدا نے دی ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی قرشتہ آیا تھا جو تمہیں یہ بشارت دے گیا؟"

درگوت نے جواب دیا۔ "بے وقوف انسان! اللہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا یہ جاننے اور سمجھنے کے لیے مشکل تسلیم چاہیے۔ قرشتوں کی آمد کا سلسلہ بند ہوا۔ آج یورپی مغربی دنیا سلطنت عثمانیہ کے سامنے بے دست و پا ہے۔ کیا یہ بات سمجھنے کے لیے کافی نہیں کہ آج اللہ ترکوں پر مہربان ہے اور یہ عزت اللہ کی عطا کردہ ہے۔"

درگوت نے قیروانی بزرگوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس سے تعاون کریں، اخوت اسلامی پیدا کریں اور ترکوں کو بھی اپنا بھائی سمجھیں۔

وہ کی دن تک شہر کی ظلم و ستم میں مشغول رہا۔ اس کے بعد اپنے بیٹے حصار رئیس کو فوج سے الگ کیا اور لوگوں کو بیٹل بار بتایا۔ "لوگو! یہ میرا بیٹھتا ہے۔ میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ یہ نوجوان رشتے میں میرا کیا لگتا ہے مگر آج بتا دیا رہا ہے کہ یہ میرے بھائی کا بیٹا حصار ہے۔ اس کے نام کا لفظ رئیس سے ملتا ہے کہ اسے... میں اس کا خطاب تو کی طرح نے عطا کیا ہے جو اس کی خدا دادی فطرت کی وجہ سے عطا ہوا ہے۔"

"میں تیونس میں مستقل نہیں رہ سکتا کیونکہ میرے ذمے دوسرے بہت سے کام ہیں اس لیے یہ تیونس میں میری نیابت کرے گا۔"

ترک فوج کو درگوت کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہ تھا، اس لیے انہوں نے کوئی اختلاف نہ کیا اور حصار رئیس کو بطور حاکم شہر تسلیم کر لیا لیکن قیروانی بزرگ، درگوت کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ انہیں اعتراض تھا کہ یہ نوجوان قیروانی بزرگوں پر حکم نہیں چلا سکتا۔ انہوں نے اپنے اس اختلاف کا کسی سے ذکر نہیں کیا مگر اہلین کے نمائندوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔

درگوت اپنے بھائی بزرگ کے ساتھ مل کر چلا گیا جبکہ حصار رئیس نے تیونس کا حکم و ستم سنبھال لیا۔

اسی دوران میں چارلس نے اقوام یورپ کی طرف سے سلطان سلیمان سے ایک معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کی رو سے جنگ یا کسی کے علاقے پر جبری تسلط یا حملے کو ناجائز قرار دیا گیا۔ مگر اب سلطان سلیمان یا اس کا کوئی جرنیل کسی بھی یورپی ملک یا شہر پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح چارلس،

سلطان کے کسی علاقے پر یا کسی مسلم ملک پر حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید یہی اطمینان ڈوریا کو تیونس سے اٹلی لے گیا تھا کہ اس کے پیچھے تیونس پر کسی کے حملے کا خطرہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ تیونس کے مقامی اور غیر مقامی لوگ کسی بھی طرح ترکوں کی بالادستی ماننے کو تیار نہ تھے۔



چارلس کو جب یہ خبر ملی کہ تیونس اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو اسے بہت قلق ہوا مگر وہ اندر سے معاہدہ مذکورہ کو تیونس کو منجی دیتا کا حصہ نہ خود کو سمجھ سکتا تھا اور نہ کسی اور کو سمجھ سکتا تھا۔ یورپ اور اس خبر سے بے چین تھا لیکن وہ سب کچھ نہ کر سکتے کی حیثیت میں تھے۔ چارلس کو مختلف ملکوں سے اطلاعات ملیں کہ ترکوں کے خلاف ایک اتحاد قائم ہو رہا ہے اور اس کی سربراہی کا مسئلہ درپیش ہے۔ چارلس سے درخواست کی گئی کہ وہ اس متحدہ فوج کی کمان سنبھالے۔

اسی دوران میں طرطوط کا نواب ڈان گارشا اچانک سیاسی حق پر نمودار ہوا اور چارلس سے درخواست کی گئی کہ یورپ کی متحدہ فوج کی کمان ڈان گارشا کے سپرد کی جائے۔ چارلس کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ جب اس مقصد کے لیے ڈان گارشا نے چارلس سے ملاقات کی تو اس وقت ڈوریا بھی بولا گیا۔ ڈوریا نے صاحب رئیس کو اسے خاصا لے لیا کیونکہ اس کے اپنے خیال میں صاحب رئیس کو اس کے بڑھانے کا یہ بہترین موقع تھا۔

یہ چند بڑوں کی مجلس مشاورت تھی اور صدر رئیس خود چارلس تھا۔ اس نے ڈوریا کے ساتھ صاحب رئیس کو کچھ کرکچھ ناگواری سے مدد بنایا۔ پوچھا۔ "اس محفل خاص..... میں اس عرب ملاج کو لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

ڈوریا نے جواب دیا۔ "جناب والا! میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں کہ ہمیں قدرت نے تیونس میں مداخلت کا ایک بہترین موقع اسی طرح دیا ہے کہ اندر سے معاہدہ اس عیسائی فوجیں ہماری سرکردگی میں تیونس نہیں چاکتیں مگر صاحب رئیس کے ذریعے ہم یہ کام لے سکتے ہیں۔"

چارلس کو بخبری امور سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی لیکن تیونس کے نکل جانے کا اسے قلق ضرور تھا۔ اس نے ڈان گارشا سے پوچھا۔ "کیا تو نے اپنی حیثیت کا اندازہ لگا لیا ہے اور تجھ کو تیونس میں ہونے والی جنگ کے سیاہ و سفید سے عہدہ بڑا ہونے کا کچھ اندازہ ہے؟"

ڈان گارشا نے چارلس کو سمجھایا۔ "میں ایک عیسائی عہدہ کی حیثیت سے، سواری کا خواہش مند ہوں اور خداوند سنا نے

مجھے یہ موقع فراہم کر دیا ہے تو میں اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں۔"

چارلس نے ڈوریا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ڈوریا تیرا ساتھ دے گا۔ میں تو صرف مشورے اور بات چیت کی حد تک اس مہم میں حصہ لے سکتا ہوں۔"

ڈوریا نے صاحب رئیس سے کہا۔ "دوست! اقم کر بے ہو جاؤ۔ شاید قدرت نے تمہیں اسی دن کے لیے میرے پاس بھیجا تھا۔"

ابھی تک صاحب رئیس کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ مجلس مشاورت کس سلسلے میں منعقد ہوئی ہے۔ چارلس نے کہا۔ "تیرے سامنے درگوت نے تیونس پر قبضہ کر لیا ہے اور ہم اس کی واپس کے لیے اندر سے معاہدہ کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ اب تو ہم سے درخواست کرے گا کہ تیرے ملک پر ترکوں نے قبضہ کر لیا ہے اس لیے تیری مدد کی جائے۔ میں تیرے معاون اور مددگار کی حیثیت سے تو کچھ کر سکتا ہوں مگر اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتا۔"

صاحب رئیس شرمندہ تھا کہ اسے چالاک مسیحی اس کی مرضی کے خلاف استعمال کر رہے تھے اور اس میں اتنی ہمت و جرأت بھی نہیں تھی کہ وہ استعمال ہونے سے انکار کر دیتا۔ ڈوریا نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

صاحب رئیس نے جواب دیا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ میں نہ تو کسی ملک کا حکمران ہوں نہ کسی شہر کا حاکم پھر میں کس حیثیت سے تم لوگوں سے مدد طلب کروں گا؟"

چارلس نے جواب دیا۔ "الطرب اتحاد کے ایک علمبردار کی حیثیت سے اور یہ حیثیت کسی حکمران سے کہیں زیادہ ہے۔ جس طرح آٹھ مسیحی سلطنتوں کا میں تھا تھا متحدہ ہوں اسی طرح عرب اتحاد کے علمبردار کی حیثیت سے تو عرب دنیا کا نمائندہ ہو جائے گا۔"

صاحب رئیس نے پوچھا۔ "جب مسیحی دنیا میری مدد کو تیونس بھیجے گی تو اس وقت میں کہاں رہوں گا؟"

ڈان گارشا نے کہا۔ "تو ہمارے ساتھ رہے گا۔"

ڈوریا نے کہا۔ "اور اس کا بھی امکان ہے کہ درگوت کو تیونس سے بے دخل کرنے کے بعد وہاں کی حکومت تیرے حوالے کر دی جائے۔"

صاحب رئیس نے آہستہ سے کہا۔ "صاحبان! آپ مجھے استعمال کریں مگر اس بات کو یاد رکھیں کہ آپ نے تیونس کی راہ کے بعد وہاں کی حکومت مجھے دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

ڈوریا نے کہا۔ "بے شک اہم اپنا وعدہ دو تمہیں گے"

لیکن تمہیں بھی یہ عہد کرنا ہوگا کہ بحیثیت تیونس کے حکمران تم کبھی عرب بحریہ کے قیام اور تعمیر وترقی میں کوئی حصہ نہیں لو گے۔

صالح رئیس نے پوچھا۔ ”یہ پابندی کیوں؟ اگر میں عرب بحریہ وجود میں لاتا ہوں تو بحیثیت حلیف مجھ سے تم لوگوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔“

چارلس نے کہا۔ ”ترکوں کی بحریہ نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے اور اب ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے مقابل ایک عرب بحریہ بھی آجائے۔“

ڈان گارشیا نے کہا۔ ”مجھے تو اس معاملے میں مجبوراً شامل کیا گیا ہے، ورنہ تو ہمارے لیے بالکل بے مصرف ہے۔“

درحک اسی طرح نرم گرم باتیں ہوتی رہیں اور آخر میں صالح رئیس سے ایک تحریری درخواست کی گئی کہ اس کے ایک عرب شہر پر ترکوں نے قبضہ کر لیا ہے اس لیے تیونس کی آزادی کے لیے اس کی مدد کی جائے۔

چارلس نے اس سے اختلاف کیا۔ ”تیونس کسی عرب ملک کا حصہ نہیں ہے بلکہ وہ شمال مشرقی افریقہ کا ایک حصہ ہے۔ تم یہ لکھ سکتے ہو کہ اس حصے پر کئی سو سال سے تم عرب لوگ حکومت کر رہے ہو اور یہ شہر عرب اتحاد میں شامل ہے، اسی لیے تم نے ہم سے مدد کی درخواست کی ہے۔“

صالح رئیس نے وہ سب کچھ لکھا جو چارلس اور ڈان گارشیا چاہتے تھے۔

متممیں سے چارلس نے غصہ طور پر عیسائی ملکوں سے درخواست کی کہ وہ تیونس کے معاملے میں ڈان گارشیا کی مدد کریں۔

اس بار یورپ کی فوجیں غلطی کے مقابل مشرق میںا بلدیہ کے ساحل پر جمع ہونے لگیں۔ کیونکہ ڈان گارشیا غلطی کا نواب تھا اور نواب مسلمانوں سے جہاد کے خداوندی حق کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

صالح رئیس کے دل پر بڑا بوجھ تھا کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے۔ اسے بھی خدا کے سامنے جواب دینا ہے۔ اسے یہ سوچ کر بھی وحشت ہو رہی تھی کہ تیونس کے ساحل پر اس کے نام نہاد عیسائی حلیف اس کو جہاد کے عرصے پر درگاہ کے سامنے کھڑا کر دیں گے اور ہر طرح کی بادرکاری میں گمے کے یہ عظیم الشان معرکہ صالح رئیس کی ادا دہلی پر برپا ہو رہا ہے۔

دو دن اس وقت تو کچھ نہیں ہوا لیکن مجلس مشاورت کے برخاست ہونے کے بعد رات میں دونوں میں مکمل کے

باتیں ہوئیں۔

صالح رئیس نے ڈوریا سے کہا۔ ”دوست ڈوریا! تم لوگ میرے ساتھ بہت برا سلوک کر رہے ہو۔ مجھے ایسی امید نہیں تھی۔“

ڈوریا نے پوچھا۔ ”تم مجھ سے کیا توقعات رکھتے تھے؟“

صالح رئیس نے جواب دیا۔ ”میں تمہاری بحریہ میں ترکوں کے خلاف معاون و مددگار بننا چاہتا تھا مگر تم لوگ عربوں اور ترکوں کو مقابل لاکر ایک نیا جتہ کھڑا کرنا چاہتے ہو۔“

ڈوریا نے جواب دیا۔ ”دوست! تم یہی سمجھ لیں کہ میں تمہیں بحیثیت معاون و مددگار سمندر کی سطح پر لیے جا رہا ہوں۔ تم شاید چارلس سے واقف نہیں ہو۔ وہ بہت ہی سخت مذہبی اور انتہا پسند حکمران ہے اور اسے ترکوں سے نفرت ہے۔ اس نے ہمیں گوارا کر لیا اب تم اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو اور وہ تم سے فائدہ اٹھائے گا۔“

رات کو صالح رئیس سے ڈان گارشیا نے پلغیہ طے کو کہا۔ صالح رئیس تو یہاں حکم کا بندہ تھا، انکار نہیں کر سکتا تھا اور اس صورت میں کہ ڈوریا بھی پلغیہ جا رہا تھا۔ یہ تینوں پلغیہ روانہ ہو گئے۔

پلغیہ کے ساحل پر روز اٹھی، سلا، صیدا، پالینڈا، انگلستان، جزیرے کے جہاز کھینچ رہے تھے۔ غرض بہت سے ملکوں نے اپنے اپنے بحری بیڑے ساحل پر پہنچانا شروع کر دیے اور یہاں ڈوریا اور ڈان گارشیا کا زیادہ وقت مشغوروں اور معائنے میں گزر رہا تھا۔ ان میں صالح رئیس کو بہت کم شریک کیا جاتا تھا۔

کئی کئی جہاز پر صالح رئیس کو بھی لے جایا گیا اور سپاہیوں سے ملاقاتیں کروائی گئیں۔ اس طرح عیسائیوں نے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے امیر البحر کو قریب سے دیکھا۔ انہوں نے ترک بحریہ کے بڑے بڑے لوگوں کے نام تو سنے تھے مگر کسی کو اس طرح قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

اس بار موم کا بھی خاص خیال رکھا گیا اور ڈوریا کے مشغوروں پر خاص دھیان دیا گیا لیکن اس بار ڈان گارشیا چارلس کا مقام حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔

کئی بار ڈان گارشیا اور ڈوریا میں بحث و مباحثہ بھی ہوئے اور ڈوریا نے ہمیشہ یہی محسوس کیا کہ غلطی کا یہ نواب چارلس بننے کی فکر میں ہے۔

ڈوریا کے بڑے چاہنے والے اسے کچھ کچھ پسپائی پسند

ذہنیت کا عادی بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے جو اس کو آگے بڑھایا۔ کیونکہ اس میں ڈوریا کو اپنی جوانی دکھائی دے رہی تھی اور جتنا جو اس کی خواہش کو سمجھتا جا رہا تھا۔ لہذا اب وہ اپنے چچا جیسا مقام حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔

صالح رئیس نے اس سے کہا کہ وہ کو دیکھا تو ایسا لگا جیسے خدا نے اس کے لیے ایک نیا معاون و مددگار منتخب دیا ہے۔ وہ کبھی بھی جو اسے لئے بھی لگا۔

ڈوریا نے جب یہ دیکھا کہ صالح رئیس نے اس کے پیچھے کو دوست بنالیا ہے تو اس نے جو اس کو سمجھایا۔ ”اس عرب ملازم پر کسی قسم کا بھروسہ نہ کرنا۔“

جوا نے کہا۔ ”میں تو صالح رئیس سے گھر کی باتیں معلوم کرتا رہتا ہوں اور ایسا انداز کی بات تو یہ ہے کہ صالح رئیس بہت بڑا امیر البحر ہے۔ یہ اسے سوچھی کیا جو ہم میں آگیا۔“

ڈوریا نے پیچھے کو سمجھایا۔ ”صالح رئیس کی تعریف اس کے منہ پر مست کر دینا ورنہ وہ خود کو ہم سب کے مقابل بہت بڑا آدمی سمجھنے لگے گا۔“

ڈان گارشیا بھی صالح رئیس سے کئی بار ملا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ صالح رئیس کسی کام آئے یا نہ آئے مگر اس کو سامنے رکھ کر تیونس کے عربوں کو اپنا حامی بنانا جا سکتا ہے۔ صالح رئیس کا یہ فہم کہ عربیوں نے دوا ایک ہو جائے، عالم اسلام میں تفریق پیدا کرنے کے لیے بہترین فقرہ ہے۔ مسلمان خود بخود زبانوں اور جغرافیائی حدود میں تقسیم ہوتے جائیں گے۔

تیونس پر ڈان گارشیا کی سرپرستی میں مغربی ممالک جو متحدہ ویلفا کر کے والے تھے، چارلس نے خود کو ان سے علیحدہ رکھا۔ وہ ورپردہ ان اتحادیوں کو مشورے بھی دے رہا تھا اور کئی مدد بھی کر رہا تھا مگر یہ ظاہر ان سب سے اعلیٰ تیار رہا۔

درگاہ نے تیونس کو اپنے پیچھے حصار رئیس کی تحویل میں دے دیا اور خود اٹلی روانہ ہو گیا۔

خیر الدین کی طرح درگاہ کے سر پر نظر تھا کہ سلطنت عثمانیہ سے اپنی مہمات کے سلسلے میں جو کچھ لیا جائے اس سے زیادہ سلطنت عثمانیہ کو واپس کیا جائے۔

جب وہ اٹلی جا رہا تھا تو اس نے کئی جہازوں کو اسی سمت میں جاتے دیکھا۔ ان جہازوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ کئی جہاز صرف ایک جہاز کی حفاظت اور نگرانی کے لیے سفر کر رہے ہیں۔

چالاک درگاہ نے اندازہ لگایا کہ یہ مخصوص جہاز جس کی دوسرے کئی جہاز حفاظت کر رہے ہیں، ضرور کوئی قیمتی چیز لے کر جا رہا ہے۔

درگاہ نے اس پر حملہ کر دیا۔ محافظ جہازوں نے درگاہ کا مقابلہ کیا لیکن یہ مقابلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہا۔ درگاہ کے جہازوں نے ان سب جہازوں کو ترے میں لے لیا اور حکم دیا کہ وہ درگاہ کے ساتھ نکلیں۔

ان جہازوں کے ساتھ مجبوری یہ تھی کہ اگر وہ مقابلہ کرتے تو درگاہ انہیں برا کر دیتا۔ سب ہی کو سمندر کی ت میں بٹھا دیا جاتا لیکن درگاہ کا حکم سامنے میں یہ فائدہ تھا کہ وہ زندہ بچ جاتے اور کسی نہ کسی طرح کبھی رہائی بھی ممکن ہو جاتی۔

درگاہ ان جہازوں کو اپنے درمیان لیے ہوئے شاخ زریں میں داخل ہوا۔ جہاز کا عملہ گرفتار کر لیا گیا۔ جہازوں کے محافظین کو قتل کر دیا گیا اور جس جہاز کی حفاظت کی جا رہی تھی اس سے اٹلی کا خزانہ برآمد ہوا۔

یہ ظاہر درگاہ کا یہ معمولی کارنامہ تھا جو سمندری سفر کے دوران میں اس نے انجام دیا تھا مگر اس سے سلطنت عثمانیہ کو بہت فائدہ پہنچا۔

سلطان سلیمان کو جب یہ معلوم ہوا کہ درگاہ نے تیونس بھی واپس لے لیا ہے تو اسے اور زیادہ خوشی حاصل ہوئی اور اسے اعتراف کرنا پڑا کہ درگاہ خیر الدین باربروسہ کا بہترین جانشین ہے۔

سلطان سلیمان کو تیونس کی طرف سے یہ اطمینان تھا کہ چارلس معاہدہ امن کی وجہ سے تیونس پر حملہ نہیں کرے گا اور درگاہ نے بھی اسی معاہدہ امن کی وجہ سے اپنے پیچھے حصار رئیس کو تیونس میں چھوڑ دیا تھا۔

حصار رئیس قیروانی بزرگوں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن وہ قیروانی بزرگ جس کی کوششوں سے حمید بن حسن کو تیونس کی حکومت کی بھی بھر اسی قیروانی بزرگ کی کوششوں سے حمید بن حسن کو بھی معزول کر دیا گیا اور حکومت کی باگ ڈور کئی قیروانی بزرگوں کی کوششوں نے سنبھال لی تھی، حصار رئیس کے قیروانی نہیں آ رہا تھا۔

یہ یہ ظاہر حصار رئیس سے تعاون کر رہا تھا لیکن وہ دل سے عرب اتحاد کا حامی تھا اور سلطنت ترکیہ اور حصار رئیس کو عاصی سمجھتا تھا۔

قیروانی بزرگ کو صالح رئیس کا اعتقاد تھا جو متحدہ عرب کے منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کس کس

تیونس سے بے دخل کرنے کے لیے مغرب سے متحدہ قوتوں نے کمر ہا ہے۔

اس قیروانی بزرگ نے روپوش ہو جانے کی کوشش کی مگر حصار رئیس نے اس کو بروقت گرفتار کر لیا اور اس سے پوچھا۔ ”تو مسلمان ہونے کے باوجود عیسائیوں سے مدد کیوں حاصل کر رہا ہے؟“

قیروانی بزرگ نے اس کی تردید کی۔ ”صاحب زادے! میں نے کسی سے بھی تمہارے خلاف مدد نہیں مانگی۔ وہ تو صالح رئیس ہے جو عرب اتحاد کے لیے کام کر رہا ہے اور میرا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔“

حصار رئیس نے کہا۔ ”لیکن میں نے سنا ہے کہ تم صالح رئیس کے قہر والی بزرگ سے جوہ چاہتا ہے، وہی تم چاہتے ہو۔“

قیروانی بزرگ نے جواب دیا۔ ”جناب! میں کسی طرح ممکن ہے کہ میں اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف عیسائیوں سے مدد چاہوں۔ اس میں صالح رئیس پر اختیار نہیں رکھتا۔“

حصار رئیس ٹھٹھکی کر رہا تھا کہ یہ چالاک قیروانی بوڑھا چاہیچاہے کے باتیں جو کر رہا ہے اس میں اس کے دل و دماغ سمجھ نہیں رہا تھا۔

پھر اچانک حصار رئیس کے سمندری خبروں نے یہ خبر دی کہ مغرب سے جہازوں اور کشتیوں کا ایک طوفان تیونس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

حصار رئیس کو عابدہ امین کے پیش نظر ابھی تک یہ یقین تھا کہ اب عیسائی تیونس کی مدد نہیں کریں گے مگر عیسائی فوجیں اس کی طرف بڑی چلی آ رہی تھیں۔ خبروں نے اپنے طور پر مشورہ بھی دیا تھا کہ صالح رئیس چرنکوب سے آگے جہاز پر موجود ہے، اس لیے تیونس کے لوگ بھی صالح رئیس کا ساتھ دیں گے۔ ان حالات میں اپنی جیت کا امکان بہت کم ہے۔

عیسائیوں کے بحری جہازوں کے قریب سے داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے ہی حصار رئیس نے اپنا بحری بیڑا پھیل بڑھنے کے سائل پر پہنچا دیا اور معمولی سے مقابلے کے بعد حصار رئیس تیونس سے نکل گیا اور ڈان گارشیافا تھا نہ شان سے تیونس میں داخل ہو گیا۔

چونکہ صالح رئیس کو آگے رکھا گیا تھا اس لیے تیونسی عربوں نے ڈان گارشیافا کا ساتھ دیا۔

حصار رئیس کے آدمی درگوت کو تلاش کر رہے تھے۔ درگوت کو جیسے ہی یہ خبر ملی کہ مغربی عیسائیوں کا متحد لشکر ڈان گارشیافا کی قیادت میں تیونس پر قابض ہو چکا ہے تو وہ فوراً مہدیہ کی طرف روانہ ہوا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ ڈان گارشیافا

کے ساتھ چونکہ ڈان گارشیافا نے اس لیے اس بار عیسائیوں کی یہ مہم تیونس پر قبضے کے ساتھ ہی ختم نہیں ہوگی بلکہ اس خطرناک سے تیونس تک پورے علاقے پر عیسائی قبضہ کر لیں گے۔ مہدیہ اور جرجہاں دونوں کے دو مقامی علاقے تھے۔ درگوت نہایت آسانی سے جرجہاں پہنچا اور یہاں جنگی حکمت عملی ترتیب دی جانے لگی لیکن یہاں سے اس کو کسی وجہ سے اٹنی جانا پڑا۔

سلطنت عثمانیہ کو خبر ہو چکی تھی کہ تیونس پر حملے اور قبضے نے معاہدہ امن کو داغ دار کر دیا ہے۔ سلطان عیساہ نے چارلس کو انتہائی سخت خط لکھا اور اس نے جواب طلب کیا کہ معاہدہ امن کی خلاف ورزی کیوں کی گئی؟

چارلس نے جواب میں سلطان عیساہ کو لکھ دیا کہ اس مہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ طیلطہ کے نواب ڈان گارشیافا کی کارروائی ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ بحری قزاقی کہا جاسکتا ہے۔

سلطان عیساہ نے چارلس کے خط پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ شک ہے ڈان گارشیافا کی قزاقی ہے اور چارلس ان قزاقوں کا سر پرست ہے۔“

تیونس پر قابض ہونے کے بعد ڈان گارشیافا نے طرابلس سے رابطہ قائم کیا۔ طرابلس پر بحری افریقہ کا جہاز ساحلی شہر تھا۔ ان دونوں کے درمیان جرجہاں اور مہدیہ واقع تھے۔ مہدیہ تیونس سے قریب تھا اور جرجہاں طرابلس سے۔ گویا طرابلس یا تیونس کے بعد یہی دو مقام تھے جن پر عیسائیوں کے قابض ہونے کے بعد مسلمانوں کی بربری افریقہ سے متعلق اہم بندرگاہیں عیسائیوں کے قبضے میں جا رہی تھیں۔

ڈان گارشیافا کا یہ بیڑا جاکم تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی تیونس میں کامیابی کے بعد خط لکھا کہ وہ مہدیہ اور جرجہاں پر بھی قبضہ کر لے تاکہ طرابلس سے تیونس تک پوری ساحلی پٹی پر عیسائی قابض ہو جائیں۔

چنانچہ ڈان گارشیافا نے مہدیہ پر اچانک حملہ کیا اور اسے بھی فتح کر لیا۔

ان دونوں درگوت اہلی کے ساحلی علاقوں میں الجھا ہوا تھا اور اس کو جیسے ہی یہ خبر ملی کہ مہدیہ پر بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو وہ نہایت تیز رفتاری سے صحیح صورت حال جاننے کے لیے جرجہاں آیا اور جرجہاں کو جاننے کے لیے پہنچا۔

جرجہاں کو بھی قوت کچھ ایسا تھا کہ ایک ٹھک آبی راستے سے جرجہاں میں داخل ہوا یا مسکا تھا لیکن اگر اس ٹھک دہانے کو

گھیرے ہیں لے لیا جاتا تو محصور حکومت بھتیار ڈال دینے پر مجبور ہو جاتی۔

جرجہاں کے اندر جنوبی حصے میں دلدلی جھیل واقع تھی اور اس دلدلی جھیل کو آبی شاہراہ کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔

درگوت نے جرجہاں میں اپنا ڈیرا ڈال دیا۔

ڈان گارشیافا کے ساتھ ڈیرہ بھی آ گیا تھا۔ اس نے اس خطرناک اور نازک محل وقوع کا فائدہ اٹھایا اور جرجہاں کے دہانے کے سامنے اپنا بحری بیڑا کھڑا کر دیا۔ گویا اب درگوت محصور ہو چکا تھا۔

ڈوریا کو شاید ہی کبھی اتنی خوشی حاصل ہوئی ہو جتنی درگوت کو حاصرے میں لے لینے کے بعد حاصل ہوئی تھی۔

ڈوریا نے فوراً چارلس کو لکھا۔ ”جناب! ڈان گارشیافا جس درگوت کو ہم نے تین ہزار سو گنے کے سکون کے عوض چھوڑ دیا تھا اور بعد کے تقریباً آٹھ نو سال درگوت کی تباہ کاریوں میں بصرے تھے، خداوند کج کا شکر ہے اب وہ درگوت ہمارے قبضے میں ہے۔ اب ہم اسے مقدمہ چلا کر قتل و واقعی سزا دے سکیں گے۔“

جرجہاں میں محصور ہونے کے بعد درگوت نے ڈان گارشیافا کو لکھا کہ اس کی فوج کے مقابلے میں تو اس کی فوجیں کم ہیں۔ ان کے دل اندلی عیسائیوں پر نکلے تھے۔ یہاں یہ جرجہاں گرم ہوئی کہ صالح رئیس اندلی لشکر میں موجود ہے اور اب یہاں صالح رئیس حکومت کرے گا۔ گویا اب اندرا اور باہر دونوں جگہ درگوت کے دامن میں موجود تھے۔

کئی اطراف سے گھرا ہوا درگوت جرجہاں سے ٹھکنے کے راستے تلاش کر رہا تھا۔ سر دسٹ اس نے جرجہاں کے آبی دہانے پر تو تینوں گھبراہٹیں اور دقت دقت سے گولہ باری شروع کر دوائی۔

ڈوریا نے مقابلے سے سوچا جانا۔ اس نے اپنے چہاز پیچھے ہٹا لیا کہ درگوت کا گولہ بارود ضائع ہوتا رہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر درگوت نے پیچھے ہٹ کر براہ فکری نکل جانے کی کوشش کی تو شمال میں مہدیہ اور تیونس اس کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ جنوب میں طرابلس تھا، مالٹا کے عہدیدین تھے۔ اگر وہ جنوب میں طرابلس سے سمندر میں پہنچتا چاہتا تو ایک بہت بڑی دلدلی جھیل تھی جس سے جہازوں کو سمندر تک لے جانا ناممکن تھا۔

درگوت نے اسی دلدلی جھیل کو کام میں لینے کا فیصلہ کیا اور ہزاروں مزدوروں نے فحشی کو کھود کے سمندر تک آبی

شاہراہ بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ اس جھیل کو آبی شاہراہ میں بدل دینا چاہتے تھے۔

ایک طرف کھدائی ہوئی رہی تاکہ سمندری پانی جھیل میں داخل ہو سکے اس کی دلدلی حیثیت کو ختم کر دے۔ دوسری طرف گولہ باری ہوئی رہی تاکہ ڈوریا یا اس گمان میں رہے کہ درگوت اس کا مقابلہ کر رہا ہے۔

جب گولہ باری میں کچھ وقت پیدا ہونے لگا تو ڈوریا کو بڑی خوشی ہوئی کہ آخر کار گولہ بارود کا ذخیرہ ختم ہو رہا ہے۔

ڈوریا کو اطمینان حاصل تھا کہ درگوت اس کی چال میں ٹپکس چکا ہے اور اب وہ کسی بھی طرح گرفتاری سے نہیں بچا سکے گا۔

گولہ باری میں وقت پیدا ہوا تو ڈوریا کے ہاتھوں نے اجازت چاہی کہ انہیں آگے بڑھ کر درگوت کی گرفتاری کا موقع دیا جائے لیکن ڈوریا کو شبہ تھا کہ درگوت اتنی آسانی سے قابو ہونے والے نہیں ہیں اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ گولے بارود کا ذخیرہ جھولے رکھے گا جیسے ہی ڈوریا جیش قدمی کرے، درگوت اس پر اچانک حملہ آور ہو جائے۔

ڈوریا نے آخری کارروائی کے لیے اپنے عمل کو چاق و بیکر بند رکھا۔

جب گولہ باری بالکل بند ہو گئی تو ڈوریا نے اپنے بحری بیڑے کو آہستہ آہستہ اندر بڑھا کر شروع کر دیا اور یہ حکم دے دیا کہ جس طرف سے بھی ان پر حملہ ہو، وہ اس طرف شدید گولہ باری شروع کر دیں۔

لیکن ان پر کسی طرف سے بھی گولہ باری نہیں ہوئی۔ وہ نہایت خاموشی سے اندر بڑھتے چلے گئے اور فحشی پر قبضے کے دم لیا۔ اب وہ یہاں سے اس مورچے کا بیڑہ لے کر رہے تھے۔

مقامی لوگوں نے کچھ بتایا اس لیے پسند نہیں کیا کہ درگوت کو مدد دینے کے جزم میں انہیں کوئی سزا دی جائے۔

ڈوریا جہاز تھا کہ درگوت کی فوج اسے اور جہازوں سمیت کہاں خائب ہو گئی۔ دلدلی جھیل اب بھی سو ہو چکی مگر کھدایا ہوا حصہ قریب ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں آتا تھا۔

ڈوریا نے ان حصوں کا جائزہ لیا جہاں درگوت نے محاذ بنایا تھا اور تو جیسے ٹھک کر کے مسلسل گولہ باری کی تھی۔

جب گولہ باری کا سلسلہ متوقف ہوا تو ڈوریا کو گمان ہوا کہ اب درگوت کی طرف سے صلح اور شرائط کی درخواست آنے والی ہے یا پھر درگوت کی یہ بھی کوئی جنگی حکمت عملی ہوگی اور وہ ڈوریا کے آگے بڑھنے کا انتظار کر رہا ہوگا۔

اسی اندیشے کے پیش نظر اس نے آگے بڑھنے میں

خاصہ وقت لگا یا اور جب پیش قدمی کی تو بہت آہستہ آہستہ،
روک روک کے، اپنے دائیں بائیں اور اپنے آگے پیچھے کا جائزہ
لیتے ہوئے۔ وہ چھوٹک بھونک کر قدم بڑھا رہا تھا اور دائیں
بائیں اور آگے توپ خانے کا سراغ لگا رہا تھا لیکن اپنی رخ پر
کسی کی یا جہاز کا وجود نظر نہ آیا اور جب ڈور یا کھنکی کے
قریب گیا تو وہ بائیں بھی گھس گھس کوئی توپ خانہ نظر نہ آیا۔
جرے کی حیثیت ایک جرے پر سے جیسی تھی اور جرے
میں اگر آدمیوں اور توپ خانوں کو چھپایا جاتا تو بالآخر وہ
پکڑے ضرور جاتے۔

اس نے درگت کی تلاش میں خاصہ وقت ضائع کیا مگر
کچھ ہاتھ نہ آیا اور یہاں سے اسے درگت کی فوج کا ایک
تھنک بھی نہ ملا۔

ڈور یا اگر یہ فرض کر لیتا کہ درگت اپنی فوج کو پانی کے
اس پار تھیں کے علاقے میں نکال لے گیا ہے تو اس کے
جہازوں کو تو میٹھیں گھنٹوں موجود ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہاں کے
دلدلی علاقوں سے جہاز کو نکال کر لے جانے کا یہ مطلب تھا
کہ وہ اپنے پورے بھری بیڑے کو دلدلوں میں پیٹھنا کے تباہ
و برباد کر دیتا۔

اس کے آدمی جرے کے ساحل پر اتر گئے اور پورے
جرے کے کمانی دن تک جائزہ لیتے رہے۔ اس کے آدمی بہت
پریشان تھے کہ درگت نے اپنے بھری بیڑے اور آدمیوں کو
کیاں چھپا دیا ہے؟

دلدلوں کے متوازی جن حصوں کی کھدائی ہوئی تھی وہ
زیر آب ہونے کی وجہ سے سمجھ نہیں آ رہے تھے۔ ان کی مٹی
کتنی دور پھینکوا دی گئی تھی۔

اس نے جرے کے لوگوں کو پکڑا اور ان سے پوچھ
کچھ شروع کر دی لیکن یہاں کے مسلمانوں نے لاعلمی ظاہر کی
اور بتایا کہ جب درگت یہاں آیا تھا تو وہ اپنے گھروں میں
مقید ہو گئے تھے اور جب تک ان کے کانوں میں توپوں کی
آوازیں پہنچتی رہیں وہ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلے۔ گولہ
باری بند ہوئی تھی مگر کسی میں باہر نکلنے کی ہمت نہ تھی پھر
لوگوں نے اعلا کیا۔۔۔ کہ اب عیسائی فوجیں جرے میں
داخل ہو چکی ہیں تو شہری باہر نکلے۔ اب ان کے سامنے
عیسائیوں کا بھری بیڑا ہے۔ جس طرح وہ لوگ درگت کے
بارے میں حیران ہو رہے ہیں، اسی طرح انہیں بھی حیرت
تھی۔ کیا درگت یا اس کے ساتھی اجنبی سے تعلق رکھتے ہیں جو
اپنا بھری بیڑا انہوں میں نکال لے گئے ہیں۔

ڈور یا کئی دن تک درگت کے بیڑے کو تلاش کرتا رہا

اور جب بائیں ہو گیا تو جرے کے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ
شروع کر دی۔

آخر کار جن مزدوروں نے دلدلوں سے ملحقہ حصوں کی
کھدائی کی تھی ان میں سے ایک مزدور ڈور یا کے حصے لگ گیا
اور ڈور یا نے اس سے پوچھا۔ ”تج بتا کہ درگت کا بھری بیڑا
کیاں جا رہا ہے؟“

مزدور نے جواب دیا۔ ”جناب! یہاں کے دلدلی
راستوں سے نکل گیا۔“

ڈور یا نے دلدلی علاقے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”کھنک تو نٹے میں تو نہیں ہے۔ دلدلوں سے تو جہازوں کو بچایا
جاتا ہے اور تو تو درگت کو دلدلوں میں اتار دیا۔ یہ کس طرح
ممکن ہے؟“

مزدور نے ہنکھدے ہوئے حصے دکھائے اور ڈور یا کو
بتایا۔ ”جناب! ان کھدے ہوئے حصوں کو ملا کر فرما لیں اور
پھر ان دلدلوں پر غور کریں تب بات سمجھ میں آجائے گی۔“
ڈور یا مذکورہ حصوں کا جائزہ لیتا رہا تو زمین کے
کھودے جانے کے آثار ملے۔

اس نے مزدور سے پوچھا۔ ”جب یہاں کھدائی ہوئی
ہوگی تو یہاں کی مٹی کہاں پہنچی گی؟“

مزدور نے بتایا۔ ”مٹی کو کچھ کے لیے بے شمار گھوٹوں
کا انتظام کیا گیا تھا اور ان کے ذریعے یہ مٹی پہاڑی کھنڈروں
میں پھینکوا دی گئی۔“

ڈور یا نے دیکھا یہاں کھڈوں میں مٹی کے کئی توڑے
کھڑے ہوئے تھے۔ تازہ کھدی ہوئی مٹی کے توڑے۔

ڈور یا نے اپنے پیچھے کو بلوایا اور دلدلی حصے کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تو ان دلدلوں کے راستے
سمندر تک پہنچ سکتا ہے؟“

پیچھے نے جواب دیا۔ ”سوال ہی نہیں ہوتا۔“
ڈور یا نے اس کو حکم دیا۔ ”لیکن میں تجھ کو حکم دیتا ہوں
کہ تو اپنا ایک جہاز اس دلدلی حصے سے سمندر تک لے جا اور
واپس آ کر مجھے خبر دے۔“

پیچھے نے چیل تو دلدلی حصے کا مشاہدہ کیا پھر اپنے جہاز
کو دیکھا اور پچھا سے پوچھا۔ ”کیا آپ مجھے یہ حکم سمجھیدی سے
دے رہے ہیں؟“

ڈور یا نے جواب دیا۔ ”ہم اس وقت ایک خطرناک
محاذ پر موجود ہیں۔ یہاں شاق کی مخالفت نہیں ہے۔ تجھ کو یہ
بھری بیڑا آج کرنا ہے۔“

پیچھے نے پوچھا۔ ”چچا! آپ مجھے میرے کسی نامعلوم

جرم کی پزیرا تو نہیں دے رہے ہیں؟“
ڈور یا نے جواب دیا۔ ”نہیں سمجھتے ایسے بات نہیں بلکہ
مجھے اس طرح ایک تجربہ کرنا ہے۔“

پیچھے نے کہا۔ ”تو چچا یہ خطرناک تجربہ کسی اور سے
کر دیا کریں۔ مجھے ابھی اپنی زندگی کے کئی کارنامے انجام دینا
ہیں۔“

ڈور یا نے کہا۔ ”سمجھتے! تجربہ سبھی تیرے کارناموں
میں شامل کر دیا جائے گا۔ میں تجھے مجبور نہیں کروں گا۔ اگر تجھ
کو یہ کارنامہ انجام دینے میں ہنچکا ہٹ محسوس ہو رہی ہے تو تو
یہاں میری جگہ بیٹھ، میں یہ کارنامہ انجام دے کر واپس آتا
ہوں۔“

پیچھے نے چچا کو اٹھنے نہیں دیا اور کہا۔ ”آپ یہاں
بیٹھے رہیں، میں جاتا ہوں۔ اگر میرا جہاز دلدلی میں پھنس
جائے تو آپ اس کو نکالنے کی تربیب ضرور کیجیے گا۔“

ڈور یا نے کہا۔ ”اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی، کیا تو
موت سے ڈرتا ہے؟“

پیچھے نے کہا۔ ”موت نے ڈرنے کا سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا لیکن جس مہم میں مسلمانوں کا مقابلہ شامل نہ ہو اور
اس میں موت واقع ہو جائے، میں اس فضول موت سے ڈرتا
ہوں۔“

ڈور یا نے کہا۔ ”تو بالکل خوف نہ کر۔ میں تجھ کو بلا کرت
میں نہیں ڈال سکا اور امید ہے کہ جب تو اس دلدلی کو عبور
کر کے سمندر میں پہنچے گا تو تجھے بڑی خوشی حاصل ہوگی اور پھر
جب اسی راستے سے واپس آئے گا تو اور زیادہ خوش ہوگا۔“
پیچھے نے کہا۔ ”قد اودیر سچ آپ کی زبان مبارک
کرے۔“

پیچھے نے ایک جہاز پر چہرہ بردار بٹھائے اور انہیں
بتایا۔ ”اپنا یہ جہاز دلدلی علاقے سے سمندر تک جانے کا۔ تم
سب کوچہ چلائے میں بہت مہارت دکھانا ہوگی کیونکہ اگر تم
نے اس دلدلی راستے کو پیچھے نہ عبور کیا اور اسی راستے سے
بھجریے واپس آئے تو یہ ہم سب کا عظیم کارنامہ ہوگا۔ تمہیں یہ
سفر جان کی بازی لگا کر طے کرنا ہوگا۔“

پھر جہاز دلدلی حصے کی طرف بڑھا۔ مسلمان خلاصیوں
نے نہایت تیزی سے ہاتھ چلا کر شروع کر دیے۔ جیسے جیسے
دلدلی حصہ قریب آ رہا تھا ڈور یا کا ہتھکا غیر معمولی بار خاطر
محسوس کر رہا تھا۔ جب یہ جہاز دلدلی علاقے میں داخل ہو گیا
تو سب ہی کی عجیب حالت ہو گئی۔ وہ کسی نگاہی خطرے کے
لیے بالکل تیار تھے۔

چچا نے والوں کو حیرت تھی کہ انہیں معمول کی محنت
کرنا پڑ رہی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے جہاز مکمل سمندر میں رواں
رواں تھا۔ ڈور یا کا ہتھکا بھی چچا نے والوں کے پاس اور
بھی جہاز کے بالکل پچھلے حصے میں چلا جاتا۔ وہاں زبان پر بھی
چڑھا کیونکہ اسے سمندر کی سطح اور دلدلی سطح کا موازنہ نہ تھا۔
وہ یہ سمجھتا جاتا تھا کہ جہاز کے دلدلی میں داخل ہونے کے
بعد بھی جہاز کی چال میں کوئی فرق کیوں نہیں آیا۔

ساحل سے ڈور یا جہاز کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور
اسے حیرت تھی کہ دلدلی حصے کو عبور کرتے ہوئے جہاز کی رفتار
میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کئی گھنٹے بعد جہاز دلدلی حصے کو عبور
کر گیا۔ ڈور یا بے حد خوش تھا اور ڈور یا کا ہتھکا بھی۔

جب جہاز بحیرہ روم میں داخل ہو گیا تو کئی چٹھروں
نے ہاتھ کے اشارے سے ڈور یا کے پیچھے کو پکھ بٹایا جو اس کی
سمجھ میں بالکل نہ آیا۔ یہ ایک چھوٹی سی کشتی کے ذریعے
چٹھروں کے پاس گیا اور ایک چٹھرے کو اپنی کشتی میں بلایا۔
اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے تم کیا پوچھ رہے ہو؟“

چٹھرے نے پوچھا۔ ”جناب! آپ جس راستے سے
آئے ہیں وہ تو ایک نہایت پرخطر دلدلی حصہ ہے پھر آپ نے
اسے عبور کس طرح کیا؟ تمام سمندری چٹھیاں اسی حصے میں
جاتی ہیں اور ہم دلدلی کی وجہ سے ادھر نہیں جاتے۔“

جودا نے چٹھرے کو بتایا۔ ”وہ حصہ صدیوں سے ممنوعہ
کہلاتا ہے اور اگر کوئی نہیں جاتا جبکہ اب سفر کرنے کے بعد
اندازہ ہوا کہ یہ آبی شاہراہ بھی محدود نہیں ہے۔“
چٹھرے نے پھر دھماکوں پر ہاتھ رکھا۔ ”جناب! مجھے یہ پہلی
بار تعجب نہیں ہوا بلکہ میں نے اسی راستے سے درگت کو جاتے
ہوئے دیکھا ہے۔“

جودا نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا درگت بھی اپنے
بیڑے کو اسی راستے سے نکال لے گیا؟“

چٹھرے نے جواب دیا۔ ”بالکل جناب! اس میں
شک و شبہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ اپنا آنکھوں دیکھا معاملہ
ہے، ہنسی سالی بات نہیں ہے۔ وہ اتنی شان سے مکمل سمندر میں
داخل ہوا تھا کہ میں کیا عرض کروں۔“

چٹھرے نے ڈور یا کے پیچھے کی چٹھیلوں سے تواضع
کی۔ ڈور یا کے پیچھے نے اس کے ساتھ ایک کھٹا کڑا اور پھر
اسی راستے سے اپنے چچا کی طرف روانہ ہو گیا۔

ڈور یا اپنے پیچھے کے انتظار میں پریشان تھا۔ آخر جب
جہاز کا پرجہ آج اب پر نمودار ہوا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ
رہا۔



لہجہ سب لکھا اور سن رہا

نئے نئے دوست

سنو سناؤ 8020 سروسز دلچسپ ٹیگٹوں اور اچھی آوازوں کی ایک دنیا کا رنگ اور مزہ فراہم کر رہا ہے۔ سنو سناؤ سروسز میں آپ کیلکس گیسے کارڈز جو پاکستان کے مختلف علاقوں سے کال کرتے ہیں۔ ہر کسی کی اچھا دہانہ ہے اور اپنی کہانی۔

یہ سب کارڈز 8020 سروسز میں شامل ہو کر اپنے خیالات اور تجربات کی باتیں دوسرے کارڈز کے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔ 8020 سروسز میں ذرا پیچھے آپ پاکستان کے مختلف علاقوں اور لوگوں کے بارے میں مفید باتیں جان سکتے ہیں۔ دوسرے شہروں میں کیا ہو رہا ہے، وہاں کے لوگ کیا سوچ رہے ہیں اور اپنا نام کیسے مزارتے ہیں۔ آپ یہ سب باتیں اب بہت آسانی سے جان سکتے ہیں۔ آپ بھی اس گفتگو میں شامل ہو کر نئے نئے دوست اپ بہت آسانی سے بنا سکتے ہیں۔

ہمارے ویڈیو کارڈز جو کہ ایچ آر آنوائس اور RJ بنا رہے ہیں، دوسرے سناؤ میں دوسروں سے بات کر کے اپنی صلاحیت کو اجاگر کر سکتے ہیں۔

دوست بنانے اور معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ آپ سنو سناؤ کی ذرا کہہ کر فری ٹیگٹس اور دوسرے انعامات بھی جیت سکتے ہیں اگر آپ کو اچھی باتوں اور اچھے لوگوں میں دلچسپی ہے تو ہر چیز میں آپ کے لئے perfect دے کے۔

تو آج ہی اپنے ہم خیال لوگوں کی اس تحریر انگیز کہانی سے connect ہو جائیے۔ 8020 سروسز کے ذریعے کچھ شکر اور کچھ سناؤں، کچھ باتیں اور کچھ سکھائیں۔



Rs. 5000000

اپنے موبائل سے 8020 ڈائل کریں

آزادی نصیب ہوئی۔
یہ سارے مسلمان خلاصی تھے اور برسا برس سے اپنی عیسائیوں کی غلامی میں تھے۔ انہیں بھی یہی معلوم تھا کہ طرابلس اور تونس کے درمیان ترکوں کی وہ آخری بندرگاہیں بھی ڈور یا نئے چھین لیں۔

جب تک یہ دونوں بندرگاہیں ترکوں کے قبضے میں تھیں اس وقت تک عیسائیوں کے مسلمان غلاموں کو امید ہی نہیں کہ وہ کسی بھی خوف ناک معرکے کے بعد ترکوں کی رنج کی صورت میں آزادی حاصل کر لیں گے اور جب انہیں یہ خبریں ملیں کہ مہدیہ اور جریہ بھی ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گئے تو وہ اپنی آزادی کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تھے۔

لیکن اب جو ایک ترک ان کے جہازوں پر نظر آئے اور انہیں آزادی کی خوش خبری دی تو وہ بہت حیران ہوئے اور انہیں اس اعلان کی صداقت پر شبہ ہوا۔ اب وہ ترکوں کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ ان میں اب بھی اتنی ہی ہمت نہیں تھی کہ وہ اعلان کرنے والے ترک سے پوچھتے کہ تم کون ہو اور کس حیثیت سے اعلان کر رہے ہو؟

غلاموں کے ہاتھ اسی طرح کام کر رہے تھے جس طرح وہ حالہا حال سے قوت کر رہے تھے۔ جہاز کے عیسائی ملازم نے ترکوں کو پرچم اٹھانے کا اشارہ کیا تو انہیں روک لیا گیا اور ان کو ڈرا کرے ہوئے کہا۔ ”اگر تم مسلمان قزاق ہو تو تمہیں یہ معلوم ہوتا چاہیے کہ اب جریہ اور مہدیہ کی بندرگاہیں بھی ترکوں سے چھین لی گئی ہیں اور ترکوں کا نامی کرائی امیر البحر ہمارا قیدی ہے۔“

ترکوں نے سچ عیسائیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے ہتھیار پیچھے رکھیں ورنہ مارے جائیں گے۔

ابھی یہ بحث و تمحیص جاری تھی کہ بہت سے ترک اس جہاز پر پہنچ گئے۔

ملاح نے اپنے جہاز کو بہت سے جہازوں کے درمیان گھرا ہوا دیکھا تو اسے کچھ کچھ یقین ہوا کہ وہ ترکوں کی قید میں جا چکا ہے لیکن یہ ترک کون ہیں جو اب بھی ماننا اور طرابلس کے درمیان بارسلونا کے شائق قاصد جہاز کو گرفتار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک عرب خلاصی نے جہاز کے مسلح سپاہیوں کو اپنے ہتھیار رکھنے دیکھا تو اسے کچھ کچھ یقین آیا کہ شاید ان کا دور غلامی واقعی ختم ہوا ہو پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس جہاز پر بہت سے ترک پہنچ گئے اور اپنے قبضے میں لے لے۔

اب عرب مسلم ملاح ترکوں کے اختیار میں پلے گئے

ڈور یا کا بھتیجا جس شان سے ولدی علاقے سے گزر کے واپس آیا تھا وہ یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ درگوت نے دلدل سے ہاتھ ایک بڑے حصے کو نکھڑا کے اس میں مسافر دری پانی داخل کر دیا تھا جس سے یہ ایک آبی شاہراہ بن گئی تھی اور درگوت صاف سچ کر نکل گیا تھا۔

بہر حال جریہ ڈور یا کے قبضے میں آچکا تھا۔ ڈور یا کے سپاہیوں کو یہ جگہ بہت پسند آئی۔ یہاں غریب بہت پیدا ہوتا تھا اور لوگ ایٹوں بھی استعمال کرتے تھے۔ جن لوگوں کو صرف عیش و عشرت مقصود تھا وہ اسی جریہ میں قیام کرتے تھے۔ ڈور یا کے سپاہیوں کو بھی غریبوں سے اور ایٹوں نے فتح کر لیا۔

بارسلونا میں انتظار تھا کہ درگوت اور ترک سپاہی گرفتار کر کے لائے جا رہے ہوں گے یا ڈور یا مزید جہازوں اور سپاہیوں کا انتظار کر رہا ہوگا کہ وہ آجائیں تو کچھ کہ جریہ کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیے جریہ میں چھوڑ دیا جائے اور درگوت کو دوسرے ترک قیدیوں کے ساتھ بارسلونا روانہ کر دیا جائے۔

ایٹوں کے دارالخلافت سے ایک جہاز اس خبر کے ساتھ جریہ پہنچے تو روانہ کر دیا گیا کہ اگر درگوت اور ترک قیدیوں کو ابھی روانہ نہیں کیا گیا ہے تو ڈور یا ان مزید جہازوں کا انتظار کر رہے ہو یا بارسلونا سے اس کی مدد کو بھیجنے والے ہیں۔

درگوت نے اس جہاز کو درگوت سے مل کر روک لیا۔ حالانکہ بارسلونا کا یہ جہاز بے خوف و خطر پیکرہ روم میں اس لیے سفر کر رہا تھا کہ انجرائز کے علاوہ تمام ساحلی علاقہ عیسائیوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ کچھ دنوں پہلے تک جیولس اور طرابلس کے درمیان مہدیہ اور جریہ ترکوں کے قبضے میں تھے لیکن بارسلونا کی اطلاعات کے مطابق ڈور یا نے ان دونوں بندرگاہوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس لیے پیکرہ روم کی جنوبی آبی شاہراہیں عیسائیوں کے لیے غیر محفوظ ہو گئی تھیں۔

جب بارسلونا کے اسی قاصد جہاز کو درگوت نے محاصرے میں لیا تو اسے گھنٹوں یہی غلط فہمی رہی کہ ترکوں کے یہ جہاز عیسائیوں کے قبضے میں آچکے ہیں اور اب وہی ان جہازوں سے کام لے رہے ہیں۔

درگوت کے سپاہی بارسلونا کے جہاز پر چڑھ گئے اور جہاز کا پرچم اٹھانے کے اس پر بلائی پرچم لہرایا گیا تو جہاز کے ملاح نے ترکوں سے پوچھا۔ ”تم کون لوگ ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

ایک ترک نے سب سے پہلے خلاصیوں کو بتایا۔ ”تمہیں آزادی مبارک ہو۔ تمہیں عیسائیوں کی قید سے

ملاح نے کہا۔ ”جی ہاں! مجھے خود بھی حیرت ہے کہ میرے کانوں نے جو کچھ سنا اور میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، میں ان دونوں میں سے کسی پر اعتبار رکروں۔“

سلطان کو جربہ اور مہدیہ کے نکل جاتے کا بے حد
فسوس ہوا۔ اس نے درگاہ سے پوچھا: "یہ بحری اور

درگاہوں نے کہا۔ ”جناب والا! انہیں عیالات کی جائیداد کے حصے سے معاملات میں دخل نہ دیں کیونکہ اگر میرے تابع نہیں رہیں گے تو میرے معاملات میں مداخلت خود کر دیں گے۔ ہاں یہ اپنی اپنی حد تک اور اپنے اپنے معاملات میں میرے باوجود نہیں ہوں گے۔“

طر ابس میں مالٹا کے حکام انھیں تیار پھاڑ کر دیے
رہے تھے کہ درگوت کے جہاز چیلنا شروع ہو گئے۔ سب سے
پہلے درگوت نے طر ابس کے عیسائی حکمران کو یہ معمولی ماحکم
دیے۔ ”تم طر ابس کو خالی کر دو۔ شہر میرے حوالے کیا جائے۔“

ہم جنہیں طرابلس سے نکل جانے کی اجازت دے دیں گے۔

اس کو شہری حاکم کی طرف سے سخت جواب ملا۔ ”درگوت کو معلوم ہونا چاہیے کہ طرابلس پر مقابلے کے بغیر قبضہ نہیں کیا گیا تھا جو میں اسے تیرے ہاتھ سے تیرے مشکوک گدائی میں ڈال دوں۔ طرابلس تجھ کو نہیں دیا جاسکتا۔“

درگوت کو غصہ تو بہت آیا، جواب میں لگتا۔ ”میں باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا حالانکہ تم لوگوں نے تو طرابلس مشکوک گدائی سے حاصل کیا تھا۔ اس بڑے قزاق نے چھوٹے بھکاریوں کو یونہی دے دیا تھا۔ میں بھکاریوں سے جنگ نہیں کرتا چاہتا۔ اس لیے میری امانت مجھے واپس ملنی چاہیے۔“

طرابلس میں عیسائیوں کے آٹھ فرے 1510ء سے اس سبھوتے پر عمل پیرا تھے کہ ہر فرے کا سردار ایک سال حکومت کرتا تھا اور دوسرے سال دوسرے فرے کا سردار اس سے اقتدار لے لیتا تھا۔ جب درگوت نے محاصرہ کیا تو ایورینا کا کسپارڈی ویلر نامی حیدر طرابلس کا گورنر تھا اور اسی سے درگوت کی بات چیت ہو رہی تھی۔

باہوی کے بعد درگوت نے صناعان یہودی کو حکم دیا۔ ”یہودیوں جھگڑیوں سے حملے کی تیاریاں شروع کر دی جاویں۔“

صناعان یہودی نے کارروائی شروع کر دی اور ہزاروں نے سمندر سے قلعہ کو نشانہ بنایا۔ کسپارڈی ویلر نے حالات سنیں دیکھے اور اسے اندازہ ہو گیا کہ گولہ باری سے قلعہ کی دیواریں ٹوٹ جائیں گی اس لیے اسے نہیں سے کمک ضرورتی چاہیے۔ چنانچہ مالٹا اور تیونس کا صدر دانہ کر دیے گئے۔

درگوت کو یقین تھا کہ کسپارڈی ویلر جس نے ابتر میں سخت لہجہ اختیار کیا تھا اور اب وہ نرمی پر اتر آیا ہے اور صلح اور مفاہمت کی روش اختیار کی ہے تو اس طرح یہ شخص مہلت حاصل کر رہا ہے۔ یقیناً اس کی کہیں مشکوک چل رہی ہوگی، یہ کمک حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ یہ کمک کہاں سے حاصل کی جاسکتی ہے، اس میں اس سوال کا پہلا جواب مالٹا تھا اور دوسرا تیونس۔

اس نے کئی کشتیاں دور دورہ روانہ کر دیں کہ وہ کسی بھی شہر کو طرابلس آنے دیں یہ جانے دیں۔ ایک کشتی پکڑی گئی جو کمک کے لیے مالٹا جا رہی تھی۔ اپنے خط میں کسپارڈی ویلر

نے لکھا تھا کہ درگوت کے مقابلے میں اس کی فوراً مدد کی جائے اور اس صورت حال سے بارسلونا کو بھی مطلع کر دیا جائے۔

اس شہر کی کور درگوت نے اپنے بیڑے کے عقب میں پانچواں دیا اور کسپارڈی ویلر کو سوچنے اور شیر حوالے کرنے کے لیے اردن دیے۔

کسپارڈی ویلر نے حذر پیش کیا کہ وہ اپنے مشیروں کی جس کونسل کے ذریعے طرابلس پر حکومت کرتا ہے اس کے چند ارکان موجود نہیں ہیں اور امید ہے کہ وہ ایک ہفتے کے اندر آجائیں گے اور پھر ان سب کے دستخطوں سے یہ شہر آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اتنا بڑا قدم وہ تنہا نہیں اٹھا سکتا۔

درگوت نے جواب میں لگتا۔ ”میں بھی نہیں چاہتا کہ تو طرابلس کو تنہا میرے حوالے کر دے اسی لیے میں تیرے مشیروں کو بھی اس نازک قدم سے داری سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔ تجھ کو جودن اپنے گئے ہیں، وہ کافی ہیں۔ تیرے ان میری بحریہ اپنا کام شروع کر دے گی اور اس کا جو انجام ہوگا اس سے ہم دونوں واقف ہیں۔“

کسپارڈی کی ساری راہیں بند کر دی گئی تھیں۔ اس کی سوچ پر بھی پھرے لگ گئے تھے۔ کسپارڈی ویلر نے انہوں اور انہوں نے عریہ و زاری شروع کر دی۔ شہری فراری راہیں تلاش کر رہے تھے لیکن صلیبی مجاہد جان وینے اور جان لینے کے لیے آمادہ تھے۔

صناعان یہودی وقت کے گزرنے اور معاہدے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور یہ انتہائی گھڑی گھڑی اذان اور فرائض کے بعد تھم رہی تھی۔

فیصل پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ عیسائیوں نے بھی توپوں کا جواب توپوں سے دیا مگر دیواروں میں شکاف پڑ گئے یا دیواریں ٹوٹ گئیں تو ان کے توپ خانے بھی ان دیواروں کے ساتھ نہیں بوس ہو سکے۔ عیسائیوں کے حوصلے بہت جلد جواب دینے لگے۔

دست بدست بڑی لڑائی کی نوبت اس لیے نہیں آئی کہ شہریوں کی ٹھکانوں نے مجاہدین کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ اس کے علاوہ کئی دن سے گرجوں کے نیچے والے کھنڈے، نچوں اور بادریوں کی گریہ و زاری بھی لڑنے والوں کے حوصلوں پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

درگوت کے جہاز آگے بڑھتے بڑھتے ساحل کے قریب پہنچ گئے اور شہر کے پیچھے ترین جنوبی شہری حصے میں داخل

ہو گئے۔ اسی طرح کچھ فوج شمال سے داخل ہو گئی۔

اب طرابلس دو طرف سے گھیر چکا تھا اور کچھ عیسائیوں نے ان دونوں حصوں میں مسلمانوں کو روکنا شروع کر دیا جس سے قلب کمزور پڑ گیا اور مسلمانوں کو درمیان سے شہر میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ یہاں بھی معمولی سا مقابلہ ہوا۔ کسپارڈی ویلر نے شہر کی چابیاں درگوت کے حوالے کر دیں اور شکایت آمیز لکھے میں لکھا۔ ”آپ نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اور خواہواہ اتنا گولہ بارود ضائع ہوا۔ میں تو اپنے مشیروں کا انتظار کر رہا تھا۔“

درگوت نے چابیاں لے لیں اور پوچھا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو؟“

کسپارڈی نے جواب دیا۔ ”جناب! جب 1522ء میں سلطان سلیمان نے ربوہ کو فتح کیا تھا تو ہمارے ساتھ نہایت مشفقانہ سلوک کیا گیا تھا اور اجازت دی گئی تھی کہ اپنے جملہ سامان سمیت ہم جہاں چاہیں، بٹے جائیں۔ اس وقت ہم نے اپنے لیے مال کا کچھ لے لیا تھا اور سلطان نے ہمیں یہاں آباد ہو جانے کی اجازت دے دی تھی۔“

درگوت نے کہا۔ ”جس کا تم نے یہ جاننا فائدہ اٹھایا کہ طرابلس پر بھی قبضہ کر لیا اور جب تم سے سلطان کا نمائندہ طرابلس کی واپسی کا ذکر کرتا ہے تو تم بھاری کی سنگین سخت دشمنی کرتے ہو۔ اب تم از کم میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہمیں کوئی رعایت کس طرح دی جائے؟“

کسپارڈی نے کہا۔ ”ہمیں مالٹا جانے کی اجازت دی جائے۔“

درگوت نے کہا۔ ”تم اپنے اعلیٰ ترین عہدیداروں کو بھیجا کرو اس کے بعد کوئی بات ہوگی۔ میں ان سے پوچھوں گا کہ کیا تم میری دی ہوئی زندگی کی ہیکہ پر تردد رہنا پسند کرو گے؟“

کسپارڈی نے درخواست کی۔ ”براہ کرم آپ ہمارے لیے ذلت آمیز الفاظ استعمال کریں۔ آخر ہم نے خود ہی مفاہمت کی بات شروع کی ہے تو ہمیں اس کا جواب بھی ایسا ملنا چاہیے۔“

درگوت نے پھر وہی اعلیٰ منصب داروں کے بارے میں بات کی۔ ”براہ کرم وہ فہرست تو پیش کی جائے کہ ایسے کتنے لوگ ہیں جنہیں تمہارا جوا عزت آزادی چاہیے ہیں؟“ درگوت کا حتمہ طرابلس میں داخل ہو گیا اور کسپارڈی نے نہ صرف اپنے معزز افراد کی فہرست پیش کر دی بلکہ ان سب کو بھی درگوت کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

درگوت نے ان سب کو گرفتار کر لیا اور کسی بھی قسم کے معاہدے سے انکار کر دیا۔ اس نے کسپارڈی کو بتایا کہ اس نے یہ اس لیے کیا کہ کسپارڈی نے بھی اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا کہ ایک طرف تو وہ درگوت سے صلح کی بات کر رہا تھا اور دوسری طرف اس نے مالٹا سے کمک طلب کر لی تھی۔ گویا وہ حکمت عملی سے جنگ کے وقت کو طول دے رہا تھا اور صلح یا مفاہمت کا دل سے تامل نہ تھا۔ اس لیے اب وہ اس کے ساتھ کسی بھدردی کے شکی نہیں تھے۔

کسپارڈی نے اسے الزام قرار دیا اور سختی سے اس کی تردید کی تو درگوت نے اس شکی کے عمل کو کسپارڈی کے سامنے پیش کر دیا جو مالٹا کمک لینے جا رہا تھا۔ اس عمل میں کسپارڈی کا قصہ بھی موجود تھا۔

کسپارڈی نے ہمت نہیں ہاری اور دوسری دلیل دی۔ ”لیکن ہم دونوں میں مفاہمت ہو گئی تھی۔ آپ کو اس کا تو پاس کرنا چاہیے تھا۔“

درگوت نے تندہ و تیز لہجے میں جواب دیا۔ ”جب تم لوگ مسلمانوں کے کی شہر پر غلبہ حاصل کرتے ہو تو وہاں کے مقامی مسلمانوں سے رواداری کا سلوک نہیں کرتے، ان سے بھیمانہ پیش آتے ہو اور ہم سے رواداری اور انسانیت سے پیش آنے کی امید رکھتے ہو۔“

کسپارڈی نے بڑی دلیلیں دیں اور درگوت کو ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور ان سب کو قید کر کے قسطنطنیہ روانہ کر گیا اور سلطان سے درخواست کی کہ ان قیدیوں کو قسطنطنیہ کے کوچہ و بازار سے باہر جولان گزارا جائے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ جب وہ مطلوب مسلمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں تو ان مسلمانوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔

قسطنطنیہ میں کسپارڈی اور اس کے ساتھیوں سے وہی سلوک کیا گیا جس کی درگوت نے خواہش کی تھی۔ اب درگوت طرابلس کے استحکام میں مشغول ہو گیا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مغربی دنیا طرابلس کے معاملے میں خاموش نہیں رہے گی کیونکہ یورپ کی مسیحی اقوام نے مالٹا کے غارت گروں کے ذریعے طرابلس کو غارت گروں کے مسلح ملکوں میں آؤٹ پوسٹ (بیرونی پوزی) کی حیثیت دے رکھی تھی اور مالٹا کی یہ حکومت عیسائیوں کا مقدس امتیاز تھا یا عرف عام میں ہراولی دست تھی۔ طرابلس سے مطمئن ہونے کے بعد جہاں کے خلاف کارروائی کی گئی اور درگوت نے اسے بھی جین لیا پھر مہدیہ کا رخ کیا اور اس پر بھی قابض ہو گیا۔

یہ ساری خبریں یورپ پہنچ رہی تھیں۔ چارلس نے
الجزائر کی جہتیز اور پسپائی کے بعد معاملات حکومت اور
مذہبی جہاد سے الگ اختیار کر لی تھی اور اپنا تاج الجزائر سے
واپس آتے ہوئے حکومت سے سمندر میں ٹھیک دیا تھا۔ وہ
کاروبار مملکت ہندوستان اپنے بڑے قلع کو متسلح کرتا رہا اور خود
خانقاہیں بنو گیا۔ وہاں باغی افراتفریاں مچا رہا تھا خداوند متعال کی یاد
تھی۔ شراب نوشی یہاں بھی جاری رہی۔
نوجوان حکمران قلعہ نے اقتدار سنبھالنے والے باپ
کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ وہ درگوت کے قلعے کو ہمیشہ
کے لیے فتح کر دینا چاہتا تھا تا کہ تاریخ میں وہ باپ سے ایک
قدم آگے نکل جائے۔
چارلس آٹھ حکومتوں کا واحد حکمران تھا اور اس
کے بعد یہ حیثیت قلعہ کو حاصل ہونا چاہیے تھی لیکن چارلس
کے چھوٹے بھائی فرڈی منڈ نے باپائے انکسٹم سے ساز باز
کر کے چارلس کا مقام خود حاصل کر لیا۔
قلعہ کو اس سے دیکھ کر پہنچا مگر اس نے عملیہ ثابت...
کھینے کی کوشش کی کہ وہ اپنے باپ چارلس کا جانشین ہے اور
اس کے جس منصب اور مقام کو چھین کر غاصب فرماؤں گا
دیا گیا ہے وہ اسے واپس ملنا چاہیے۔ اس نے بھی طرابلس
کے نکل جانے کی خبریں سنیں اور اس کی واپسی کے لیے بے
چین ہو گیا۔ وہ درگوت کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا۔
بڑے سے ڈر دیا تو نوجوان بادشاہ کو درگوت کے
بارے میں بتایا کہ اسے قلعہ کے باپ نے ایک معمولی اور
خفیہ امیر انکسٹم کے تین ہزار سونے کے ٹکے لے کر چھوڑ دیا
تھا۔ آج وہی درگوت پوری تکی دنیا کے لیے وہاں جان بنا
ہوا تھا۔ ڈر دیا تو ہی قلعہ کو یہ سمجھا ہوا تھا کہ اگر قلعہ پورے
یورپ کو متحد کر کے طرابلس پر یلغار کرے اور طرابلس سے
تیونس تک کے علاقے پر دوبارہ قابض ہو جائے تو یہی تاریخ
میں اس کو چارلس سے بڑی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔
یہ کام اتنا آسان نہیں تھا اس لیے طرابلس پر فوج کشی
سے پہلے اعلیٰ درجے کی حکمت عملی درکار تھی۔
یاضی میں عالم اسلام کے خلاف جب بھی عیسائیت
نے عملی قدم اٹھایا اس میں پادریوں نے اہم کردار ادا کیا
تھا۔ کوئی پادری یا درویش راہب پورے یورپ کو مسلمانوں
کے خلاف متحد کر سکتا تھا۔
اب قلعہ کے امیر پر یہ قدم ثابت پائے روم میں چارم
نے انجام دی۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف پرجوش خطبے
دیے۔ خلیفہ المورس، اسکی، نیپلز اور افریقا میں اپنے مخطیوں سے

آگ لگا دی۔ وہ جنوبی یورپ کے لوگوں کو جتنا پھر رہا تھا کہ
ہلکا سے مقدس سیلیبی مجاہدین کے ساتھ طرابلس میں کیما زلت
آئیں ملوک کیا گیا۔
ان خطبات نے ایک آگ کی لگادی اور عیسائیوں میں
درگوت کے خلاف ایک ایسا پیمانہ اور جوش پیدا ہو گیا، جسے
دیکھ کر کوئی بھی یہ رائے قائم کر سکتا تھا کہ جنوبی یورپ کا یہ مسکن
سیلاب درگوت اور طرابلس کو بہا لے جائے گا۔
قلعہ اپنے معتقد میں کامیاب ہو گیا۔ ایتھین میں مسکن
مجاہد پہلے سے ہی تیار تھے۔
اس دوران میں درگوت، بیالی پاشا اور صحنان یہودی
اٹلی اور اس کے نواح میں حملے کرتے پھر رہے تھے اور دشمن کو
بھی ان کے حملوں سے نقصان پہنچا تھا۔ سلطان سلیمان کا داماد
وزیر ویش کی طرف داری کرتا تھا اور اس نے کئی بار درگوت کو
متنبہ بھی کیا تھا کہ نہ صرف ویش کے خلاف کارروائی نہ کی
جائے بلکہ ان آبی شاہراہوں کو بھی محفوظ رکھا جائے جو ویش
کی گزرگاہ ہیں۔
درگوت سمندری سطح پر اپنے سوا کسی کی بلا دیتی قبول
کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ ان کی کے مضامین سے مال و زر لے کر
قطیفیہ پہنچا تو اس کے ساتھ غلاموں کی بھی ایک بڑی تعداد
تھی۔ سلطان سلیمان قطیفیہ میں موجود نہیں تھا۔ سلطان کی
علم موجودگی کا رستم نے فائدہ اٹھایا۔
درگوت کو ایوان وزارت میں طلب کیا گیا۔
درگوت ایک سچا سچ امیر، خود سر اور من چلا امیر المجر تھا۔ وہ
نہایت متکبرانہ انداز میں اندر داخل ہوا۔ ایوان وزارت کے
کسی پیریدار یا محافظ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ درگوت کو
اخر جانے سے روک دیتا۔
درگوت نے رستم کے بارے میں سن رکھا تھا کہ یہ
سلطان سلیمان کی چوتھی بیوی مہر ماہ کا شوہر ہے اور سلطنت عثمانیہ
کی پوری تاریخ کا یہ واحد وزیر اعظم ہے جسے نجات کی
یگمات کی سفارش پر وزیر اعظم مقرر کیا گیا اور رستم وہ شخص ہے
جو بہت کم باتیں کرتا ہے اور جب کرتا ہے تو صرف حکم دیتا
ہے۔ اس کو بھی کسی نے ہتھ پکڑا سکتا ہے۔
درگوت کو اس عجیب و غریب شخص کا سامنا کرنا تھا۔
چنانچہ جب وہ متکبرانہ شان سے رستم کے سامنے پہنچا تو رستم
اس کی اس روش سے خوش نہیں ہوا اور ایک پیریدار کو طلب
کر کے پوچھا۔ ”تم کچھ دیر پہلے کہاں تھے؟“
پیریدار نے جواب دیا۔ ”میں کئی گھنٹے سے دروازے
پر موجود تھا اور اب بھی ہوں۔“

رستم نے اسے سامنے کھڑے ہوئے درگوت کو دیکھا
اور پیریدار سے کہا۔ ”تم تاہل ہو تم پر خاست کیے گئے۔“
پیریدار میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ عذر داری کرتا۔
چپ چاپ باہر نکل گیا۔
درگوت نے کہا۔ ”میرے پاس تو بارہ وقت نہیں ہے۔“
جواب کرتی ہے، فوراً کی جائے۔
درگوت سے ابھی تک بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا گیا
تھا۔ وہ خود بیٹھ گیا۔
رستم نے دوسری نشست کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں
نہیں ادھر بیٹھو۔“
درگوت نے رستم کے حکم کی کوئی پروا نہ کی اور کہا۔
”میرے پاس زیادہ وقت نہیں، بات کرو ورنہ میں چلا جاؤں
گا۔“
رستم نے نہایت رعوت سے حکمانہ لہجے میں کہا۔
”ویش ہمارا حلیف ہے۔ آئندہ اس سے چھین چھاؤں نہ کی
جائے اور اس کی آبی شاہراہوں کو برائیں رکھا جائے۔“
درگوت نے جواب دیا۔ ”امیر انکسٹم میں ہوں اور
سمندر تہارے اعتبارات وزارت میں نہیں آتا اور نہ تم مجھ
سے سمندری معاملات میں بات کر سکتے ہو۔“
رستم نے پھر اپنی بات دہرائی۔ ”ویش ہمارا حلیف
ہے۔ اس سے چھین چھاؤں نہ کی جائے اور اس کی آبی شاہراہیں
برائیں لائی جائیں۔“
درگوت نے سختی سے تردید کی۔ ”ویش ہمارا دوست
نہیں ہے کیونکہ اس کی دوستی جنگ پر ہی ویرا کے ساتھ ہی ختم
ہو گئی تھی۔“
رستم نے سہارہ بخشی سے کہا۔ ”یہ میرا حکم ہے۔ میں
نے جو کہہ دیا اس کی تعمیل کرنی چاہیے۔ بس اس کے سوا کچھ
نہیں۔“
درگوت نے انکھڑے لہجے میں جواب دیا۔ ”بحری
معاملات میں تیری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لیے آئندہ کبھی
بھی آبی شاہراہ یا بحری معاملے کا مجھ سے ذکر نہ کیا جائے۔“
اب رستم نے بیٹھنا بدلا۔ ”طرابلس میں جو کچھ نے فتح کیا
تھا وہ اسے بخش دیا گیا۔ یعنی اب طرابلس صحنان یہودی کے
حوالے کیا گیا۔ اس سے تم کو کوئی تعلق نہیں رہا۔“
درگوت نے سختی سے کہا۔ ”طرابلس کی ہم کا امیر انکسٹم
میں تھا اسے میں نے فتح کیا تھا۔ جب کسپارڈی اور اس کے
ساتھی میرے حکم پر گرفتار کیے گئے تھے تو انہیں قطیفیہ کے
کوچہ و بازار میں پابند جلاں صری فرما لیں اور میری خواہش پر

پھرایا گیا تھا۔ کسپارڈی نے طرابلس شہر کی گلیاں میرے
حوالے کی تھیں۔ صحنان یہودی تو میرا شریک کار جنگ تھا بعد از
تھا۔“
رستم نے کہا۔ ”اب صحنان یہودی نہیں، صحنان پاشا
ہے۔ طرابلس کا حکمران صحنان پاشا۔“
درگوت نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”مگر یہ سب
کچھ تیرے حکم سے ہو رہا ہے تو میں تیرا ہم نہیں مانوں گا اور
اگر یہ سلطان کے حکم سے ہے تو مجھے مرنے کا حق ملنا چاہیے۔“
رستم نے کہا۔ ”تو خود کہہ چکا ہے کہ میرے اعتبارات
سلطنت عثمانیہ کی زمینوں تک ہیں اور شہر طرابلس زمین پر واقع
ہے۔ تو شوق سے سمندر پر حکمرانی کرتا رہ۔“
درگوت نے ایوان وزارت سے نکلے ہوئے کہا۔
”میں طرابلس سے دستبردار نہیں ہو سکتا اور اگر تو یہ چاہتا ہے
کہ میں تیری کا سہ لسی کروں تو یہ نامکن ہے۔ اگر تو میری
جرات، دلیری اور بہادری کا نظارہ کرنا چاہتا ہے تو مجھے شاخ
قرس پہنچ کر مشاہدہ کرنا ہوگا۔“
رستم نے اپنے ایک محافظ کو حکم دیا کہ وہ شاخ قرس کی
بحرانی کرے اور درگوت جیسے ہی وہاں پہنچے اسے اطلاع دی
جائے۔
درگوت نے بازار کا رخ کیا اور وہاں سے سرخ
کپڑے کا ایک تھان خرید اور اسے جہاز پر لے جا کر حکم دیا
کہ وہاں پرچم کے ساتھ لے کر پرتگیزیہ کے چارلس کے پاس
رستم کو خبر کر دی گئی کہ درگوت شاخ قرس میں داخل
ہو چکا ہے۔
رستم فوراً اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ خیر الدین
باربروس کے حصار کے دروازہ میں داخل ہوا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا
کہ درگوت کتنا ہی غصے یا اشتعال میں کیوں نہ ہو وہ جانے
سے پہلے خیر الدین باربروس کے حصار پر حاضری ضرور دے گا
اور جہاز روانگی سے پہلے خیر الدین باربروس کے حصار کو توپوں
سے سلامی ضرور دیں گے۔
رستم نے بھی باربروس کے حصار کے سر ہانے کھڑے
ہو کر فاتحہ پڑھی۔ اچانک درگوت بھی وہاں سے پہنچے تو لے
ہوئے اندر داخل ہوا اور رستم کو فاتحہ پڑھتے ہوئے دیکھ کر خود
بھی فاتحہ پڑھنے لگا۔
فاتحہ پڑھ سکتے کے بعد اس نے رستم سے کہا۔ ”مجھے تیرا
انتظار تھا۔ تو آگیا بڑی خوشی ہوئی۔ باہر لگی اور تیرا تماشہ
دیکھ۔“
رستم نے باہر نکل کے درگوت کو جہازوں کی طرف

جائے ہوئے دیکھا۔

یہ بڑا صبر آزا وقت تھا۔ رستم کی نظر میں درگوت کے بحری بیڑے پر بھی ہوئی تھیں جن پر ہلائی پرچم لہرا رہے تھے۔ اس نے اچانک ایک شخص کو یاد بانوں سے متسلل پرچم والی لٹی پر چڑھتے دیکھا۔ اس کی نفل میں ایک سرخ کپڑا دیا ہوا تھا۔

پھر ہلائی پرچم غائب ہو گیا اور اس کی جگہ سرخ پرچم لہرانے لگا اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے جملہ جہازوں پر سے ہلائی پرچم غائب ہو گئے اور ان کی جگہ سرخ پرچم لہرانے لگے۔

پھر درگوت کی طرف سے اعلان ہوا۔ ”رستم اب تو مجھے سمندری راہوں میں تلاش کرو! جہاں کوئی علامت نہیں ہوئی، کوئی عمارت نہیں، کوئی چوراہا نہیں، کوئی جنگل نہیں، کوئی درخت نہیں اور کوئی بازار اور کوئی کوچہ نہیں۔ میں سب سمندر کا بے تاج بادشاہ ہوں۔ مجھ پر تیرا حکم نہیں چلے گا۔“

رستم حیران تھا کہ وہ یہ کیا دیکھ رہا ہے اور کیا سن رہا ہے۔

یہ ایک توپوں کی آواز مٹتی ہوئی درگوت کے جہازوں نے خیرالدین باربرد کو صحتی سلام کیا تھا۔

درگوت کا بحری بیڑا دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا اور رستم سرکشی اور بغاوت کا شاندار اور ناقابل فراموش نظارہ کرتا رہا۔

اب رستم کو یقین تھا کہ درگوت نے جذبات اور جوش کے عالم میں جو عاقبت نااندیشانہ قدم اٹھایا تھا وہ اس کے خطرناک انجام کی نشاندہی کر رہا تھا۔ گویا رستم نے درگوت کو اس مقابلے میں شکست دے دی تھی۔ جتنی پرچم کی بے حرمتی اور اس کو اتر کر اپنا پرچم لہرانے کی سرکشی۔ یہ بظاہر ایک مگر حقیقتاً دو ناقابل معافی جرم تھے۔ رستم سلطان سلیمان کے مزاج اور غلط و غشبی سے واقف تھا۔ ایک ایسا شخص جس نے اپنے ولی عہد، اپنے سب سے بڑے بیٹے کو نہ معاف کیا ہو، وہ درگوت کو کس طرح معاف کر دے گا۔

پورے قسطنطنیہ میں ہر شخص کی زبان پر درگوت کی سرکشی کے جہے تھے۔

رستم نے صناعان بیہودی کو صناعان پاشا کر دیا تھا۔ طرابلس کی حکومت اس کے نام کر دی گئی اور اسے حکم دے دیا گیا کہ وہ فوراً طرابلس پہنچے اور طرابلس کا قلم و لیس سنبھال لے۔

ان دنوں یورپ متحد ہو رہا تھا اور مشرق اور سلطنت

عثمانیہ انتشار کی طرف مائل تھے۔ وہاں ہم خیال اور ہم ارادہ لوگ تھے، یہاں ہر شخص کے ساتھ اس کی سوچ الگ تھی۔ ارادے الگ تھے، نصاب الگ تھا۔

سلطان سلیمان وسط ایشیا کے دورے سے واپس آیا اور یہاں آتے ہی رستم کی زبانی درگوت کی سرکشی اور بغاوت کی داستان سنی تو ذرا سی دیر کے لیے سلطان بھی بہک گیا اور اس نے حکم دیا کہ درگوت جہاں کہیں بھی ہو، اسے گرفتار کر لیا جائے۔

رستم کے لیے بس یہ فرمان کافی تھا۔ طرابلس صناعان پاشا کو دے دیا گیا۔ اس طرح دور دستوں میں علیحدگی ہو گئی۔ اب رستم کے پیچھے ہوئے بحری جہاز بحیرہ روم میں رواں دواں ہو گئے لیکن رستم نے صرف اس کی تلاش براکتفا نہیں کیا بلکہ وہ ایک بحری بیڑا بھی ترتیب دینے لگا جو درگوت کو سمندر پر گرفتار کرے اور اگر وہ قابو میں نہ آئے تو اسے تباہ و برباد کر دیا جائے۔

عثمانی جہاز بحیرہ روم میں درگوت کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ان جہازوں کو درگوت کی یہ نشانی بتائی گئی تھی کہ اس کے جہازوں پر سرخ و سفید پرچم لہرا رہے ہوں گے۔ سرخ پرچم لہراتے ہوئے تو رستم نے بھی دیکھے تھے لیکن سفید پرچم کے چارے میں اسے ان کشتیوں نے خبر دی تھی جو درگوت کے جاتے وقت یا سونوں کو مجبور کر رہی تھیں اور ایسا نے کوئی کس بندوگاہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کشتیوں کے ملاحوں نے سرخ پرچموں کے درمیان سفید پرچم بھی دیکھے تھے۔



سلطان سلیمان کو قلب اور پاپائے روم چہارم کی خندہ کوششوں کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ ان کی تقریروں کے نتیجے میں یورپ پر جس طرح تشدد ہوا تھا اسے خبر بھی یا تفصیل ملی گئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تقریباً دو سو بحری جہاز طرابلس کو واپس لینے کے لیے تیار ہیں۔

اسی عالم میں رستم نے سلطان کو بتایا۔ درگوت نے سرکشی اختیار کی اور اس نے اپنے جہازوں پر سے سلطنت عثمانیہ کے ہلائی پرچم اتار دیے اور اپنے پرچم لہرا دیے۔

سلطان، رستم کی زبانی درگوت کی بغاوت اور سرکشی کی کہانی سنتا رہا اور اس نے پوچھا۔ ”اس نے ایسا کیوں کیا؟“ رستم نے بتایا۔ ”میں نے ویش کے سلسلے میں درگوت کو بدایات دی تھیں کہ ویش ہمارا سا لہا سال حلیف رہا ہے مگر جب اس نے ہماری دوستی کو بالائے طاق رکھ دیا اور اتحاد

خلاشا ایک رکن بن گیا اور ہری ویزا کے مقام پر بحری جنگ میں اسے شکست ہوئی تو سلطنت عثمانیہ نے اسے دی ہوئی مراعات واپس لے لیں۔ اس طرح ویش بالکل تباہ و برباد ہو گیا حالانکہ بعد میں اس نے تالان جنگ بھی ادا کر دیا اور معافی بھی چاہی۔ اسے معاف بھی کر دیا گیا لیکن درگوت نے ویش کو کئی بار نقصان پہنچایا اور اس کی آبی شاہراہوں کو کھود ویش اور بحر خطرناک بنا دیا جس پر میں نے درگوت کو حکم دیا کہ وہ اسخندہ ایسا نہیں کرے گا۔ درگوت نے میرا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور اس نے کہا کہ سلطنت عثمانیہ کا حکم زمینوں کی حد تک قابل قبول ہو سکتا ہے۔ سمندر کو مالک و مختار درگوت ہے اس لیے درگوت وزیر کا حکم نہیں مانے گا۔“

سلطان سلیمان یہ کہانی نہایت دلچسپی سے سنتا رہا اور جب رستم چب ہو گیا تو سلطان نے پوچھا۔ ”چپ مت ہو، آگے بیان کر دو پھر کیا ہوا؟“

رستم نے کہا۔ ”مجھے بتایا گیا تھا کہ طرابلس کی تعمیر میں صناعان کا کرافتدر حصہ تھا۔ میں نے اپنے زمینی اختیارات سے کام لیتے ہوئے طرابلس کی حکومت صناعان کو دے دی اور اس کے نام کے ساتھ پاشا کا اضافہ کر دیا۔“

سلطان نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

رستم نے کہا۔ ”درگوت نے میرے اس فیصلے کی مخالفت کی اور کہا کہ صناعان تو میرا شریک کار اور ماتحت تھا۔ اسے طرابلس کا حکمران نہیں بتایا جا سکتا اور پھر وہ ناقابل متسلل ہوا کہ اس نے اپنے جہازوں پر سے ہلائی پرچم اتار دیا اور ان کی جگہ سرخ و سفید پرچم لہرا دیے اور مجھ سے کہا کہ اب تم مجھے سمندری بیڑے میں ڈھونڈتے رہو۔“

رستم خاموش ہو گیا اور سلطان کچھ سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”تو اب وہ کہاں ہوگا؟“

رستم نے جواب دیا۔ ”وہ کہیں بھی ہو، مگر وہ ہلائی پرچم کے بغیر اپنا ذاتی پرچم لگائے سمندری سطح پر رہے گا تو کہیں کا بھی نہیں رہے گا۔“

سلطان نے پوچھا۔ ”اس کی تلاش کا بندوبست کیا گیا؟“

رستم نے جواب دیا۔ ”ہمارے کئی جہاز اس کی تلاش میں جا چکے ہیں اور میں اس کی مکمل سرکشی کے لیے ایک بحری بیڑا ترتیب دے رہا ہوں۔“

سلطان نے گویا خندہ سے بھرا ہوا ہوتے ہوئے کہا۔ ”درگوت کے بحری بیڑے میں جہاز کس کے ہیں؟“ رستم نے جواب دیا۔ ”بیشتر جہاز ہمارے ہیں اور چند

وہ جہاز ہیں جو... درگوت نے عیسائیوں سے جیسے تھے یا خود تیار کروائے تھے۔“

سلطان نے دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے کہا۔ ”تو گویا اس نے ایک جرم اور کیا یعنی اپنے ساتھ ہمارے جہاز بھی لے گیا۔“

رستم نے نہایت خوشی سے تائید کی اور کہا۔ ”بے شک اور اسی لیے میں مغرب درگوت کے تعاقب میں ایک بحری بیڑا روانہ کر دوں گا جو اس کو گرفتار کر کے یہاں لے آئے گا اور اگر ممکن تھا بلکہ ہوا تو درگوت کو ہلاک کر دیں گے۔“

سلطان نے کہا۔ ”یہ آخری بات غلط ہے۔ درگوت کو جبر سے سامنے نہ دلا یا جائے کیونکہ میں اس مقدمے کی پوری روداد اس سے بھی سنتا چاہتا ہوں اور عدالت میں انصاف کا تقاضا بھی نہیں ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو سامنے لکھا کر کے ان کے بیانات لیے جائیں۔ مستفیض سے دعویٰ سننے اور دوسرے فریق سے جواب دعویٰ سننے پھر کیے بغیر پہنچا جا سکتا ہے۔ درگوت کے خلاف انتخابی کارروائی فی الحال نہیں کی جا سکتی۔“

رستم کو ایسا لگا جیسے وہ مقدمہ بار رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”درگوت ایک جوتی، خود سرواں میں جلا امیر البحر ہے جو من مانے فیصلے کرتا ہے اور یہ سب کچھ حکومتی قلم و ضبط کے خلاف ہے۔ آئی کہتا ہی تھے میں کیوں نہ ہوں تو یہ پرچم کا ہر حال میں احترام کرنا چاہیے مگر درگوت نے قوی پرچم کی بے حرمتی کی ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”سب درست لیکن اب یہ مقدمہ میری عدالت میں چلے گا۔ اگر مسئلہ یہی ہوتا تو مفتی کو شریک کر لیا جاتا۔“

رستم نے آہستہ سے کہا۔ ”تب پھر ہمیں درگوت کا اتحاد کرنا پڑے گا مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس کی تلاش میں نکلنے والے جہاز اگر اسے تلاش کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو اس کو واپس لانے میں ناکام رہیں گے۔“

سلطان سلیمان کا حکم تھا کہ... درگوت کو واپس لایا جائے، اس طرح کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے۔

رستم نے درگوت کے خلاف بحری بیڑے کی تیاری جاری رکھی اور کئی جہاز مختلف سمتوں میں درگوت کی تلاش میں روانہ کر دیے گئے۔

حالانکہ رستم کو یقین تھا کہ کوئی بھی جہاز درگوت کو واپس نہیں لاسکتا بلکہ یہ امکان تھا کہ یہ جہاز بھی درگوت کے قبضے میں چلے جائیں گے اور درگوت کے بحری بیڑے میں

مزید چند جہازوں کا اضافہ ہو جائے گا۔

☆ ☆ ☆

درگوت نے کرینٹ کے ساحل پر قیام کیا۔ اب اس کے سامنے کی ساحلی بندرگاہیں تھیں جہاں وہ اپنے بحری بیڑے کو ٹھہرا سکتا تھا اور ان میں موزوں ترین بندرگاہ انگریزوں کی جس کو آئے دن انگریزوں سے خطرہ لاحق رہتا تھا۔ یہ بندرگاہ اس کی سب سے زیادہ پسندیدہ تھی۔ یہاں کے لوگ بھی اس سے نہ صرف واقف تھے بلکہ بہت مانوس تھے اور شاید حسن آغا کو بھی یہاں ایک مضبوط امیر البحر کی ضرورت تھی۔ درگوت کو یقین تھا کہ انگریز اسے پناہ دے سکتا تھا اور کسی وجہ سے حسن آغا مجبور بھی ہو جائے تو تھیں اور انگریز کے درمیان کی ایسی غیر معروف بندرگاہیں موجود تھیں جو اس کی معاون اور پناہ گاہ بن سکتی تھیں۔ یہاں سے وہ آزادانہ بحری قزاقی کر سکتا تھا۔ اسے اب اس بات کا قطعی کوئی شک یا فہم نہیں تھا کہ اس نے سلطنت عثمانیہ کے وزیر رستم سے جھگڑا کیا اور اپنے جہازوں سے ہلائی پر پیم ارتوا دیے اور ان کی جگہ اپنے سرخ و سفید مارو پر پیم لہرا دیے۔

سلطنت عثمانیہ کا ایک جہاز درگوت کو تلاش کرتا ہوا کرینٹ پہنچ گیا۔ اس نے کرینٹ کے ساحل پر بہت سے جہاز لشکر اتنا دیکھے تھے۔ ان جہازوں پر سرخ و سفید پرچم لہرا رہے تھے جس سے ترکی کے خلاشی جہاز کو مطمئن ہو گیا کہ یہ درگوت کے جہاز ہیں۔

درگوت کے ساتھیوں نے بھی ایک جہاز کو اپنی طرف آتے دیکھا جس پر دو پرچم لہرا رہے تھے، ایک پرچم ہلائی تھا اور دوسرا سفید۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ یہ جہاز درگوت سے صلہ کی بات چیت کرتے آئے ہیں۔

اس وقت درگوت کشتی پر بیٹھا پر لطف باتوں میں مشغول تھا۔ اسے اس کے دوستوں نے تھیرے میں لے کر کھانا کھا اور اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کرینٹ کا ساحل چھوڑنے کے بعد کہاں جائے گا؟

درگوت نے انگریز کا نام نہیں لیا اور کہا۔ ”اب تو ہمیں دوبارہ قزاقی کا پیشہ اختیار کرنا پڑے گا جس میں کسی کی خوشی یا ناخوشی کا خیال نہیں کرنا پڑتا۔ کسی بالادست کو کوئی حصہ نہیں دینا پڑتا۔ دل و دماغ سے جواب ملے گی اور جواب دہی کا دھڑکاٹل جائے گا۔“

اس کے ایک دوست نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ”جناب! میں آپ کی اس دھڑکے والی بات سے اتفاق نہیں کروں گا۔ اب تو آپ کو کوئی مسئلہ سے دھڑکاٹل جائے گا۔ سلطان سلیمان کا دھڑکاٹل اس کے جہاز ایک سرکش باغی مغرور

کی تلاش میں ہوں گے۔ اس میں کا دھڑکاٹل ایک لاوارث، بے آسرا، محرف امیر البحر کو تلاش کر رہے ہوں گے جنہیں اس سے بہت زیادہ نقصانات پہنچیں گے۔ مالٹا کے مسیحی عبادین کا خوف جن کی یہ کوشش ہوگی کہ درگوت اور سلطان سلیمان میں کسی طرح دوبارہ مفاہمت نہ ہو جائے۔ وہ اس مفاہمت سے پہلے آپ کا کام تمام کر دینے کی کوشش کریں گے۔“

درگوت۔۔۔ اسے سنا بھی کی کچھ بھی ہوئی ہونیکا خیالی تصویر سے ذرا بھی نہ ٹھہرایا اور اسے سنا بھی سے پوچھا۔ ”دوست! یہ دنیا کتنی بڑی ہے اور ابھی کتنی کام ہمیں علم ہے اور کتنی سے ہم بے خبر ہیں؟“

ساتھی نے جواب دیا۔ ”دیکھو اور پھر دیکھو کہ کسی کو کچھ پتا نہیں۔ تا معلوم دنیا کا ہمیں کوئی حکم نہیں لیکن معلوم دنیا کتنی وسیع ہے کہ دن رات چلتے رہے تو بھی یہ بھی ختم نہیں ہوگی۔“

درگوت نے کہا۔ ”قوس۔ میں نظر انہیں ہوں اور خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ میں اس زمین پر کبھی بھی جا سکتا ہوں۔“

اس دوران میں ایک شخص بھاگتا ہوا درگوت کے پاس پہنچا اور بے آواز بلند خبر دی۔ ”سلطنت ترکیہ کا ایک جہاز حکومت کا ہلائی پرچم اور امن و صلہ کا ایک سفید پرچم لہرا رہے ہوئے جارہے قریب پہنچ چکا ہے۔“

درگوت نے بے چینی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اپنے بیڑے کو مستعد کر دیا جائے۔ یہ امن و صلہ کا جہاز اپنے پیچھے بہت سے جہازوں کو لاسکتا ہے تاکہ جب ہم مطمئن ہو سکے جہاز والوں سے امن و صلہ کی بات کریں تو اس غفلت سے فائدہ اٹھا کے سلطان کے دوسرے جہاز ہم پر حملہ کر دیں۔“

اس لیے اس وقت ہماری یہ حیثیت نہیں ہے کہ ہم کسی پر آگے بند کر کے ٹھہر دیا کریں۔“

دیکھتے ہی دیکھتے تمام جہازوں پر اس کا حملہ اور فوجی پہنچ گئے۔

درگوت ساحل پر ہی کھڑا رہا۔ اس کی نظریں دور سمندری سطح کا جائزہ لے رہی تھیں کہ شاید کسی طرف سے اور جہاز نمودار ہوں۔

اس دوران میں آنے والے جہاز سے چند آدمی اترے اور درگوت کے پاس پہنچے۔ ان میں سے ایک کو درگوت نے پیالی پاشا کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کا نام سعید تھا اور یہ باتیں بڑی پر لطف کیا کرتا تھا۔

سعید نے درگوت کو دیکھتے ہی سلام کیا اور کہا۔ ”استادا آپ نے بہت پریشان کیا۔ کہاں کہاں کی خاک چھان کر

یہاں پہنچا ہوں۔“

درگوت نے کہا۔ ”تو نے تو اب تک مجھے سمندر کی سطح پر ہی تلاش کیا ہوا اور سمندر کی سطح پر خاک کا وجود نہیں ہوتا پھر تو نے کس طرح خاک چھانی؟“

سعید نے کہا۔ ”میں نے اپنی محنت اور پریشانی کو محاورے کی زبان میں بیان کیا ہے۔“

درگوت ہنسنے لگا۔ ”کیسے آتا ہوا؟“

سعید نے جواب دیا۔ ”جناب! آپ نے ہم سب کو چھوڑ دیا آپ واپس چلیں۔“

درگوت نے کہا۔ ”تو نے مجھ کو دیکھ دیا وہاں چلیں۔ یہ کیا بات ہوئی، تفصیل بیان کر۔“

سعید نے بتایا۔ ”آپ کا مقدمہ سلطان کی عدالت میں پہنچ چکا ہے۔“

درگوت نے پوچھا۔ ”تھہ کو میری تلاش میں سلطان نے بھیجا ہے یا اس البانوی بدعاش نے جس کا نام رستم ہے؟“

سعید نے جواب دیا۔ ”مجھے تو رستم نے بھیجا ہے مگر اس کو سلطان نے حکم دیا تھا۔“

درگوت نے کہا۔ ”میں واپس نہیں جاؤں گا کیونکہ اس غیبت کی کوئی بات نہیں باتوں کا جو خود کو سلطان کا داماد اور سب سے زیادہ اختیار زد پر سمجھتا ہے۔ یہ ازار بھاری رحمت اس کے لیے عزت کا باعث ہو تو ہو، میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔“

سعید نے بے خوف شام کی اور دلیلیں بھی دیتا رہا کہ اسے بظاہر تو رستم نے بھیجا ہے لیکن رستم کو یہ حکم سلطان نے دیا تھا۔

درگوت نے سعید کو بھی ترغیب دی کہ وہ قسطنطنیہ واپس نہ جائے اور اس کے ساتھ شامل ہو جائے لیکن سعید نے انکار کر دیا اور کہا۔ ”آپ ذرا مگر نہ ٹھہرائیں۔ سلطان آپ کے ساتھ انصاف کرے گا۔“

درگوت نے جواب دیا۔ ”میں فی الحال واپس نہیں جاؤں گا کیونکہ میں ان لوگوں سے واقف ہوں جو اس قسم کی ملاقاتوں کے دوران میں نہیں آس پاس موجود رہتے ہیں اور پھر اچانک نمودار ہو کر اپنا کام کر کے واپس چلے جاتے ہیں اور شخص مذکور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔“

سعید نے درگوت پر انہیں کیا۔ ”میں آپ کے پاس بڑی تو تھاوت لے کر آیا تھا مگر آپ میری بات نہیں مانتے۔ یہ بہت برا ہوا۔“

درگوت نے پوچھا۔ ”تو واپس جا کے اس البانوی بدعاش سے کیا کہے گا جو بڑیم خود سلطان کے بعد سب سے زیادہ با اختیار انسان ہے۔“

سعید نے جواب دیا۔ ”جو جواب دیا۔“ جو جواب آپ نے دیا ہے اسے ہرانے کی کچھ بھی نہیں ہے۔ کس بھی کبہ دواں گھڑ کر آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

درگوت نے کہا۔ ”لیکن تیرے ساتھی تو یہی جواب دیں گے کہ تو نے مجھے پایا تھا۔“

سعید پریشانی میں ٹھہر گیا۔ اب وہ نہ تو درگوت کے پاس رکنا چاہتا تھا اور نہ ہی دل واپس جانے کا مشورہ دیتا تھا۔ سعید چند دواں کے لیے درگوت کے پاس ہی ٹھہر گیا۔

پھر ایک ایک انہیں مثال کی طرف سے بہت سے جہاز آتے دکھائی دیے۔

درگوت کے ماہر ساتھی نے بتایا۔ ”جناب! یہ جہاز ڈیوک میڈینا کی سرداری میں طرابلس جا رہے ہیں۔ اس میں دوسو سے زیادہ جہاز جمع ہو چکے ہیں اور جنوبی یورپ کی جملہ قومیں اس میں شامل ہیں۔“

درگوت نے انہیں کرتے ہوئے کہا۔ ”اب دیکھتا ہے صغناں بیوہ کی جسے رستم نے پاشا کو خطاب دیا ہے، طرابلس کو کس طرح بچاتا ہے۔“

اس موقع پر سعید نے اس کو مشورہ دیا۔ ”نب پھر جناب، اب آپ طرابلس پہنچیں اور اس جنگ میں حصہ لیں اور جب فتح حاصل کر لیں تو سلطان کو یہاں کی پوری روادار لکھ دی جائے۔ اس وقت آپ کی کتنی جائے گی اور اس طرح آپ کو سامانی معافی مل جائے گی۔“

درگوت ہنسنے لگا اور کہا۔ ”یہ ساری خیالی باتیں ہیں جو فضول اور بے معنی ہیں۔ سلطان کچھ بھی کہے۔ طرابلس کی شکست ہو یا فتح، یہ دونوں چیزیں صغناں سے وابستہ کر دی جائیں گی۔“

ڈیوک میڈینا کے ساتھ پادری بھی تھے اور یہ حسب سابق دعاؤں کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ درگوت کو یہ بات بھی بتا دی گئی۔ درگوت نے کرینٹ چھوڑ دیا اور رھوڑ توڑی گلیا۔ یہاں بھی عیسائیوں میں بوجہ و خروش پایا جاتا تھا لیکن سلطان کے زیراثر ہونے کی وجہ سے رھوڑ کے عیسائی اپنے جوش و خروش کا اظہار برطانیوں کر سکتے تھے۔

رھوڑ کے چند روزہ قیام کے دوران میں ہی درگوت کو بتایا گیا کہ یہاں تھیرے طور پر عیسائیوں کی بھرتی ہو رہی ہے اور یہ لوگ بھی طرابلس کی مذہبی جنگ میں حصہ لیتا چاہتے

اس خبر نے درگوت کو یہ سبق دیا کہ یہ جنگ مذہبی ہے اور اس کے اور ترکی کے اختلافات سے عیسائیوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اس نے سعید سے پوچھا: ”اچھا اب یہ بتا کہ سلطان میرے پاس سے کیا دے رہا ہے؟“

سعید نے کہا: ”سلطان آپ کا مداح ہے لیکن آپ کی زاد و بوموں تک دوری سلطان کو آپ کی طرف سے بدظن بھی کر سکتی ہے اس لیے آپ کی قلعہ بندی سے دوری خطرناک ہے۔“

☆☆☆

ڈیوک میڈیٹا نے گریٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے درگوت کے بیڑے کو دیکھا تھا۔ ڈیوک کے بیڑے میں ڈور یا بھی موجود تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ درگوت کی ترک حکومت سے ان بن ہو گئی ہے اور درگوت قلعہ بندی سے ناراض ہو کے گریٹ کے ساحل پر پڑا ہوا ہے۔ اگر اسے یہ سن گئی ہوتی تو وہ اپنے دو سو جہازوں کے ساتھ درگوت کا محاصرہ کر لیتا اور بوجھالے میں اس کی یہ خواہش پوری ہو جاتی کہ اسے کاش اور درگوت کو وہ بارہ گرفتار کر سکتا۔ فی الحال تو وہ طرابلس کو واپس لینے جا رہا تھا۔

اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر اس بھوٹے سے بیڑے سے پھیر پھار کر کسی کو دیکھیں کہیں کوئی بڑا بیڑا بھی موجود ہو سکتا ہے اور طرابلس پہنچنے سے پہلے ہی کسی بڑی جنگ کا آغاز ہو سکتا ہے جو فی الحال کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔

ڈیوک میڈیٹا اور ڈور یا میں اس سلسلے میں کچھ باتیں ہوئیں اور پھر یہ لوگ طرابلس کی طرف بڑھ گئے۔

مالٹا سے آگے پہنچنے کے بعد ایک نئی بحث چھڑ گئی۔ چنانچہ ڈیوک میڈیٹا کو طرابلس کی طرف سے کیوں خطرات لاحق ہو گئے تھے کیونکہ اس نے طرابلس کے بجائے جزیہ کو اپنی منزل مقصود قرار دیا اور طرابلس کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔

اس اتحادی لشکر میں مالٹا کے کئی کئی موافق اور موجود تھے اور یہ سب ڈور یا کی طرح چاہتے تھے کہ ترکوں سے پہلے طرابلس واپس لیا جائے اس کے بعد جزیہ کا محاصرہ کیا جائے۔

ڈیوک میڈیٹا نے کہا: ”روستو! طرابلس تو مسلمانوں کا محفوظ ترین قلعہ ہے جہاں تو کی کو فیض شہر کی حفاظت کر رہی گی اور شہری بھی ان کا ساتھ دیں گے، جس سے یہ مقابلہ کمزور ہونا چاہا جائے گا۔ پھر چاہیں کہ اس مہم کا کیا انجام ہو لیکن جزیہ پر حملہ کرنے سے ہمارا مقابلہ صرف معمولی

سایہوں سے ہوگا۔ شہری آبادی بھی ان کا ساتھ نہیں دے گی کیونکہ جزیہ کے لوگ یا تو خربوزے بہت کھاتے ہیں یا پھر اقبیوں بہت استعمال کرتے ہیں اور اس کے نشے میں وہ اس لائق نہیں رہے کہ جنگ وجدال میں حصہ لیں۔ اگر بدرجہ مجبوری حصہ لے بھی لیں گے تو وہ لڑنے کے لائق نہیں ہوں گے۔“

ڈیوک میڈیٹا کی دونوں شہروں کے بارے میں تجزیاتی دیکھیں اپنا کام کر سکیں اور سب ہی کا ارادہ بدل گیا۔ چنانچہ دو سو مگر جہازوں کا جزیہ کی طرف کر دیا گیا۔

ہر سبکی عیاد بے چینی سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا کہ شاید کہیں کوئی آبادی نظر آجائے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ جزیہ کے ساحل پر پہنچ گئے۔ یہ وہی ساحل تھا جس کے ایک دہانے پر ڈور یا، درگوت کو روک لنگر انداز ہو گیا تھا اور پھر درگوت دلدلی پھیلنے کا سلسلہ سمندر سے ملا کے قرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ان دنوں جزیہ کا حاکم ایک عرب تھا۔ اس عرب نے اچانک عیسائیوں کے جہازوں کو دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فوری بھی مزاحمت نہ کی اور محاصرہ کرنے والوں سے پوچھا: ”وہ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟“

ڈور یا نے بھلایا: ”جزیہ کو ہمارے ہوا لے کر دو اور تم اسن وعافیت سے نکل جاؤ۔“

عرب حاکم نے پوچھا: ”جانے کے بعد ہمارے مسلمان بھائیوں سے کیا سلوک کیا جائے گا؟“

ڈور یا نے جواب دیا: ”ہم صرف تمہارے امن وعافیت سے نکلنے کی فست داری پوری کر سگے۔ بقدر لوگوں سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ کہیں تمہیں بھی یہ عافیت نکلنے سے روک دیا جائے۔“

ڈیوک میڈیٹا کا خیال تھا کہ حاکم کو بھی نہ نکلنے دیا جائے اور اسے بھی گرفتار کر لیا جائے تاکہ ساتھ آنے والے عیسائیوں کے حوصلے بڑھ جائیں لیکن ڈور یا نے کہا: ”جنگوں کے بھی کچھ اصول ہیں اور سب ایسوں کی بھی کچھ اخلاقیات ہوتی ہیں۔ جب عرب شیخ نے ہتھیار ڈال دیے اور اذروے معاہدہ وہ یہاں سے یہ عافیت نکل جاتا چاہتا ہے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔“

ڈیوک میڈیٹا نے کہا: ”خیر اسے نکل جانے دیں۔“ عرب شیخ نے جزیہ پر عیسائیوں کو قبضہ کر لینے دیا اور خود امن وسلامتی سے نکل گیا۔ پھر عیسائی مجاہدین نے شہری

مسلم آبادی کی جو درگت بنائی وہ بڑی عبرت ناک تھی۔

ساحل پر اترتے ہی ڈیوک میڈیٹا نے سب سے پہلے وہ مسجد دیکھی جہاں شہر کے مسلمان بتدریج نماز پڑھنے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے اور سینکڑوں درگوت بھی نمازیں پڑھتا رہا تھا۔

مسجد کا جائزہ لینے کے بعد اس کو گرجا میں تبدیل کر دیا گیا۔ عربی عبارات کی جگہ چڑنا پھیر دیا گیا اور نماز کی صفوں کی جگہ گرجا میں پھجوا دی گئیں اور مقامی مسلمانوں پر زور دیا گیا کہ وہ عیسائی ہو جائیں۔

لیکن ان کی یہ تدبیریں ان قال پستہ اور حال پستہ لوگوں پر کارگر نہیں ہوئیں اور یہ مسلمان ہی رہے۔ اب وہ بجائے مسجدوں کے گھروں میں نماز پڑھنے لگے۔

ڈیوک میڈیٹا کو وہ رور کر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے جزیہ پر قبضہ تو کر لیا تھا مگر مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہیں ہوا۔

ڈیوک میڈیٹا نے جزیہ میں ایسا قیام اہتمام کیا جیسے اسے متزل مقصود ملتی ہو اور اس کے لیے طرابلس کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔

ڈور یا کی خواہش تھی کہ اس مہم کا خاتمہ طرابلس میں ہونا چاہیے۔ ان کے مسلکی مجاہدین بھی یہی چاہتے تھے کیونکہ طرابلس ان سے چھینا گیا تھا اور ان کے بہت سے معزز عسکری مجاہد گرفتار کر کے قلعہ بندی دیے گئے تھے۔ اب طرابلس میں صحنان پاشا کی حکومت تھی اور اسے یہاں ترک و وزیر اعظم پرستم نے بھیجا تھا۔ گویا اب طرابلس کا تعلق براہ راست عثمانی سلطنت سے ہو گیا تھا۔ اگر طرابلس پر حملہ کیا جاتا تو اسے ترکی پر حملہ تصور کیا جاتا اور ڈیوک میڈیٹا کی صورت میں بھی ترکوں سے پھیر پھار پڑ پڑنا پڑتا تھا۔

جب ڈیوک میڈیٹا پر مسلسل دباؤ پڑا کہ وہ طرابلس کو طاقت سے چھین لے تو اس نے جزیہ میں ایک نئے قلعے کی تعمیر کی بنیاد ڈال دی۔

اب یہ صلیبی مجاہدین نئے قلعے کی تعمیر میں مشغول ہو گئے تھے۔ پورے جزیہ میں عیسائی پھیل گئے اور ان سب کی پوری توجہ قلعے کی تعمیر پر مرکوز ہو گئی۔

آئیں پادریوں کی رہنمائی میں مقامی مسلمان آبادی کے ساتھ غلط رویہ دانی کے بجائے محبت اور درواری کا سلوک کرنا تھا تاکہ جو مسلمان ظلم اور زبردستی سے عیسائیت پر مائل نہیں کیے جاسکے تھے انہیں محبت یا نرم رویے سے اپنی طرف مائل کر لیا جائے۔

پادریوں نے مسلم آبادی کو عیسائیوں سے گریزاں اور نفور دیکھا۔ وہ ان سے آنے والوں سے دور دور اور لافعلی رہتے۔ آئیں اپنے وطن میں یہ ایسی ایسی نہیں لگ رہے تھے مگر ان کی مجبوری یہ تھی کہ ان کا کوئی دلی وارث نہیں تھا۔ عرب حکمران اپنے خاندان کو لے کر ترحیل چلا گیا تھا۔ گویا اس کا جزیہ والوں سے بھی کوئی تعلق ہی نہیں رہا تھا۔

مقامی مسلمانوں نے نہ تو کبھی مزاحمت کی، نہ سزا آنے والوں سے کوئی واسطہ یا رابطہ رکھا۔ ان میں پادری آتے اور وعظ و تلقین کرتے۔ مسلمان نہایت خاموشی سے ان کا وعظ سنتے رہتے اور آخر میں کچھ کہے سے بغیر چپ چاپ اپنے گھروں کی راہ لیتے۔

ڈیوک میڈیٹا کو پادری یہ بتاتے کہ جزیہ کے لوگوں پر ان کی تقریر کارگر نہیں ہو رہی ہے اور یہ بے حس لوگ تقریریں سننے کے بعد منتشر ہو جاتے ہیں اور پلٹ کر پادری کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

ڈیوک میڈیٹا نے اپنے ساتھ آئے ہوئے عام عیسائیوں سے کہا کہ وہ مقامی لوگوں سے مکمل مل جائیں۔ انہی کی طرح کھائیں پیئیں اور ان کی جیسا رہن بن اختیار کریں اور ساتھ ساتھ بالواسطہ اپنے عمل اور قول سے تبلیغ جاری رکھیں تو ان مسلمانوں پر ضرور اثر ہوگا۔

ڈیوک میڈیٹا کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ ایک طرف تو ایک نیا قلعہ تعمیر کروا دے اور دوسری طرف مقامی آبادی کو ہوشیاری سے عیسائی بنالیا جائے تو یہ جزیہ نامی شہر اور بندرگاہ بہت محکم ہو جائے گی۔ درگوت کے لیے جزیہ جنت سے کم نہیں تھا اور ڈیوک میڈیٹا اس جنت سے درگوت کو بے دخل کر دینا چاہتا تھا۔

جزیہ کے کئی ہوش مندوں نے طرابلس کے حکمران صحنان پاشا کو یہ ساری روداد و لکھ کر بھیج دی اور آخر میں لکھا: ”صلیبی مجاہدین جزیہ کی مذہبی اور فانی تعمیر میں جس طرح مشغول ہیں وہ مستقبل میں نہایت عیسائیت پسند شکل اختیار کر جائے گی۔ اس کا فوری سد باب ہونا چاہیے۔ بہ صورت تاخیر چاہیں ہمارا کیا مشر ہو۔“

صحنان پاشا کی مجبوری یہ تھی کہ درگوت نے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور عثمانی جزیہ پر قبضہ معطل ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ جزیہ کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اسے خود اپنا وجود خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ صحنان پاشا نے یہ تحریریں وزیر اعظم پرستم کو روانہ کر دیں کہ اس طرف فوراً توجہ دی جائے۔

رستم نے فی الحال ان واقعات پر پردہ ڈال کر صورت حال سے سلطان کو باخبر رکھا۔ کیونکہ رستم فی الحال درگوت سے لڑ رہا تھا۔ صفنان پاشا نے غلط فہمی سے دور رہ کر بھی وہاں کی اصل غرابی کو سمجھ لیا تھا۔ اس نے سلطان سلیمان کو جرہ کی صورت حال سے براہ راست مطلع کر دیا اور صاف صاف لکھ دیا کہ جس درجہ کا قلعہ مکمل ہو جائے گا، یسویٰ جیادین فوراً طرابلس کا رخ کریں گے۔

سلطان سلیمان نے صفنان پاشا کے اس خط کا رستم سے کوئی ذکر نہیں کیا اور اسے حکم دیا کہ درگوت کو کسی بھی قیمت پر واپس لایا جائے۔

صفنان پاشا کو لکھا گیا کہ اسے بہت جلد ملک مل جائے گی، بدحواس ہونے کی ضرورت نہیں۔

صفنان پاشا نے جرہ کے باشعور اور ہوش مند لوگوں کو لکھ دیا کہ وہ بالکل نہ گھبراہٹیں، مختصر یہ کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ ڈوریا کو اس خفیہ خط کی مہتمم کا کوئی علم نہ تھا اور اسے صرف یہی خوف تھا کہ مذہبی جوش و جنون میں مبتلا جنونی یورپ کے عیسائیوں کو اگر زیادہ دنوں تک جنگ سے باز رکھا گیا تو ان کے جذبے سرد پڑ جائیں گے۔ وہ بار بار ڈیوک میڈینا کو متنبہ کر رہا تھا کہ قلعے کی تعمیر اور جرہ کے مسلمانوں کی دفاعی اور مذہبی تحیر آتی ضروری نہیں ہے، جتنی ضروری طرابلس کے خلاف جنگ ہے۔

اس بار بھی ڈیوک میڈینا نے ڈوریا کو یہی جواب دیا۔ ”تم جبری معاملات کے ماہر ہو اس لیے میری کوششوں کے نتائج کا تم اعتماد نہیں لگا سکتے۔ میں چاہتا ہوں کہ جرہ کو درگوت کے لائق نہ رکھا جائے کیونکہ میری نظر میں اصل فتح مندی یہی ہے کہ جرہ والوں کو ایسا بنا دیا جائے کہ اگر ہم جرہ سے چلے بھی جائیں تو درگوت ان کے لیے قابل قبول نہ رہے۔“

ایسٹن کے قلب کو ڈوریا نے آگاہ کیا کہ ڈیوک میڈینا قلعے کی تعمیر اور مذہبی متحین پر براہِ وجہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اسے حکم دیا جائے کہ وہ فوراً طرابلس پر حملہ کرے اور جرہ میں وقت نہ برباد کیا جائے۔

قلب نے فوراً ڈیوک میڈینا کو لکھا۔ ”جرہ کا قلعہ تو تعمیر ہوتا رہے گا۔ اس سے زیادہ ضروری کام طرابلس کی تعمیر ہے۔ جس قسم کی منصوبہ بندی تو کر رہا ہے وہ حکومتوں کا کام

ہے۔ تیرے ہاتھ میں جنوبی یورپ کی کمان دئی گئی ہے۔ آگے بڑھو اور طرابلس کو فوراً واپس لے لے۔“

قلب کا یہ فرمان ڈیوک میڈینا کو ملا تو وہ پڑھ کے بڑبڑانے لگا۔ ”یہ لوگ سیکڑوں میل دور بیٹھے صرف ہدایات دیتے رہتے ہیں، خود کچھ نہیں کرتے۔“ قلب کو یہ نہیں معلوم کہ میں اب براہِ راست قلب کے چچا فرڈی نڈ کے ماتحت ہوں یا پھر مجھے پاپائے اعظم حکم دے سکتا ہے۔ قلب کی تو اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں۔“

ڈیوک میڈینا نے جرہ کے مسلمانوں میں مکمل مل جاتے والے عیسائیوں کو دیکھا۔ اب وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کے خربوزے کھا رہے تھے اور انہوں کے نشے میں جھوم بھی رہے تھے۔

ڈیوک میڈینا کو اپنے آدمیوں کی صورت حال نے خوف زدہ کر دیا۔ یہاں سے وہ قلعے کی تعمیر کا معائنہ کرتے گیا۔ وہاں بھی کام ٹھپ تھا اور یہ لوگ انہوں کے نشے میں مست پڑے ہوئے تھے۔ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ ڈیوک میڈینا معائنہ کرتا ہوا ان کی طرف آ رہا ہے تو وہ ڈرا بھی نہ گھبرائے۔

ڈیوک میڈینا نے اپنے مذہبی امور کے ماہرین کو قلعے میں جمع کر لیا اور انہیں موجودہ صورت حال سے آگاہ کر کے حکم دیا کہ اب آپس میں آدمیوں کو بیدار کرنے اور بیدار رہنے کی تلقین کی جائے۔ ورنہ یہ سب لفظی ہو جائیں گے اور طرابلس کی تعمیر تو کجا انہیں جرہ سے بھی بے دخل ہونا پڑے گا۔

اب اسے ڈوریا سے اتفاق کرنا پڑا۔ اس نے یورپوں کو حکم دیا کہ وہ خود تو تلخ و متحین کرتے رہیں مگر جنوبی یورپ سے آئے ہوئے عیسائیوں کو مقامی لوگوں میں مکمل مل جانے سے روکا جائے۔

یاد رہی یہی جب حقیقی صورت حال سے واقف ہوئے تو انہیں اپنے عیسائی بھائیوں سے زیادہ مقامی مسلمانوں پر غصا یا جو جو دیکھ سکتے ہوئے نہ تھے بلکہ عیسائیوں کو اپنا جیسا بنا لیا تھا۔ اسی جوش و غضب کے عالم میں ایک عیسائی یادری نے غوث اور یزیدوں کے بازار میں تلخ شروع کی اور تقریر کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ کا موازنہ کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ کو مکمل فرار و پنا شروع کر دیا۔

جاری ہے

کہانی کے تدریجی ماحوذ

جواب صلیبیہ	فاتحانِ ایران	ہیرا خیل	ہی سلاطینِ ہند	سوتلا خیل	تاریخِ افریقہ
رہنمائی	لین ہول	بیراٹ	لین ہول	انجمہ، مولانا حنفی	مولوی حامد علی صدیقی

عجیب بات ہے کہ کمزور لمحات میں انسان ناقص ہو جاتا ہے مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ جب تک وہ بے بس صورت حال سے دوچار رہا، تب تک اس کے بخت کے ساتھ ساتھ اس کا ”بس“ بھی زوردار ہو رہا مگر جیسے ہی اس کے قدموں نے چلتا سیکھا، جانے کیوں ہر خوش بختی اس سے روٹھ گئی۔ چلتا تو سب ہی سیکھ لیتے ہیں مگر لغزشوں پر قابو پانا ہر کس و ناکس کی بات نہیں

ایک دیرک اور مٹاؤ پرست انسان کی چالاکی

کاشفِ زبیر

سہارا

میکس ایک ہوشیار آدمی تھا، جس نے زندگی بہت ہوشیاری اور پلاننگ سے گزاری تھی۔ اس کا شمار ان افراد میں ہوتا تھا جو اپنے ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیتے ہیں۔ جب انہیں ضرورت ہوتی ہے تو وہ کسی کی مدد لینے سے نہیں ہچکچاتے ہیں لیکن وہ خود کسی کی مدد کرنے کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔ میکس کا خیال تھا کہ وہ بہت ہوشیار آدمی ہے اور وہ اپنے سارے فیصلے خود کرتا تھا۔ وہ نہ کسی کو خود سے زیادہ دیتا تھا اور نہ ہی دوسروں پر اعتبار کرتا تھا۔

میکس خیرا کا ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا تھا اور اس کا تعلق ایک کاشت کار خاندان سے تھا لیکن اس میں شہریوں والی ہوشیاری اور چالاکی تھی۔ اس کے خاندان والے جب کرتے تھے کہ عید سے سادے کاشت کاروں میں سے ہوشیار بچہ کہاں سے پیدا ہو گیا۔ بچپن میں اس کی حرکتیں دیکھ کر اس کے دادا نے پیش گوئی کی تھی۔



”یہ بڑا ہو کر بہت چالاک نکلے گا لیکن اس کی چالاکی اسے صرف حاضری فائدہ پہنچائے گی۔ کیونکہ زمین سے وابستہ لوگوں کو چالاکی اس میں نہیں آتی ہے۔ یہ صرف شیروں کا خاصا ہے۔“

میکس کے دادا کی پیش گوئی کم سے کم اس حد تک درست نکلی تھی کہ میکس بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ ہوشیار ہوتا جاوے گا اور اسی ہوشیاری کی وجہ سے وہ دوسروں سے زیادہ فائدے میں رہتا تھا۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں سب سادہ فطرت لوگ تھے۔ ان میں وہ ہوشیاری اور چالاکی نہیں نکلی تھی جو میکس میں کوٹ کوٹ کر پھری ہوئی تھی۔ میکس بچپن میں دوسرے بچوں کے کھلونوں سے تو خوب کھیلتا اور اکثر ان کو توڑ بھی دیتا تھا لیکن اپنے کھلونوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے دیتا تھا۔ اسی طرح کھیل کے دوران اس سے دوسرے بچوں کو چوبیس لگ جاتی تھیں مگر مجال ہے جو بھی اسے کوئی چوٹ لگی ہو۔ گو یا اس کے ساتھ کے بچے نقصان میں تھے اور وہ نقصان سے محفوظ رہتا تھا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ نقصان نہیں اٹھاتا تھا۔ اسے بھی چوبیس لگتیں اور نقصان ہوتے تھے لیکن یہ نقصان اور چوبیس عام طور سے قدرت کی طرف سے ہوتی تھیں۔ جیسے اسے بچپن میں بیمار یا بہت گھبرائی تھیں۔ اس طرح اسے از خود چوبیس بھی بہت لگی تھیں۔ اس کی چیزوں کا اس کے اپنے ہی ہاتھوں نقصان ہو جاتا تھا مگر وہ ان نقصانات کو ہمیشہ خوش برداشت کر لیا کرتا تھا لیکن کسی دوسرے کے ہاتھوں اسے کوئی نقصان ہو یا اسے بالکل بھی گوارا نہیں تھا اور کوئی اس سے کسی معاملے میں آگے نکل جائے یہ بھی اسے برداشت نہیں تھا۔ اگر بھی اتفاقاً کسی کوئی بات ہو جاتی تو وہ بچکاہ کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا کرتا تھا۔ اس کی فطرت کچھ اس قسم کی تھی کہ ہر اچھی چیز اسے مل جائے اور اگر سے نہ ملے تو کسی اور کو تو بالکل نہ ملے۔ یعنی اپنی غریبی اسے گوارا تھی لیکن کسی دوسرے کو کچھ ملے یہ بالکل گوارا نہیں تھا۔

میکس کی طبیعت میں صمد کا مادہ بہت زیادہ تھا اور اسے کوئی دوسرا مشکل سے ہی برداشت ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قدرت نے اس کے ماں باپ کو کوئی اور اولاد نہیں دی تھی۔ البتہ اس کے کزنز درجنوں کے حساب سے تھے اور وہ سب آس پاس رہتے تھے۔ اس لیے اسے کھیلنے کے لیے بچوں کی کمی نہیں تھی۔ بچے بھی سارے اس سے دیتے تھے۔ اس کی ہوشیاری کی وجہ سے اس کی سرداری مانتے تھے۔ وہ ان پر اپنی

حاکمیت جھا کر خوش ہوتا تھا۔

یوں تو سب ہی میکس کے ہاتھوں ستائے ہوئے اور پریشان رہتے تھے لیکن میکس کی خالد کا بیٹا مورگن خاص طور سے اس کا نشانہ بنتا تھا۔ وہ میکس سے پانچ سال چھوٹا تھا اور وہ بچپن سے میکس کا پسندیدہ شکار رہا تھا۔ میکس کے ہاتھوں سب سے زیادہ چوبیس اسے لگتی تھیں اور سب سے زیادہ کھلونے اس کے ٹوٹتے تھے۔ جب وہ روتا دھونتا اپنی ماں اور باپ کے پاس شکایت لے کر جاتا تو وہ اسے صبر کی تلقین کر کے چپ کر دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میکس بھی اپنی غلطی نہیں مانتے گا اور اگر وہ مان بھی گیا تو مورگن کے باپ کا کزن یعنی میکس کا باپ اپنے بیٹے کی غلطی نہیں مانتے گا۔ میکس کینے پن میں اپنے باپ پر گیا تھا۔

مورگن شریف اور سادہ طبیعت لڑکا تھا۔ وہ بچپن سے میکس کے مقابلے میں نہیں زیادہ بھڑکتے کا مالک تھا۔ جب آٹھ سال کا تھا تو میکس سے ایک دو سال چھوٹا لگتا تھا۔ دراصل میکس کو جیلے کڑھنے کی عادت بھی تھی اور اس کا اکثر وقت کسی نہ کسی کی کامیابی یا خوشی پر خون جلاتے ہوئے گزرتا تھا۔ جیسے اس کے ایک دور بار کے کزن اسٹیفن نے اسکول میں ساتویں درجے میں پہلی پوزیشن حاصل کی تو میکس بارے میں اس کے پیار پر ہلکا اور ان وجہ سے وہ اسکول کی تعلیم تک کی تقریب میں بھی شامل نہیں ہو سکا تھا۔ اگلے سال اس نے تعلیم میں جان باری شروع کر دی لیکن ہر نمٹ کے بعد واضح ہوتا جا رہا تھا کہ وہ تعلیم کے معاملے میں اسٹیفن سے آگے نہیں نکل سکے گا۔ اس لیے میکس نے اسے پہلی پوزیشن حاصل کرنے سے روکنے کے لیے دوسرے

زریعوں پر غور شروع کر دیا۔

ان کے قصبے اسٹین ٹاؤن میں ایک چھوٹا سا سپر اسٹور تھا جہاں روزمرہ استعمال کی تمام چیزیں دستیاب تھیں لیکن بعض چیزیں ذرا مشکل سے ملتی تھیں، خاص طور سے لہجہ جوتوں کو۔ جیسے خواتین ماڈرن کی تصاویر پر مبنی رسالے، مگریت اور بیرو وغیرہ۔ سپر اسٹور کا مالک مین اس معاملے میں قانون کا پابند تھا اور اس نے بھی سبیل بڑھانے کے لیے نئے جوتوں کو اس قسم کی چیزیں فروخت نہیں کی تھیں لیکن میکس کے شاطر ذہن نے ان کے حصول کے لیے ایک ترکیب سوچ لی تھی۔ یہ سوچ ڈوبنے کے بعد جب اسٹور میں لائٹس روشن ہوئی تھیں۔ میکس نے کسی طرح اسٹین کو اپنے ساتھ لایا اور اس کے ڈبے پر کام لگایا کہ وہ اسٹور کے عقبی حصے میں واقع

بجلی کے بورڈ پر مین سوچ بند کر دے۔ اسٹیفن راضی نہیں تھا لیکن میکس نے کسی نہ کسی طرح اسے راضی کر لیا تھا۔ اسٹیفن نے مین سوچ بند کیا اور پیسے ہی تار کی ہوئی میکس نے اپنا کام لکھایا اور وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ اسٹیفن وہاں سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ دس منٹ بعد دونوں ایک ویران کواد میں ملے تو میکس کے پاس ایک بیگ تھا۔ اسٹیفن جانتے کے لیے بے تاب تھا کہ میکس نے کیا چیز لایا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میکس نے چاکلیٹ یا کھانے کی ایسی کوئی چیز چرائی ہوگی۔ لیکن جب میکس نے بیگ سے بیبر کے ڈبے، مگریت اور تصویر کی رسالے نکالے تو اسٹیفن کی ہر شخص کھلی رہ گئی۔ خاص طور سے رسالوں پر اس کی رول ٹیک تھی۔ آج سے کوئی تین سال پہلے وہ یہاں توں میں اس قسم کی چیزیں آسانی سے دستیاب نہیں تھیں اور نو جوانوں کے بڑے ان کی کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ اب ماحول بدل گیا ہے لیکن اس وقت نو جوانوں کو اس قسم کی سرگرمیاں بہت چھپ چھپا کر کرنی پڑتی تھیں۔

میکس نے زندگی میں پہلی بار فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف بیبر تیرا اور مگریت کے بیگ اسٹیفن کے حوالے کر دیے بلکہ اس نے تصویر کی رسالے بھی اسے دے دیے تھے۔ متعدد صاف ظاہر تھا کہ اسٹیفن ان چکر میں پڑ کر اپنی تعلیم سے ہٹ جائے اور اگلی بار کلاس میں اول نہ آ سکے۔ میکس نے خود پہلی پوزیشن حاصل کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی اور اسے پروا بھی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسٹیفن اول نمبر پر نہ آئے۔ اس کی خواہش پوری ہوئی بلکہ اس کی کوشش کا سبب رہی اور اگلی بار اسٹیفن نے کوئی پوزیشن حاصل نہیں کی۔۔۔ بلکہ اس کا معیار اتنا گر گیا کہ وہ بہ مشکل ہی پاس ہو سکا تھا۔ اسٹیفن کا باپ اس معاملے میں بہت سخت تھا اور اس نے اسٹیفن کو وارننگ دے رکھی تھی کہ اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی خبریں تو اس کی خیر نہیں ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ اسٹیفن کی کوئی دوست لڑکی نہ تھی۔ جب کہ اس کے تمام دوستوں کی گرل فرینڈز تھیں۔ وہ بے جا راز لویوں کے لیے ترسا ہوا تھا۔ میکس نے اسے رسالوں کی

ایسی لت لگائی کہ وہ بس اسی پکر میں رہنے لگا اور اس کے بعد اس نے خود ان رسالوں کو حاصل کرنا شروع کر دیا۔ ان کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم پر بھی توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اس کے ماں باپ سمجھتے تھے کہ وہ کمرے میں پڑھ رہا ہے جب کہ وہ رسالوں میں کھل پاتا ہوا ہوتا تھا۔

جو ایک بار میکس سے چوٹ کھا لیتا وہ اس کے بارے میں محتاط ہو جاتا تھا اور دو بارہ اس کے قریب کھینچنے سے گریز کرتا تھا۔ لیکن مورگن کی بدتمیزی کہ اس کا میکس سے بہت قریبی رشتہ تھا اور پھر وہ پاس پاس ہی گھروں میں رہتے تھے۔ اس لیے وہ ختمہ میں نہانے کے لیے میکس کو ہر وقت دستیاب رہتا تھا۔ مورگن کا گھر ان میکس کے گھر کی طرح زیادہ خوشحال نہیں تھا۔ اس کے باپ کے پاس زمین کم تھی اور کنبہ بڑا تھا۔ مورگن کے چچا بہن بھائی تھے اور ان سب کی پرورش میں اس کا باپ بہت جان مارتا تھا تب کہیں چاکر انہیں ضرورت زرخیز کی تمام چیزیں دستیاب ہوتی تھیں۔

مورگن اس معاملے میں بہت حساس تھا اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنی ضروریات کے لیے اپنے باپ کو تنگ نہ کرے۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے تھیں سے ایک پرانی سی سائیکل لے کر خود اس کی مرمت کر لی اور اس پر پانچ گے وقت گھروں میں اخبار تقسیم کر کے اپنے اخراجات خود پورے کرنے لگا۔ جو مریخ جالی وہ اپنی ماں کے حوالے کر دیتا تھا۔ جب فصل لگانے یا کٹنے کا چیزن ہوتا تو وہ اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ باپ کی زمین پر کام کرتا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ مزدور کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میکس ڈھکے چھپے انداز میں مورگن اور اس کے گھر والوں کی غربت کا مذاق اڑاتا تھا۔ وہ اس کا اور اپنا موازنہ کرتا تھا۔ میکس کے پاس بھرتی اور جدید قسم کی سائیکل تھی۔ جب مورگن کسی کام سے اپنی سائیکل نظر آنے والی سائیکل پر فٹا تو میکس فوراً اپنی سائیکل نکال لاتا اور اس کے آس پاس ہی منڈلاتے ہوئے اس کی سائیکل کی خستہ حالی کا مذاق اڑاتا ہوا تھا۔ حالانکہ وہ صرف دیکھنے میں خستہ حال تھی ورنہ چلنے میں مورگن نے اسے خوب ہمار کھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ

انشاء

الغصہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے لایے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) ایک مہینے کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ اشتہاریں کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ناک شائع کر دی جاتی ہے۔ قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست اشتہاریں سے رجوع کریں یا اس کی مکمل تفصیل یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ، بجلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

اخبار ڈالنے کا کام کر پاتا تھا۔ ورنہ سائیکل مسئلہ کرتی تو اسے یہ کام کیسے ملتا۔

ان کی نگاہ میں بہن کا بھی گھر تھا۔ بیلن ابھی بارہ سال کی تھی لیکن اس نے قد کاٹھ نکال لیا تھا اور اس کے چہرے کے نقوش بہت دلکش تھے۔ میکس اکثر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس روز بھی وہ بیلن کو اپنی سائیکل دکھا رہا تھا اور اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک گمراہ تھا۔ مورگن کسی کام سے سائیکل لے کر نکلا تو میکس نے اس کی سائیکل کی طرف اشارہ کر کے بیلن سے کہا۔

”یہ وہ سائیکل ہے جس پر چاروج واٹسٹن سواری کیا کرتا تھا۔“

مورگن نے جواب دیا۔ ”تجلی یہ چلے میں بہت اچھی ہے آج کل کی سائیکل اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔“

میکس اچھل پڑا۔ اسے لگا کہ مورگن نے اسے براہ راست چیلنج کر دیا ہے۔ ”کیا تم مجھ سے ریس لگانا چاہ رہے ہو؟“ اس نے عقارت سے کہا۔

”نہیں تو۔۔۔ لیکن اگر تم لگانا چاہو تو میں تیار ہوں۔“

میکس فوراً سرک پر آ گیا اور اس نے بیلن کی طرف دیکھا۔ ”اگرچہ اس کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن کیا تم ہمارے لیے جینے چاہتے ہو؟“

”ہاں کیوں نہیں۔“ بیلن راضی ہو گئی۔

لے ہوا کہ وہ اس پورے بلاک کا راز ڈھنگا کر رہی تھی۔ وہ نہیں گئے اور جو پہلے پہنچے گا وہی فاتح ہوگا۔ بیلن نے ایک دو تین کہا اور انہوں نے ایک ساتھ سائیکل دوڑا دی تھی۔ یہ بلاک چوکور تھا اور اس میں اکثر چھتیس خالی گھر اس لیے بیلن انہیں دیکھ سکتی تھی۔ دونوں اپنی پوری قوت اور توجہ سے سائیکل چلا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میکس نے محسوس کیا کہ اس کا سانس اکڑ رہا ہے اور اب اس سے سائیکل پہلے جیسے انداز میں نہیں چل رہی ہے۔ مورگن اس سے آگے نکلتا جا رہا تھا۔ مورگن کی صحت اس سے اچھی تھی اور اسے سائیکل چلانے کی مشق بھی زیادہ تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ میکس سے خاصا آگے نکل چکا تھا اور میکس تمام تر کوشش کے باوجود اس کے نزدیک بھی نہیں جا پا رہا تھا۔ جب وہ پھر کاشت کر دوسری طرف پہنچے اور ایک جگہ مکانات سامنے آئے، اور میکس کو لپٹیں ہو گیا کہ وہ بیلن کو نظر نہیں آ رہے ہیں تو اس نے اچانک ہی اپنی سائیکل ایک درخت سے ٹکرا دی اور پیچھے گر پڑا۔ آگے جاتے ہوئے مورگن نے مڑ کر دیکھا۔ اسے میکس گمراہ ہوا نظر آیا تو وہ واپس پلٹ آیا اور اس نے سہارا سے کر میکس کو اٹھایا۔ وہ اچانک

چلانے لگا۔

”مجھے تم نے گمراہ کیا ہے۔۔۔۔۔ جان بوجھ کر گمراہ کیا ہے۔“

مورگن حیران رہ گیا۔ ”میں مجھے گمراہ کیا ہوں۔۔۔ میں تو تم سے بہت آگے تھا۔“

”جھوٹ مست بولو۔“ میکس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”تم نے جیتنے کے لیے مجھے جان بوجھ کر گمراہ کیا ہے۔“

اس دوران میں بیلن بھی وہاں آئی تھی۔ اسے دیکھ کر میکس زیادہ شور کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مورگن کو پیچھے چھوڑنے والا تھا کہ اس نے اسے جان بوجھ کر دھکا دے کر گمراہ کیا۔ مورگن بے چارہ تردید کرتا رہ گیا لیکن بیلن نے اسے جس طرح۔۔۔ ملامت بھری نظروں سے دیکھا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے میکس کی بات پر یقین کر لیا ہے۔ گرنے سے میکس کے ہاتھ پاؤں پھیل گئے تھے اور ہاتھ پر بھی نیل کا نشان نظر آ رہا تھا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا؟“ بیلن نے مورگن سے کہا۔

”بیلن یہ غلط ہے میں نے۔۔۔۔۔“ مورگن نے وضاحت کی کوشش کی لیکن بیلن اس کی بات نے بغیر میکس کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔ میکس نے جاتے جاتے مڑ کر فاتحانہ انداز میں مورگن کی طرف دیکھا۔ جیسے کہ رہا ہو کہ تم مجھ سے کسی صورت نہیں جیت سکتے۔ اس دن کے بعد سے مورگن میکس سے بچ گیا تھا۔ اگرچہ میکس نے چند دن بعد اس سے اس طرح ملنے کی کوشش کی جیسے کچھ ہوا تھی۔ لیکن مورگن اب خود پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ کوشش کرتا کہ جہاں میکس موجود ہو وہاں جانے سے گریز کرے۔ اس بھی ہوتا تھا کہ وہ کہیں کھیل رہا ہوتا اور میکس آ جاتا تو وہ کھیل درمیان میں چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ میکس سمجھ گیا کہ مورگن نے اس دن والی حرکت پر اسے معاف نہیں کیا ہے۔ اس لیے وہ بھی کھینچا کہ اس سے دور ہو گیا۔

مورگن کے گھر کے حالات خراب ہوتے جا رہے تھے۔ کیونکہ اس کی ماں کو دل کا مرض ہو گیا تھا اور وہ اب صحت دلا کوئی کام نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس کے علاج پر بھی بہت خرچ آ رہا تھا۔ مورگن کا باپ اتنا زبردست تھا کہ مورگن کو باپ اسکول کے بعد کل وقتی ملازمت کرنا پڑی تھی۔ چونکہ ان کے علاقے میں چھوٹے کاشت کار زیادہ تھے جو اپنی زمینوں پر خود کاشت کرتے تھے اور ان میں سے شاذ و ہی کوئی مزدور استعمال کرتا تھا۔ اس لیے مورگن دایم دننگ چلا گیا۔ وہاں دولت مند کسان تھے جن کے پاس کئی ہوا سائیکل زمین ہوتی ہے اور ان کو ملازموں کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ شروع میں مورگن کو کچھ پریشانی تو ہوئی

لیکن پھر اسے اچھا محاذ ملنے لگا اور وہ اپنے باپ کو رقم بھیجنے لگا۔ تھا۔ دو سال بعد مورگن کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بڑے بھائی بھی اس کے پاس ملے آئے تھے اور مزدوری کرنے لگے تھے کیونکہ ان میں سے کسی کو اسکول سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پھر مورگن کا باپ بھی اپنی زمین بیچ کر بیٹوں کے پاس چلا گیا تھا۔ مورگن کی کنکریں بھی شادی کر کے قبضے سے چلی گئیں اور اس طرح مورگن کے پورے خاندان نے قبضہ چھوڑ دیا۔ میکس نے اپنی خالہ کی زندگی میں بھی ان لوگوں سے خاص میل جول نہیں رکھا تھا۔ وہ کبھی مورگن کے گھر نہیں گیا تھا۔ اس لیے جب خالہ مر گئیں تو ان لوگوں سے تعلق رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر مورگن اور اس کا سارا خاندان یہاں سے چلا گیا اور میکس ان کو بھول گیا۔

میکس نے اپنے باپ کی زمین منسجیل لی تھی۔ اس کے پاس کوئی دو سو ایکڑ زمین تھی جسے وہ اپنے ملازموں کی مدد سے کاشت کرتا تھا۔ وہ بہت اچھا کمانے لگا تھا۔ اس کے باوجود ملازموں کو کچھ دیتے ہوئے اس کی جان جاتی تھی اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ کم سے کم معاوضے پر مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کام لے۔ یہی خاصیت میکس کو بھی مل گئی۔ بلکہ کبھی کے معاملے میں وہ اپنے باپ سے بھی کی بچھڑا کرتا تھا۔ جب اس کے باپ نے رنڈا کوٹ لیا اور کاسٹمیکس کے ہاتھ میں آ گیا تو چند بیٹوں میں برسوں پرانے ملازمین اسے بھجوا کر بھاگ گئے۔ میکس کو ان کے جانے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس نے دوسرے ملازم رکھ لیے کیونکہ ان کے علاقے میں روزگار کی کمی اور مزدور آسانی سے مل جاتے تھے لیکن اس کے پاس کتنا کوئی نہیں تھا کیونکہ اس کا روزی بکایا ہوتا تھا کہ ملازم بھاگ جاتے تھے۔

☆ ☆ ☆

مورگن بس سے اتر اور اپنا بیگ منسجیل کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں سب ویسا ہی تھا جیسا اس نے آج سے دس برس پہلے دیکھا تھا۔ وہ دس برس پہلے آخری بار یہاں آیا تھا اور اس کے بعد آج آیا تھا۔ اسے ایک بچے پہلے ہی میکس کی کال آئی تھی کہ اسے مورگن کی مدد کی ضرورت ہے۔ مورگن کا دل چاہا کہ وہ انکار کر دے لیکن پھر وہ مان گیا۔ اس کے خیال میں میکس کتنا برا لگتا تھا لیکن اس کا فرسٹ کزن تھا اور اس کی ایک ہی خالہ تھی جس کا وہ اکھڑ بیٹا تھا۔ خالہ کا دس سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور وہ اسے موقع پر یہاں آیا تھا۔ اس وقت بھی میکس کا رویہ اتنا خراب تھا کہ وہ بس تین تین میں شرکت تک رکا اور پھر واپس چلا گیا۔ اسے

حیرت تھی کہ میکس کو اس کا فون نمبر کہاں سے مل گیا۔ بہر حال اس نے میکس سے کہا کہ اسے کچھ ضروری کام ہیں جنہیں نمٹا کر وہ ایک ہفتے میں اس کے پاس آ جائے گا۔

وہ قبضے کے بس اسباب پر اتر آ تو اس کا خیال تھا کہ میکس اسے لینے آئے گا یا کسی کو بھیج دے گا لیکن وہ خود آیا اور نہ ہی اس نے کسی کو بھیجا۔ اب مورگن کو کوئی ایک میل کا فاصلہ پیدل ہی طے کرنا تھا۔ وہ ایک شانے پر ٹانگ کر روانہ ہو گیا۔ خوش قسمتی سے کچھ دیر بعد ہی پیچھے سے ایک پک اپ آئی اور اس سے ایک جوان آدمی نے ہماں کر اسے قبضے تک لطف دینے کی پیش کش کی۔ مورگن پک اپ میں آ گیا۔ تعارف ہوا تو پتا چلا کہ وہ مورگن کے ایک دور کے چچا کا بیٹا نام تھا۔ جو اس سے گرم جوشی سے پیش آیا تھا۔

”میں نے تمہیں بہت پہلے دیکھا تھا لیکن تمہارے بارے میں سنا ہے۔ آج کیسے آئے؟“

مورگن نے اسے بتایا۔ ”مجھے میکس نے فون کر کے بلایا ہے۔“

میکس کے نام پر اس نے برا سنا تھا۔ ”میکس۔۔۔۔۔ اگر اس نے تمہیں بلایا ہے تو یقیناً اسے تم سے کوئی کام ہوگا۔“

”چچا بات ہے میں خود بھی نہیں جان سکا کہ اس نے مجھے کیوں بلایا ہے لیکن اس نے کہا تھا کہ اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔“

”مدد کی ضرورت تو اسے ہے۔“ نام کا لہجہ طرے ہو گیا۔ ”اس کا گھٹنا پھر تھوڑے عرصے کے بائیں روک جیک میں آ گیا تھا جس سے بڑی چھٹکا چور ہو گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے اسے ایک سال تک ملنے بچھرنے اور کام کرنے سے منع کر دیا ہے۔“

مورگن نے سر ہلایا۔ ”تو یہ بات ہے لیکن اس نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اگر اسے کام کا آدمی چاہے تو وہ یہاں سے بھی مل جاتا۔“

”اسے نہیں مل سکتا۔“ نام نے کہا۔ ”وہ اپنے ملازمین کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے، کوئی اس کے پاس کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے۔ ایک نیم پاگل ریڈیٹر میں لگیا ہے اس بے چارے سے وہ لگدھوں کی طرح کام لیتا ہے۔ ایک دو اور ملازم مل جاتے ہیں لیکن کوئی اس کے پاس زیادہ عرصے نہیں بٹکتا ہے۔“

”اور تو یہ بات ہے۔“

نام نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ ”میرا تو مشورہ ہے کہ میکس کے لیے کام کرنے کے بجائے کہیں اور کام تلاش کر لو۔“

”فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اپنا کام چھوڑ کر آ چکا

ہوں اور پھر میں جس علاقے میں کام کرتا ہوں وہاں گزشتہ دو سال سے بارش نہ ہونے کی وجہ سے حالت بہت خراب ہے زمین پر کام کرنے والے بے روزگار ہیں اور کہیں کام نہیں ہے۔

”حالت تو یہاں بھی اچھی نہیں ہے لیکن اگر انکی بات ہے تو میکس کو مت بتانا ورنہ وہ کھلے گا کہ تم مجبور ہو۔ اس کا رویہ اور بھی خراب ہو جائے گا۔“

مورگن نے دل میں سوچا کہ میکس کو اس سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ عمر کے مترو مال تک وہ میکس کے ساتھ جی رہا تھا۔ جب وہ یہاں سے گیا تو وہاں تنگ میں اسے اچھی فوری مل گئی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد اس نے بھائیوں کو بھی وہاں بلا لیا تھا۔ اس کے بھائی اس کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار تھے اور انہوں نے کئی سال تک کام کر کے رقم جمع کی اور وہیں زمین لے لی۔ اب وہ وہاں فارم پر تھے۔ مورگن کا باپ اس کے ساتھ رہا تھا اور دو سال پہلے اس کا بھی کینسر کے مرض میں انتقال ہو گیا تھا۔ پھر وہاں خشک سالی کی وجہ سے حالات خراب ہوتے گئے۔ مورگن کے بھائی زیادہ پریشان تھے۔ ان کی زمینیں تھیں لہذا وہ زمین چھوڑ کر جا نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے مزید کار خرچ جانے کے لیے مورگن سے مدد مانگی تھی اور مورگن نے ایک سال ان کے پاس کام بھی کیا جس کا اسے کوئی خاص معاوضہ نہیں ملا تھا۔ پھر پانی کی کمی کی وجہ سے فصلوں کی کاشت ہی ممکن نہیں رہی اس لیے مورگن بے روزگار ہو گیا۔

وہ ان دنوں جنوب کی طرف جانے کا سوچ رہا تھا جہاں روزگار تھا اور ممکن تھا اسے وہاں زمین مل جاتی کیونکہ شمال میں زمین اتنی مہنگی تھی مورگن جیسے شخص کے لیے یہاں زمین لینا ممکن نہیں تھا۔ پھر اسے میکس کی کالی آگنی اور وہ یہاں آ گیا۔ نام کی باتوں سے لگا تھا کہ میکس ان دنوں سچ سچ مصیبت میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میکس کے ساتھ کام کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ ایسا ہی شخص تھا جو سبایا خا تھا جس کے پاس رہنے والا شخص زخمی ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کے پاس ضرور جائے گا۔

نام نے اسے میکس کے فارم کے سامنے اتار دیا۔ ”گڈ پائی۔۔۔ اینڈ وٹس یو گڈ لک۔“ کہہ کر اس نے پیک اپ آگے بڑھا دی مگر کچھ دور جا کر روک دی اور کھڑکی سے سر نکال کر بولا۔ ”میکس کو مت بتانا کہ میرے ساتھ یہاں تک آئے ورنہ مجھے پھنسا دیں گے۔“

مورگن نے ہاتھ بلایا اور فارم کی طرف بڑھ گیا۔ اس علاقے میں عام طور سے زمین کی حد بندی کے لیے لوگ

مصبوبی سی پاڑا لگا لیتے تھے یا درخت لگا لیتے تھے۔ یہ بھی اضافی آمدنی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ لیکن میکس نے اپنے فارم کی گرد و ہری خار دار پاڑہ لگا رکھی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ فارم نہیں کوئی سوئے کی کان ہو جس کی حالت کا اتنا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہی نہیں اس نے ہر دس گز بعد وارنٹک والے بورڈ لگا رکھے تھے جن پر لکھا تھا۔ ”غیر وارنٹک زمین ہے۔۔۔ دور رہیں۔“

پچانک آبادہ کھلا ہوا تھا جس سے مورگن اندر داخل ہو گیا۔ میکس نے اسے بتا دیا تھا کہ اس نے قصبے والا مکان چھوڑ دیا تھا اور اب فارم پر ہی ٹھہر گیا تھا۔ مورگن نے دیکھا کہ گھر بڑا اور خوب صورت تھا۔ لگتا تھا میکس نے اس پر خاصی رقم خرچ کی تھی۔ مکان کے احاطے میں ایک شاندار لینڈ کروڈز رکھ کر رکھی تھی اور برآمدے میں میکس ایک وہیل چیئر پر بیٹھاے ٹوٹی کر رہا تھا۔ اس کی صحت کچھ بھی اور چھوڑنا ہوا اور وہ بلا ہو رہا تھا۔ اس نے مورگن کو دیکھ کر کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ اتنا کہا۔

”ہیلو کیسے ہو تم؟“ اور پھر سے اپنے پیک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ مورگن نے کسی قدر تذقیب سے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ میکس نے اسے پچانا نہیں ہے۔ ”میں مورگن ہوں۔“

”ہاں میں تمہیں پہچان چکا ہوں۔“ میکس نے اطمینان سے کہا۔ اب بھی اس نے نہ تو کسی خاص رد عمل کا اظہار کیا تھا اور نہ ہی مورگن کو جھٹنے کے لیے کہا تھا۔ حالانکہ سامنے ہی کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر ایک وہل کی بوتل بھی رکھی تھی لیکن گلاس ایک ہی تھا جو میکس کے ہاتھ میں تھا۔ مورگن خاصی قوت برداشت رکھتا تھا لیکن اس وقت اسے غصہ آ گیا۔ اس نے بیگ میز بھی پر پٹخا اور ڈرا آگے جھک کر بولا۔

”میں کوئی تین سو کو میز پر دوڑ سے پانچ گھنٹے کا سفر کر کے اس لیے نہیں آیا ہوں کہ تمہارا سے ٹوٹی کا اسٹائل دیکھوں مجھے ایک منٹ کے اندر بتاؤ کہ تم نے مجھے کیوں رحمت دی ہے؟“

اس کے تنور دیکھ کر میکس ڈراؤب گیا تھا۔ اس نے گلاس دکھ دیا اور بولا۔ ”سوری اصل میں مجھے تکلیف ہو رہی تھی بسے دبانے کے لیے میں بی رہا ہوں۔“

مورگن جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بولی رہا ہے۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا لیکن اس کی معذرت نے مورگن کا غصہ

خفہ کر دیا تھا۔ وہ خود ایک کڑی پریشہ گیا۔ ”اد کے۔۔۔ اگر تمہاری تکلیف کم ہوگئی ہے تو تم مجھے بتاؤ کہ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“

میکس نے شانے اچکائے۔ ”میں تمہیں کیوں بلا سکتا ہوں۔“ اس نے چاروں طرف پھیلے فارم کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے فارم سنبھالنے کے لیے ایک آدمی کی ضرورت ہے اور میرا خیال ہے تم یہ کام کر سکتے ہو۔“

فارم مورگن نے اندر آتے ہوئے دیکھا تھا جس کی حالت بہت خراب تھی۔ زمین کی مٹاؤ و کچھ بھال نہیں ہو رہی تھی۔ بائیں طرف موجود اسٹرابیری کے درخت خشک اور بے ترتیب تھے۔ زمین بھی ہموار اور زرخیز سے محروم نظر آ رہی تھی۔ ملکی کی کاشت کا وقت آ گیا تھا لیکن ابھی تک فارم پر اس کی کاشت کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے کہا۔

”ہاں میں یہ کام کر سکتا ہوں۔“

میکس مسکرایا۔ ”اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے۔“ میکس کا انداز ایسا تھا جیسے مورگن کو اس کام کے لیے منتخب کرنا بھی اس کی کوئی ذاتی قابلیت ہے۔ مورگن کو پھر غصہ آنے لگا تھا۔ ”میں نے یہ کہا کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں یہ نہیں کہا ہے کہ میں کر دوں گا۔ جب تک کہ میری اٹھیلے میں تم سے کسی بات نہیں ہو جاتی۔“

میکس ایک بار پھر چوک گیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”تمہارا اس طرح آنے کا مقصد کیا ہے؟“

”میں نے سوچا کہ تم سے بات ہو جائے گی اور پھر برائے دوستوں اور جانتے والوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ مورگن نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ نہ تو اس کا دوست ہے اور نہ جانتے والا ہے۔ وہ صرف اس سے کام کی بات کرنے آیا ہے۔ میکس ان دنوں شاید بہت مشکل میں تھا کیونکہ اس کی ڈنگ پلاسٹر میں جکڑی ہوئی تھی اور وہ زمین پر کام کرنے تو کیا اس پر آمد سے سے بچے اترنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس لیے اسے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس کی جگہ زمین پر کام کر سکے۔ نام کی زبانی مورگن کن چکا تھا کہ یہاں اب کوئی میکس کے لیے کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”اوہ اچھا۔“ میکس کا چہرہ پیکا ہو گیا تھا۔ ”خیر تم نے دیکھا لیا ہوگا کہ اس فارم کو سنبھالنے کے لیے ایک تجربے کار آدمی کی اشد ضرورت ہے۔“

مورگن نے پہلی بار میکس کی ٹانگ کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں یہ چوت کب کی؟“

”دو ہفتے ہو گئے ہیں۔ ابھی ایک آپریشن ہوا ہے۔“

ٹین سینے بعد دوسرا اور پھر آٹھ سینے بعد تیسرا آپریشن ہو گا۔ اس کے بعد بھی مجھے چار سینے خزانہ خرابی کرنا ہوگی تب میں چلنے پھرنے کے قابل ہو سکوں گا۔“

”یعنی تمہیں مکمل طور پر بے دار آدمی کی ضرورت ہے؟“

”نہیں میں ٹھیک تو کر سکتا ہوں؟“

مورگن نے ٹی ٹی میں سر ہلایا۔ ”اس صورت میں، میں کام نہیں کر سکوں گا۔ تم یہ کام کسی عام مزدور سے بھی لے سکتے ہو۔ اگر تم مجھ سے کام لینا چاہتے ہو تو یہ فارم مکمل طور پر میرے سپرد کرنا ہوگا۔“

”تمہارا سپرد؟“ میکس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں جنہیں صرف تنگ سے مطلب ہونا چاہیے اور تم میرے کام میں کوئی مداخلت نہیں کرو گے۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ میکس نے اعتراض کیا۔ ”یہ میرا فارم ہے اور مجھے بتانے کے لیے یہاں کیا کرنا ہے۔“

”وہ ٹھیک ہے لیکن اگر تم آدمی ادھوری ہدایت کاری کرو گے تو اس سے معاملات خراب ہوں گے۔“ مورگن نے شانے اچکائے۔ ”میں اس صورت میں کام نہیں کر سکوں گا۔ کیا بات تو ہے کہ اگر تم ٹھیک ہوتے تو میں یہ کام کرنے سے انکار کر دیتا لیکن تم بہر حال میری خالہ کے بیٹے ہو، اس لیے میں یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میں نے اپنی اولین شرط بیان کر دی ہے۔“

میکس نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”تو تمہاری کوئی اور شرط بھی ہے؟“

”ہاں میں معاوضہ تنخواہ کی صورت میں نہیں بلکہ ہونے والے کل نفع کے تہائی حصے کی صورت میں ملوں گا۔“

میکس کی آنکھیں پھلکی گئیں۔ ”تہائی حصہ؟“

مورگن نے سر ہلایا۔ ”نفع کا۔۔۔ اخراجات نکال کر بتنا بھی نفع ہوگا اس کا تیسرا حصہ میں لوں گا۔ اس میں تمہارا سے لیے بھی آسانی ہے۔ ایک تو تمہیں مجھے تنخواہ نہیں دینی پڑے گی۔ تم مجھے جو بھی دو گے وہ ایک مشہ ہوگا۔ اس طرح تمہیں ہر پختے یا مینے والا کسی سے نجات مل جائے گی۔ دوسرے میں زیادہ کمانے کے لیے کہیں زیادہ محنت کروں گا۔ صرف کام کے اوقات نہیں دیکھوں گا۔“

”لیکن تہائی حصہ بہت زیادہ ہے۔“

”زیادہ نہیں ہے۔ اگر تم مجھے معاوضہ دو گے تو میں کم سے کم آٹھ سو ڈالر روزانہ لوں گا اور اگر تم مجھے ایک سال تک یہ معاوضہ دو گے تو تم مجھے چالیس ہزار ایک سو ساٹھ

ڈالر کی ادائیگی کرو گے۔ جب کہ اس حالت میں تم اس فارم سے شاید ایک لاکھ ڈالر بھی نہیں نکال سکتے ہو گے۔ جبکہ فرض کر لو کہ خاص طرح ایک لاکھ ڈالر بے تو تمہیں مجھ کو تنقید ہزار ڈالر آزاد کرنا ہوں گے۔

”اور اگر نقد زیادہ ہوا تو؟“ میکس نے اعتراض کیا۔
 ”مورگن مسکرایا جیسے اسے اسی سوال کی توقع تھی۔“ تمہیں کس چیز پر اعتراض ہے اپنے دوستانی جیسے پر یا میرے ایک جانی ہے؟ اگر میں ایک ڈالر منافع میں رہوں گا تو تم میری جگہ دو ڈالر منافع میں رہو گے۔“
 ”لیکن یہ میرا فارم ہے اور اس پر مارا خرچ میں کروں گا اور نقد میں سے تمہاری تنقیدیں دے دوں۔“
 ”ہاں صرف ایک سال کی بات ہے پھر تم خود سے کا سکو گے۔ میں ایک سال کا معاہدہ کروں گا۔“

میکس سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس کے اشارات بتا رہے تھے کہ اس خیال سے اس کا دل اندر ہی اندر کٹا جا رہا تھا کہ اس کے فارم پر کام کر کے مورگن ایک اچھی رقم کا سکا ہے۔ حالانکہ خود اس نے بھی اپنے فارم سے سال میں ایک لاکھ ڈالر کا نفع حاصل نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ اس پر مستقل کام نہیں کروا تھا اور نہ ہی اس نے زمین کی حالت سدھارنے کے لیے اس پر خرچ کیا تھا۔ ملازم بھی وہ بہ وقت ضرورت ہی رکھتا تھا اور اسے معاوضہ اتنا کم دیتا تھا کہ وہ دل لگا کر کام ہی نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک طرف تو فارم کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی تو دوسری طرف اس سے حاصل ہونے والی آمدنی میں کمی آ رہی تھی لیکن میکس اس معاملے میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا بلکہ وہ دوسروں کو الزام دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے ملازم ہی کا بل اور حرام خورد ملے ہیں جو محنت کرنے کے بجائے کام سے جی چراتے ہیں۔

میکس کو سوچ میں ڈکھ کر مورگن کھڑا ہو گیا۔ ”تم سوچو اور دو دن میں مجھے جواب دے دو۔ میں پر جرحے ہاں ہوں گا۔“
 اگلے روز ہی میکس نے مورگن کو بلا لیا تھا۔ ”مجھے شہراری شرط منظور ہے لیکن تمہیں جو ملے گا پورے ایک سال بعد ملے گا۔“

”ظاہر ہے۔“ مورگن نے سر ہلایا۔ ”میری ایک شرط یہ بھی ہے کہ تم میرے کام میں کوئی مداخلت نہیں کرو گے اور میں جو باتوں کا مجھے مہیا کرو گے۔“
 ”منظور ہے۔۔۔ شرطیں خاص کردہ کام سے متعلق چیز ہو۔“
 ”معاہدہ تحریری ہو گا۔“ مورگن نے کہا۔ ”اور اس میں ہر چیز طے کی جائے گی۔“

مورگن کی آمد کی اطلاع قصبے میں پھیل گئی تھی اور جب اس کے رشتے داروں کو پتا چلا کہ وہ میکس سے ایک معاہدہ کر رہا ہے تو تقریباً سب نے اسے منع کیا تھا۔ حالانکہ میکس بھی ان لوگوں کا رشتے دار ہی تھا لیکن اسے کوئی پسند نہیں کرتا تھا اور مورگن کو سمجھانے والوں کا کہنا تھا کہ میکس کی فطرت میں دھوکا اور شر ہے لہذا وہ اس کے لیے کام نہ کرے۔ لیکن مورگن نے بتایا کہ وہ معاہدہ کر چکا ہے اور اب اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔

معاہدے کے تحت میکس اس کے کام میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے صرف اخراجات کی فراہمی اور نتائج سے سروکار تھا۔ مورگن نے اپنی رہائش کے لیے پاس ہی ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا تھا۔ اس کے جاننے والے جہاں تھے کہ اس نے میکس سے اس قسم کا معاہدہ کیوں کیا تھا جس میں بہت زیادہ امکان تھا کہ آخر میں اسے نقصان اٹھانا پڑے گا کیونکہ میکس ایسا شخص نہیں تھا جو اپنی ذات سے کسی کو فائدہ اٹھانے دے۔ مورگن سب لوگوں کی رائے سنتا اور دوسرے کان سے کٹتا رہا تھا۔

اٹھین ٹاؤن میں آمد کے ایک ہفتے بعد مورگن نے فارم پر باقاعدہ کام شروع کیا۔ ٹیڈ اٹھین ٹاؤن کا مکمل بہت سختی لیکن ذہنی لحاظ سے پیمانہ تھا۔ ممکن ہے وہ شدید غم ہوتا تو کسی کی جرات نہ ہوتی اس سے اس طرح بچا رہنے کی۔ لیکن میکس اس سے ظالمانہ حد تک کام لیتا تھا۔ دوسرے وہ صرف جسمانی محنت کے کام کر سکتا تھا، اس سے تکنیکی کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ مورگن نے میکس سے کہا۔ ”مجھے ایک مزدور کی ضرورت ہے جو مشینوں کو بھی استعمال کر سکے۔“
 ”وہ تو بہت مہنگا پڑے گا۔“ میکس نے کہا۔ ”تم خود بھی تو مشینیں استعمال کر سکتے ہو۔“

”مجھے اور بھی بہت سارے کام ہیں۔ مجھے ایک آدمی کی اشد ضرورت ہے۔ فصل لگانے کے دنوں میں دو آدمی اور درکار ہوں گے لیکن ابھی ایک سے کام چل جائے گا۔“
 ”کبوں میکس کا یہ سوچ کر دم نکلے لگا کہ ابھی صرف ایک آدمی چاہیے بعد میں مزید دو دنوں کی ضرورت پڑے گی۔ اس نے بھی فارم میں دو سے زیادہ ملازم نہیں رکھے تھے۔ لیکن معاہدے کے تحت وہ مورگن کا مطالبہ پورا کرنے کا پابند تھا اور وہ مورگن کام چھوڑ کر جانے کا تیار تھا جبکہ اگر مورگن بلاوجہ کام چھوڑ کر جاتا تو میکس اس پر جرحے گا کہ وہی کر سکتا تھا۔ مجبوراً اسے مورگن کا مطالبہ ماننا پڑا تھا۔

فارم کی حالت مورگن کے اندازے سے بھی زیادہ

خراب تھی۔ زمین میں زرخیزی کی کمی تھی۔ اس نے مٹی کا بل ٹیٹ کر لیا تو بعض ضروری عناصر کی کمی پائی تھی۔ مورگن نے اس کی کو پورا کرنے کے لیے خاص کھادیں منگوائیں اور اس دوران میں نئے ملازم ٹیٹ کی مدد سے زمین سموار کرتا رہا۔ اس نے میکس سے خاد داہ تاریں بٹانے کو کہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ”تم اس پکھر میں مت پڑو ورنہ اسے کام پڑو۔“

کامل کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا اس لیے مورگن نے اسے فارم کی حدوں کے ساتھ پوکھش کے پودے لگانے کا کام دے دیا۔ یہ درخت اس علاقے میں بہت تیزی سے بڑھتے تھے اور دو سال میں پچیس ٹن خشک بلند ہو جاتے تھے۔ مختلف مشینوں میں ان کی بہت مانگ تھی جیسے کانڈ اور گٹا بنانے میں یہ خام مال کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ زمین سموار کر کے مورگن نے اس پر اچھی فصل کی کٹی لگا دی۔ کئی پورے فارم پر نہیں لگائی تھی بلکہ مورگن نے جگہیں چھوڑ چھوڑ کر لگائی تھی اور دوسری جگہوں پر اس نے بڑی کاشت کی۔ اس دوران میں اسے ایک ملازم کی ضرورت اور پڑی تھی۔ یہ ملازم میکس نے بڑی مشکل سے فراہم کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مورگن نے اب تک اس کا خرچہ کر دیا تھا جو وہ دو سال میں بھی نہیں کرتا تھا۔

”جی جی خرچہ اس بار تمہیں اٹھانے کا جو تم نے پہلے تین سال میں ہی نہیں کیا ہو گا۔“ مورگن نے اسے جواب دیا۔
 ایک مہینے میں مورگن محنت کر کے اور بہترین منصوبہ بندی سے فارم کو ایک نئی شکل میں لے آیا تھا۔ کئی کے سرسبز پودے سر اٹھا چکے تھے اور سبزیاں تو خاصی بڑھ گئی تھیں۔ مورگن نے آلو، چنڈر، شامبو، بند گوبھی اور مٹر کاشت کیے تھے۔ کامل نے فارم کے کناروں پر پوکھش کے درخت لگانے کا کام مکمل کر لیا تھا۔ اب وہ فصل کی دیکھ بھال میں دوسروں کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ وہ مورگن کے ساتھ کام کر کے بہت خوش تھا کیونکہ میکس نے بھی اسے ایک ملازم سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی جب کہ مورگن اس سے اچھے انداز میں پیش آتا اور اس کا خیال رکھتا تھا۔

میکس کی زمین میں نیچے اچھا پانی تھا لیکن اس کے پاس پانی کھینچنے والا پمپ اور پانی فصلوں کو دینے والے ایئر کنڈر بہت پرانے اور تقریباً کارہ تھے۔ مورگن نے وہ تبدیل کر کے کیونکہ پوری فصل کو بدوقت پانی مہیا کرنا ضروری تھا تب ہی کم سے کم وقت میں اسے ایک ساتھ فصل تیار ہوئی۔ کیونکہ یہ علاقہ شمال سے نزدیک ہے۔ اس لیے یہاں

نومبر میں برف باری کا آغاز ہو جاتا تھا اور اگر اکتوبر کے آخر تک فصل نہ کٹے تو امکان ہوتا تھا کہ وہ جٹی جا جائے گی۔ اسی طرح سبز یوں کو جلدی تیار کرنے کے لیے پانی کی اشد ضرورت تھی۔ میکس نے دل پر پھر رکھ کر مورگن کا یہ مطالبہ بھی پورا کر دیا۔ نئے پمپ اور ایئر کنڈر سے اس کا کام آسان ہو گیا تھا۔ اکتوبر کے آخر میں بڑی کی فصل تیار تھی اور مٹی کینے سے پہلے مورگن نے ملازموں کی مدد سے سبزی زمین سے لھکوا لی تھی اور اسے مقامی منڈی میں بھی بیچنا دیا تھا۔ اس نے یہ کام اتنی مہارت اور نظم کے ساتھ کیا کہ میکس کا ایک ہی ایک پمپ ٹرک سوئٹھنے سے زیادہ سبزی کو منڈی تک پہنچانے کے لیے کافی ثابت ہوا تھا۔ ٹرک خستہ حال تھا لیکن مورگن نے اس کی مرمت بھی کر لائی تھی۔ ایک ہفتے کے اندر سبزی منڈی پہنچ چکی تھی۔ چونکہ علاقے میں سب سے پہلے میکس کے فارم سے سبزی آتی تھی اس لیے تاجروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ مورگن نے سبزی اچھی معیار کی لگائی تھی اور فصل بہت اچھی تیار ہوئی تھی اس لیے اس کی قیمت بھی اچھی لگتی تھی۔

میکس کو جب ایک لاکھ تیس ہزار ڈالر کا چیک ملا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اول تو وہ فارم پر سبزی نہیں لگاتا تھا کیونکہ سبزی میں محنت بہت ہوتی ہے اور بھی سبزی لگائی بھی تو معمولی درجے کی لگائی تھی جس سے اسے کچھ نہیں ملا تھا۔ مورگن نے اسے چیک دیتے ہوئے کہا۔ ”سبزی پر آنے والا خرچہ اندازاً چالیس ہزار ڈالر ہے یعنی اس میں تمہیں نوے ہزار ڈالر کا خالص نفع ہوا ہے۔“
 میکس نے سنبھلے ہوئے کہا۔ ”وہ تو سال کے آخر میں پتا چلے گا۔ اخراجات بھی کتنے ہیں۔“
 ”کتنی کی فصل کینے والی ہے ہمیں ایک دانے نکالنے والی مشین کی ضرورت ہے۔“

”مشین کی کیا ضرورت ہے، مجھے ایسے ہی فروخت کر دیتے ہیں۔“ میکس نے جلدی سے کہا۔
 ”اس صورت میں ہمیں پچیس فی صد قیمت کم ملے گی۔“ مورگن نے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ اس فصل کے تمہیں وہ لاکھ ڈالر مل سکتے ہیں اگر ایسے ہی فروخت کیا تو پڑھ لاکھ ڈالر ملیں گے۔“

میکس آسانی سے ماننے والا نہیں تھا لیکن پچاس ہزار ڈالر نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مشین کوئی بارہ ہزار ڈالر کی تھی جسے خرید کر بھی وہ اس میں خسارے کے نفع میں رہتا جب کہ مشین تو سالوں استعمال ہو سکتی تھی۔ وہ مان گیا اور مورگن نے فوری طور پر مشین اور یور یوں کا آرڈر دے

دیا۔ میکس کے پاس اجناس کی ذخیرہ گاہ بہت چھوٹی تھی۔ اس لیے جو بھی کئی گھنٹی جاتی اسے منڈی پہنچانا لازم تھا۔ میکس چاہتا تھا کہ ملازموں کو فارغ کردے لیکن اس کے بجائے مورگن نے انہیں پہلے سے زیادہ معاوضے پر رکھ لیا تھا۔ میکس کو پتا چلا تو وہ غصے سے بھر گیا۔ اس نے مورگن کو بلایا۔

”تم نے ان لوگوں کو کچھ رکھ لیا ہے جب کہ ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟“ اس نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

”ضرورت ہے۔“ مورگن نے کہا۔ ”مکی سے نکلے دانے جی لوگ یورپوں میں بھر کر میرے ساتھ منڈی تک پہنچائیں گے۔“

”یہ کام تو دوسرے بھی کر سکتے ہیں جو ان سے کم معاوضہ لیں گے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ میرا کم بعد یہ نہیں آئیں، اب بچا میں انہیں اضافی کام دے رہا ہوں۔ یہ اس فائدہ کو کچھ چکے ہیں۔ اگر انہیں کو ایک مہینے میں چند ہزار ڈالرز اضافی دے دیئے جائیں تو اب اگلے سال آکر میں زیادہ فائدہ پہنچا سکیں گے۔“

میکس کو اس بار بھی خاموش ہونا پڑا کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ مورگن کی وجہ سے اسے کس قدر فائدہ ہو چکا تھا۔ اس کے ایک اکاؤنٹ میں لاکھ ڈالرز سے زیادہ کی رقم آچکی تھی اور اس سے زیادہ آنے والی تھی۔ مکی کی فصل میکس کی توقع سے زیادہ شاندار ثابت ہوئی تھی۔ وہ اس کے اترنے سے پہلے اپنا دوسرا آپریشن کرانے اسپتال روانہ ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ آیا تو نصف فصل اتر چکی تھی اور باقی اتر رہی تھی۔ مورگن فصل اتروانے کے ساتھ ساتھ کچھ اس کے دانے نکلوا کر یورپوں میں بھر کر منڈی پہنچا رہا تھا۔ نومبر کے پہلے ہفتے میں جب پہلی برف پادی ہوئی تو اس دن مکی کی فصل کی آخری یوریاں منڈی کی روانہ ہو چکی تھیں۔

وہ اپنے میں ساری فصل اتار کر اسے یورپوں میں بھر کر منڈی بھیجتا آسان کام نہیں تھا۔ مورگن اپنے چار ساتھیوں سمیت روڈ قائم ہونے کا کام کرتا تھا کہیں جا کر یہ کام مکمل ہوا تھا۔ اس کی اگائی ہوئی مکی اسی شاندار ثابت ہوئی تھی کہ تاجروں نے اس کی بڑھ چڑھ کر بولی لگائی تھی۔ چند دن میں مجموعی طور پر دو لاکھ بارہ ہزار ڈالرز مالیت کی جیکس میکس کے اکاؤنٹس میں آچکے تھے۔ اب کوئی کام نہیں تھا، اس لیے مورگن نے سوائے کانٹے کے تمام ملازموں کو مع یوں کے فارغ کر دیا۔ اس نے یوں کے بارے میں میکس کو نہیں بتایا تھا لیکن جب اس نے بعد میں چیک کیا تو مورگن پر برس پڑا۔

”یہ یوں کس خوشی میں دیے گئے ہیں۔ جب کہ ان

لوگوں کو ان کے کام کی مکمل ادائیگی کر دی گئی ہے۔“

”یہ ان کی بھرتی کر کر گئی کا انعام ہے۔“

میکس کچھ دیر مورگن کو ذہنی نظروں سے دیکھتا رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ”سٹو مورگن یہ میرا فارم ہے اور میں انعامات کا قائل نہیں ہوں۔“

”لیکن میں تو یوں اور ابھی میں تمہارے ساتھ نفع نقصان میں شریک ہوں۔“

”پھر بھی یہ فارم میرا ہے۔“

”معاوضے کی رو سے تم میرے معاملے میں دخل نہیں دے سکتے، لیکن اگر میں اس بات سے اختلاف ہے تو تم انعام میں دی جانے والی رقم میرے حصے سے کاٹ سکتے ہو۔“ مورگن نے بے پروائی سے کہا۔

میکس تھلا کر رہ گیا۔ فصلوں سے ہونے والے نفع سے زیادہ معاوضے نے اس کے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ اس نے کانٹے کے بارے میں پوچھا۔ ”تم نے اسے کیوں رکھا ہوا ہے؟“

”میں نے مکی کی بیج جانے والی فصل بھی کٹوا کر رکھ لی ہے اور کانٹے اسے مٹھین سے کاٹ کر جاتوروں کے چارے میں تبدیل کرے گا۔ سردیوں میں اس علاقے میں چارہ مہنگا ہو جاتا ہے۔ یہ چارہ کچھ انہی رقم کمانی جا سکتی ہے۔“

مورگن نے کچھ یوروں کے بڑے بڑے ڈیڑھ جوا کر انہیں سڑیالوں سے ڈھک دیا تھا۔ تاکہ وہ بارش اور برف پاری سے محفوظ رہیں۔ مورگن نے کانٹے کو کام کا طریقہ سکھا دیا تھا اور وہ اس کے مطابق یوروں کو مٹھین کی مدد سے کاٹ کر چارے کی صورت میں پیکی کر رہا تھا۔ ابھی منڈی میں خشک چارے کی قیمت اتنی نہیں تھی کیونکہ جانوروں پالنے والوں نے ابھی چارہ جمع کر رکھا تھا۔ سراسر کے آخر میں جب ان کا جمع کیا ہوا چارہ ختم ہونے کے قریب ہوتا تھا تب وہ منڈی سے چارہ لیتے تھے اور اس وقت قیمت اچھی ملتی تھی۔ کانٹے کٹے ہوئے چارے کی یوریاں بنا کر ان کو اسی طرح ترپال کے نیچے رکھ دیا تھا اور وہ خوش تھا کیونکہ سراسر کے چارہ مہینے اسے کام نہیں ملتا تھا اور وہ گھروں کے سامنے سے برف صاف کر کے کچھ رقم کمایا کرتا تھا۔ اس بارے میں وہ گارڈ روم ہوتا تھا۔ یہ کام اتنا تھا کہ وہ تین مہینے تک آرام سے کر سکتا تھا پھر ایک مہینہ وہ جاتا اور بارش کے خاتمے تک فارم پر کندم کی کاشت کے لیے تیاری شروع ہو جاتی۔ مورگن نے اسے کہا کہ وہ آرام سے کام کرے کیونکہ ایک مہینے میں وہ اس سے دس ہزار ڈالرز کی دیکھ بھال اور صفائی کا کام لے گا جو اب خاصے بڑھ چکے تھے اور امکان تھا کہ ایک سال میں یہ پندرہ ہزار سے زیادہ دے دیے ہو جائیں گے۔

کیونکہ مورگن کو اب کوئی کام نہیں تھا اس لیے وہ دن میں ایک چکر لگا کر اور کانٹے کے کام کا جائزہ لے کر چلا جاتا تھا۔ جس دن برف پاری ہو جاتی تو کانٹے بھی کام پر نہیں آتے تھا، اس لیے مورگن بھی آرام کرتا تھا۔ اس کے پاس پھونکا سا دو کمروں کا کالج تھا جہاں وہ خود کھاتا جاتا اور اس کا وقت اکیلے گزارتا تھا۔ ہاں جب موسم بہتر ہوتا تو وہ قصبے کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس روز اسے کچھ سامان لیتا تھا تو وہ پراسٹور چلا آیا تھا۔ وہاں سامان لیتے ہوئے اس کی نظر ایک عورت پر پڑی اور اسے لگے اس نے اسے تنکا دیکھا ہے۔ وہ سامان لے کر گاڑی پر بیٹھ گیا جہاں اسٹور کا مالک ایڈم موجود تھا۔ اس نے عورت کو بلین کہہ کر مخاطب کیا تو مورگن سمجھا کہ وہ اسے کیوں جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔

”ہیلو..... مجھے پہچانتا؟“

بلین نے غور سے اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔“

”میں مورگن ہوں ہم ایک ہی جگہ میں رہتے تھے۔“

”اوہ اچھا۔“ بلین نے سر سرپی سے انداز میں کہا اور ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے انداز میں سرورہری محسوس کر کے مورگن سمجھے ہو گیا تھا۔ اس نے سامان لیا اور باہر نکل آیا۔ اسے لگے کہ بلین چین کی وہ بیٹی نہیں بلوئی تھی جب اس کی میکس سے سائیکل کی دھڑکی ہوئی تھی اور میکس نے اس پر گرانے کا الزام لگا کر بلین کی ہمدردیاں جیت لی تھیں۔ جب مورگن یہاں سے گیا تو بلین اس وقت باقی اسکول کے آخری سال میں تھی۔ مورگن کا خیال تھا کہ اس کی میکس سے دو تہی ہے اور شاید وہ آپس میں شادی کر لیں لیکن بعد میں اسے اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ بلین یہاں سے چلی گئی تھی۔ مورگن کو پھر اس کا خیال نہیں آیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میکس نے شادی نہیں کی تھی۔

دو دن بعد وہ فارم کی طرف گیا۔ کانٹے ایسا کام کر رہا تھا۔ مورگن میکس سے ملا۔ اس نے اب اسٹک کے سہارے ہلکا ہلکا چلنا شروع کر دیا تھا لیکن ابھی وہ اس ٹانگ پر زور نہیں دے سکتا تھا۔ مورگن اس سے کہنے آیا تھا کہ کندم کے لیے بیج ابھی سے لے لے کیونکہ سیزن شروع ہو گیا تو قیمت بڑھ جائے گی اور اچھا بیج مشکل سے ملے گا۔ میکس نے اسے ٹال دیا۔ ”ابھی تو مکی مہینے پر ہے۔“

”ہاں لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا تمہیں بیج مہنگا ملے گا۔“

میکس سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن اس نے مورگن کی

بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کے بجائے اس نے کہا۔ ”تمہیں پتا چل گیا ہوگا۔ بلین وہاں آگئی ہے۔“

”ہاں میں نے اسے پراسٹور میں دیکھا تھا۔“

”دیکھا تھا اس سے غری ہوئے کی کوشش کی تھی؟“

میکس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

”نہیں میں نے تو اسے یہ سہاٹی پڑوسی ہونے کے ناطے پہلے ہائے کی کھی لیکن اس نے سچ سے جواب نہیں دیا۔“

”وہ کل مجھ سے ملنے آئی تھی۔“ میکس کا لہجہ اب ہو گیا جیسے اسے توقع ہو کہ مورگن یہ بات جان کر جل جائے گا۔ ”وہ یوسٹن چلا گئی تھی لیکن اب شہر سے اس کا دل بھر گیا ہے اور وہ اپنی زمین پر کام کرے گی۔“

مورگن نے اس کی بات کا اثر نہیں لیا تھا۔ ”میں نے سنا ہے اس کے پاس سوا کروڑ زمین ہے۔“

”ہاں اور وہ مزید خرید رہی ہے۔ سچ اپنی زمین فروخت کر رہا ہے۔ بلین کی زمین کے ساتھ ہی ہے۔“

مورگن کچھ لمبی جانتا تھا۔ وہ مرانا کوشش کر رہا تھا لیکن اب پوڑھا ہو گیا تھا اور اس کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ اس لیے مجبوراً وہ زمین بیچ رہا تھا۔ اس کے پاس بھی سوا کروڑ سے زیادہ زمین تھی۔ سچ، بلین کا باپ اور میکس کا باپ اسٹین ہاکاؤن کے بڑے زمیندار تھے باقی لوگوں کے پاس اپنی زمین نہیں تھی۔ سچ کی زمین میکس کی زمین سے بھی نفی ہوئی تھی۔ مورگن نے پوچھا۔

”کیا تم نے سچ سے زمین لینے کی کوشش نہیں کی تھی؟“

میکس نے برا سامنا نہ کیا۔ ”کی۔ لیکن بڑھ چکا ہمارا خراب ہے۔ سچ کو لاکھ ڈالرز دیا جب میں نے دوبارہ پیش کش کی تو مجھ سے پانچ لاکھ ڈالرز مانگ رہا تھا۔“

”میرے خیال میں تو خشک مانگ رہا تھا شاید اس علاقے میں زمین کی قیمت اس سے زیادہ ہی ہے۔“

”ہاں لیکن ابھی کوئی خریدار نہیں ہے۔“

میکس نے شاید سونے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ پوڑھا بیچ اٹھا کر وہ بھی نہیں تھا کہ اپنی زمین اونے بیچے سچ دیتا۔ اس نے کیا تھا اور آرام سے اپنا پوڑھا گزار سکتا تھا۔ لیکن وہ زمین کو بے آباد نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور خود اس میں اتنی بہت نہیں تھی کہ زمین کاشت کر دے۔ اس کا ہدف اقتصادی بد حالی کی وجہ سے زمین کی خرید و فروخت بند تھی۔ میکس نے شاید اسی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ وہ اپنی زمین تو بیچنے پر تھے سے کوشش نہیں کر پا رہا تھا لیکن اس کے اندر سب سے بڑا ہن جانے اور مہ

سپر پائس بار بہت سخت تھا کیونکہ برف باری حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ برف باری کا ساٹھ سالہ برائے یکاؤ ٹوٹ گیا تھا۔ دو بیٹے تک تو گھر سے نکلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ برف باری رکی تو موٹر گن نے خشک چاروا منڈی میں پہنچانا شروع کر دیا۔ کال کال کا کام بھی رکا ہوا تھا۔ برف باری کا نہ ور ختم ہوا تو اس نے گاڑی شروع کیا۔ مارچ کے وسط تک وہ یہ کام مکمل کر چکے تھے۔ اگرچہ برف باری رکی تھی لیکن سرمایہ کی شدت میں کمی نہیں آئی تھی اور ہمارا کام موسم ابھی دوڑ رہا۔ فارم

”یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ مورگن نے کہا اور
پولیس کی ایک سکن اور سیدھی لکڑی لاکر پودے کے ستنے کے
ساتھ زمین میں گاڑ دی اور ستنے کو زوری کی مدد سے لکڑی سے
باندھ دیا۔ ”اب اسے سہارا مل گیا ہے۔ ایک آدھ بیٹے میں یہ
بہتر ہو جائے گا بشرطیکہ کسی بیماری یا ماحول سے متعلق کوئی
مسئلہ نہ ہو۔“

پیشہ ایس ایس ایمبر 3349 مسٹر آبادی کرچی 75080

[illegible]

Registered with CBR
Govt. of Pakistan

[illegible][illegible]

موبائل — SMS — بچت کو برس کا نام ختم ضرور تاج

MoB: 0300-2219514, 0344-2609828
Tel: 021-34519074

卷之四



میکس مطمئن نہیں تھا اس نے سر ہلایا۔ ”دیکھتے ہیں ورنہ میں کسی باہر کو بلاؤں گا۔“

پھر میکس اس سے گندم کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ کبھی کبھار زمین پر چلنے سے منع کیا تھا اور وہ اپنے مکان سے باہر نہیں جاتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کا شاید کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا۔ اس دوران میں بیلن سے اس کی ملاقاتیں جاری تھیں۔ کئی بار آتے جاتے بیلن سے مورگن کا سامنا ہوا لیکن وہ اسے نظر انداز کر کے گزر جاتی تھی۔ اس کے رویے پر بعض اوقات مورگن کو پیش آ جاتا تھا لیکن پھر وہ خود کو ہنسا کر لیتا تھا۔ مٹی کے آخان میں بارشیں شروع ہو گئیں۔ یہ بارش گندم کے لیے بہت ضروری تھی۔ مورگن خوش تھا بارشوں کی وجہ سے اسے امید تھی کہ گندم کی فصل بھی شاندار ہوگی۔ اس روز وہ کام ختم کر کے گھر کی طرف روانہ ہوا تو بارش ہو رہی تھی۔ مورگن نے برساتی دھن دھن دھن دھن سے نکل کر قصبے کی طرف جانے والی بچی سڑک پر آیا تو اسے ایک چھوٹی کارڈ کی نظر آئی۔ دراصل کارڈ کا پچھلا پیہ ایک گڑے میں پھنس گیا تھا اور ڈرائیور کی کوشش کے باوجود کارڈ گڑے سے نہیں نکل پا رہی تھی۔ مورگن نے گڑے کی کاشیٹ بچایا۔

”کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“

ڈرائیور نے شیشہ نیچے کیا تو مورگن جھجک گیا۔ سامنے بیلن تھی۔ وہ پریشان لگ رہی تھی۔ ”وہ... کارڈ پھنس گئی ہے۔“

”تم ریس مت دو میں کوشش کرتا ہوں۔“

مورگن نے ادھر ادھر سے پتھر اور شیشے جمع کر کے ٹائز کے سامنے رکھیں اور میکس نے کہا۔ ”جب میں گاڑی کو دھکا دوں تو تم ریس دینا۔“

مورگن نے دھکا دیا تو کارڈ آرام سے گڑے سے نکل گئی۔ بیلن نے کارڈ کو دی۔ مورگن پاس آیا تو اس نے کہا۔ ”تمہارا شکر ہے... کہاں جا رہے ہو؟“

”گھر جا رہا ہوں۔“ مورگن نے جواب دیا۔

بیلن پچھلی گاڑی پر اس نے پیش کش کی۔ ”میں تمہیں چھوڑ دیتی ہوں۔“

”اس کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن تم کہتی ہو تو...“ مورگن گھوم کر اندر آ گیا۔ بیلن نے کارڈ آگے بڑھا دی۔ پچھویر خاموشی رہی تھی۔

”تم میکس کے لیے کام کر رہے ہو؟“

”ہاں جہاں میں کام کرتا تھا وہاں خشک سالی کی وجہ سے کام نہیں رہا تھا۔“

”میکس تمہارا بے رحمی نے اس سے شراکت پر کام کیا ہے؟“

”ہاں اگر مجھے مشکل ہو رہی ہے کیونکہ سال سے پہلے میکس مجھے ایک ڈالر روزمی ادائیگی کر کے گاڑیوں سے میرے لیے بھرتے میں چھٹی محنت کروں گا اس کا صلہ حاصل کروں گا۔“

بیلن نے کسی قدر بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”لیکن یہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے؟“

مورگن حیران ہوا۔ ”مجبوری سے فائدہ وہ کیسے؟“

”میکس خود سے کام کرنے کے قابل نہیں ہے اور تم نے اس سے فائدہ اٹھا کر اس سے شراکت داری کا معاہدہ کر لیا۔“

”یہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے اس کا اور میرا مشترکہ فائدہ ہے۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ کام کر سکے اور اگر میں اس کی ملازمت کرتا تو وہ ہر محالے میں ٹانگ اڑاتا۔ اس کے اکثر ملازم اس کے اسی خراب رویے کی وجہ سے بھاگ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ تنخواہ اتنی کم دیتے ہیں کہ کوئی مشکل سے ہی اس پر کام کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ اگر کوئی کرتا بھی ہے تو بے دلی سے کرتا ہے۔ جب میں نے فارم پر کام شروع کیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔“

”لیکن میکس کا کہنا ہے کہ فارم بہت اچھی حالت میں تھا اور تم نے اسے خراب کیا ہے۔“

”وہ ایک گھبراہٹ کا بیج ڈالتا ہے۔“ مورگن کا جواب تھا۔

”اب بار پہلے بھی اس نے جھوٹ بولا کہ تم کو کچھ سے بدعتن کیا تھا اور اب بھی وہ یہی کام کر رہا ہے۔ اس وقت میرا کوئی گواہ نہیں تھا لیکن اب پورا قصبہ میرا گواہ ہے تم برابر والے چلے گئے ہو چھوڑو جب میں نے فارم پر کام شروع کیا تھا تو اس کی کیا حالت تھی؟“

بیلن چپ ہو گئی۔ کچھ دیر میں مورگن کا گھر آ گیا۔ اس نے مورگن کو اتارا اور ایک باورچہ اس کا شکر ادا کر کے چلی گئی۔ مورگن کو کسی قدر اندازہ ہو گیا کہ بیلن کے اس رویے کی کیا وجہ تھی۔ میکس بیلن کو اس کے بارے میں بیکار رہا تھا اور مورگن نہیں سمجھ سکا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ کیا اسے مورگن سے کوئی خوف تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ امکان تو یہی تھا کہ وہ یہ حرکت اپنی فطرت کے مطابق کر رہا تھا۔ اگلے روز وہ فارم پہنچا تو میکس گھر کے پاس کھڑا زمین کا معائنہ کر رہا تھا۔ مورگن کو اسے دیکھ کر قہقہہ اٹھایا اور اس نے میکس کے پاس جاتے ہی پوچھا۔

”تم نے بیلن کو میرے بارے میں کیا کہا ہے؟“

میکس چونکا نہیں تھا۔ اس نے چہ سگوت انداز میں پوچھا۔ ”تم نے کیا سنا ہے؟“

”بیلن کے خیال ہے میں تمہاری مجبوری سے میں فائدہ اٹھا رہا ہوں۔“

”یہ اس کا اپنا خیال ہے۔“ میکس کا انداز بے پرواہی والا ہو گیا۔

”اس کے ذہن میں یہ خیال کہاں سے آیا؟“

”میں نے کہا کہ میں نے نہیں ڈالا... اور وہ خود بھی تو سب دیکھ رہی ہے۔“

”کیا دیکھ رہی ہے؟“

”بیلن کہ تم نے میری عارضی معذوری سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے ایسا معاہدہ کر لیا جس میں تمہیں تمہاری حیثیت کے نکلنے کی زیادہ حاصل ہو گیا ہے۔“

”مورگن نے جواب دیا۔ ”ورنہ تم اس فارم پر کام کر کے اتنا نہیں کمائے تھے۔“

”یہ تمہارا خیال ہے۔“ میکس کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔

”اچھا اور دوسرے لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ مورگن نے پھر کیا۔ ”اب تک بیلن صرف تمہاری باتیں سنتی رہی ہے میں نے اسے مشورہ دیا ہے کہ وہ قصبے کے دوسرے لوگوں سے کچھ تمہارے بارے میں معلوم کر لے کہ میرے آنے سے پہلے اس فارم کو کس طرح چلایا ہے۔“

میکس کا مذہب نہ کیا تھا۔ ”تم کون ہوتے ہو اسے مشورہ دینے والے؟“

”تو تم کون ہوتے ہو بیلن کو میرے بارے میں بھگانے والے۔“

میکس کچھ دیر اسے گھورتا رہا۔ ”تم بھولو کہ تم میرے ملازم ہو؟“

”ملازم نہیں ایک سال کے لیے شراکت دار اور تیرے بھے کا حق دار۔“ مورگن نے مسکرا کر کہا اور کھیت کی طرف چلا گیا۔ میکس تھملا کر رہ گیا پھر اس نے ذہن پر لپکا۔

”میں تمہیں دیکھ لوں گا۔“

مٹی کے آخر تک پودے خاصے بڑے ہو گئے تھے اور ان کی نشوونما کی رفتار تیز تھی۔ بارشوں نے فصل پر مثبت اثر کیا تھا۔ جیسے جیسے سال پورا ہونے کا وقت پاس آ رہا تھا۔ میکس کی فکر بڑھتی جا رہی تھی اور اس کا یہ سوچ گرم نکلا جا رہا تھا کہ اسے مورگن کو ایک بہت بڑی رقم بھرنے کے طور پر دینا ہو گا۔ اس نے اب تک جو کم کر دیا اس میں اس کا حصہ ایک لاکھ ڈالر کے قریب ہو گیا تھا اور گندم اور بھری کی فصل فروخت کرنے کے بعد یہ حصہ کہیں زیادہ ہو جاتا۔ جب کہ

مورگن کے لگائے ہوئے درخت بھی خاصے بڑے ہو گئے تھے۔ ان کی فروخت سے بھی بڑی رقم حاصل ہوتی۔ میکس کا اندازہ تھا کہ اسے کوئی پونے دو لاکھ ڈالر کے آس پاس رقم مورگن کو دینا ہوگی اور اس کے خیال میں وہ اتنی رقم کا حقدار نہیں تھا۔ میکس نے اس چیز کو فراموش کر دیا تھا کہ مورگن کی وجہ سے ہی اس نے اتنا کمایا تھا کہ ایک دو سال کچھ نہ کرتا تب بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ اس کا فارم منظم کر کے جا رہا تھا۔ لیکن اپنی فطرت کے مطابق اس نے یہ سب نظر انداز کر دیا تھا اور اب اسے گلجری کر مورگن کے حصے میں کس طرح کی کرے۔

جون کے شروع میں گرم اور خشک موسم کا آغاز ہوا جو گندم کو بھگانے کے لیے ضروری تھا۔ مورگن نے اس بار کم بھری لگائی تھی کیونکہ گریسوں میں اس کی اتنی مانگ نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی گندم کے پتے سے پہلے ہی بھری یک ہی تھی اور اس نے منڈی میں سپلائی شروع کر دی۔ جون کے آخر تک گندم کاٹ لی جاتی۔ مورگن اس سے پہلے ساری بھری منڈی پہنچا دینا چاہتا تھا۔ گندم کی فصل اس کی توقع سے زیادہ اچھی ہوئی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ کم سے کم پانچ سو ٹن گندم اٹھا سکے گا۔ اس کی اچھی قیمت مل جائے گی اور سب سے پہلے میکس کے فارم کی گندم مارکیٹ میں آئے گی جب کہ باقی بھگیوں سے ایک ہفتے بعد گندم آئے گی۔ اس لیے اس کی اچھی بولی لگ سکے گی۔

بارش والے دن کے بعد مورگن کی بیلن سے ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی اور اس نے سمجھو کیا کہ وہ اب اس سے بھرتا انداز میں پیش آ رہی تھی گویا اس کے ذہن میں میکس کی پھیلائی ہوئی غلط باتوں کا جال کھ رہا تھا۔ لیکن اس کے انداز میں اب بھی ایک پچھلاہٹ نمایاں تھی اور مورگن کے خیال میں شاید یہ طبعیاتی فرق کی وجہ سے تھا۔ بیلن کے پاس بہت بڑی زمین تھی اور وہ کئی زمینیں بھی حاصل کر لیتی تو میکس سے زیادہ زمین ہو جاتی۔ جب کہ مورگن ایک غریب آدمی تھا۔ اس کے پاس کوئی ذاتی زمین نہیں تھی۔ اس کے باپ کی زمین فروخت ہو چکی تھی۔

مورگن کام کر کے فارم سے گھر جا رہا تھا کہ اس نے سڑک کے گھر سے بیلن کو ٹھٹھکے دیکھا۔ اس بار وہ پیدل تھی۔ شام کے وقت خوش گوار ہوا چل رہی تھی اور پیدل چلنے کے لیے بڑا اچھا موسم تھا۔ بیلن اسے دیکھ کر رک گئی۔

”ہائے... کیا حال ہے؟“

”تم دیکھ رہی ہو۔“ مورگن نے اپنے مٹی سے اٹنے

و جودی طرف اشارہ کیا۔ ”تم سچ سے ملے آئی تھیں؟“
 ہیلن نے سر ہلایا۔ ”ہاں میں اس سے زمین کا سودا
 کرنا چاہ رہی ہوں لیکن وہ قیمت ذرا زیادہ مانگ رہا ہے۔“
 ”قیمت زیادہ ہے لیکن سچ کی زمین بہت اچھی ہے اور
 یہ ایک دو سال میں اپنی قیمت ادا کر دے گی۔“
 ”ہاں لیکن فی الحال میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے اور
 بینکوں سے قرض بڑی مشکل سے اور کڑی شرائط پر مل رہا
 ہے۔ اگر میں نے ساری جمع پونجی سچ کو دے دی تب بھی
 زمین کی قیمت ادا نہیں کر سکتی اور پھر مجھے زمین پر کام کرنا ہے
 تو اس کے لیے مجھے رقم چاہیے ہوگی۔“
 ”ہاں یہ تو ہے۔“ مورگن نے کہا اور پھر خلوص سے
 بولا۔ ”اس سلسلے میں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں
 حاضر ہوں۔“
 ہیلن نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تم میری کیا مدد
 کر سکتے ہو؟“

”جیسی میں میکس کی کر رہا ہوں۔“
 ”یہ بد وقت نہیں ہے معاہدہ ہے۔“
 مورگن سر آہ بھر کر رہ گیا۔ لیکن بھی میکس کے انداز
 میں سوچ رہی تھی۔ اس کے نزدیک بھی زمین کا ایک ٹکڑا ہوتا اور
 دولت مند ہونا ہی اس کا تھا۔ کوئی اگر اپنے ہزاروں تجربے کو پیش
 کر سکتا تو یہ ان کے نزدیک ملازم رکھنے سے زیادہ اہمیت نہیں
 رکھتا تھا۔ مورگن نے اپنے تجربے اور بھر سے میکس کو اس
 سے کہیں زیادہ فائدہ پہنچایا تھا پتا وہ خود کام کر کے حاصل کرتا
 تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کے خلاف سازش کر رہا تھا اور
 ہیلن کی نظر میں اسے ایک موقع پرست بنا کر پیش کر رہا
 تھا۔ میکس جیسے لوگ دوسروں سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں لیکن اپنی
 ذات سے کوئی فائدہ ہونے نہیں دیتے۔

”تم نے میکس سے معاہدہ کیا ہے کہ ایک جولائی سے
 اگلے سال میں جون تک اسے فارم سے جو قطع ہوگا تم اس میں
 تہائی کے حصے دار ہو گے۔“
 ”صرف قطع میں نہیں بلکہ نقصان میں بھی شریک
 ہوں۔“ مورگن نے سچ کی۔
 ہیلن چیخی۔ ”میکس نے یہ تو نہیں بتایا تھا۔“
 مورگن جی سے مسکرایا۔ ”وہ نہیں صرف وہی بتاتا ہے
 جو اس کے مفاد میں ہو اور جس سے اسے نقصان ہو وہ باتیں
 چھپا جاتا ہے۔“
 ہیلن نے اس کی طرف دیکھا۔ ”جب وہ تمہیں پسند
 نہیں ہے تو تم اس کے لیے کام کیوں کر رہے ہو؟“

”اس کام کے لیے میں اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ اس
 نے مجھے خود اپنی مدد کے لیے بلایا تھا اور خوب سوچ سمجھ کر یہ
 معاہدہ کیا تھا۔ اب وہ تمہارے سامنے مظلوم بن رہا ہے۔ تم
 ذرا منڈی میں جا کر وہاں تاجروں سے پوچھ لو کہ ایک سال
 پہلے تک وہ انہیں کیا فروخت کرتا رہا ہے اور اس سال اس
 کے فارم سے منڈی میں کیا آیا ہے جیسے خودی سب معلوم ہو
 جائے گا۔“ مورگن نے تیز لہجے میں کہا اور ہیلن سے اس کے نکل
 نہیں نہ جانے کیوں اسے بہت غصہ آ رہا تھا۔ حالانکہ اسے
 میکس سے کوئی اچھی توقع نہیں تھی لیکن ہیلن کا انداز دیکھ کر
 اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ اب بھی مشکوک تھی کہ مورگن نے
 میکس کی معذوری اور مجبوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔

اگلے روز مورگن فارم پہنچا تو میکس اس کا منتظر تھا اور
 اس کے چہرے پر بد مزگی کے آثار تھے۔ مورگن سمجھا کہ
 شاید اسے ہیلن سے ہونے والی گفتگو کا علم ہو گیا ہے۔ لیکن
 اس نے مورگن کو بازو سے پکڑا اور اسے باغ میں لے
 آیا۔ اس کا پاؤں تقریباً ٹھیک ہو گیا تھا اور اب وہ بغیر
 سہارے کے چل رہا تھا۔ ایک مہینے بعد اس کا آخری آپریشن
 کر کے اس کے گھٹنے کی خشک ختم کر دی جانی جس کے بعد وہ
 اپنے اس پاؤں کو پوری طرح استعمال میں لاسکتا تھا۔ فی
 الحال تو پاؤں ٹکڑی کی طرح سیدھا تھا۔ وہ مورگن کو اس
 پودے کے پاس لایا جو مر جھار ہوا تھا اور مورگن نے اسے سہارا
 دینے کے لیے اس کے ساتھ ایک لکڑی لگا دی تھی۔ میکس نے
 اس کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ دیکھو یہ کیا ہوا ہے؟“
 مورگن نے دیکھا کہ اس نے سہارے کے لیے جو
 لکڑی لگائی تھی اس نے زمین میں جڑ پکڑ لی تھی۔ اگرچہ اس
 نے اپنا کام بھی کیا تھا اور کئی پودے پر بھی بہار آ رہی تھی۔
 مورگن کا خیال درست تھا۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی اور
 جب اسے سہارا مل گیا تو وہ پھر سے سرسبز ہو رہا تھا۔

”ہاں اب یہ ٹھیک ہو رہا ہے۔“
 ”میں اس کی نہیں اس لکڑی کی بات کر رہا ہوں جس
 نے جڑ پکڑ لی ہے۔“ میکس نے ٹھٹھا کر کہا۔
 ”اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے جب پودا پوری طرح سر
 سبز ہو جائے گا تو یہ لکڑی مع جڑ کے نکال دی جائے گی۔“
 ”نہیں اس وقت تک یہ میرے قیمتی پودے کو خراب کر
 دے گا اور زمین میں اپنی جڑیں بچھلا دے گا۔“ میکس نے
 فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”اسے زمین سے نکال دو۔“
 ”اگر لکڑی کو زمین سے نکال دیا تو یہ پودا سہارے

سے محروم ہو جائے گا اور پھر سے مرجھانے لگے گا۔“
 ”یہ اب ٹھیک ہے اور اسے سہارے کی ضرورت نہیں
 ہے۔“ میکس نے اصرار کیا۔ ”اسے نکال دو۔“
 ”جیسی تمہاری مرضی۔“ مورگن نے شانے اچکائے
 اور کھڑی لاکڑی زمین کھودی اور پوکش کی شاخ کو جڑ سمیت
 زمین سے نکال دیا۔ میکس مطمئن نظر آنے لگا۔
 ”اب ٹھیک ہے۔“

مورگن فارم پر چلا آیا۔ اس نے شاخ ایک طرف
 پھینک دی اور کام میں لگ گیا۔ سبزی کی آخری کھپ روٹ گئی
 کے لیے تیار کی جا رہی تھی۔ اس کے بعد گندم کی کٹائی کا آغاز
 ہو جاتا۔ میکس کے پاس ایک چھوٹا سا تر پھر تھا اس سے
 ساری زمین کی گندم کاٹنے میں ایک ہفتہ لگ جاتا اور اس میں
 زیادہ مزدوروں کی ضرورت پڑتی کیونکہ گندم کا دانہ پوروں
 میں بیک کرنا تھا۔ شام کو کام سے فارغ ہو کر مورگن نے
 میکس سے کہا۔

”میں چار مزدوروں کی ضرورت ہوگی۔“
 اس نے محو کر مورگن کو دیکھا۔ ”تمہارا دامخ درست
 ہے۔ مین افریڈ پہلے ہی کام کر رہے ہیں اور تم مزید چار کا
 مطالبہ کر رہے ہو۔“
 ”یہ چار مزدور صرف ایک ہفتے کے لیے چاہئیں اور ان
 کی مدد سے گندم جلد منڈی تک پہنچا کر زیادہ قیمت حاصل کی
 جاسکتی ہے۔“

”اس کی اتنی جلدی نہیں ہے۔“ میکس نے بے
 پرواہی سے کہا۔
 مورگن نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیوں جلدی
 نہیں ہے۔۔۔ اگر دوسروں کی فصل بھی مارکیٹ میں آگئی تو
 قیمت گر جائے گی اور تمہیں وہ قیمت نہیں ملے گی۔“
 ”یہ میرا مسئلہ ہے۔“ میکس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔
 ”گندم کی کٹائی ایک جولائی سے شروع کی جائے گی۔“
 ”ایک جولائی تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔“ مورگن
 چلا اٹھا۔

”میں نے کہا تھا کہ یہ میرا مسئلہ ہے۔“
 مورگن سمجھ گیا تھا میکس اسے گندم کی فروخت سے
 حاصل شدہ نفع سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ معاہدے کی رو سے
 وہ صرف تیس جون تک ہونے والی آمدنی میں حصے دار تھا۔
 مورگن نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ”میکس تم ایسا
 کیوں کر رہے ہو؟“
 وہ مسکرایا۔ ”ایک سال پہلے تم نے میری مجبوری کا

فائدہ اٹھایا تھا اور اب میں مجبور نہیں ہوں۔“
 ”میرا معاہدہ کی خلاف ورزی ہے۔“
 ”بالکل بھی نہیں ہے۔“ میکس نے اپنی جیب سے
 معاہدے کی کاپی نکال کر لہرائی۔ ”اس میں کہیں بھی نہیں لکھا
 ہے کہ میں اپنے فارم کی پیداوار مخصوص مدت میں بیچنے پر
 مجبور ہوں۔“

مورگن مستحضر رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا
 کہ میکس ایسی چالاکي دکھائے گا۔ واقعی وہ معاہدے کی رو
 سے فارم کی پیداوار ایک مخصوص مدت میں بیچنے کا پابند نہیں
 تھا۔ اب وہ گندم کی کٹائی اور منڈی میں سپلائی ایک جولائی کو
 شروع کرتا تو مورگن کو اس کے نفع میں سے کچھ نہیں ملتا۔ اس
 نے فارم کے کنارے لگے پوکش کے درختوں کی طرف
 دیکھا اور بولا۔

”میں فیصلہ تمہارا ان درختوں کے بارے میں ہے؟“
 ”ہاں میں نے سوچا ہے ان کو مزید ایک سال بعد
 فروخت کر دوں گا۔“ میکس عیاری سے بولا۔
 مورگن نے اسے گھورا۔ ”تم یہ مت سمجھو کہ تم چھوٹ
 جاؤ گے میں عدالت میں جاتاؤں گا۔“

”اس صورت میں اپنے بقیہ حصے سے بھی اس وقت
 تک کے لیے محروم ہو جاؤ گے جب تک یہ معاہدہ عدالت میں
 چلے گا اور اس میں بہت طویل عرصہ لگ سکتا ہے۔“
 مورگن کو احساس ہوا کہ اس کی پوزیشن بہت نازک ہو
 گئی تھی۔ درحقیقت وہ پچھلے ایک سال سے بغیر کسی آمدنی کے
 بہت مشکل سے گزارا کر رہا تھا اور اب اس کے پاس کچھ بھی
 نہیں رہا تھا۔ مقدمہ کھڑے کی صورت میں اس کے پاس
 عدالت کے اخراجات اور وکیل کی فیس دینے کے لیے کچھ
 نہیں تھا۔ اس نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ ”ٹھیک ہے تب
 تم میرا اب تک کا حصہ ادا کر دو۔“

”وہ میں نہیں جون کو تمہیں اس شرط کے ساتھ دوں گا
 کہ تم لکھ کر دو کہ اب تمہیں مجھ سے کچھ نہیں لینا ہے۔“
 ”میکس تم نے ایک بار پھر میرے ساتھ زیادتی کی
 ہے۔“ مورگن کے لہجے میں شکوہ آ گیا تھا۔ ”میں نے تو
 تمہارے ساتھ اٹھا کیا ہے۔“
 ”نہیں مزید نہیں ہوں میں نے پورا ایک فارم چلایا ہے۔“
 میکس نے فحاش سے اسے دیکھا۔ ”تم ایک مزدور
 ہو اور تم نے اپنی اوقات سے اونچا اڑنے کی کوشش کی تھی۔“

امید ہے اب ہمیں اپنی اوقات یاد آگئی ہوگی۔“
”افسوس کہ میں نے سمجھا کہ تم میرے ساتھ پھر دھوکا نہیں کرو گے لیکن تم اب بھی ایک دھوکے باز ہی ہو۔ پچھن میں بھی تم نے مجھے تین کی نظروں سے گرانے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔“

میکس ہنہ۔ ”میں آج بھی جھوٹ پل کر اسے حاصل کر لوں گا۔ اس کے ساتھ اس کی زمین اور پھر سچ کی زمین بھی میرے پاس آ جائے گی اور میں تم جیسے درجنوں ملازم رکھ سکوں گا۔ اگر ہمیں ملازمت کی ضرورت ہو تو پھر میرے پاس آ جانا میں کمزور ہونے کے ناتے انکار نہیں کروں گا۔“

”تم جیسے آدمی کے پاس ملازمت کرنے سے بہتر ہے میں بے روزگار رہی رہوں۔“ مورگن نے نفی سے کہا۔ ”مجھے شروع سے شک تھا کہ تم تین کے ساتھ بھی تخلص نہیں ہو۔“
”لیکن مجھے شک بھی نہیں تھا۔“ قریب سے تین کی آواز آئی تو وہ دونوں اچھل پڑے۔ بارش میں درختوں کی بیج سے انہیں چٹائی نہیں چلا کر تین کب وہاں آگئی۔ تین میکس کو کھو رہی تھی جو کچھ بدحواس ہو گیا تھا پھر اس نے جلدی سے خود کو سنبھالا۔

”تم کب آئیں؟“
”بہت دیر ہوگی۔“ وہ بولی۔ ”تمہاری باتیں سن رہی تھی۔“
”تین تم نے جو ستادہ اصل میں مورگن کو...“

”اب مجھے حریہ بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔“ تین نے اس کی بات کاٹی۔ ”میں نے خود مٹا ہے تم اس سے شکم زیادہ کہنے ثابت ہوئے ہو جتنا میں دوسروں سے تمہارے بارے میں سنی آئی ہوں۔“ تین نے کہا اور پلٹ کر وہاں سے چلی گئی۔ میکس اس کے پیچھے آؤ اڑیں دیتا رہا لیکن تین نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میکس کھپانا ہو کر واپس آیا اور مورگن پر ہنس پڑا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ کل سے یہاں قدم نہ رکھا۔“
مورگن مسکرایا۔ ”تم بھول رہے ہو کہ میں تین جون تک یہاں کام کرنے کا پابند ہوں۔“

”کوئی پابند نہیں ہو اب جاؤ یہاں سے۔“
”ایسے نہیں جب تک تم مجھے تحریری طور پر منع نہیں کرو گے کہ میں اب یہاں آنے کا پابند نہیں ہوں میں آتا رہوں گا۔“
اگلے روز میکس نے اسے تحریری طور پر منع کر دیا اور تین جون کو اس کے حصے کے چوراٹے ہزار ڈالر ادا کر دیے اس نے ایک جولائی سے گندم کی کٹائی شروع کرانی لیکن پہلے تو اسے مزدور ہی نہیں ملے۔ بڑی مشکل سے اس نے دو گئے

معاوضے پر تین مزدور حاصل کیے تو انہوں نے نہایت سستی سے پندرہ دن میں چار گندم کی کٹائی مکمل کی اور اس وقت تک میکس کی بد قسمتی کہ گندم کی قیمت چالیس فی صد تک گر گئی تھی اور اسے فروخت میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ میکس کے لیے یہ حد سے کی بات تھی کہ اسے اتنا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

لیکن بڑے صدے ابھی باقی تھے۔ ایک دن وہ صبح گھر سے نکلا تو اس نے مورگن کو سچ کی زمین پر کام کرتے دیکھا۔ وہ ہانڈے کے پاس آیا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”جو تم دیکھ رہے ہو۔“ مورگن نے کہا۔ ”میں نے سچ سے اس کی زمین پانچ سال کے لیے گرانے پر ملے لی ہے اور اب میں اسے کاشت کروں گا۔“

میکس دنگ رہ گیا تھا پھر اس نے منجیل کر پوچھا۔ ”تمہارے پاس رقم کہاں سے آئی؟“
مورگن نے دونوں ہاتھ سامنے کیے۔ ”جو لوگ ان ہاتھوں کو استعمال کرتا جانتے ہیں انہیں کام حاصل کرنے کے لیے رقم کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔“

مورگن نے ایک سال کا کرپا دے کر زمین لے لی تھی اور اب بھی اس کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ سارے سال کے اخراجات ادا کر سکتا تھا۔ اس کے ایک ہفتے بعد اس نے تین کی درخواست پر اس کی زمین کا کام بھی سنبھال لیا تھا۔

مورگن کے پاس مزدور اور سفینیں چلانے والے تھے اور اسے کام لینا بھی آتا تھا۔ وہ میکس کے فارم سے آتے ہوئے وہ ٹماخ لیتا آیا تھا جسے اس نے تین کی پودے کو سہارا دینے کے لیے زمین میں لگا دیا تھا اور شارخ نے جڑ پکڑ لی تھی۔ اس نے یہ پودا اپنے گھر کے سامنے لان میں لگا دیا تھا جس نے وہاں بھی جڑ پکڑ لی تھی۔ وہ جیتی پودا جسے اس شارخ نے سہارا دیا تھا

سہارے سے محروم ہونے کے بعد ایک بار پھر مر گیا تھا۔ یہی حال میکس کے فارم کا ہوا۔ مورگن کے بعد اس نے خود اسے کاشت کرنا شروع کیا اور چند ہی مہینوں میں فارم اپنی سابق حالت پر لوٹ گیا۔ مکمل اور دوسرے اچھے کام کرنے والے مورگن کے ساتھ چلے گئے تھے اور میکس کو اب اپنے جیسے لوگ دستیاب تھے۔ اس لیے فارم کو کھلی حالت میں آتا تھا۔ ایک سال بعد جب مورگن نے اتنا کمایا کہ اس نے سچ سے تین کا ایک ٹکڑا خرید کر اس پر اپنے لیے مکان کی تعمیر شروع کر دی تو میکس کے لیے سب سے بڑا دھچکا مورگن اور تین کی شادی کی خبر ثابت ہوئی تھی۔ اس وقت اسے لگا

اس نے بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ کھو پایا ہے۔

اس نے بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ کھو پایا ہے۔

اس نے بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ کھو پایا ہے۔

اس نے بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ کھو پایا ہے۔

اس نے بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ کھو پایا ہے۔

اس نے بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ کھو پایا ہے۔

علم چاہے جیسا بھی ہو، اگر دماغ کے کسی حصے میں جگہ پٹالے تو کبھی رائگان نہیں جاتا۔ وہ جو قدموں کی دھول تپا، اچانک ان علم والوں کے لیے گھٹا معتبر بن گیا کہ دنیا حیران تھی مگر... اس نے جان میں مل کر پتا لیا کہ اب اسے ان بلندیوں کی حاجت نہیں رہی۔

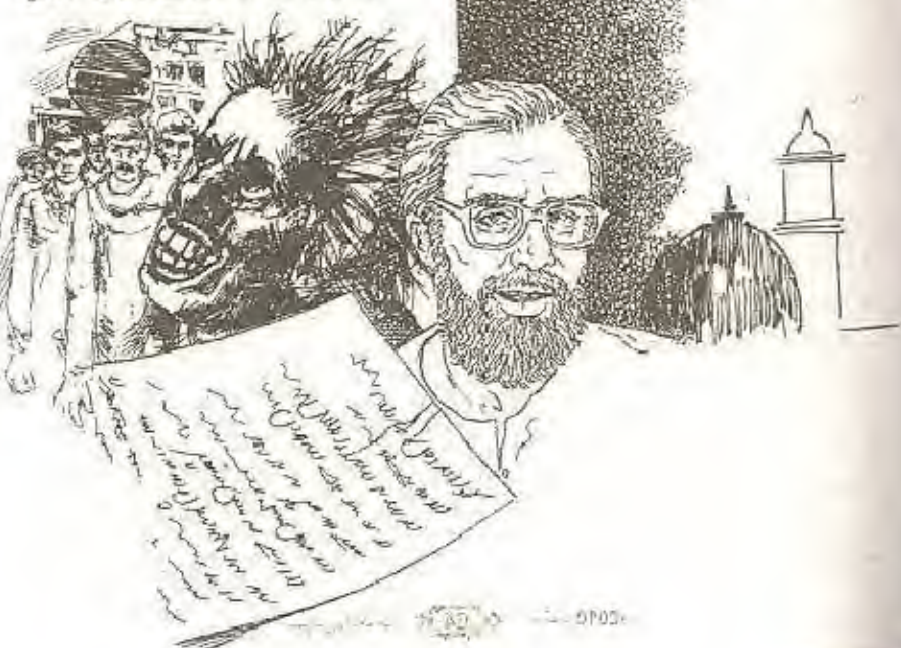
”علم کی جاگیر دار کی میراث نہیں“ کی ایک براہِ تفسیر

نواکست ریاض مہروکی

آگیا

گلو صبح سے سہ پہر تک چودھری فتح محمد اور اس کے آدمیوں کے عتاب کا نشانہ بنا رہا۔ اس پر سنے لائیں اور لائیں بیاں برسمانی جانی رہیں۔ نہ صرف چاہوں سے اس کے جسم کو اسیڑا گیا بلکہ اسے گاؤں کی گلیوں میں گھسنا گیا اور تو اور اسی پر بس نہیں کیا، چودھری کے کارندے اس کے منہ پر کا لک ٹھوپ کر گدھے پر سوار کر کے تمام گاؤں کی گلیوں میں اسے گھماتے رہے۔ اس دوران میں گاؤں کے شرارتی لڑکوں کا ایک ٹولہ ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ جو لڑکے متعلق واپیات قسم کے نعرے لگاتے اور اسے پتھر بھی مارتے رہے۔ اس کے ساتھ ہر وہ قلت امیر سلوک کیا گیا جس سے نہ صرف اس کا جسم بلکہ روح بھی لٹاں ہوئی رہی۔

چودھری فتح محمد کا حکم تھا کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا



مکروہ ان کے اندر لکھیں موجود ضرور تھا۔ اسی رواجی چودھری کے آسمان پر وہ اس سے لیے دیے رہتے تھے۔ وہ بہت نیک انسان تھے عذراات پات کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اپنے چودھری ہونے پر بڑے نازدار رہتے تھے۔ کونے نوراً سے خوشخبر مولوی صاحب کی بات گروہ میں باندھ لی اور انکی ذہانت دکھائی کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ کھوکھو جب بڑھتا آیا تو اس نے کتابوں کو اپنی خانجیوں کا ساتھی بنالیا کیونکہ اسے کتابوں کی باتیں سمجھ آنے لگی تھیں۔ ان کتابوں نے اسے زندگی کا مقصد بتا دیا تھا۔ دھیرے دھیرے ان کتابوں نے جب اسے زندگی چینی کے سہرے آگاہی دی تو کچھ کام کرنے کا بھی جی چاہا۔ اب اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ بغیر محنت کے مولوی صاحب کے ہاں سے کھاتا رہے۔ پہلے پہل اس نے اس کا یہ بل نکالا کہ مولوی صاحب کے کبے بغیر ان کے گھر کے کام کاج کرنے لگا۔ ان کے کھیتوں پر کام کرتا۔ ان کے مویشیوں کو سنبھالتا اور اسی طرح کے کئی اور کام اس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ جب کھوکھو جان بوا تو مولوی صاحب کی اجازت سے قریبی شہر جا کر محنت مزدوری کرنے لگا۔ وہ دن بھر جہاں بھی کام کرتا، شام کو لاری گاؤں واپس آ جاتا۔ رات وہ اپنی چھوٹی کھیتی میں بیٹھ کر کام کرتا۔ اسے جو نیڑی سے خصوصی اہمیت تھی کیونکہ وہاں اس کی ماں نے زندگی گزار لی تھی اور وہیں اس نے دم توڑا تھا۔ وہ جھوپڑی اس کے لیے کسی مقدس مقام کی طرح تھی۔ جس کے لیے اس کے دل میں بے پناہ احترام موجود تھا۔

☆☆☆☆

مولوی صلاح الدین کا بیٹا غیاث الدین بھی جوان ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب کی چھ اولادیں تھیں۔ اللہ نے انہیں پانچ بیٹیوں کے بعد بیٹے سے نوازا تھا۔ اس لیے غیاث الدین بے حد لاڈلا تھا۔ کوئی بھی چیز جب ”حد“ کے دائرے سے نکلتا کرتا ”بے حد“ کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو بکاڑ کا باعث بنتی ہے۔ غیاث الدین کو بھی ”بے حد“ لاڈ پنانے لگا تو لاڈلا تھا۔ وہ بری مخلوق کا ولدا تھا۔ مزاج خالص رواجی چودھریوں جیسا تھا۔ وہ بچپن ہی سے اپنے باپ سے کچھ مختلف سا تھا اور مولوی صاحب باوجود کوشش کے اسے اپنے رنگ میں نہ رنگ سکے تھے۔ یہ بات جانتی ہی کہ مولوی صاحب نے اسے بے پناہ لاڈ پیار سے بالا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس کی اچھی تربیت بھی کی تھی۔ وہ اپنے اصولوں پر کھنکھتے کے قائل نہ تھے۔ اس غیاث الدین کی ماں کی طرف سے اسے کافی ڈھیل دی تھی۔ ہر ماں کی طرح اس ماں پر بھی بعض اوقات

منا غائب آ جاتی تھی اور وہ اس کی بعض بے جا خدیں اور فرمائشیں پوری کرنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ جب غیاث الدین نے پہلی بار ساتھ والے گاؤں کے کچھ دوستوں کے ساتھ کھوتے کے لیے شہر جانے کی ضد کی تو اس کی ماں نے بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر اس کی وکالت کی تو مولوی صاحب کو اجازت دینی پڑی۔ پھر اس کے بعد ایسے ”نور“ اکثر ہونے لگے۔ بیٹا مقررہ کے لیے شہر کھنکھوتے جاتا تھا لیکن وہاں جا کر وہ اور اس کے دوست کس قسم کی ”تفریح“ کرتے تھے۔ اس سے مولوی صاحب اور ان کی بیگم ناواقف تھیں۔ جب انہیں آگاہی ہوئی تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ غیاث الدین جو نے اور شراب نوشی کا عادی ہو چکا تھا۔ باپ اپنے ”وعدہ“ میں جن مشاغل کو حرام کہتا تھا اپنی مشاغل کا ولدا وہ تھا۔ گاؤں میں باتیں ہوتے تھیں۔ مولوی صاحب پر انکھیاں اٹھنے لگیں۔ کئی لوگوں نے ان کے پیچھے نماز تک پڑھنے سے انکار کر دیا۔ چودھری فتح محمد بھی اپنے دل کی نیچر اس نکال رہا تھا۔ مولوی صاحب بیٹے پر پکڑی کرتے تو وہ گھر سے بھاگ جانے کی کوشش کرتا اور یہی ان کی کمزوری تھی کہ وہ اسے اپنی آنکھوں سے دور ہوتا بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ بہت مجبور تھے۔ انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ اس کی ہدایت کے لیے دعا بھی کر سکتے تھے۔ سو وہاں ہر وقت کرتے رہتے تھے۔

☆☆☆☆

مولوی صلاح الدین حسب معمول نماز تہجد کے لیے اٹھتے۔ لائین جلائی۔ دھوکا اور مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کچھ زیادہ ہی بولناک اور تاریک تھی۔ سردی بھی معمول سے زیادہ تھی۔ انہوں نے سردی سے بچنے کے لیے طر خواہ انتظام کر رکھا تھا مگر سردی پھر بھی مزاج پر کئی پر آباد تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں لائین اور دوسرے میں لائین سنبھالے مسجد کی طرف روانہ تھے۔ صبح والا واقعہ اب بھی ان کے ذہن میں تازہ تھا۔ وہ بہت گہرے صدمے سے دوچار ہوئے تھے۔ ان کا دل دو ماں اس صدمے کے دھار سے نکل نہیں پایا تھا۔ انہیں اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی کہ جس شخص کو انہوں نے برسوں سہارا دیے رکھا۔ وہ انہیں اللہ کے احسانات کا ایسا صلہ دے گا۔ یہ تو سراسر ان کی بدنامی تھی کہ مال ان کے گھر سے برآمد ہوا تھا۔ اور خدا کو اسے کلو اعتراف جرم نہ کرتا تو آج وہ کسی کو بھی نہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔ بہر حال ایک بات ان کے لیے باعث اطمینان تھی کہ کھوکھو کی اصلیت ان پر ظاہر ہو گئی۔ انہی سوچوں میں غفلت

وہاں وہ مسجد کے احاطے میں داخل ہوئے۔ وہ جوتے اتار رہے تھے کہ ان کی نظر مسجد کے چھوٹے سے محن کے عین وسط میں پڑی کسی چیز پر پڑی۔ ”کیا ہے؟“ وہ تو پر بڑھائے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ لائین اور لائین سمیت اس ”چیز“ کے پاس موجود تھے۔ وہ کوئی آدمی تھا جو اس طرح سنا ہوا پڑا تھا جو دور سے کوئی ٹھری ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کا دہانا بازو تھا جس سے اس کا چہرہ چھایا ہوا تھا۔ ”کون ہو بھائی؟“ مولوی صاحب نے لائین اس کے چہرے کے قریب کر کے اس کا بازو اس کے چہرے سے ہٹایا۔ چہرے پر نظر پڑتے ہی نفرت کی آگ ان کے پورے وجود میں دھک اٹھی۔ ”یہ کم بخت ابھی کم کر انہیں۔“ وہ غصے سے بڑھائے۔ وقتاً ان کی نظر غلو کے داسے ہاتھ میں دے ایک ایک کاغذ پر پڑی۔ ہاتھ کس خیال کے تحت انہوں نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے نکال لیا۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ گوسور ہے۔ انہوں نے شبنم سے بیچے ہوئے کاغذ لائین کے قریب کیا۔ وہ لکھائی گلوہی کی تھی۔ ان کی نظر خیر پر روڑنے لگی۔ لکھا تھا۔

”استاذ خترم! ایک نہایت شرمیلی بات آپ کو بتانا مقصود تھی۔ میں اگر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ میرے من سے ایک لفظ بھی سنا گوارہ نہ کرتے۔ اس لیے کاغذ قلم کا سہارا لے رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تجھ کی نماز کے لیے سب سے پہلے اپنی مسجد میں آئیں گے اور میرا یہ خط آپ تک پہنچ جائے گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں حق پاؤں گا۔ ویسے بھی میری زندگی تو بے کار ہی ہے۔ شاید اب تو پھر مرنے پر مجبور ہو جائے گا ہوں بس اسی لیے اب جیسے سے جی ہی احاط ہو گیا ہے۔ شاید اسی لیے یہ ڈوری ٹوٹنے لگی والی ہے لیکن اس سے پہلے میں جانتا ہوں کہ اصل بات آپ کو بتا دوں۔“ زبورات پوری کرنے والا میں نہیں بلکہ آپ کا اپنا بیٹا غیاث الدین ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے پیٹ کو روٹی اور تین کے لیے کپڑا آپ ہی کے وسیلے سے میسر تھا۔ میں کمزور ما انسان بس انتہائی حق ادا کر سکا۔ میرے حسن! آپ کا بیٹا صرف جو سے اور شراب کا بھی نہیں، چور بھی عادی ہے۔ خدا را سے راہ راست پر لائے تاکہ آئندہ وہ آپ کے لیے ذلت اور بدنامی کا باعث نہ بنے۔ گزشتہ رات جب میں کھوکھو کی طرف آ رہا تھا تو میں نے غیاث الدین کو ایک پولی ہاتھ میں لیے اسے گھر کی دیوار پر ہانکا کر اندر جاتے دیکھا تھا۔ شاید اس کی نظر کچھ پریشان پڑی تھی۔ اس وقت تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اس پولی میں کیا ہے؟

لیکن صبح جب وہی پولی آپ کے حجرے سے برآمد ہوئی تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب چودھری فتح محمد آپ کے ساتھ انتہائی بدترین سلوک کرے گا۔ کیونکہ اس کی کوشش تو ہمیشہ ہی رہی ہے کہ کسی طرح آپ کا سر نیچا رہے۔ مگر مجھے یہ سب منظور نہیں تھا۔ اس لیے میں نے چودھری کا الزام اپنے سر لے لیا۔ میں آپ کی عزت بچانے کے لیے یہی کر سکتا تھا۔ میرے محن غیاث الدین کو چھایا کہ وہ ایسے افعال سے باز آ جائے۔ روٹی اور کپڑے کے علاوہ مجھے آپ کی ذات سے علم و آگاہی کا شعور بھی ملا ہے مولوی صاحب جس نے مجھے زندگی کے سچی بہت اچھے انداز میں نبھائے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ مگر جب اس کا احساس ہوا تو میں نے بسے بھر کی تاخیر نہیں کی اس کا حق ادا کرنے میں۔ بس آخری خواہش یہی ہے کہ آپ تک کسی طرح میری یہ بات پہنچ جائے کہ آپ کی مجھ پر محنت رائگاں نہیں گئی۔ میں نے ایسا کوئی گناہ نہیں کیا کہ آپ کا سر نیچا ہو جائے۔ بحیثیت انسان مجھے جو غلطیاں، کوتاہیاں ہوئی ہوں انہیں معاف فرما دیجئے گا۔“

اس سے آگے کاغذ خالی تھا۔ مولوی صلاح الدین کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو بہتے ہوئے کاغذ کو مزید بھگو رہے تھے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ وہ روہے تھے اور کھوکھو بھگور رہے تھے۔

”اللہ جاہیر سے بچے، اللہ جاہتباب اللہ جا۔ میں نے تجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ مجھے بھول ہوئی ہے میرے بچے معاف کروے مجھے۔“ وہ سچ تو ہے مجھے مگر اب تو سب کچھ لا حاصل تھا۔ کھوکھو بہت دور جا چکا تھا اور جاتے جاتے ثابت کر گیا کہ اچھا یا برائی کی کسی میراث نہیں ہے۔ کسی ایک ذات یا قوم کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بہت اونچی ذات کا آدمی بھی بہت گھٹا سوچ کا مالک ہو سکتا ہے اور بہت معمولی سے آدمی کی شخصیت بھی اونچی اوصاف سے مزین ہو سکتی ہے۔ کھوکھو چل بسا تھا لیکن مولوی صلاح الدین کی آنکھیں کھول گیا تھا۔ انہیں عملاً بتا گیا تھا کہ ہیرا میرا ہی ہوتا ہے خواہ وہ بکرے کے ذریعہ بری کیوں نہ پڑا ہو۔

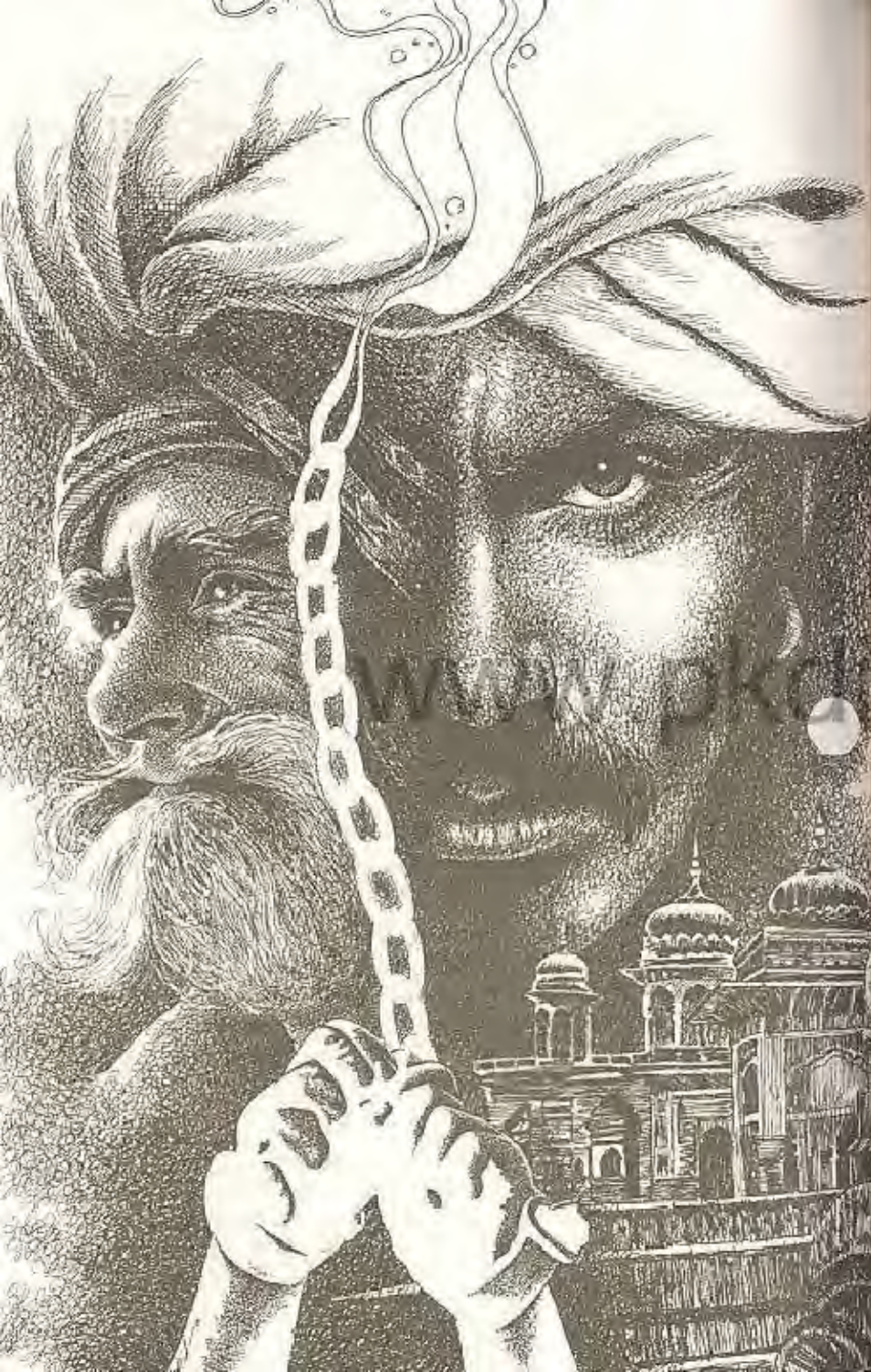
وہ چاند تو نہ تھا مگر چاند کے گرد کھینچا ہوا ایسا ہوا جو خود کو مان کر کے چاند کی روٹی بڑھانے کا باعث بنا ہے۔ اس نے بھی یہ سب سمجھ لیا تھا اپنی ذات پر۔ اسے محسن کے چاند کو مخلوق کر دیا تھا۔



کے بار بار

کوئی اگر وقت کی صورت دیکھنا چاہے تو
انسان کے بدلے روپ دیکھے۔۔۔ وقت کا کام
بظاہر گزر جانا ہے مگر۔۔۔ پھر سے کسی نئے روپ
نئے پیراہن میں ڈھل کر پلٹ بھی آتا ہے سمندر کا
سنگوت یہ یقین دلانا ہے جیسے سب کچھ ٹھیک ہے
لیکن۔۔۔ اس کی گہرائی میں کتنے طوفان مچلتے ہیں
کوئی نہیں جانتا۔۔۔ اس کی زندگی بھی کسی طوفان
بلاخیز سے کم نہیں تھی۔۔۔ جس کا مشغلہ تلاطم
وہابیاتی اور جس کی شوخی بادوباراں جیسی تھی۔۔۔
جس کی باغی فطرت اسے بے چین رکھتی۔۔۔ قیم و فراست
آسمان سے باتیں کرتی اور سماعت و بصارت ہمیشہ دور کی
کوڑی لاتی تھی۔۔۔ اس کی طلسماتی شخصیت کے آگے کیا تخت
وتاج اور کیا سلطنت کی اوقات۔۔۔ وقت بھی جیسے اس کے آگے
ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔۔۔ جسٹ اس کا غلام اور محبت اس کی کنیز
تھی مگر۔۔۔ اسے ایک طویل سفر درپیش تھا۔۔۔ کیونکہ اسے صفحہ
قرطاس پر ایک طویل داستان رقم کرنے کے لیے جنگلوں سے ہستی اور
ہستی سے صحرا کی سمت دشوار گزار حالات سے برسوں بیکار رہنا تھا

عس درگس ہر قوں کا سلسلہ ایک بحر الوردی طویل داستان



تھا۔ میرا بڑا چاہا جیلا بار باؤٹ ٹرن ہو کر ایک انوکھے سفر کا آغاز کرنے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

پولیس اور انٹیلی جنس والے فارم ہاؤس میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں یہ معاملہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا کہ وہاں وہ کتوں اور تین انسانوں کو کس نے ہلاک کیا ہے اور واردات ایک اجڑے ہوئے فارم ہاؤس میں کیوں کی گئی ہے؟ میں ان کے لیے سیکورٹی فراہم کر چکا تھا۔ انہوں نے دو لاشوں کے قریب سچی پر لکھے ہوئے فون نمبرز پڑھے تھے۔ آئندہ ان نمبروں کے ذریعہ وہ معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ کتوں کے ٹریزر اسلام آباد سے آئے تھے۔ وہ لاہور میں ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں کر سکتے تھے۔

انٹیلی جنس کے ایک افسر نے نادر شاہ کے فون نمبرز بیچ کئے۔ وہ فون میری تحویل میں تھا۔ میں نے کانگ فون سن کر اسے کان سے لگایا۔ اس افسر نے پوچھا۔ ”کیا میں آپ کا نام معلوم کر سکتا ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”آپ صرف نام ہی نہیں، حرام موت مرنے والوں کے مکمل پتے بھی معلوم کرنا چاہیں گے؟“

اس نے جلدی سے کہا۔ ”بیک ہم قانون کے محافظ ہیں۔ آپ جی ایس اے ان ہم سے تعاون کریں۔“

میں نے نادر شاہ کی رہائش گاہ کا پتا بتا کر کہا۔ ”باقی دو لاشیں ان کتوں کے ٹریزر کی ہوں گی۔ لاہور میں شاید پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے پاس ایسے بلند ہاؤز نہیں ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے انہیں اسلام آباد سے لایا گیا ہے۔“

میں نے اٹاکہ کر رہا تھا۔ پھر اس فون کی تمام کال لی۔ وہ افسر مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے کال کر رہا ہوگا اور رابطہ ہونے پر ہتھیار رہا ہوگا۔ میں جانتا تھا اب وہ نادر کے گھر پہنچ کر مزید معلومات حاصل کرے گا اور میرا خیال درست تھا۔ انہیں یہی کرنا تھا۔ وہ لوگ نادر شاہ کی کونسی میں پہنچ گئے۔ میری جی ٹی ٹرن میں کون سے معلوم ہوا کہ وہ یہ وہ ہو گئے ہیں اور نادر شاہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ پہلے تو اسے لیفٹن نہیں آیا۔ وہ اپنی جوان اولاد کے ساتھ اسپتال میں پھر خاندانی لاش کو شناخت کرتے ہی رونے لگی۔ افسر نے پوچھا۔ ”کیا آپ اپنے شوہر کے قاتلوں کی شناخت کر سکتی ہیں؟“

وہ جانتی تھی کہ یہ باپ بیٹے اور داماد کے درمیان جان لیوا دشمنی کا نتیجہ ہے۔ اس کے بابا جانی نے پھر مراد اور سلطان نے اپنی بیٹی اور کون کے سہاگ کو کتوں کے آگے ڈال دیا ہے۔

شرمین نے فوراً ہی کسی کو انعام نہیں دیا۔ اسے بڑے بھائی منور پر بھروسہ تھا۔ وہ پہلے اس سے بات کرنا چاہتی تھی اور اس کے مشورے کے مطابق کوئی بیان دینا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میرے ماما آج صبح بھائی جان کے ساتھ فارم ہاؤس گئے تھے۔ میں پہلے ان سے بات کروں گی۔ پھر آپ کے سوالوں کے جواب دوں گی۔“

”آپ کے بھائی جان کون ہیں اور کہاں ہیں؟“

”ان کا نام منور غازی ہے۔ انہیں بھی فارم ہاؤس میں ہونا چاہیے تھا۔ میں ابھی گھر سے اسپتال آئے تک کئی بار ان سے فون پر رابطہ کرنے کی کوششیں کر چکی ہوں۔ لیکن یہی معلوم ہو رہا ہے کہ گھر بند ہے۔“

افسر نے کہا۔ ”جب منور غازی آپ کے شوہر کے ساتھ گیا تھا تو یقیناً وہ واردات کے وقت وہاں موجود رہا ہوگا؟ خود بخود ان کو دیکھ کر کہیں چھپ گیا ہوگا۔“

ایک افسر نے کہا۔ ”جیسے والے کو اب قانون کے محافظوں کے پاس آنا چاہیے۔ قانون کی نشاندہی کرنی چاہیے۔“

”شاید وہ اب بھی اپنے لیے خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ وہ ہماری رہنمائی کے لیے وہاں زمین پھون پھونک کر کھڑا ہے۔“

دوسرے افسر نے کہا۔ ”جب وہ فون نمبر لکھ سکا ہے تو قاتلوں کے نام اور پتے بھی بتا سکتا ہے۔ میں نے فون پر اس سے بات کی تھی۔ اس نے صرف دو نمبروں کی گتیاں بتا کر پھر فون بند کر دیا۔ اب وہ نمبر مسلسل بند چار رہا ہے۔“

ایک جاسوس نے کہا۔ ”وہ مختل کا سالہ ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ہم سے چھپ رہا ہے۔ مگر وہ اپنی بہن کو تو فون پر اطلاع دے سکتا تھا کہ وہ جینے ہو چکی ہے اور اپنے رویوش رہنے کی وجہ بتا سکتا تھا۔“

ابھی وہ تمام جاسوس بھنگ رہے تھے۔ منور پر شبہ کر رہے تھے کہ اسی نے شاید بہنوئی کو قتل کر لیا ہے اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا ہے تو پھر کیوں چھپ رہا ہے؟ وہ لوگ منور کی کوٹھی میں آ کر ایسے ہی سوالات کر رہے تھے۔ لیکن خاطر خواہ جوابات نہیں مل رہے تھے۔

منور کی بیوی اور جوان بیٹیاں اپنے اس کے گم ہو جانے سے پریشان تھیں۔ فون پر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ آہر شرمین کے دل میں یہ شبہ پکڑ رہا تھا کہ اس کے بھائی جان نے اپنے بہنوئی کو قتل کیا ہے۔ دار کو ہلاک کیا ہے۔ شرمین اور منور کی بیوی کے درمیان بڑی دشمنی تھی۔ بڑا اعتماد تھا۔ اب وہ اعتماد اور دوستی ختم ہو رہی تھی۔ ان کے درمیان اختلافات شروع ہونے والے تھے۔ منور نے واقعی نادر کی موت کا سامان کیا تھا۔ وہ پھر قصور نہیں تھا مگر مظلوم تھا۔ زعموں کے

باعث شہم مردہ اور نیم مرد ہو کر ایک خفیہ علاج گاہ میں پڑا ہوا تھا۔

پلا اسے کب تک چھپا کر رکھ سکتا تھا؟ وقت گزرنے کے ساتھ اسے منظر عام پر اور بیوی بچوں کے درمیان آنا تھا اور انکوائری وارث بننے کے سلسلے میں پھر سے جدوجہد کا آغاز کرنا تھا۔ بکرے کو پھر کسی وقت میری شخصی چھری تھے آنا تھا۔

باپ پلا اپنے آقا شوکت شاہنواز کو خزانے کا راز بتا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ آئندہ اس کا آقا پھر سے معاملات سے غائب نہ رہے گا اور منور کو بھی خاطر خواہ سیکورٹی دینے پر راضی تھا۔ اس نے بے کو ہدایت دی تھی کہ مجھ سے رابطہ کرنے اور ٹیلی فون کے ذریعے مجھے اپنے آقا سے متعارف کرائے۔ لیکن اس کے پاس میرا فون نہیں تھا۔

میں نہیں جانتا تھا وہاں کیا ہو رہا ہے؟ میں تو اپنے طور پر جان لیوا سکون پر باد کرنا چاہتا تھا۔ ان سب کے فون نمبر حاصل ہو چکے تھے۔ میں نے بے کے نمبر کیجے۔ اس نے کانگ فون کی۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خطرے کی گھنٹی سن رہا ہے۔ اس نے فون کو کان سے لگایا پھر پوچھا۔ ”ہیلو۔ کون؟“

میں نے بھرپور آواز میں کہا۔ ”فارم ہاؤس۔“

ایک دم اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ ڈراما الجھا پھر سبیل کرخت کچھ میں بولا۔ ”میں نام پوچھ رہا ہوں۔ کون ہو تم؟“

میں نے کہا۔ ”دوست۔۔۔“

وہ چونک کر خلا میں تنکے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے فارم ہاؤس کا منظر تھا۔ وہاں دو کتوں کی اور تین انسانوں کی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ پہلے اس نے سخت لہجہ اختیار کیا۔ اس بار ڈراما کسٹ خوردہ سا ہو کر بولا۔ ”تم۔ تم پر اسرار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ آ۔ آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”آگے کچھ کہنے سے پہلے ہی تم سارا کھیل سمجھ چکے ہو۔“

”ہاں۔ ٹھیک ہے۔ سمجھ گیا ہوں۔ کھل کر بولو۔“

میں نے کہا۔ ”اپنے خاص آدمی کو وہاں سے اٹھا کر لے گئے۔ باقی لاشوں کو پکڑا کچھ کر چھوڑ دیا۔ یہ نہیں سوچا کہ جیسے کدوڑی میں گل ہو سکتا ہے۔ ویسے ہی پکڑے سے سو باگل فون اور ان کی شناخت مل سکتی ہے۔“

وہ فون کو کان سے لگا سے گم سم سمہا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم نے اپنے فون کے ذریعے نادر شاہ سے اور کتوں کے مالک سے رابطہ رکھا تھا۔ وہاں تمہارے نمبر مسیو تھے۔“

اس نمبر پر ابھی میں بول رہا ہوں۔ اس کے بعد قانون کی گرجتی برقی آوازیں سنائی دیں گی تو بھاگتے اور چھپتے بھرا گئے۔“

وہ بولا۔ ”نہیں۔ تم۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔“

”موت سے ملاقات ہوتے ہی زندگی کی بغل ڈوب جاتی ہے۔ مجھ سے ملنے کی اعتقاد آرزو نہ کرنا۔ ڈوب جاؤ گے۔“

”تم چاہتے کیا ہو۔۔۔؟“

”مجھے تم سے کرنا اور تم سے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ مجھ سے کسی طرح کا بھگوت نہیں ہوگا۔ میں ہر روز پھر پھر کمر لے لے کر تمہارے ڈوبنے اور ابھرنے کے مناظر دیکھتا رہوں گا۔“

وہ ذرا چپ رہا۔ پھر بولا۔ ”مجھے کچھ اندازہ ہو رہا ہے۔ شاید میں تمہیں پہچان رہا ہوں۔“

”مجھے پہچانتے رہنا۔ پہلے اپنی سلامتی کی فکر کرو۔ تم اس دشمنی کو فارم ہاؤس سے لے جاتے وقت یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تمہاری دونوں گاڑیوں کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔“

یہ ایک اور دھماکا تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا تم نے اسپتال تک پہنچا کیا تھا؟“

”فلت کر دو۔ میں اس کے دفتر بھرنے تک پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو وہاں نہیں پہنچاؤں گا۔ میں نے کہا تھا۔ بڑے آرام سے ہر روز انجوائے کرنا رہوں گا۔“

وہ ڈراما سوچنا رہا۔ پھر بولا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں تم کون ہو؟ تم۔ تم بہت ہی خطرناک ہوؤ گے۔ ہو۔ ہماری پھیل کا پھوڑا ہو۔ تمہیں پکڑنے کے لیے بھی ہند کرتے ہیں تو پھوڑے سے تمہیں اٹھنے لگی ہیں۔۔۔ عمیر بن غازی! میں تمہیں پہچان رہا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”سنا ہے عمیر بن غازی بیمار اور کمزور ہے۔ بڈیوں کا ڈھانچا ہے۔ ایسا شخص بستر خلاص سے کیسے اٹھے گا؟ فارم ہاؤس اور پھر اسپتال تک کیسے پہنچے گا؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ ”چلو گئے تو بھول گیا۔ میں وہی ہوں۔ تم نے دو بار انکار کیا ہے۔ میری بار بار ڈانٹنے کے لیے خون خوار کتوں کے ساتھ آئے تھے۔ اب کیا ارادہ ہے؟“

”میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے بھاری دیکھیں کے کہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہا۔ اب یہی نقصان پہنچانے والا توقع سے زیادہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ تم ایک بار مجھے آزما کر دیکھو۔“

”مجھے کس طرح آزمانا چاہیے؟ اور کیوں آزمانا چاہیے؟“

”میں اپنی بہتری کے لیے تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔“

میں نے عزت مآب شوکت شاہنواز سے تمہارا ذکر کیا تھا۔ وہ ایسے جن جنسی انتظامات کریں گے کہ موت بھی اجازت حاصل کیے بغیر تمہارا قریب نہیں آ سکی گی۔"

وہ ذرا سنجیدگی سے کہتا تھا: ”نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ جب تک تقدیر میں لکھا ہے، تم جیو گے۔ بڑے بڑے شاعر خطرہ کے دھمکے میں بار بار نہیں اٹھ اٹھیں گے۔“

”مگر میں تو بار بار اٹھا ہوا چاہتا ہوں۔ تم لوگوں نے مجھے اس کھیل کا حادی بنا دیا ہے۔“

”خدا کے لیے میری بات کو مذاق نہ سمجھو۔ تم کہیں جاؤ، تمہیں عزت مآب شوکت شاہنواز...“

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”اے عزت مآب کرپٹ سیاستدان کی عزت کیا ہے؟ جب حکومت کرتی ہے تو یہ لوگ بھی اوندھے منہ گریڑنے لگتے ہیں یا ملک چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ جیسے ہزار باغ نہ دکھائے۔ صرف اپنی بات کرو۔“

”اچھا بات کیا کروں؟ تم نے پہلے ہی کہہ دیا ہے مجھ سے مجھوتا نہیں کرو گے۔“

”اس کے باوجود اتنی مہربانی کروں گا کہ پولیس والوں کو اس اسپتال تک نہیں پہنچاؤں گا۔“

”میں تمہاری اس مہربانی کو کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”اے احسان! دوسرا طریقہ یہ بکروں گا۔ ایک قویہ کہ منور کو اس اسپتال سے کسی دوسری جگہ قفل نہیں کروں گا۔ میرے آدمی اس کی اور تمہاری نگرانی کر رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ جگہ تبدیل کی جائے۔“

”ٹھیک ہے۔ اس میں ہماری بہتری ہے۔ منور کا علاج یہیں رازداری سے ہوتا رہے گا۔“

معلومات فراہم کرو۔ اس کا فون نمبر اور رہائشی پتہ بتاؤ۔ وہ یہاں آکر تمہارے علاوہ اور کتنے لوگوں کے کام لے رہا ہے؟“

وہ منور اور نادر سے گھٹے جو شوکر کے ہمارے ملک میں آیا ہے۔
تاہم ان سے بھی چھپ کر اپنا رخ پائش گا میں بدل رہتا ہے۔ ہم
سب سے فخر کے ذریعہ راہ پر رہتا ہے۔“

”اس نے کتوں کے ذریعے مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ منتخب
 منصوبہ بنایا تھا۔ اسے کامیابی کا حقیقی یقین ہو گا۔“
 اپنے کاہلی کرتے کے لہو ضرور آیا ہو گا۔“
 ”ہو سکتا ہے آیا ہو یقین مجھ سے قسم کے لو... میں نہیں

اور تم نے جس طرح نادار اور منور کی اتر میں ان فریزز تک پہنچا دی تھیں وہاں کی داوے۔۔۔ تم نے اپنی جان تو بچا لی ہے۔ مگر اپنے بچے کو خسراناوا ہے۔“

وہ خاموش رہا۔ کچھ سوچتا رہا۔ میں نے پوچھا۔ ”چپ کیوں لگتی ہے؟“

"میں مرنے پامارنے آیا ہوں۔ ڈرنے نہیں آیا۔ کل کسی بھی وقت تمہاری شامت آسکتی ہے۔"

ڈھانچا بن گئے ہو۔ کیا میری ایک حیرانی دور کرو گے؟
میں نے پوچھا۔ ”حیرانی کیا ہے؟“

حلقے سے بچ گئے؟ کیا کوئی جادو منتر سیکھ لیا ہے؟ ابھی طاقتور بن جاتے ہو اور کبھی کمزور دکھائی دیتے ہو؟“

”تمہارے جیسا بے ایمان اور مکار ایمان کی بات
 بیایمان کی باتیں ہیں۔ تم اسے چارویں سمجھتے رہو گے۔“

ہمارے درمیان کوئی عداوت نہیں رہے گی؟ تو راجلہ جلدی سے
 بتا دو! اب تو حلال کی کمائی کھاؤ گے ناں؟“

”پھر تو کالے دھندوں سے کمائی ہوئی دولت اور وہ

خزانہ بھی تمہارے لیے حرام ہو چکا ہے۔“
 ”درست کہہ رہے ہو۔“
 ”وہ تمہارے کسی مصرف کا نہیں رہا۔ اسے میرے اور

حصہ میری حلال کمائی سے حاصل کیا ہوا ہے۔ باقی تین حصے بیت المال میں جانیں گے۔“

جہاں بھی چھپا ہوا ہے۔ جو بھی اس خزانے کا مستحق ہے اللہ تعالیٰ اسے وہاں پہنچا دے گا۔“

”دوست مجھ رہے ہو.... کام نہیں آؤں گا۔ تمہارا کام

آنے ہی والا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہاں تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ ویش آں.....“

زندگی شروع کرنے والا تھا۔

مکہ پایا کچھ نہیں ہے سراسر نقصان ہی اٹھاتے آرہے ہیں۔
 تاجدار شاہ کی بیوی یعنی میری بیٹی شریمن بیوہ ہوئی تھی۔

تقریباً دھائی گھنٹے۔ جب بھی واپس آئے گا تو شوہر بن کر نہیں
 سبکی بن کر رہے گا۔

یہ پرانی کہاوت ہے کہ گتھوں کے ساتھ گتھیں بھی پیدا جاتا ہے۔ ان کے درمیان شرارہ خواہ مخواہ پس رہی تھی۔ منور اور نادر نے اس کے ذریعے دیکھے ٹریپ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ قصداً برباد ہو چکا تھا۔ میں نے شرارہ سے وعدہ کیا تھا کہ اسے منور کی کوٹھی سے نکال لاؤں گا بعد میں منور بھی راضی ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ نادر کو ٹھکانے لگانے کے بعد شرارہ کو وہاں سے گھر جانے کی اجازت دیدے گا۔

شرارہ ایک بار مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان فون پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ اب اس نے موجودہ حالات سے گھبرا کر مجھے فون پر مخاطب کیا۔ ”آپ کہاں ہیں؟ یہاں منور صاحب کی کوٹھی میں لوگس اور ان کی جمن والے آ رہے ہیں۔ سنا ہے نادر شاہ کا مردہ ہو گیا ہے اور منور صاحب لا پتا ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں ان کے ساتھ یہاں کوٹھی میں آئی تھی۔ ہاتھیں میرے ساتھ کیا ہوتے والے؟“

میں نے تسلی دی۔ ”فکر نہ کرو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ ”آپ نہیں جانتے یہاں کیا ہو رہا ہے؟ پولیس والے میرے بارے میں بھی سوالات کر رہے ہیں۔ پولیس باہمی نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا ہے کہ میں ان کی بہن ہوں۔ آج آئی ہوں کل چلی جاؤں گی۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالیں۔“

میں اس کی برائائی کو سمجھ رہا تھا۔ وہ پچھلے دو دنوں سے جیسے ایک قیدی کی حیثیت سے تھی۔ اپنی مرضی سے کوٹھی کے باہر قدم بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ بولی۔ ”یہ تو میں اچھی طرح سمجھ چکی ہوں! آپ بہت زبردست ہیں۔ جو آپ سے دشمنی کرتا ہے منور کی کھاتا ہے۔ آپ کا کچھ نہیں جاتا۔ میں آپ کی پناہ میں آتا چاہتی ہوں۔ مجھے اچھی اپنے پاس ملا لیں۔“

”میں کائنات پر چلنے والا ایک تہارا رہی ہوں اور آئندہ بھی تہارا رہوں گا۔ میری پناہ میں رہنے کی بات نہ کرو۔ میں نے ایک بار تلے کا وعدہ کیا ہے۔ کل میں یہ وعدہ پورا کر دوں گا۔“ اس نے برائیاں ہو کر کہا۔ ”کل بہت دور ہے۔ آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ۔“ مجھے آج بلکہ ابھی یہاں سے نکالیں اور ملاقات کریں۔“

میں سوچنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”آج آپ سے ضرور ملوں گی۔ بس میری اتنی ہی خواہش پوری کریں۔ خدا آپ کی مرادیں پوری کرے گا۔“

اس کی یہ بات دل کو گئی۔ آج عشا کے بعد میری بہت بڑی اور بہت ہی اٹوٹی مراد پوری ہونے والی تھی۔ میں

مسرتوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایسے میں اس کی ایک خوشی پوری کرتا میرا فرض تھا۔ میں نے کہا۔ ”فون بٹیس کر دو۔“

اس نے پوچھا۔ ”آپ مجھے بلا رہے ہیں نا؟“ میں نے کہا۔ ”پہلے بٹیس کو بلاؤ۔ اسے فون دو۔“ وہ قدرے مایوس ہو کر بولی۔ ”لوچھا۔ ابھی بلائی ہوں۔“ ٹھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر میری بیوی کی آواز سنائی دی۔ ”بابا جانی! آپ نے مجھے بلایا ہے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یقین کر لو۔ میں ہی بول رہا ہوں۔“ وہ میری آواز سن کر یقین کرتے ہی رونے لگی۔ روتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بابا جانی! ہم برباد ہو رہے ہیں۔ آپ کے سب سے لاڈلے صاحبزادے لا پتا ہیں۔“

وہ بہت کچھ بتانے والی تھی۔ میں نے کہا۔ ”آگے کچھ نہ کہو۔ میں تم لوگوں کے تمام حالات سے باخبر ہوتا ہوں۔ منور کے لیے آئندہ بہاؤ۔ دو کچھ روز کے بعد وہاں آجائے گا۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”خدا کا شکر ہے۔ میں سمجھ گئی! آپ نے میری کی بہتری کے لیے اسے کہیں چھپا کر رکھا ہے۔“ ”تم کچھ بھی سمجھتی رہو۔ پولیس اور منور کی جمن والوں سے یہ نہ کہنا کہ مجھے فون پر باتیں کر چکی ہو۔“ ”مجھے نہیں کہیں گی۔ میں نے فون پر جان دیا ہے کہ آپ بھی لا پتا ہیں اور ہم آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”اس بیان پر قائم رہو۔ شرارہ کو وہاں سے جانے دو۔ ابھی ایک کھٹے کے اندر ایک گاڑی وہاں آئے گی۔ شرارہ کو اس گاڑی میں روانہ کر دو۔“

”آپ کا حکم سر آکھوں پر۔۔۔ آپ منور سے کہہ دیں کہ ہم سب تحریرت سے ہیں۔ پہلے ان کے لیے روہ ہے۔ اب نہیں روہیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”مگر آئندہ سوچو۔ کوئی خوش نظر آؤ گی تو منور کی جمن والوں کو بھی ہوگا۔ وہ سمجھیں گے کہ میں منور کی تحریرت معلوم ہو چکی ہے۔ پھر تو وہ تہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”نہیں۔ میں خوش نظر میں آؤں گی۔ پہلے کی طرح بائے ہائے کرتی رہوں گی۔ ابھی فون بند کرتے ہی رونا شروع کر دوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”فون شرارہ کو دو۔“ وہ فون اسے دیتے ہی رونے لگی۔ شرارہ نے اسے جبرانی سے دیکھا۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ کسی کو شش کے بغیر چشم زدن میں آنکھوں سے آنسو چھٹک پڑے تھے۔

شرارہ نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”تعب ہے! آپ

سے فون پر رونے کا وعدہ کیا اور اب وہ واقعی دھاروں آنسو بہاتی ہوئی چلی گئی ہیں۔“

”میرے بیٹے نیکیاں اور بیہوش سب ہی ڈرا سے باز ہیں۔ انہیں چھوڑو اور وہاں سے اپنی روانگی کی تیاری کرو۔“ ابھی ایک گاڑی میں بیٹھیں لینے آئے گی۔ ”دونہیں ہوئی تھی۔ خوشی سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ایک دم سے چپک کر بولی۔ ”میں آپ کے پاس آ رہی ہوں ناں۔؟“

میں نے جواب نہیں دیا۔ سوچنے لگا کہ وہ مغرب کی نماز کے بعد یہاں پہنچے گی۔ مختصری ملاقات ہوگی۔ پھر میرے آرمیوں کی نگرانی میں ٹھوکر نماز بیک چلی جائے گی۔ میں اپنی خفیہ رہائش گاہ کا راستہ کسی کو دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے انہی بلائے مناسب نہیں تھا۔ لیکن میں اس سے ملنے کے لیے کسی دوسری جگہ نہیں جا سکتا تھا۔

آج عشا کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آنے والا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ یہاں آئے گی۔ اس سے دو چار باتیں کروں گا۔ اس طرح ملاقات کرنے کا وعدہ پورا ہو جائے گا تو وہ عشا سے پہلے چلی جائے گی۔

میں نے ایک جاں نثار کو ہدایت دی کہ وہ منور کی کوٹھی میں جائے اور شرارہ کو وہاں سے لے آئے۔ لیکن گاڑی کی چابی سیٹ پر تھانے کے بعد اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے۔ جب وہ میری رہائش گاہ کے اندر پہنچ جائے گی تب اپنی کوٹھی جائے گی۔ پھر وہ وہاں سے کی تو اسی طرح اپنی باندھ کر رخصت کیا جائے گا۔ اسے بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کس علاقے کی کس کوٹھی میں مجھ سے ملنے آئی تھی؟

میں نے خوب سوچ سمجھ کر اسے وہاں بلایا تھا۔ مغرب اور عشا کے درمیان اتفاقاً وہ ہونے کے ایک مختصری ملاقات ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ مقررہ وقت پر نہ آ سکی۔ راستے میں دو جگہ ٹریفک کے جھوم نے اسے روک لیا تھا۔ وہ میری کوٹھی میں آئی تو عشا کی آواز ہو رہی تھی۔ میرا ایک جاں نثار اسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر چلا گیا۔ آدھرا اذان پکار رہی تھی۔ اور وہ آگئی تھی اور مجھے نماز کی طرف جانا تھا۔ میں اس سے کہتا چاہتا تھا کہ وہ انتظار کرے۔ اب ایک آدھ کھٹے کے بعد ہی ملاقات ہو سکے گی۔

میں یہ کہنے کے لیے ڈرائنگ روم میں آیا تو اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ ایک جھمبے کی طرح کھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ میں اسے یوں تک رہا تھا پیسے ستر برس گزارنے کے بعد پہلی بار عورت کو دیکھ رہا ہوں۔

ایسی عورت کو جو مجھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کا جادو نہیں بگاڑ رہی تھی۔ مگر اوجھار کا ایک لخت سر چھڑ کر بولنے لگا تھا۔

وہ چپ تھی۔ مگر اس کی سانسیں کھینچ ہوئی خاموشیاں مجھے پکار رہی تھیں۔ میرے اندر شور مچا رہی تھیں۔ ماضی میں نہ جانے کتنی عورتیں آئیں اور گئیں۔ مگر اس کا سراپا کبہ رہا تھا۔ ”میرے جیسی کوئی نہیں آئی ہوگی۔ میں تمہاری زندگی کی چمکی اور آخری عورت ہوں۔ میرے بعد ساری دنیا یہاں آئے گی۔ مگر کوئی عورت ابھی نہیں آئے گی۔“

میں مجھ نہیں بارہا تھا کہ اس میں کتنی کشش ہے؟ میں کیوں اس کی طرف کھینچا چلا جا رہا ہوں؟ اچانک ہی میرے اندر کے تھماڑی نے کہا۔ ”یہ آرائش کی گھڑی ہے۔ آگے جانا ہے۔ نماز کی طرف۔۔۔ حسن جسم کی طرف۔۔۔“

انہیں شمع حسن روشن کر کے فطر تھا کہ ادھر جاتا ہے دیکھو یا ادھر آتا ہے پروانہ۔ میں اسلئے قدموں چمکا ہوا ڈرائنگ روم سے جاتے لگا۔ شاید اس نے میری آہستہ سنی لی تھی۔ بڑے جسم سے بولی۔ ”آپ آگئے۔؟“ مجھے یہاں لانے والے نے کہا ہے آپ خود آ کر یہ پٹی کھولیں گے۔“ میں جاتے جاتے دو دروازے پر رک گیا۔ پھر بولا۔ ”نماز کا وقت ہو گیا ہے۔“

”ہاں میں نے اذان سنی ہے۔“

”آنکھیں اٹھار کر رہا ہوگا نماز کے بعد ملاقات ہوگی۔“ اس نے پوچھا۔ ”ملاقات کسے کہتے ہیں؟ اگر ملاقات میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ بولنے اور سننے ہیں تو ہم بول رہے ہیں اور سن رہے ہیں۔ اب وہی ملاقات ہو چکی ہے۔ آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں دیکھ نہیں پا رہی ہوں۔ یہ نا انصافی ہے۔ آپ نماز سے پہلے انصاف کریں۔ آنکھوں سے پٹی ہٹا کر جائیں۔“

اگر نماز کے لیے وقت وہاں سے پہلے بندے کے حقوق ادا کیے جاسکتے ہوں اور انصاف کرنا ممکن ہو تو ضرور کرنا چاہیے۔ مگر میں قریب جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ آگ نہیں گئی۔ چلا نہیں کھتی تھی۔ مگر بندے کو اس کی اپنی کمزوری جلا دیتی ہے اور میرے پاس ابھی اپنی کمزوری اور قوت ادا کی کو آ رہا تھا کا وقت نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”اپنے ہاتھوں سے پٹی کھول سکتی ہو۔“

اجازت ملنے ہی اس نے پٹی کھول دی۔ میں ذرا قاصدے پر اس کے رویہ کو دیکھا۔ وہ پلٹیں چھپکائے بغیر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”تم نے میری جو تصویر اپنے ذہن میں بنائی تھی۔ وہ منہ پٹی ہوئی۔ میں ہڈیوں کا ڈھانچا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”یقین کریں میں نے یہی تصویر بنائی تھی۔
پچھلے دو دنوں سے آپ کے بیٹے اور داماد کی باتیں سن کر
میرے دل و دماغ میں یہی خاکہ بن رہا تھا۔“
”کیا اس ملاقات سے مایوسی ہو رہی ہے؟“
”ہاں ہو رہی ہے۔ آپ کھڑے آنے کے انداز میں دور
کھڑے ہیں۔“

”میں عبادت کے لیے جا رہا ہوں۔ کیا نماز پرستی ہو؟“
اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔۔“
پھر کہا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔۔“ یہی کئی بار چاہتی ہوں۔“
”آج پہلی ملاقات ہے۔ تم جو مانگو گی وہ تجھے کے طور
پر دوں گی۔ لیکن کیا ابھی تم مجھے ایک ٹھنڈی دیکھی؟“
”میری اوقات کے مطابق جو غلبہ کریں گے وہ
دوں گی۔“

”میں تم سے نماز کی ادائیہا چاہتا ہوں۔“
وہ چٹکتاتے ہوئے اپنے لباس کو دیکھنے لگی۔ میں نے
کہا۔ ”تمہارے پاس وہ بیک رکھا ہوا ہے۔ یقیناً دوسرا لباس
ہوگا۔ کسی کمرے میں جا کر شادلوں لباس تبدیل کرو۔ نماز
اداکرو۔ پھر انتظار کرو۔ ایک آدھ گھنٹے بعد ملاقات ہوگی۔“
میں وہاں سے پلٹ کر اپنے بیڈ روم میں آگیا۔
دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ تاکہ وہ اندر نہ آئے۔ لا شعوری
طور پر میری حالت ایسی تھی جیسے وہ چچا کر رہی ہو اور میں اپنی
بادشاہی کا مجرم رکھنے کے لیے بھاگتا چھڑ رہا ہوں۔ اس نے
ابھی درست کہا تھا کہ میں اس سے کتر رہا ہوں۔

آج کی رات آج کی نماز مجھے اپنی جان سے زیادہ
عزیز تھی۔ میں کسی کی مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ نہ چاہنے کے
باوجود اٹھیں مرؤ و ایک فنڈ جگانے والی کو میرے کمرے کی چار
دیواریں میں میرے استے قہر پ لے آیا تھا۔ ہمارے
درمیان کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ صرف ایک بند دروازہ تھا
جو کسی بھی کمزوری کے باعث کھل سکتا تھا۔

میں وضو کرتے وقت آتھیں پڑھتا رہا۔ بار بار معذرت
تھیں پڑھ کر شیطان مردود کو بھگا تا رہا۔ یہ یقین ہو گیا کہ سخت
آزمائش سے گزر رہا ہوں۔ ہم اپنے مضبوط ارادے سے
باس آنے والی عورت کو دور بھگا سکتے ہیں۔ مگر سیلابی ریلے کی
طرح ذہن میں آنے والے خیالات کو بھگا تا تقریباً ناممکن
ہو جاتا ہے۔ مجھے ناممکن کو ممکن بنانا تھا۔ میں وہی غیر بن
عازی ہوں جو پچھلے دس مہینوں سے اپنے اور بچوں کے
ہاتھوں سے ذمہ کھا رہا۔ مگر مجھے توڑنے والے کسی صورت
توڑ نہ سکے۔

میرے ارادے ہمیشہ فولاد ہی رہے ہیں۔ تمام رات
کھلے آسمان کے نیچے برقرار رہی سے لڑتا رہا تھا۔ موت میرے
قریب آ کر بارگزی تھی۔ میرے اپنے غمزدی ارا دونوں کے آگے
عورت کیا چیز ہے؟
میں مصیبت پر آگیا۔ رسول کریم ﷺ دعا میں مانگا
کرتے تھے۔ ”خدا یا میں برے اخلاق برے اعمال اور بری
خواہشات سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“

پناہ مانگنے کے سلسلے میں یہ ہدایت تھی کہ شیطان کی
طرف سے تجھیں اکساہت ہو تو اللہ کی پناہ مانگو اور کہو۔ ”میرے
پروردگار میں شیطان کی اکساہتوں سے پناہ مانگتا ہوں۔“
میں نے نماز شروع کی تو قہار و قہار نے والے خیالات
دماغ سے فنا ہو گئے۔ صرف اور صرف عبادت کا عمل جذبہ گیا۔
”میرے مجبورانہ نے ایک بار مجھے جوانی دی۔
میں نے غمخسری میں اسے پانی کر دیا۔ ایک بچہ قہر سے کھلنے کو
تا دانی میں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میں نے بھی چھگانے اور
احتقانہ تحریکیں میں اور تیری دی ہوئی جوانی کو بیاریوں کا کھن
بنا ڈالا۔“

جوانی منہ زور آدمی ہوتی ہے۔ ہوش و حواس بہالے
جاتی ہے۔ اس دور میں ساری رنگینیاں یاد رہتی ہیں۔ صرف
خدا یا وحش آتا میں نے بھی تجھے بھلا دیا تھا۔
میں شرمسار ہوں۔ تو مجھے جیسے گناہگار بندے پر رحمتیں
نازل کر رہا ہے۔ تیری رحمتیں اور نواہتیں ذہن سے ہلا
ہیں۔ آج یہ وعدہ کرتا ہوں از سر نو ملنے والی جوانی کے ایک
ایک لمحے میں شیطان پر غفلتیں بھیجتا رہوں گا اور تیرے
بندوں کے کام آتا رہوں گا۔ ایسے تمام دنیاوی معاملات سے
دور رہوں گا جو کمرہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ ٹوٹے مجھے
قوت ارا دی دی ہے۔ حوصلہ دیا ہے۔ مجھے اور حوصلہ دے
آئیں۔۔۔۔۔۔“

میں عشا کی نماز ادا کر چکا تھا۔ دعا مانگنے کے بعد
بڑے جذبے سے سجدے میں گر پڑا۔ ان لمحات میں شاید
جوانی کی طرف مزمگ تھا۔ اگر ایسا تھا تو یہ نیا سفر سجدے سے
شروع کر رہا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو سجدے میں ہی
رہتا۔ سر نہ اٹھاتا۔ مگر حکم خداوندی ہے کہ صرف دین کے
ساتھ نہیں دنیا کے ساتھ بھی چلو۔

نئی زندگی شروع ہو چکی تھی۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ شروع
ہو چکی ہے؟ میں نے آٹھیں بند کر کے محسوس کرنے کی کوشش
کی۔ ”کیا میرے اندر کوئی تبدیلی ہو رہی ہے؟“
سجدے کے وقت جسم کا خون دماغ کی طرف کھینچا آتا

ہے۔ ایسا لگتا ہے سر جھکاتے ہی اپنے رب کے سامنے کچھ
چلے آتے ہیں۔ کچھ پائے کا احساس ہوتا ہے۔ میں کیا
پارہا تھا؟ یہ فوراً ہی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک نورانیدہ بچہ نہیں جانتا کہ کس کا دودھ پی رہا ہے؟
وہ رفتہ رفتہ مٹا کی خوشبو سے آشنا ہوتا ہے اور ماں کو پہچانتا
ہے۔ اس وقت میں بھی نورانیدہ بچے کے مانند تھا۔ اپنے اندر
ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھ نہیں پارہا تھا۔ یقیناً آگے جا کر
معلوم ہو سکے گا کہ میں کیا سے کیا ہو رہا ہوں؟

میرے کمرے کے باہر شرارہ ڈرائنگ روم میں انتظار
کر رہی تھی۔ میں نے اسے نماز پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ
شاہرے کر لباس تبدیل کر کے میری ہدایت پر عمل کر سکتی تھی
مگر اس نے کیا کیا کیا تھا۔ دراصل میں نے اس پہلو کو نظر
انداز کر دیا تھا بلکہ بھول گیا تھا کہ عورتوں کی کچھ مجبوریوں بھی
ہوا کرتی ہیں۔

وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ یاد بار
وال تحاک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ بس میں
آنے ہی والا ہوں۔ اسے مجھ جیسے بڈیوں کے ڈھانچے سے
متاثر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ شاید وہ متاثر نہ ہو۔ کوئی اور بات
ہو۔ کوئی اور ضرورت اسے میری طرف متوجہ کر لاتی ہو؟

وہ ایک گھنٹے بعد اٹھ کر کمرے کی ہوئی۔ عشا کی نماز دو
تک ہوئی ہے۔ گمراہی ہو چکی تھیں ہوئی۔ وہ ڈرائنگ روم
سے نکل کر دوسرے کمروں کی طرف گئی۔ دو بیڈ روم کے
دروازے کھلے تھے۔ تیسرا اندر سے بند تھا۔ وہ دستک دینا چاہتی
تھی۔ پھر حرکت گئی۔ دروازے سے کان لگا کر سننے لگی۔

اندر گہری خاموشی تھی۔ اسے وہ خاموشی پر اسرار لگ
وہی تھی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کو دیکھ کر سوچنے
لگی کیا کرے؟ دستک دے گی تو اسراریت ختم ہو جائے گی۔
دروازہ کھل جائے گا۔ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ میں بند کمرے
میں اب تک کیا کرتا رہا ہوں؟

اس نے سراٹھا کر روشن دان کو دیکھا کچھ سوچا پھر ایک
ادنیٰ اسٹول لاکر اس پر چڑھ گئی۔ پلوں کا آؤھا چہرہ اور دو
آنکھیں روشن دان تک پہنچ گئیں۔ کمرے کا پیشتر حصہ دکھائی
دے رہا تھا۔ میں بھی نظر آ رہا تھا۔

اس وقت میں ہاتھ پاؤں کی ہلکی چٹکی سی ورزش کرتے
ہوئے خود کو آزار مار رہا تھا کہ ممکن محسوس ہوئی ہے یا نہیں؟ خدا کا
شکر ہے ان لمحات میں پھر پودہ اتنی محسوس کر رہا تھا۔ وہ بڑی
حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ میں نے اسے نماز پڑھنے کی تلقین
کی تھی اور خود بند کمرے میں آ کر اس پر حا پے میں ورزش

کر رہا ہوں؟

وہ مجھے بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں لگ
رہا تھا جیسے میں کچھ تبدیلی ہو گیا ہوں۔ بالکل ہی بوڑھا نہیں
لگ رہا ہوں۔ اس نے تقریباً دو گھنٹے پہلے مجھے ڈرائنگ روم
میں دیکھا تھا۔ اتنی ہی دیر میں ایسی کیا تبدیلی ہوئی تھی؟ وہ
مجھے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں ایک مارکر لے کر کیلنڈر کے سامنے آگیا۔ وہاں
تجہ تجربہ کار پر دائرہ لگا ہوا تھا۔ تاریخ آگے بڑھتی ہے۔
مجھے سات تجربہ پر نشان لگانا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے پانچ تجربہ
پر دائرہ لگایا۔ یہ اس کے لیے حیرانی کی بات تھی۔ وہ مجھے
آنکھیں میاڑ میاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسی سمجھ ہی نہیں سکتی تھی
کہ میں ایسی کتنی کی طرف کیوں جا رہا ہوں؟

وہ اسٹول سے اتر گئی۔ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے
ہوئے ناقابل فہم باتوں پر غور کرتی رہی۔ پھر اس نے اپنے
فون پر میرے نمبر پر کیے۔ میرا فون بند کے سر ہانے والی میز
پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہاں آکر نمبر دیکھے تو احساس ہوا کہ
میں اسے بڑی دیر سے نظر انداز کر رہا ہوں۔ مجھے وعدے کے
مطابق اس سے ملاقات کرنی تھی۔

میں نے خون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”سوری۔ کچھ دیر
ہو رہی ہے۔ ابھی آتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”فون بند نہ کریں۔ میری ایک بات کا
جواب دیں۔ کیا آپ دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں اور خود
اس پر عمل نہیں کرتے؟“

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”کم نہ کیا جا رہی ہو؟“
”آپ نے مجھے نماز پڑھنے کے لیے کہا اور خود بند
کمرے میں رہ کر اتنی دیر سے ورزش کر رہے ہیں۔“

میں نے حیرانی سے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے
پوچھا۔ ”کیا تم دروازے کی لاٹ سے چھانک رہی تھیں؟“

”پہلے میری بات کا جواب دیں۔ میں نے آپ کے
بیٹے اور داماد کی کئی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا اور جس طرح
آپ دشمنوں کو زیر کر رہے ہیں، اس سے بھی یقین ہو رہا تھا
کہ بوڑھے اور کمزور نہیں ہیں اور ابھی آپ کو دیکھ کر یہ بات
سمجھ میں آ رہی ہے کہ جناب کو جوان بننے کا بہت شوق ہے۔“
مجھے یوں لگا جیسے وہ میری برسوں کی خواہش کو پڑھ
رہی ہو۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم یہاں ایسی ہی ایلی سیدی
باتیں کرنے آئی ہو؟“

”میں نہیں آپ ایلی سیدی حرکتیں کر رہے ہیں۔ چھ
تاریخ کے بعد سات پر نشان لگانا چاہیے تھا۔ آپ نے گزری

شمرقند

سرمردہ روز

کے ساتھ

اعلیٰ کوالٹی گلاس مفت



PET
بائیں میں شمرقند

اس Summer میں صرف شمرقند

اگرچہ اب بھی میں یوڑھا دکھائی دیتا ہوں۔۔۔ مگر بال سیاہ ہو گئے ہیں۔ میرے ساتھ جو قدرتی معاملات ہیں انہیں ندوہ سمجھ پانے کی اور نہ میں قدرت کا بھید سمجھتا ہوں گا۔
میں پہلے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مختصری ملاقات کے لیے آئے گی تو کمر کی بھیدی بننے کی راہ نکال لے گی۔ تاکہ جھانک کرنے والیاں بڑی تیز طرار ہوتی ہیں۔ میں نے سوچ لیا کہ اس سے کچھ باتیں کروں گا پھر اسے رخصت کر دوں گا۔

میں اپنے روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہوئی۔ سر ہلکا جلدو۔۔۔ ہو گئی۔ پتا نہیں اس میں کیسی کشش تھی کہ مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے میرے سر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں جھوٹ کہہ رہی تھی؟ آپ نے خطاب نہیں لگایا ہے؟“
میں نے انہماک میں سر ہلکا کر کہا۔ ”ہاں لگایا ہے۔ مگر یہ نہ جھوٹ کہ میں نے نماز نہیں پڑھی۔ پہلے پڑھی ہے پھر یہ بال سیاہ ہوئے ہیں۔“
وہ بڑی اداؤں سے مسکرا کر بولی۔ ”یعنی مجھے دیکھتے ہی جوان بننے کا ارادہ کر لیا؟“

میں نے ہنچکاتے ہوئے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے ملاقات کرنے کا وعدہ پورا کیا ہے۔ کچھ کہنا ہے تو کہو۔۔۔ اس کے بعد میرے آدمی نہیں گھر چھوڑا میں گئے۔“
وہ بولی۔ ”کبھی بات تو یہ کہ میں چشمی بجا کر بندوں کو پھانس لیتی ہوں۔ مگر آپ کو چھانسنے نہیں آتی ہوں۔ احسان فرماؤں نہیں ہوں۔ آپ میرے محسن ہیں۔ میں آپ کا بیڑے سے بیڑا کام کروں گی۔ آپ کی ہر بات مانوں گی مگر اپنے بدن کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گی۔“

وہ شاید اپنا بھاء بتا رہی تھی۔ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”تم ضرورت سے زیادہ بولتی ہو۔ میں نے تمہاری آرزو نہیں کی ہے۔ تمہیں طلب نہیں کیا ہے۔ تم بہت زیادہ خوش ہو گئی۔“

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”پلیز یہاں کوئی تیسرا نہیں ہے۔ جوچ ہے اس کا اعتراف کریں۔ میں بازاری عورت ہوں۔ کسی بھی مرد سے لگاؤ نہیں چاہ کرتے ہی اس کی نیت کو بھانپ لیتی ہوں۔“

اس نے خود کو بازاری کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”کچھ رہی تھی۔ میں اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جب بازاری ہو تو یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ بدن کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گی؟“

ہوئی پانچ تاریخ پر نشان لگایا ہے۔ کیا آپ اس طرح وقت کو پیچھے کی طرف لے جاتا جاتے ہیں؟“
میں نے کیلنڈر کی طرف دیکھا۔ پھر ادھر ادھر نظریں دوڑاتے لگا۔ روشن دان پر نظر کی۔ تب میں نے کہا۔ ”اچھا تو تم روشن دان سے دیکھ رہی تھیں؟“
”ہاں دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ غلط ہے کہ آپ کو جوان بننے کا شوق ہے؟ اتنا شوق ہے کہ نماز پڑھنے کے وقت بالوں میں خضاب لگاتے رہے؟“

میں نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کیا کیا ہو اس سے؟ میں اپنے کمرے میں آ کر نماز پڑھ رہا تھا۔ خضاب نہیں لگا رہا تھا۔“
”عجب ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے دیکھا تھا تو سر کے بال سفید تھے۔ اب خضاب لگا کر پھر سیاہ کیسے ہو گئے؟“
اس کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے فوراً ہی پلٹ کر آئینے کے سامنے آ کر دیکھا تو حیرت سے ایک خوشگوار سا جھٹکا لگا۔ میرے سر کے بال اور بھویریں سیاہ ہو گئی تھیں۔ کوئی بھی دیکھتا تو یہی کہتا کہ میں نے خضاب لگایا ہے۔ میں ایک دم سے پلٹ کر کنبے کے رخ کرتے ہوئے سجدے میں بیٹھ گیا۔ میری سرسوں کی انتہا نہیں تھی۔ بڑھاپے سے واپس جوانی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اس سے واضح نشانی اور کیا ہو سکتی تھی کہ ابھی عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد کسی وقت میرے بال سیاہ ہو گئے تھے۔

ہمارا موجودہ جنگ کا دور مطلق ہے۔ مٹی بھر میں سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا دیتا ہے۔ وقت کا پیچھے کی طرف گھما دیتا ہے۔ کیلنڈر کی تاریخ پیچھے لے جاتا ہے۔ وہ رب کریم مجھے بڑھاپے کے کھنڈر سے نکال کر جوانی کے گل و گلزار کی سمت لے جا رہا تھا۔ اس واضح نشانی کو دیکھ کر پختہ یقین ہو گیا کہ واپسی کا سفر شروع ہو چکا ہے۔ میرا رب مجھ سے راضی ہے اور آئندہ مجھے اس معبود کی رضا کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ میں نے سجدے میں رہ کر اپنے رب سے وعدہ کیا کہ قیمتی غلطیاں نہیں دہرائوں گا۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر فون کی طرف دیکھا۔ وہ بند ہو چکا تھا۔ شرارہ دروازے پر آگئی تھی۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ”آپ فون پر نہیں بول رہے تھے اس لیے آئی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ڈرائنگ میں چلو میں آ رہا ہوں۔“
میں قالین پر سے اٹھ کر سوچنے لگا۔ ”اس نے ڈرائنگ روم میں سفید بالوں والے یوڑھے کو دیکھا تھا۔

”میں نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ میرے محسن ہیں۔ آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ اپنی یادیں آپ کو کبھی لگاؤں گی۔“ میں نے متاثر ہو کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”تم بہت اچھی ہو۔ یہ بات ہوں کہ تم پر دل آگیا ہے۔ مگر میرے ذہن میں دور تک گناہ کا تصور نہیں ہے۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھنے کے بعد اپنے دین اور شریعت کے مطابق شریک حیات بنانا چاہوں گا۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میری یہ بات اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی کوئی اسے ایسی عزت دینا چاہے گا۔ ابھی وہ بازاری انداز میں آنکھیں میکا رہی تھی۔ اب اچانک ہی اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ ہنسنے لگے میں بولی۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھ سے تنگی کریں اور میں آپ کو مار ڈالوں۔“ میں نے کہا۔ ”ہماری دنیا میں بدترین بیماریوں کا علاج ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں لندن لے جاؤں گا۔ بڑے تجربہ کار ڈاکٹروں سے علاج کراؤں گا۔“

”آگے نہ بولیں۔ آپ کی یہ محبت یہ جذبہ مجھے مار ڈالے گا۔ اب تک تو یہی سن رہی ہوں کہ دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس ایڈز کا علاج نہیں ہے۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ میں ناقابل علاج ہوں۔“

میں نے سر جھکا لیا۔ اس کے لیے دل میں درد پیدا ہو رہا تھا۔ مجھے پائے کا لٹینا ہو اور وہ ملے ملتے بھی نہ مل پائے تو اس کے لیے اور زیادہ کوشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا۔ ”میں آپ سے مدد حاصل کرنے آئی ہوں۔“ میں نے بڑے جذبے سے کہا۔ ”زبان کھولو۔ تمہاری بر ضرورت پوری کروں گا۔“

”میری چھوٹی بہن دس برس کی ہے۔ اس کے لیے پریشان ہوں۔ صاف نظر آتا ہے کہ اسے کوئی عزت سے بیاہ کر نہیں لے جائے گا۔ وہ ایک بازاری عورت کی بہن کہلائی رہے گی۔“

”میں تمہاری پریشانیوں کو سمجھ رہا ہوں۔ مگر نہ کرو۔ تم دونوں بہنوں کو عزت ملے گی۔ ایڈز کا علاج کسی حد تک ہو رہا ہے۔ بعض مریض بھالی کی طرف آ رہے ہیں۔ میں تمہارا علاج کراؤں گا۔ تم ایک ہفتے کے اندر بہن کے ساتھ لندن جاؤ گی۔ وہاں مستقل رہائش اختیار کرو گی۔ تمہاری بہن کی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی رہے گی۔ جب وہاں آؤ گی تو تمہاری حیثیت بدل چکی ہوگی۔ تمہاری بہن بھی کسی عزت دار گھرانے میں بیاہی جائے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

وہ میری محبت اور ہمدردیاں پاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ اسے رونے دیتا کہ اندر کا سارا غبار نکل جائے اور آج کے بعد وہ کبھی آنسو نہ بہائے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کے بیٹے اور داماد سے سنا ہے کہ پڑوسی ملک سے بھی آپ کا ایک دوست آیا ہوا ہے۔ آپ سب ہی پر بھاری پوری ہیں۔ سب ہی۔“ میں نے بظاہر یوڑے بیٹا اور کمزور دکھائی دیتے ہیں مگر حقیقت اسے نہیں ہیں۔

اس نے اٹھ کر اٹھ کھٹے دیکھا پھر کہا۔ ”آج پہلی بار آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ کسی بھی طرح بیمار اور کمزور نظر نہیں آ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”رہ کریم کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ میں شیطان کے حربوں سے بچنے لگا ہوں۔ مجھے جو توانائی حاصل ہو رہی ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ایسی رحمتیں صرف نصیب والوں پر نازل ہوتی ہیں۔“

”آپ مرد ہیں۔ شیطان کے حربوں سے بچ گئے ہیں۔ میں عورت ہوں۔ ایک شیطان سے بری طرح مات کھا چکی ہوں۔ اس نے مجھے دو کوزی کا بنا دیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کون ہے وہ؟“ ”وہ ایک عیاشی جاگیردار اور سیاحانہ بہت ہی با اختیار اور بے لگام ہے۔ آپ نے شوکت شاہ جواز کا نام سنا ہوگا؟“

میں صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے مخالفین کی فہرست میں اس کے نام کا اضافہ ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تم اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟“

”اس سے میں شاید مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا ہوگا۔“ ”میں بر جانا چاہتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”اس کے باپ دادا کے زمانے سے ایک قلمی ادارہ قائم ہے۔ وہاں مفت کھانا کپڑا اور تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ پانچ برس سے لے کر تیس برس کی ایتھلیٹکس و فٹ بال کیوں کو اس ادارے میں تعلیم و تربیت کے لیے داخلہ ملے۔“

بنت میرے پیچھے پڑ گیا۔ اس نے میرے ابا کا اپنی کھچی میں طلب کیا۔ اسے مشورہ دیا کہ مجھے ادارہ تعلیم و تربیت میں داخل کرادے۔

میں بہت غریب تھے۔ کبھی ابا کا کر لانا تو تینوں وقت کھاتے تھے۔ ورنہ قاتل ہوتے تھے۔ اس نے ابا کو پچاس ہزار روپے دیے تو وہ مجھے اس ادارے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ ذرا چپ ہوئی۔ اپنی آنکھوں پر کٹی پڑھتے ہوئے بولی۔ ”میں آٹھ برسوں تک وہاں رہی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ کتنی شرمناک حرکتیں کر رہا ہوگا؟“

”جنگ۔ میں اندازہ کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”دولت مند عیاشی طرح طرح کے شوق رکھتے ہیں۔ اسے کم سن لڑکیوں سے کھیلنے کا شوق تھا۔ وہ پچہ بن کر ان کے ساتھ آٹھ بجو کی کھلتا تھا۔ تاریکی میں انہیں ڈھونڈتا تھا۔ پکڑتا تھا انہیں اچھی طرح ٹٹولتے ہوئے کہتا تھا کہ تم ایلا ہو۔“

وہ بڑی دلچسپ معلومات پیش کر رہی تھی۔ میں توجہ سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بھئی وہ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کہتا تھا کہ میں تم میں سے کسی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ صرف ہونٹوں سے اور زبان سے چھو کر پیمان لوں گا۔ چلو ادھر اصر ہو جاؤ۔ ہم صبح جگمگ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ وہاں مجھ سے بھی کم عمر لڑکیاں مختصر سے لباس میں ہوتی ہیں۔ وہ انہیں ڈھونڈتا ہوا غریب پچھتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوتے تھے۔ وہ اپنے ہونٹوں سے اور زبان سے بدن کے کتنے ہی حصوں کو گولہ گدا تھا۔ لڑکیاں ہنسنے لگتی تھیں۔ وہ ہنسنے جساتے کھینچتے کھلاتے انہیں جوانی کی دہلیز پر پہنچا دیتا تھا۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”میں ان لڑکیوں میں سے ہوں جن پر جوانی آئی نہیں لائی گئی ہے۔ یہ پیش و عشرت میں مست رہنے والے جوانی سے پہلے بچوں کو جوان بنا دیتے ہیں۔ جب بوڑھے ہوتے ہیں تو خود جوانی کی طرف آنے کے لیے بھونک اور سلا جیت کا سہارا لیتے ہیں۔“

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے کسی عارضی سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں قدرتی طور پر واپس جا رہا تھا۔

وہ بڑے دکھ سے بڑے کرب سے بولی۔ ”یہ کسے لوگ ہوتے ہیں؟ ان میں ایک ذرا سی شرم و راسخائیت نہیں ہوتی۔ باپ دھیرے دھیرے فصل پکاتا تھا۔ بعد میں بیٹا آرام سے کھاتا اور دھکیں کرتا رہتا تھا۔ ایسی فیر اتھائی، غیر اخلاقی کڑی حقیقت سن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟“

میں نے عداوت سے کہا۔ ”بڑی شرم آ رہی ہے۔ ایسے لوگوں کے گناہ ظاہر نہیں ہوتے۔ وہ جانتے تو ہم انہیں زندہ نہ چھوڑیں۔ میرا وعدہ ہے کہ وہ باپ بیٹے حرام موت مر رہیں گے۔“

وہ اطمینان سے گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی چاہتی ہوں۔ برکت شاہنواز ان کا مریض ہے۔ اللہ کرے وہ کھل کر مرنا آج مر جائے۔ کتنی ہی لڑکیوں کو ایسے مہلک مرض سے بچاتے مل جائے گی۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ میرے سامنے آگئی۔ دل کی دھڑکنیں یکدم بے انتہائی ہونے لگیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ایک بار اسے چھوٹا چاہتا تھا۔ وہ میرے دل میں اتر چکی تھی۔ کیا ہوا اگر وہ بری طرح تو بچی کھوئی کی تھی۔ بیماریوں کا گھر بنا دی گئی تھی۔ گہری تعمیر تو ہو سکتی ہے۔ جیسے سے مرے سے میری تعمیر ہو رہی تھی۔

بیاد کرنا کہ کافوں میں بھی بھول کھاتا ہے۔ میرے اندر یہ جذبہ تھا کہ اسے صحت مندی کی طرف لانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا۔

اس نے قائلین پر ہنسنے لگ دیے۔ میرے کھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”آپ مجھے سمندر پار بھیج کر میرا علاج کراتا چاہتے ہیں۔ میری بہن کو نیک نامی دینا چاہتے ہیں۔ خدا ان نیک ارادوں میں آپ کو کامیاب کرے۔ آج سے میں آپ کے نام ہو گئی۔“

میں نے ایتھا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ جیسے اسے پالیا۔ دل اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ مگر فاصلہ لازمی تھا۔ اس نے کہا۔ ”آج سے میں ایک ہی دعا مانگتی رہوں گی کہ میرا مہلک مرض ایک دن ایک رات کے لیے ختم ہو جائے اور میں اپنے بیماری تمام حسرتیں پوری کر لوں۔ اس کے بعد بیٹھ کے لیے آنکھیں بند کر لوں گی۔“

میں نے اس کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”مرنے کی باتیں نہ کرو۔ تمہارا پھر پور علاج ہوگا۔ تم میرے لیے جیو گی۔ یولو جیو کی ماں میرے لیے؟“

وہ میرے کھٹنے پر بیٹھ چکی تھیں۔ ”اللہ۔ آپ مجھے کتنا چارو دے رہے ہیں؟ میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہ

تھا۔ میں میرا دل چاہتا تھا۔"

وہ اچانک ہی چونک گئی۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ پھر کھڑی ہوئی۔ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "میں چارٹی ہوں۔ مجھے جانا چاہیے۔ تجھے ڈر ہے؟ ٹھہر گئی تو آپ کے آگے دھیر ہو جاؤں گی۔"

وہ پلٹ کر اپنے بیک کے پاس مٹی۔ وہاں رک کر بولی۔ "میری آنکھوں پر پتلی باندھ دیں۔ آپ کی اس پناہ گاہ کو خفیہ رہنا چاہیے۔"

میں نے فون کے ذریعے ایک جاں نثار کو طلب کیا۔ پھر شرارہ سے کہا۔ "تم کل آنکھوں سے دھمتی ہوئی یہاں سے جاؤ گی۔ اپنی ٹانگن کے ساتھ میری گلیبرگ والی کٹھی میں رہو گی۔ پچھلی زندگی کو بھول جاؤ۔ نئی زندگی شروع کرو۔"

ایک جاں نثار نے آکر سلام کیا۔ میں نے کہا۔ "میں نہیں ٹھوکر تیار بیگ لے جاؤ۔ یہ ابھی بہن کے ساتھ واپس آئیں گی۔ گلیبرگ والی کٹھی کی چابیاں ان کے خوالے کر دو۔ دو دنوں کے اندر دونوں بہنوں کے پاس پورٹ ہواؤ۔ علاج کے سلسلے میں لندن جانے کے لیے ویزا مل جائے گا۔ باقی انتظامات میرے لندن آفس والے کریں گے۔"

اس نے اپنا بیگ اٹھا کر بڑے جذبے سے بڑی محبت سے مجھے دیکھا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

پہلی ملاقات میں ہم ایک دوسرے سے یوں وابستہ ہو گئے تھے کہ مجھے ہمارے درمیان پرانی شناسائی ہو۔ ایسی بات نہیں ہے کہ میں چند گفتگوں میں اس کا دیوانہ عاشق بن گیا تھا۔ چونکہ اس پر دل آگیا تھا مگر جی جان سے اس کے کام آنے کی اور بھی وجوہات تھیں۔

سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ تھی کہ شرارہ نے ایسے وقت میرے گھر میں قدم رکھا تھا جب مجھے نئے سرے سے نئے انداز سے ایک معجزاتی زندگی مل رہی تھی۔ ایسی سرتوتوں کے جہوم میں وہ جیسے جتن محبت منانے آئی تھی۔ اس نے میری سرتوتوں کو زور دلا کر دیا تھا۔

دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ نئی زندگی کی ابتدا ہوتے ہی میں تنگی کمانے کی راہ پر چل پڑا تھا۔ ایک ایسی مصیبت زدہ کے کام آ رہا تھا جسے ہوس پرستوں نے مہلک بیماری لگا دی تھی۔ آئندہ میری زندگی کا مقصد یہی ہو گا کہ مفلوحوں کے کام آتا رہوں اور یہ میری بہت بڑی تنگی ہوگی جب میں شرارہ کی بہن کو ٹیک نامی دوں گا۔

میں اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ وہاں میرا موبائل فون ٹنگٹار تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ وہ میرے لیے

ابھی نہیں تھا۔ میں نے فون دبا کر اسے کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "جی۔ فرمائیے۔؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہم کیا فرمائیں؟ سنا ہے آپ ہم سے بات کرنا بھی نہیں چاہتے؟"

میں نے کہا۔ "سوری راگت نمبر۔۔۔" وہ جلدی سے بولا۔ "جسٹ آمنٹ۔ فون بند نہ کرنا۔ میں راگت نمبر نہیں ہوں میری بن غازی۔۔۔"

میری پیشانی پر غٹٹیں پڑ گئیں۔ میں نے پوچھا۔ "کون ہو تم؟؟؟ تمہیں یہ فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "تم پوری دنیا سے چھپ سکتے ہو۔ لیکن مجھ سے بھی نہیں چھپ سکو گے۔ میں تو درپوش رہے والوں کو تار کیوں میں بھی ڈھونڈ نکالتا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ یہ تو آلو کی خاصیت ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ مجھے آلو کہہ کر خوش ہو جاؤ۔ مجھ سے دوستی کرو گے تو طرح طرح سے خوش رہو گے گا۔"

"پھر تو یہ بھی بات دو کہ دوستی کس بنیاد پر ہوگی؟"

"مجھے چاہیے میں سوئے کا حصہ دار بنالوں۔ بڑے فائدے میں رہو گے۔ کوئی دشمن تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔"

میں نے سکراتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو آپ ہیں عزت مآب شوکت شاہنواز۔۔۔ آپ کہاں ہیں؟ میں تو حضور کو کھٹے لگانے کا فیصلہ کر رہا تھا۔"

وہ ذرا دیر چپ رہا۔ پھر بولا۔ "کیا یہ بات عجیبی سے کر رہے ہو؟ مجھے تو اطلاع ملی ہے تم مجھے خود سے کتر مجھ رہے ہو۔ دوستی کرنا تو کیا۔ مجھ سے بات کرنا بھی نہیں چاہتے؟"

"آپ بے جیسے دوست کے بد معاش کو بدل میں بنا رہے تھے۔ میں کسی غنڈے کو اپنے اور آپ کے درمیان راز دار بنانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے بھڑک دیا۔ مگر یہ طے کر لیا کہ آپ سے خفیہ طور پر ملاقات کروں گا۔ کیونکہ یہ جانتا ہوں کہ میرا سارا خزانہ آپ کی مدد سے محفوظ رہے گا۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "واہ کیا بات ہے؟ تم نے بڑی سمجھ داری سے فیصلہ کیا ہے۔ دل خوش کر دیا ہے۔"

"مگر میری شرط ہے۔ آپ بے کو تو کیا اپنی اولاد کو بھی ہمارے اس معاملے میں راز دار نہیں بنائیں گے۔"

"تم اطمینان رکھو۔ ہمارے درمیان کوئی تیسرا راز دار نہیں رہے گا۔"

چاہتا ہوں۔ اس لیے شہر سے باہر ملاقات کرنا چاہوں گا۔"

"میں ابھی آوے کھٹے میں سوچ کر ملاقات کا وقت اور جگہ بتاؤں گا۔"

"ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں کہنے والی جو بھی بات ہے بے جھجک کہو۔"

"بات یہ ہے کہ جب ہم دوست بن رہے ہیں تو ہمارے درمیان بے غٹٹنی ہوئی چاہیے۔ میں کچھ زیادہ ہی سن موچی ہوں۔ درپوش وہ کر زندقہ کی رنگینیوں سے محروم ہو گیا ہوں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ۔۔۔"

میں نے بات اور دھڑکی چھوڑ دی۔ دہنٹے ہوئے بولا۔ "اس میں جھجکنے والی کیا بات ہے؟ میں بھی رنگیلا راجا ہوں۔ کل جہاں بھی ملاقات ہوئی۔ وہاں شراب اور شباب کا زبردست انتقام ہو گا۔"

"مگر اس طرح ہماری ملاقات خفیہ نہیں رہے گی۔"

"وہ ہے کی۔ مگر نہ کرو۔ جو حسینا میں نہیں خوش کرنے آئیں گی وہ میری زرخیز ہوں گی۔ ان کا ہمارے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔ کہوں گا تو آپ چاہیں کیا سوچیں گے؟"

"بھئی! اب ہم نے مختلف دوست بن چکے ہیں۔ جو بھی بات ہے حل کر کے ڈالو۔"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "وہ دراصل میرا شوق و ذوق اور طرح کا ہے۔ مجھے پھر پور جہان حسینا میں اچھی نہیں لگتیں۔ مجھے تو کم سن لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔"

اس نے زوردار قہقہہ لگا پھر کہا۔ "بھئی! تم تو میرے ہم مزاج دم خیال ہو۔ ہماری دوستی خوب رنگ لائے گی۔ کل ایک درجن تھیلیاں اپنے پر پھیلانے تمہارے آس پاس منڈلائی رہیں گی۔"

میں نے حیرانی ظاہر کی۔ "ایک درجن۔۔۔؟"

وہ بولا۔ "اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہیں۔ تمہارا یہ شوق دیکھ کر ملاقات کی جگہ سمجھ میں آگئی ہے۔ شاہدہ سے دو گھنٹہ آگے ادارہ تعلیم و تربیت کی ایک وسیع و عریض عمارت ہے۔ کل شام چھ بجے وہاں آسکو گے؟"

"میں نے وہ عمارت دیکھی ہے۔ کل ٹھیک چھ بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"غازی! پھر ایک بار کہتا ہوں۔ تم نے دل خوش کر دیا ہے۔ ہماری دوستی سچی ہوگی۔ ہم آخری سانسوں تک ساتھ دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ میرا وعدہ ہے۔ آخری سانس لیتے وقت کوئی ہونہ ہو میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

بیس پھر کئی وقت فون پر باتیں کرنا تھیں۔ اس وقت رابطہ ختم کر دیا گیا۔ میں بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ یہ سستی گری ہوئی شرمناک بات ہے کہ لوگ معصوم اور کم سن بچیوں کو ہوس کا نشانہ بناتے ہیں؟ ایسا کیا ہوس کا کھلاڑی میرے مجھے چڑھنے والا تھا۔ میں نے شرارہ سے وعدہ کیا تھا کہہ ان باپ بیٹے کو ان کے بدترین گناہوں کی بدترین سزا میں دوں گا۔

میں نے فون پر اپنے جاں نثار اور دست راست اعظم ثانی کو بتایا کہ دوسرے دن شوکت شاہنواز سے نمٹنا ہے۔ کل صبح ہی تمام جاں نثاروں کو ادارہ تعلیم و تربیت میں پہنچا کر بڑی راز داری سے مودے بنائے ہیں اور یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کا بیٹا برکت شاہنواز کہاں ہے اور اسے کس طرح فریبہ کیا جا سکتا ہے؟

میں اسے ضروری ہدایات دینے کے بعد بستر پر لیٹ گیا۔ پھر جب تک نیند نہیں آئی تب تک قرآنی آیتیں پڑھتا رہا اور خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔ اس رات سوئے کے بعد دوسری صبح نئی زندگی کا نیا سورج دیکھنے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

انٹیلی جنس والے ان خونخوار کتوں کے متعلق معلومات حاصل کر رہے تھے۔ یہ بتا چلا کہ ہلاک ہونے والے کتوں کو اسلام آباد سے لایا گیا تھا۔ ان کے مالک اور ٹرینر کا پتا ٹھکانا معلوم ہو رہا تھا۔ مگر وہ بھی ہلاک ہو چکے تھے۔ یہ بتانے والا کوئی نہیں تھا کہ دوسری داستان بڑی بولے کے لیے کام کر رہے تھے۔

دوسری طرف پولیس والے مراد اور سلطان کی جان کو آگے تھے۔ منور اور نادر شاہ کی بیویوں اور جوان اولاد نے بیان دیا تھا کہ اس خاندان میں وراثت کا جھگڑا چل رہا ہے۔ اس جھگڑے کے نتیجے میں مراد اور سلطان نے نادر کو ہلاک کر دیا ہے اور منور کو اغوا کر کے یہیں قیدی بنا کر رکھا ہے یا اس کی لاش چھپا دی گئی ہے۔

ایسے بیانات کے بعد مراد اور سلطان کی گرفتاری لازمی تھی۔ مگر وہ خاندان نامہ قس از گرفتاری حاصل کر چکے تھے۔ اگرچہ قانونی فیصلے میں نہیں آئے تھے۔ لیکن پولیس اور انٹیلی جنس والے دن رات ان کی نگرانی کر رہے تھے اور ان کے ذاتی معاملات میں مداخلت کر رہے تھے۔

دو کئے اور تین انسان پر اسرار طریقے سے مارے گئے تھے اور منور لا جاتا تھا۔ یہ ایسا حکیم معاملہ تھا کہ پولیس والے نہ رشوت

سبب ڈالو۔

سبب ڈالو۔

سبب ڈالو۔

سبب ڈالو۔

لے رہے تھے زمانہ دونوں بھائیوں کا بیچ بچھڑ رہے تھے۔
 مراد نے فون پر مجھے مخاطب کیا اور کہا۔ ”ایا یا جانی! آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ نادر شاہ مارا گیا ہے اور سنو کہیں غائب ہو گیا ہے۔ ان کی بیویوں اور بچوں نے ہمارے خلاف جان دیا ہے۔“
 میں نے کہا۔ ”بیان دینے سے کیا ہوتا ہے؟ نہ تم نے وہ واردات کی ہے۔ نہ تمہارے خلاف کوئی چشم دید گواہ ہے۔ تمہیں کوئی عدالت سزا نہیں دے سکے گی۔“
 ”سزا نہیں کیام ہوں گی کہ ہم بیٹیاں بھگتے رہیں گے؟“
 خواجہ اپنے بھائی اور بہنوئی کے قاتل کہلاتے رہیں گے۔“
 میں نے کہا۔ ”تعجب ہے باپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بناتے وقت اور انکو کراتے وقت نہ کسی طرح کی شرم تھی نہ پریشانی۔ اب کچھ نہ کر کے پریشان ہو رہے ہو؟“
 ”آپ شرمندہ نہ کریں۔ اب تو میں اور سلطان آپ کا اعتماد حاصل کرنے آپ کی تمام پونجی کے وارث بننے کے لیے بھائی اور بہنوئی کو راستے سے ہٹا دینا چاہتے تھے۔ مگر تقدیر ہم پر مہربان ہے۔ ایک تو خود ہی جہنم میں چلا گیا۔ منور بھائی بھی شاید مر چکے ہیں۔ اگر نہیں تو ہمارے ہاتھوں مرنے کے لیے کہیں سائیں لے رہے ہوں گے۔“
 وہ اپنے باپ کے سامنے بے تحشک کہہ رہا تھا کہ میرے ایک بیٹے کو مار ڈالے گا۔ منور نے بھی اٹھوٹا وارث بننے کے لیے یہی کیا تھا۔ جن خاندانوں میں دولت اور اقتدار کی جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ وہاں باپ بیٹے اور بھائی بھائی کھلی جان لیوا دشمنی کرتے ہیں۔ یہ ہماری ہزار با صدیوں کی تاریخی سچائی ہے۔“
 میں نے کہا۔ ”تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ میرے خیالات میرے ارادے بدل گئے ہیں۔ میں اپنی کمائی کا جتنا حصہ تمام اولاد کو دے چکا ہوں۔ اس کے بعد ایک چھوٹی کوڑی بھی نہیں دوں گا۔“
 اس نے بیٹھنی سے پوچھا۔ ”باپ کیا کہہ رہے ہیں؟“
 ”جو سن رہے ہو وہی کہہ رہا ہوں۔“
 اس نے جیسے ٹپ کر پوچھا۔ ”اور وہ خزانہ...؟“
 ”اسے میں خدا کے سپرد کر چکا ہوں۔“
 ”آپ تو زبان کے سچے اور گھر سے تھے۔ وہ سچائی کیا ہوئی؟ کیوں وعدہ کر کے مکر رہے ہیں؟“
 ”جہاں خزانہ چھپایا گیا تھا وہ زمین مکر رہی ہے۔ وہ خزانہ وہاں نہیں ہے۔ اندر ہی اندر جگہ بدل چکا ہے۔“
 ”آپ فضول ہو گا نہ باتیں کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا تم نے سنا نہیں مرہا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کتنے خزانے زمین میں چھپا رکھے ہیں؟“
 ”آپ اپنے خزانے کی بات کریں۔“
 میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک حدیث سنو... حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جلد ہی وہ زمانہ آئے والا ہے جب دریائے فرات سونے کا خزانہ برآمد کرے گا۔ یعنی اس کا پانی خشک ہو جائے گا اور اس کے نیچے سے سونے کا خزانہ برآمد ہوگا۔ پس جو شخص وہاں موجود ہو۔ اس کو چاہے کہ اس خزانے میں سے کچھ نہ لے۔“
 مراد نے ہنستا کہا۔ ”یہ کسی احمقانہ بات ہے کہ خزانہ آنکھوں کے سامنے ہو اور کوئی اس میں سے کچھ نہ لے؟“
 ”اس حدیث میں تم جیسوں کے لیے سبیل ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک دریائے فرات سونے کا پھیلاؤ برآمد نہیں کرے گا۔ لوگ اس کی وجہ سے یعنی اس دولت کو حاصل کرنے اور اسے اپنے قبضے میں لینے کے لیے جنگ و جدل اور قتل کریں گے۔ پس ان میں سے خزانہ فصد ماوسے جاسا کہ اور ہر شخص بھی کہے گا کہ شاید میں زندہ بچ جاؤں اور مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔ یعنی ہر شخص اس توقع پر لڑے گا کہ شاید میں ہی کامیابی حاصل کر لوں اور اس دولت پر قبضہ ہوں۔ اگرچہ خزانہ فصد لوگ اس توقع میں اپنی جان کو اپنی جانیں گے۔ (مسلم)“
 میں فون پر پویل رہا تھا۔ وہ سن رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟ خزانہ حاصل کرنے کے لیے تم نے باپ کے اٹھنے کو بانی گردیا؟ مجھے ہلاک نہ کر سکے۔ اب بھائی ہو کر اپنے بھگے بھائی کو اس توقع پر ہلاک کر دے کہ مہر مر جائیں گے۔ آخر کار وہ سونا وہ خزانہ تمہارے ہی حصے میں آئے گا۔“
 ”آپ فضول تھے کیا نیاں بنا کر بچوں کی طرح بہلا رہے ہیں۔ آپ بہت گہرے ہیں بابا جانی یقیناً وہ خزانہ کسی خاص مقصد کے لیے چھپا رکھا ہے؟ کیا تو اس آپ نے کتنی شگواہیاں کی ہیں اور کتنی اولادیں ہیں؟ جن کی خاطر خزانے پر سانپ بن کر بیٹھ گئے ہیں۔“
 سلطان نے اس سے فون لے کر کہا۔ ”آپ آخری فیصلہ بنا دیں۔ خزانے کے مسئلے میں کیا کر رہے ہیں؟ اسے کس کے حوالے کریں گے؟“
 میں نے کہا۔ ”میں دیا خدا داری سے ایک نئی زندگی

شروع کر رہا ہوں۔ خیر خزانے سے ضرورت کے مطابق کچھ لینا رہوں گا۔ بانی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ وہ جہاں ہے وہیں رہے گا۔“
 ”آپ باقی ہو گئے ہیں۔ کیسے مان لیں کہ اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے؟“
 ”نہ مانو۔ پہلے میری مخالفت کر کے تم لوگوں نے کیا پایا ہے جو آئندہ کچھ یا تو؟؟ میری ایک بیٹی اور کتنے داماد مر چکے ہیں۔ ایک بڑا بیٹا آٹھ سالہ آدھا مردہ ہے۔ تمہارا اور مراد کا بھی کچھ ایسا ہی انجام ہوگا۔“
 سلطان نے جیلو بیٹو کا۔ پھر فون کو دیکھ کر جھنجھلا تے ہوئے اسے بند کر دیا۔ مراد نے کہا۔ ”میں کھا کر کہہ سکتا ہوں بڑے میاں نے دو چار شادیاں کی ہیں۔ ان عورتوں سے ہونے والی اولاد کو اپنا سب کچھ دینے کے لیے ہمیں دھتکار رہے ہیں۔“
 سلطان نے کہا۔ ”اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں یہ بڑھا ہمارا باپ نہیں ہے۔ ماں زندہ ہوئی تو پوچھتے ہماری اصل نسل کیا ہے؟“
 ”اصل نسل پر خاک ڈالو۔ خزانے کی بات کرو۔ یہ بڑھا ہمیں اس کی ہوا بھی نکلے نہیں دے گا۔ پتا نہیں اس نے اسے کہاں چھپا کر رکھا ہے؟“
 سلطان پاؤں پٹختا ہوا باہر سے اچھڑ جاتے ہوئے بولا۔ ”اسے دو بار غور کیا گیا۔ مسٹر سائی دو میں کھلا کر کھڑو بنایا گیا۔ امید تھی وہ نیم مرده ہو کر زندگی کی جھجک مانگے گا اور ہمیں مدفون خزانے تک پہنچا دے گا مگر وہ تو شیطان ہے۔ مرتے مرتے اٹھ بیٹھا ہے۔“
 ”جھنجھلا نے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی تدبیر سوچو۔“
 ”مقام تدبیر یہاں خاک ہو چکی ہے۔ اب تو ہماری عقل نے کام کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔“
 مراد نے کہا۔ ”آرام سے بیٹھو اور سنو؟ ہم بابا جانی کو جسمانی طور پر کمزور نہ بنا سکے۔ اگر ان کی ایک آدھ کمزوریاں ہمارے ہاتھ آئیں گی تو ہم انہیں مجبور کر سکیں گے۔“
 سلطان اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔ مراد نے کہا۔ ”ان کی کوئی ایسی زبردست کمزوری نہیں مل جائے کہ وہ ہمارے آگے گھٹے گھٹے پر مجبور ہو جائیں۔ سوچو... بابا جانی جیسے مشہور و مشہور میں ڈوبے رہتے والے بڑی بڑی غلطیاں کرتے ہی رہتے ہیں۔“
 دو دنوں سوچنے لگے کہ میں کتنے ملک میں جاتا رہا ہوں؟ اور اکثر ایسا مصروف رہا ہوں کہ برسوں گزر جاتے

تھے اور انہیں میری خبر نہیں ملتی تھی۔ انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ میں ان سے دور لا چکا ہوں کہ کسی زندگی گزار رہا ہوں؟ سلطان نے تصویر بڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”میں نے بابا جانی کو ایک آدھ پارڈائزری لکھتے دیکھا ہے۔ اگر ان کی ایک ڈائری بھی مل جائے تو اسے پڑھ کر ان کے بہت سے خفیہ معاملات اور بہت سی اہم باتیں معلوم ہو سکیں گی۔“
 ”ان کی گھجگر والی کوئی پتھیلے دس ماوسے بند پڑی ہے۔ اگر ہم اندر جائیں اور بیڈروم میں کچھ کیس تو ان کی الماری سے ڈائری کے علاوہ اور بھی بہت کچھ حاصل کر سکیں گے۔“
 ”ہم نے نئی بارادھر سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کوٹھی کے احاطے میں ایک چوکیدار اور گیٹ پر ایک سکیورٹی گارڈ دکھائی دیتا ہے۔ وہ دس بیٹوں میں مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ اگر وہ کسی رشتے دار کو آتا ہے اور نہ اب تک کوئی چور ڈاکو آیا ہے نہ آئے گا۔ یقیناً وہ ڈیوٹی دینے والے رات کو سو جاتے ہوں گے۔“
 ”ان کی نگہ نہیں ہے۔ جاگتے رہیں گے تو ہم انہیں ہمیشہ کی نیند سلا دیں گے۔ ہمارے رہو الوہ سے سائیکس لگا رہے گا۔ بے آواز فائر کر کے دروازوں کے لاک توڑ سکیں گے۔“
 وہ اب میری کسی ایک کمزوری تک پہنچنے کے لیے بے چین تھے۔ اپنے باپ کے گھر میں چوری کرنے کی پلاننگ کے ایک ایک پہلو پر غور کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ آج رات ہی یہ ٹیک کام کر گزریں گے۔
 وہ اسی وقت واردات کے لیے تیاریاں کرنے لگے۔ مراد نے کہا۔ ”وہ بڑھا جہاں بھی ہے بڑے آرام اور سکون سے ہے۔ ہمیں اس کا سکون برباد کرنا چاہیے۔“
 ”مراد نے پوچھا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“
 ”اسکی جنس والے ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔ ہم کیوں شائیں بڑے میاں کے پیچھے لگا دیں؟“
 ”کس طرح پیچھے لگاؤ گے؟ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں؟“
 ”ان کا فون غمزدہ معلوم ہے۔ اسکی جنس والے اس نمبر کے ذریعے ان کی خفیہ پتاہ کاہ کا پتا لگ سکتے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے پتا نہ بھی لگ سکے تو فون کے ذریعے ان کا سکون غارت کرتے رہیں گے۔“
 سلطان نے اسکی جنس کے ایک دفتر سے رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ ”راتا صاحب! میں سلطان غازی بولی رہا ہوں۔ آپ تو ہمارے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اسکی قاتل کو باطل ہی نظر انداز کر رہے ہیں۔“

”کون ہے اصلی قاتل؟“

”ایک ارب پتی سونے کا بیوہ پاری ہے۔“

”سونے کے بیوہ پاری تو تمہارے والد محترم بھی ہیں؟“

”میں اسی محترم اور معزز کھلانے والے باپ کے

خلاف زبان کھولنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ وہ اپنے داماد اور

شاہ سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے ہی اسے ہلاک کر دیا

ہے۔ جب آپ انہیں گرفتار کریں گے تو اندر کی بہت سی

باتیں سنائیں گی۔“

”اگر انہوں نے داماد کو قتل کر دیا ہے تو بیٹا کہاں

ہے؟ منور جانے وارادات پر نادر شاہ کے ساتھ تھا۔“

”منور حقیقتاً نادر کو بھانپ کر فارم پاؤں لے گیا تھا۔

یہ ہمارے باپ کی پلاننگ تھی۔ انہوں نے ہی منور کو بھانپ چھپا

رکھا ہے۔“

”یہ باتیں تم کیسے جانتے ہو؟“

”انہی تجویزی دیر پہلے پایا جانی نے مجھ سے اور مراد

بھائی سے فون پر باتیں کیں اور دھمکیاں دی تھیں کہ وہ نادر کی

طرح نہیں بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔“

”اسے کہا۔“ یہ بات حلق سے نہیں اتر رہی ہے کہ

ایک ہوش مند باپ اپنے بیٹے کو قتل کرنا کرنا چاہے گا؟“

”جی ہاں۔ باپ بیٹے کا رشتہ ایسا ہے کہ کوئی یقین نہیں

کرے گا مگر حقیقت اس تصور کے برعکس ہے۔ اگر آپ

ہمارے خاندانی معاملے کو راز میں رکھیں گے تو میں ایک کڑوی

حقیقت آپ کو بتا چاہوں گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں تمہارا خاندانی معاملہ راز میں

رہے گا۔“

سلطان فون پر ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔

”میں اور مراد بھائی پایا جانی کی اولاد نہیں ہیں۔ انہوں نے

فون پر صاف صاف کہہ دیا ہے ہم دونوں بھائی ان کے لطفے

سے نہیں ہیں۔ وہ ہماری ماں کی بہت بڑی غلطی کو اب تک

پرداشت کرتے آئے ہیں۔ اب نہیں کریں گے۔ انہوں نے

ہمیں ایک نئے کی مہلت دی ہے اور کہا ہے کہ ہم لندن والی

رہائش گاہ میں چلے جائیں۔ یہی اس خاندان میں واپس نہ

آئیں۔ اگر آگئے تو پھر نادر کی طرح اپنی موت کا انتظار کریں۔“

افسر نے فائل ہو کر کہا۔ ”اب یقین ہو رہا ہے۔ تم

نے ایسی شرمناک حقیقت بتائی ہے جو کوئی نہ بتاتا۔ تمہاری

سچائی نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میں تمہاری شرمناک سچائی کا

راز دار بن کر رہوں گا۔“

سلطان نے مسکرا کر مراد کو نگہ ماری پھر کہا۔ ”رانا صاحب!

ان کا فون نمبر میں نے سید کیا ہے۔ آپ لوٹ کر لیں۔“

اس نے نمبر تکرار کر رابطہ قائم کر دیا۔ پھر مراد سے کہا۔

”چلو کلو یہاں سے۔ آج ہم اس بڑے کی کوئی سے کچھ نہ

کچھ ضرور حاصل کر لیں گے۔ پتا نہیں وہ کس خطہ پناہ گاہ میں

سورہا ہوگا؟ ابھی رانا صاحب اس کی تیندیں اڑا رہے ہیں۔“

میں واقعی گہری تیندیں تھا۔ مختصر سی تیندیں سے اٹھ کر تیند

کی غماز پڑھنے والا تھا۔ ایسے وقت فون کے بزرگے چکا دیا۔

خیال آیا کہ شرارہ نیاز بیک ٹھوکر پٹخ گئی ہوگی۔ وہاں سے بھن

کے ساتھ واپس آ رہی ہوگی۔ وہی کسی ضرورت سے کال

کر رہی ہے۔

میں نے فون اٹھا کر دیکھا تو اچانک نمبر نئے۔ کوئی

پہلی بار مجھے کال کر رہا تھا۔ میں نے اسے کان سے لگا کر

پوچھا۔ ”ہلو فرمائیے۔۔۔“

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ”آپ عیبر بن غازی یول

رہے ہیں؟“

”جی ہاں۔ آپ کون ہیں؟ رات کے ایک بجے مجھے

کیوں یاد کر رہے ہیں؟“

”تمہاری نوکری ہی ایسی ہے۔ کبھی کبھی آپ جیسے محرز

اقرار کی تیندیں شراب کر کے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں

اسکی جس کا بیٹا رانا دلشا دھمکوں رہا ہوں۔“

میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”فرمائیے میں آپ

کے کس کام آ سکتا ہوں؟“

”میں دن پہلے پھر سر رضا قریشی نے آپ کے انوا

ہونے کی رپورٹ درج کر رکھی تھی۔ ہم آپ کو تلاش کرتے

رہے ہیں۔ پچھلے دس مہینوں کی میڈیکل رپورٹ کے مطابق

آپ ستر برس کے بوڑھے ہیں۔ طرح طرح کی بیماریوں

نے آپ کو نیم مردہ بنا دیا ہے۔ آپ اٹھنے بیٹھنے کے قابل بھی

نہیں ہیں۔“

”جی ہاں۔ یہ درست ہے۔“

”پھر آپ اس جگہ سے کیسے فرار ہو گئے؟ جہاں آپ کو

انوا کر کے لے جایا گیا تھا؟“

”جہاں مجھے لے جایا گیا تھا۔ وہاں دو پارٹیوں کے

درمیان زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ ایسے وقت میرے

وقادار جاں نثار بیچ گئے تھے جو مجھے وہاں سے نکال کر یہاں

لے آئے ہیں۔“

”یہاں یعنی کہاں؟ ہم قانون کے محافظ ہیں۔

آپ کو بھرپور سیکورٹی فراہم کریں گے۔ ہمیں اپنے پاس

بلائیں۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے دو بار انوا کیا گیا۔ پولیس اور انتہائی

جس والوں نے میرے لیے کیا کیا؟“

”آپ کی شکایت تھا ہے۔ مگر مارے پولیس والے

اور جاسوس تاہل نہیں ہوتے۔ میں آپ کو یقین دلانا ہوں۔

میرا گھرانی میں آپ پر گچ نہیں آئے گی۔“

”یعنی پھر قانون کے محافظوں پر بھروسہ کروں اور تیسری

بار دشمنوں کے ہاتھ لگ کر موت کے گھاٹ اتر جاؤں؟“

”آپ دشمنوں کی نشان دہی کریں۔ میں ان سے نمٹ

کر آپ کا استحوا حاصل کروں گا۔“

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”دشمن میرے اپنے

گھر میں ہیں۔ ان سے میں خود نمٹ رہا ہوں۔ آپ کی

ساکر کوئی کو آؤ نہ مانے کے لیے ان پر یا سے آئے ہوئے ایک

دشمن کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ اس کا نام سری واستو بڑ

بولا ہے۔ وہ اپنے دس دس میں سونے کا ایک ارب پتی بیوی پاری

کہلاتا ہے۔ مگر حقیقتاً ایک استعمر ہے۔“

رانا دلشا نے کہا۔ ”معاف دیجئے گا؟ آپ کے متعلق بھی

یہی کہا جاتا ہے۔ مگر کوئی ثبوت نہ ملے کے باعث آپ پر ہاتھ

نہیں ڈالا جا رہا ہے۔“

”آپ کتنے عرصے سے میرے خلاف مواد تلاش

کر رہے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”پچھلے پانچ برسوں سے۔۔۔“

”یعنی پچھلے پانچ برسوں سے ناکام ہو رہے ہیں؟ ایک

بھی ثبوت نہیں ملا۔ مان لیں کہ میں استعمر نہیں ہوں یا پھر آپ

کی کارکردگی ناقص ہے۔ اپنی ناک کے نیچے جرم کرتے

والے کو پکڑ نہیں پارے ہیں۔ پھر ایک بیمار اور بوڑھے کی

حفاظت کیسے کریں گے؟“

”میں بحث نہیں کروں گا۔ آپ اٹھ یا سے آئے والے

سری واستو کے متعلق بتائیں؟“

”میں اتنی ہی جانتا ہوں کہ وہ اسلام آباد میں ہے۔

مجھے تلاش کیے اور لے کیے بغیر اس ملک سے نہیں جائے گا۔“

میں نے اس کا فون نمبر بتاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس

سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ کیا فون بند کر سکتا ہوں؟“

”نہیں۔ ابھی تلاش جاری ہے۔ چند سلاوات دے گئے ہیں۔“

”بائی سلاوات آپ دن میں کسی بھی وقت کر سکتے ہیں۔“

”پلیز۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ یہ بتائیں آپ کا

بڑا بیٹا منور کہاں ہے؟“

میں قہر چا رہا۔ ابھی تھک کر نماز پڑھنے والا تھا۔

اگر اپنی یا کسی بے گناہ کی جان بچانی ہو تو شیطان صفت لوگوں

سے جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔ رانا دلشا شیطان نہیں تھا۔ اپنے

فرانکس کی ادائی کے لیے کچھ معلومات چاہتا تھا۔

میں نے جھوٹ سے توبہ کی اور سچ کہا۔ ”داؤد اسپتال

میں بڑی راز داری سے اس کا علاج کیا جا رہا ہے۔“

”واردات کے وقت وہ فارم پاؤں میں نادر شاہ کے

ساتھ تھا۔ پھر اسپتال کیسے نکلا گیا؟“

”آپ کو تمام حالات کے جہالت وہاں مل جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی اس اسپتال میں پہنچ جاؤں

گا۔ ڈاکٹر داؤد کو ڈاکٹر وطن بھی کہا جاتا ہے۔۔۔“

”جی ہاں۔ وہ اسی نام سے مشہور ہوتا جا رہا ہے۔“

”اس کے متعلق بھی کوئی اچھی رپورٹ نہیں ہے۔“

”ہماری بیک لسٹ میں ہے۔ ہائی داؤد۔ آپ نے ابھی کہا ہے

کہ دشمن آپ کے گھر میں ہیں اور ان سے آپ نمٹ رہے ہیں؟“

”ہاں۔ ابھی میں نے یہی کہا ہے۔“

”اور آپ نے انہیں دھمکی دی ہے کہ وہ لندن والی

رہائش گاہ میں نہیں جائیں گے تو آپ انہیں موت کے گھاٹ

اتار دیں گے؟“

”آپ ایسی بے نیکی کیوں کر رہے ہیں؟ میں

نے کسی کو دھمکی نہیں دی ہے۔“

”کیا آپ نے انہی سلطان غازی سے فون پر باتیں

نہیں کی تھیں؟“

”میں نے سونے سے پہلے مراد اور سلطان دونوں

سے باتیں کی تھیں۔“

”اور آپ ان دونوں کو دشمن سمجھتے ہیں؟“

”میں انہیں دشمن سمجھوں یا نہ سمجھوں مگر ایک باپ

ہوں۔ اپنے بیٹوں کو مار دینے کی بات بھی نہیں کروں گا۔“

رانا نے کہا۔ ”یہ آپ کی گھر بٹو اور ازاد واپسی زبردستی کا

راز ہے۔ میں نے سلطان سے وعدہ کیا ہے کہ اپنی تعیناتی

رپورٹ میں اس سچ حقیقت کا ذکر نہیں کروں گا۔“

”کون سی سچ حقیقت۔۔۔؟“

”یعنی کہ مراد اور سلطان آپ کے اپنے بیٹے جہیں

ہیں۔ آپ کی وفاق کی بد چلنی کا نتیجہ۔۔۔“

بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے دھاڑتے

ہوئے کہا۔ ”مے شٹ اپ ناں سنس۔۔۔ تم نے میری پاکباز

مردم شریک حیات پر کچھ اچھالنے کی جرات کیسے کی؟“

”میں نے جرات نہیں کی ہے۔ آپ کے صاحبزادے

سلطان نے ابھی فون پر بتایا ہے کہ وہ اور مراد آپ کے لطفے

سے نہیں ہیں۔ اگر اس نے جھوٹ کہا ہے اور مجھے گمراہ کیا ہے

جس میں آ رہی تھی۔ کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

اگرچہ حجاب اور عذارانی میرے جان نثار کے ساتھ ادھر چلی جا رہی تھیں۔ مگر جہاں تک تک پہنچنے والی تھیں؟ فی الحال ان بھائیوں کو کوئی لگاؤ نہ والا نہیں تھا۔

انہوں نے الماری کے اندرونی سیف کو کھول کر دیکھا۔ وہاں نوٹوں کی گڈیاں اور جائیداد سے تعلق رکھنے والی دستاویزات رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ڈائری بھی دکھائی دے رہی تھی۔ مراد نے فوراً ایک لپک کر اسے اٹھالیا۔ پھر مایوس ہو کر کہا۔ ”یہ ایسی سواری کی ہے۔ جس میں بڑے پڑائی۔“

سلطان نے اسے لے کر کہا۔ ”خزانہ برسوں سے جمع کیا جا رہا ہوگا۔ اس کا ذکر اس میں ضرور ہوگا۔ ہم گھر جا کر اسے پڑھیں گے۔ ضرور کوئی کام کی بات معلوم ہوگی۔“

مراد فاقہ اٹھا کر جائیداد کی دستاویزات پر سرسری سی نظرس ڈال رہا تھا۔ سلطان نے کہا۔ ”جائیداد کے ان کاغذات سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہاں زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں ہے۔ چلو۔“

وہ بولا۔ ”بابا جانی نے ٹینکوں کے لاکر میں بہت کچھ چھپا کر رکھا ہوگا۔“

وہ کہتے کہتے چونک گیا۔ کھلی ہوئی فائل کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ قشہ کیسا ہے؟“

سلطان بھی توجہ سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ”یہ کسی عمارت کا یا شہر کا نقشہ نہیں ہے۔ یہ درمیان میں سرخ وادھو دیکھیں۔ پیچیدہ لکیروں کے ذریعے اس دائرے تک پہنچنے کی رہنمائی کی گئی ہے۔“

مراد نے بڑے جوش اور جذبے سے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کسی خزانے تک رہنمائی کی گئی ہے۔“

سلطان نے فائل کو اس کے ہاتھ سے چھین کر کہا۔ ”مجھے بھی یہ خزانے کا نقشہ لگ رہا ہے۔ ان کیروں کے ذریعے جن مقامات سے گزرنا ہے۔ وہاں کے نام بھی لکھے ہوئے ہیں۔“

”اور یہ افراطی طرز کے نام ہیں۔“

وہ بڑی جتنی سے نقشے پر نظریں دوڑا رہے تھے۔ مراد نے ایک چٹرائی رکھ کر کہا۔ ”یہ دیکھو! یہاں لکھا ہے ایوان۔ یہ لیلیا کے جنوب میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ہمیں یاد ہے ہم یہاں جا چکے ہیں؟“

سلطان نے ہاں کے انکار میں سر ہلا کر فائل کو بند کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ ہم نے ایک کی لاش گرانی ہے۔ دوسرے کو زخمی کیا ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے جانا چاہیے۔ مگر پہنچ کر آرام

سے نقشے کو بھی سمجھیں گے اور ڈائری بھی پڑھیں گے۔“

سلطان کے ہاتھ میں نقشے والی فائل تھی۔ مراد نے ڈائری اپنے پاس رکھ لی تھی۔ وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے پچھلے دروازے سے باہر آئے۔ ٹائٹ چوکیدار وہاں رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ اس وقت ہوش میں آتے ہوئے کراہ رہا تھا۔ مراد نے گن کے دھتے سے پھر اس کے سر پر ضرب لگائی وہ شور مچانا چاہتا تھا۔ مگر منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ پھر ایک بار بیہوش ہو گیا۔

وہ دونوں کوٹھی کے پچھلے حصے سے دوڑتے ہوئے اگلے حصے کی طرف جانا چاہتے تھے۔ پھر ایک دم سے ٹھک گئے۔ ایک کار احاطے کے آگے گیت کے سامنے آ کر رک گئی تھی۔ بارن بجا کر ٹائٹ چوکیدار رسیکوری کی گاڑی کو بلایا جا رہا تھا۔ سلطان نے پریشان ہو کر کہا۔ ”اسی رات گویا ہاں کوں آیا ہے؟“

مراد نے کہا۔ ”کوئی بھی آیا ہو۔ پچھلے گیت سے نکل چلو۔“

وہ دونوں وہاں سے بھاگتے چلے گئے۔ اگلے گیت کے سامنے کار رکھی ہوئی تھی۔ حجاب اور عذارانی پچھلی سیٹ پر تھیں۔ میرے جال نثار نے پہلے بارن جا کر چوکیدار کو بلانا چاہا تا کہ وہ آ کر گیت کھولے۔ جب کوئی نہ آیا تو وہ کار سے اتر گیت کے ساتھ والے کسبن میں پہنچا۔ پھر رسیکوری کی گاڑی کی لاش دیکھ کر ٹھک گیا۔

ایک دم سے دماغ نے سمجھا یا کہ اس پاس خفیہ ہے۔ اس نے کوٹھی کی طرف دیکھا۔ ادھر خاموشی تھی اور خاموشی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ وہ دوڑتا ہوا کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر آ گیا۔ اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانے لگا۔ حجاب نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ کوٹھی میں نہیں جا سکتے؟“

اس نے کہا۔ ”جسٹ آمنت۔ ابھی بتاتا ہوں۔“

اس نے ڈیش بورڈ سے فون اٹھا کر نمبر شیج کیے۔ میں نماز پڑھنے کے بعد سوتے جا رہا تھا۔ کالک فون سن کر رک گیا۔ فون کوکان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہیلو عاقب! کیا گلبرگ پہنچ گئے؟“

عاقب نے کہا۔ ”پہنچ تو گئے ہیں۔ لیکن یہاں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کسی نے سکیورٹی گاڑی کو کوٹھی کی مار کر ہلاک کیا ہے۔“

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”پانڈا! یہ کیا ہو گیا؟ کسی نے اسے قتل کیا ہوگا؟ وہ دونوں بہنوں کو ذرا وہاں سے دور لے جاؤ۔“

”میں بھی گھر ہاوں۔ انہیں وہاں سے دور لے آیا ہوں۔ آپ غم وریں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”حجاب اور عذارانی میرے پاس لے آؤ۔ یہ معلوم ہونا

چاہیے کہ میری کوٹھی میں کیا ہو رہا ہے؟ میں دوسرے جال نثاروں کو وہاں روانہ کر رہا ہوں۔“

میں نے اس سے رابطہ ختم کیا۔ پھر دوسرے جال نثار اعظم ثانی کو فون پر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”گلبرگ والی کوٹھی کے سکیورٹی گاڑی کو کوٹھی کی مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ فوراً وہاں پہنچو اور معلوم کرو یہ واردات ڈاکوؤں نے کی ہے یا پھر دس دس دہائیوں سے ہوئے ہیں؟ پولیس والوں کے پہنچنے سے پہلے صحیح صورت حال معلوم کرو۔“

اعظم ثانی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ادھر روانہ ہوا۔ ادھر حجاب اور عذارانی میرے پاس آئیں۔ میں چاہتا تھا حجاب میری زندگی میں ہونے والے ہنگاموں سے دور اسی کوٹھی میں رہے۔ مگر حالات پھر اسے میرے قریب لے آئے تھے۔

میں نے عدا کوٹھی یاد دیکھا۔ وہ اپنی بہن سے مشابہت رکھتی تھی۔ میں نے اس کی چیشانی چوم کر حجاب سے کہا۔ ”یہ بڑی بولی تو بالکل تمہاری جیسی ہوئی۔“

وہ کی خیال میں گم تھی۔ چونک کر بولی۔ ”جی۔ آپ نے کیا کہا؟“

میں نے پوچھا۔ ”تم کس سوچ میں گم ہو؟“

”وہ میں سوچ رہی ہوں۔ آپ گلبرگ والی کوٹھی میں ہوتے تو کیا ہوتا؟ دشمن آپ کی جان لینے آئے ہوں گے۔ آپ ان کے ہاتھ نہیں آتے تو بیچارے ملازم کی جان لے لیں۔“

”میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ میں کسی سے لڑنے نہیں جاتا۔ دشمن خود ہی لڑنے مرنے چلتے آتے ہیں۔ کوٹھی میں جو بھی آیا ہوگا میں اسے چھوڑ دوں گا نہیں۔ اس نے اپنی شامت کو بکرا ہے۔“

عدا نے جہاں لیتے ہوئے کہا۔ ”باجی! ہلک لگ رہی ہے اور نیند بھی آ رہی ہے۔“

میں نے چونک کر کہا۔ ”میں نے خیال ہی نہیں کیا کہ تم دونوں نے اب تک کچھ کھانا نہیں ہوگا۔ آؤ کچن میں چلو۔“

ہم تینوں کچن میں آ گئے۔ حجاب نے کہا۔ ”آپ آرام کریں۔ میں کھانا تیار کر لوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”میں اٹھا کر ہاوں کہ دوسرے دن کے لیے بھی قح جاتا ہے۔ تمہیں پکانا نہیں پڑے گا۔ فریق میں بہت کچھ ہے۔“

اس نے فریق سے کھانا نکال کر گرم کرتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟“

”میں کچا چکا ہوں۔ مزید کھانے کی کفالت نہیں ہے۔“

”پھر تو آپ کو سونا چاہیے۔ کتنے بچ رہے ہیں۔ تین کھتے بعد پھر نماز کے لیے اٹھنا ہے۔“

”دشمن سونے کہاں دیتے ہیں؟ یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ میری کوٹھی میں کیا ہو چکا ہے؟ اعظم ثانی میرا دست راست ہے۔ بہت ہی ذہین اور حاضر دماغ ہے۔ وہ واردات کرنے والوں کا سراغ ضرور لگے گا۔“

تھوڑی دیر بعد ہی اس نے فون پر کہا۔ ”مرا کوٹھی کے سامنے سکیورٹی گاڑی کی لاش پڑی ہے اور پچھلے حصے میں چوکیدار بیہوش پڑا تھا۔ اسے ہوش میں لایا گیا ہے۔ اس کی مرہم پٹی کی گئی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس پر کس نے حملہ کیا تھا؟ کیونکہ وہاں نیم پڑا ہوا تھا۔ کچھ دیکھنے کھنے سے پہلے ہی اس کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ حملہ کرنے والے کوٹھی کے اندر گئے ہوں گے؟“

”جی ہاں۔ واردات کرنے والے پیٹھ پر چور ڈاگو نہیں ہیں۔ انہوں نے کوٹھی کے کتنی سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ صرف آپ کے پیڑروم میں گئے تھے۔ انہوں نے کمرے کے مقفل دروازے کے اندر سیف کے پٹ اور سیف کے لاک کو فائرنگ کے ذریعے توڑا ہے۔“

وہ بول رہا تھا کہ الماری کی کسی چیز کو بھیجنا نہیں گیا ہے۔ صرف سیف کا سامان باہر بکھرا پڑا ہے۔ فون کی چار گڈیاں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ جتنی وہاں دولت چرائے نہیں آئے تھے۔

اعظم ثانی نے کہا۔ ”آپ بتائیں سیف میں کیا کچھ تھا؟ پھر معلوم ہو سکے گا کہ یہاں سے کیا چرایا گیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”فالکوں کے نام اور نمبر پڑھو۔“

وہ پڑھنے لگا۔ میں نے سننے کے بعد کہا۔ ”وہ ایک فالک نمبر جی دن لے گئے ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”یقیناً وہ آپ کے لیے اہم ہوگی۔“

”ہاں۔ اہم تھی۔ کیا وہاں انہیں مواسی کی ایک ڈائری ہے؟“

”جی نہیں۔ یہاں کوئی ڈائری نہیں ہے۔ اگر اسے بھی چرایا گیا ہے تو یقیناً وہ بھی اہم ہوگی؟ جناب امیری عقل کتنی ہے کہ چرائے والے اپنے ہی گھر کے لوگ ہیں۔“

”ہاں۔ یہ واردات مراد اور سلطان نے کی ہے۔ فالک جی دن میں ایک خاص مقام تک پہنچنے کا نقشہ ہے۔ مگر وہ بیچارے اس سے کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ تم پہلے رضا قریشی کو اطلاع دو۔ تاکہ وہ ہمیں قانونی تحفظ فراہم کرے۔“

95 ستمبر 2010

پھر پولیس والوں کو اطلاع دو۔ اپنے مسلح ساتھیوں کو وہاں سے ہٹا دو۔ میں صبح کی نماز کے بعد رابطہ کروں گا۔“

غلام نے کہا۔ ”پلیز۔ آپ سو جائیں۔ ایک آدھ گھنٹے کی نیند ہو جائے گی۔“

میں نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ کل باتیں ہوں گی۔“

میں نے اپنے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر عصا کو بیڈ پر رکھ کر اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ وہ میرے دن رات کا ساتھی تھا۔ میں اس کے ساتھ بے خوف و خطر گہری نیند سے گزارتا رہتا تھا۔

مرد اور سلطان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ خلیفہ خزانے تک پہنچنے کا نقشہ ان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔

میرا نے کہا۔ ”کل تک بابا جانی کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی فائل میں دن چڑائی کی ہے۔ وہ ہم پریشہ کریں گے۔ کوئی کے گریٹ برہونے والے مرد رئیس میں نہیں الجھائیں گے تاکہ ہم خزانہ حاصل کرنے کے لیے لیپڈا نہ جاسکیں۔“

سلطان نے کہا۔ ”کسی طرح کی بھی رکاوٹ پیدا ہونے سے پہلے ہی ہم یہاں سے فلاحی کریں گے۔ ابھی اپنے ٹریولنگ ایجنٹ کو فون کریں۔ کل ہم کسی بھی پہلی فلائٹ سے نکل سکیں گے۔“

سلطان کارڈ ریڈ کر رہا تھا۔ مراد فون پر ٹریولنگ ایجنٹ سے باتیں کرتے لگا۔ وہ ہر دو چار منیٹوں میں یورپ امریکا جاتے آتے رہتے تھے۔ ایئر ویز انجینی والوں سے پرانے مراسم تھے۔ دوسری رات اٹھ بجے کی فلائٹ میں ان کے لیے دو بیٹن اڈے ہو گئے۔

پھر ایک اندیشہ پیدا ہوا کہ میں ایئر پورٹ پر انہیں روک سکتا ہوں۔ مراد نے ایجنٹ سے کہا۔ ”ہم آج صبح کسی بھی فلائٹ سے کراچی جائیں گے۔ وہاں سے لیبیا کے لیے روانہ ہوں گے۔ اسی حساب سے ہمارے ٹکٹ بنائے جائیں۔“

ان کے گھر پہنچنے تک حسب مشاغل تیار ہو گئے۔ دو گھنٹے بعد انہیں کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ وہ خزانہ حاصل کرنے کے لیے جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک لکھ بھٹی خان لکھ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بیویوں اور بچوں سے خزانے کا ذکر نہیں کیا۔ یہ کہہ دیا کہ کراچیکہ ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ ان سے فون پر رابطہ نہیں گئے۔

جب میں فجر کی نماز کے بعد گہری نیند سو رہا تھا تب وہ ایک فلائٹ کے ذریعے لاہور سے کراچی روانہ ہو گئے۔ ہجاز

میں آرام سے بیٹھ کر انہیں جی ون فائل کو پڑھنے اور نقشے کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملا۔

وہ اسے بڑی توجہ سے پڑھنے لگے۔ پوری فائل میں خزانے کا ذکر نہیں تھا۔ ایک ٹیمپل اسٹیم کی بلیک مارکیٹنگ ڈیجٹ اور اسٹیلنگ کا ذکر تھا۔ اس نقشے کا تعلق بھی اسی ٹیمپل اسٹیم سے تھا۔

میرا نے کہا۔ ”بابا جانی بہت چالاک ہیں۔ انہوں نے کھل کر خزانے کی بات نہیں کی۔ درپردہ علامتی انداز میں ٹیمپل اسٹیم کی بات کی ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”بے شک۔ یہ اسٹیم دوسروں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ مگر ہم سمجھ رہے ہیں۔ یہ بڑی مقدار میں ہے۔ اسی لیے اسے بڑی کارگیری سے چھپایا گیا ہے۔ اپنی یادداشت میں محفوظ رکھنے کے لیے یہ نقشہ بنایا گیا ہے۔“

وہ کراچی پہنچ گئے۔ وہاں سے تین گھنٹے بعد ایک فلائٹ سے قاہرہ جانے والے تھے۔ پھر وہاں سے دوسری فلائٹ کے ذریعے لیبیا کے شہر طرابلس پہنچ کر باقی روڈ الحاف شہر کی طرف جاتا تھا۔ اس کے بعد فائل جی ون کے نقشے کے مطابق سفر شروع ہونے والا تھا۔

وہ دونوں میری طرف سے اندیشوں میں مبتلا تھے۔ میرا نے فون کے ڈیالے اپنی بیوی ملے کو مخاطب کیا۔ ”ہیلو میں ٹول رہا ہوں۔ وہاں سب تحریرت ہے ٹال؟“

حنیفہ نے کہا۔ ”تحریرت نہیں ہے۔ وہ انگلی ٹیس والا رہا وٹا اور احمد آپ کو اور سلطان بھائی کو گرفتار کرنے آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا آپ دونوں بھائی بیٹی گئے ہیں۔ میں آپ کو بار بار فون کرتی رہی۔ اس افسر نے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر آپ کا وہ فون نمبر بند پڑا ہے۔ یہ سب خبر سے ابھی بات کر رہے ہیں۔“

”ہاں۔ یہ نمبر کسی کو نہ بتانا۔ ابھی بات کرتے ہی اسے متاثر بنا۔ کیا اس افسر نے بتایا ہے کہ کس جرم میں ہمیں گرفتار کرنا چاہتا تھا؟“

حنیفہ نے کہا۔ ”بابا جانی کی کوئی کارکنی گارڈ مارا گیا ہے۔ انہوں نے ایک باپ کو بیٹوں کا لٹیٹن کیا۔ آپ دونوں کے خلاف بیان دیا ہے۔ یہ کہا ہے کہ گارڈ کو ہلاک کرنے کے بعد آپ ان کے سیف سے اہم دستاویزات چھپا کر لے گئے ہیں۔“

میرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہم سناپ نہیں ہیں۔ مگر بابا جانی کے لیے یہ کہاوت درست ہے کہ سناپ نکل گئے ہیں۔ وہ لکیر پینتے دہیں گے۔ مگر ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے سے روک

نہیں پائیں گے۔ تم فکر نہ کرو ہم خبرت سے ہیں اور خبرت سے ہی رہیں گے۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ سلطان بھی کان لگائے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بابا جانی اب ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ہمیں سوئے تک پہنچنے نہیں دیں گے۔ چائیں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے کسی کیسے حربے استعمال کریں گے؟“

”ہم کا وہاں نہیں ہیں۔ لیبیا پہنچ کر تنہا نہیں رہیں گے۔ ہماری حفاظت کے لیے کرائے کے جنگجو قاتل ہمارے ساتھ رہیں گے۔ ہم بابا جانی کو دھمکی دیں گے کہ انہوں نے ہمارا راستہ روکا تو ہم خزانے کا پیچیدہ کھول دیں گے۔ خزانے کا نقشہ لیبیا کے اعلیٰ حکام تک پہنچا دیں گے۔“

سلطان نے کہا۔ ”یہ ذبردست دھمکی ہوگی۔ بابا جانی کو ہم سے بھگوت کرنا پڑے گا۔ واقعی وہ کبھی نہیں جاسکیں گے کہ یہ فائل یہ نقشہ اور خزانے کا راز لیبیا کے حکمرانوں کے لیے ترنوال بن جائے۔“

وہ کراچی سے لیبیا کے لیے روانہ ہو گئے۔ پاکستان سے نکلے ہی سلطان نے کہا۔ ”شکر ہے بابا جانی اور رانا وٹا وٹا رکاوٹ نہ بن سکے۔ ہم بھلا سانی نکل آئے ہیں۔“

میرا نے کہا۔ ”ہم قاہرہ پہنچ کر بابا جانی سے بات کریں گے۔ پھر معلوم ہوگا کہ وہ ہماری کامیابی پر کس طرح جھنجھلا رہے ہیں؟ ہمارے خلاف کیا ہونے والے ہیں اور آئندہ کیا کرنے والے ہیں؟“

”یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ آپ وہ ڈائری نکالیں۔ اسے پڑھ کر دیکھیں کہ اس پتھر ورا جس سے کیا نکلتا ہے؟“

میرا نے ریف ٹیس سے وہ ڈائری نکالی۔ اس ڈائری پر ایک کور چڑھا ہوا تھا۔ اس کی ڈپ کھول کر اسے اندر سے نکالا گیا تو کئی تصویریں بھی نکل آئیں۔ وہ ایک ایک تصویر کو ہاتھ میں سے گرد میٹھے لگے۔ سلطان کے ہاتھ میں میری تصویر تھی۔ اس نے کہا۔ ”بابا جانی کسی قدر جوان لگ رہے ہیں۔ یقیناً یہ میں ہوں۔ پہلا تاری کی ہے۔“

میرا نے اپنے ہاتھ کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہماری راجہ پھولی ہیں۔ تمہی خوبصورت لگ رہی ہیں؟“

سلطان نے اوجڑ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”راجہ پھولی ایک سیدھی سادی سی مشرقی خاتون تھیں۔ مگر تصویر میں راشیدہ نہیں ہیں۔ آئی بروز بنائی گئی ہیں۔ وہ بھی ایسا سبک اپ نہیں کرتی تھیں۔“

انہوں نے تصویر کو پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے لکھا ہوا تھا۔ ”رانا مانی سسر۔“

میرا نے کہا۔ ”یہاں لکھا ہے میری بہن رانا جبکہ راجہ لکھا ہے چاہے تھا۔“

میرا نے کہا۔ ”راجہ پھولی ایسی ماؤرن نہیں تھیں۔ یہ کوئی غیر مسلم لڑکی رانا ہے۔ بابا جانی نے اسے میری بہن رانا لکھا ہے۔ شاید اس لیے کہ پھولی کی ہم شکل ہے۔“

میرا نے تصویر دیکھ کر رانا کی کٹی۔ چہرے میں ایک شخص اسے پسائی رومات کے مطابق انٹوٹی پتار ہاتھ اور میں ایک سیکورٹی افسر کی وردی میں وہاں کھڑا ہوا تھا۔ ان کی شاہی کرائے والا باوری اور دوسرے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔

میرا نے کہا۔ ”یہ تصویر سمجھا رہی ہے کہ یہ ہماری راجہ پھولی نہیں ہیں۔“

”ہم کہاں تصویروں میں الجھ گئے ہیں؟ ڈائری پڑھیں۔“

”ہیں یہ دو تصویریں رو کی ہیں۔“

پھولی تصویر ایک حسین لڑکی کی تھی۔ اسے پلٹ کر دیکھا گیا۔ وہ اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ ”نیشی میوں۔“

میرا نے کہا۔ ”نام سے یہودی لگتی ہے۔ ہمارے بڑے میاں پانچیس کیسی کیسی حسین لڑکیوں کو پھلتے رہے ہیں؟“

انہوں نے آخری تصویر اٹھا کر دیکھی تو چونک گئے۔ نیشی ایک بچے کو گود میں لیے پار کر رہی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی تصویر کو پلٹ کر تحریر پڑھی۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ ”میں میری ڈارلنگ نیشی اور ہمارا بیٹا نامان۔“

میرا اور سلطان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سلطان نے ناگواری سے کہا۔ ”یہ ہے ہمارا باپ۔۔۔ پتا نہیں کہاں کہاں اولادیں پیدا کرتا رہا ہے؟“

میرا نے کہا۔ ”ان کا ایک بیٹا نامان جوان ہو چکا ہوگا اور نہ جانے کئی اولادیں جوان ہو کر خزانے کی مصیبت وار دھوے دار بننے کے لیے پرتول رہی ہوں گی؟“

”ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم ان سب سے پہلے اس امدون خزانے تک پہنچیں گے۔“

یہ کہتے ہی وہ ہنسنے لگا۔ میرا نے کہا۔ ”ہم نے ابھی کچھ حاصل نہیں کیا ہے۔ ابھی سے انتظار نہیں ہونا چاہیے۔“

وہ بولا۔ ”نیشی اس بات پر غصہ رہا ہوں کہ بابا جانی نے بچوں کی کہانی سنا لی تھی۔ کہا تھا کہ زمین سے نکلنے والے خزانے کے پیٹار طلبکار ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لڑتے لڑتے مر جاتے ہیں۔ مرنے سے پہلے سب ہی سوچتے ہیں کہ میں ہی آخر میں خزانہ حاصل کرنے کے لیے زندہ رہوں گا۔“

مراد نے کہا۔ ”ایسا ہوتا ہے اور ہمارے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ دعا کرو بابا جانی کی جن اولادوں سے ہم نے خبر لی وہ اس خزانے کی طرف نہ آ رہے ہوں۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ صرف ہم وہاں پہنچیں گے۔“

”یہی تو تھے میں کہا گیا ہے۔ سب یہی سوچتے ہیں کہ ہم پہنچیں گے۔ ہم حاصل کر سکیں گے۔ مگر وہ خزانہ کی کوئی ملتا۔“

”مراد بھائی آپ مایوس کرنے والی باتیں نہ کریں۔“

ڈائری پڑھیں۔“

وہ ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگے۔ پہلے صفحے پر جہاں ڈائری درج کرنے والے کا نام لکھا جاتا ہے۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ شہزادہ سلمان سعدی۔

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جہاں میرا نام ہونا چاہیے تھا۔ وہاں کسی اور کا نام لکھا ہوا تھا۔ سلطان نے کہا۔ ”کیا یہ بابا جانی کی ڈائری نہیں ہے؟“

مراد نے کہا۔ ”اگر ان کی نہیں ہے تو ان کے سیف میں کیوں رکھی ہوئی تھی؟ اس ڈائری کی کوئی اہمیت ہے تب ہی بابا جانی نے اسے سیف میں کر رکھا تھا۔ ہم پڑھیں گے تو اس کی اہمیت معلوم ہوگی۔“

وہ ایک ایک صفحے کو سرسری طور پر دیکھتے ہوئے گزرتے گئے۔ ایک صفحے پر لکھا تھا۔ ”رانا میری مرحوم بیوی رابعہ کی ہم شکل ہے۔ اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ پھر سے جی اٹھی ہے۔ میں نے اسے جی جان سے اپنی بہن بتایا ہے۔“

یہ تحریر پڑھتے ہی دونوں الجھ گئے۔ رانا کی تصویر اٹھا کر دیکھنے لگے۔ وہ حیرت میں وہن جی ہوئی تھی۔ ایک شخص اسے انگوٹھی پہنا رہا تھا اور میں ان کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ یہ نہ سمجھ میں آئے والی بات تھی۔ ڈائری کسی سلمان سعدی نے لکھی تھی کہ رانا اس کی بہن رابعہ کی ہم شکل ہے۔ جبکہ رابعہ میری بہن تھی اور میرے بیٹے بھی یہی کہہ رہے تھے کہ رانا ان کی بچوٹی کی ہم شکل ہے۔

میں رانا کی شادی کی تصویر میں دکھائی دے رہا تھا۔ جبکہ کسی سلمان سعدی کو ہاں ہونا چاہیے تھا۔

یہ تو ہنگامہ بازی بات ہوئی۔ اگر کہا جائے کہ میں تصویر میں نہیں تھا۔ میرا ایک ہم شکل سلمان سعدی وہاں تھا۔ یعنی بہن کی بھی ایک ہم شکل اور میرا بھی ایک ہم شکل۔ یوں میری روداد بڑی مشکل خیز ہو جائے گی۔

کیوں نہ اس داستان کو اچھے سے پہلے ہی سلجھا دوں مگر وہ ڈائری میں نے ہی لکھی تھی۔ میں نے ہی رانا کو بہن بنایا تھا اور میں ہی تصویر میں نظر آ رہا تھا۔ کسی شہزادہ سلمان

سعدی کا الگ سے کوئی وجود نہیں تھا۔ میں باقی میں دو مختلف ناموں سے زندگی گزارتا رہا ہوں۔ آگے چل کر اپنی دہری زندگی کی وضاحت کروں گا۔ فی الحال مراد اور سلطان کو اچھے دیا جائے اور وہ الجھ رہے تھے۔

تصویر میں نظر آنے والے کو سلمان سعدی تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ آخر مراد نے کہا۔ ”میدی ہی بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ رانا کے ساتھ تصویر میں بابا جانی ہی ہیں۔ ڈائری لکھنے والا سلمان وہاں موجود نہیں ہے۔“

”مگر ڈائری لکھنے والے نے یہ کیوں لکھا ہے کہ رانا اس کی مرحوم بہن رابعہ کی ہم شکل تھی؟ جبکہ رابعہ بچوٹی بابا جانی کی بہن تھیں؟“

وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ چلو مجھ کو دیر کے لیے فرض کر لو کہ بابا جانی فرضی نام سے یہ ڈائری لکھتے رہے ہیں۔ فی الحال آگے تو پڑھو۔ کیا لکھا ہے؟“

انہوں نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ ایک صفحے پر بنیسی کا ذکر آیا کہ وہ کسی طرح میری زندگی میں آئی پھر میرے ایک بیٹے کی ماں بن گئی تھی اور یہ بات میرے بیٹوں کی سوچ اور ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ وہ میرے خلاف تبصرے کرنے لگے۔ انہیں میری غیر شادیوں کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو رہا تھا کہ میں خطرناک حد تک مجاہدہ زندگی گزارتے ہوئے بڑی بڑی خفیہ تنظیموں سے منسلک رہا ہوں۔

وہ پڑھتے پڑھتے رک گئے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ مراد نے کہا۔ ”بابا جانی ہم سے دور جاتے تھے۔ پھر گھنٹوں اور برسوں تک ہم ان کی صورت نہیں دیکھتے تھے۔ یہی کبھی فون کے ذریعے خبر گیری سے معلوم ہو جاتی تھی۔“

”ہاں وہ برسوں میں کبھی چند دنوں کے لیے قسطنطنیہ لائف گزارنے آتے پھر چلے جاتے تھے۔ کیا بار بار طویل عرصے تک لاپتہ رہ کر ایسی خطرناک خبر مارتے زندگی گزارتے رہے ہیں جیسا کہ اس ڈائری میں لکھا ہے؟“

”نہیں سلطان یقین نہیں آتا۔ یہ سچ کچھ کسی سلمان سعدی کی ڈائری ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”پھر وہی سوال پیدا ہوگا کہ کسی سلمان نے ہماری بچوٹی کو اپنی بہن رابعہ کیوں لکھا ہے؟ پھر الجھتیں پیدا ہوں گی۔ پھر آپ کے سر میں درد ہوگا۔“

وہ سر کھباتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے ایک قلم رکھی تھی۔ ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیز۔ اس قلم میں ایک شخص دن کے وقت قریشی خلسات انسان بن کر رہتا ہے اور رات کو شیطان

بن جاتا ہے۔ کیا بابا جانی کبھی میر بن غازی اور کبھی سلمان سعدی بن جاتے ہیں؟“

”ہم یہی مان لیں تو بہتر ہے۔ ورنہ آپ کی طرح میرا سر بھی چکر اٹنے لگے گا۔“

”شاید آگے پڑھتے رہنے کے بعد ہم دہری شخصیت کا معاملہ کر سکیں۔“

وہ پھر سے پڑھنے لگے۔ پھر سے اچھٹے لگے۔ جب میرے دست راست اعظم مانی نے بتایا تھا کہ وہ دونوں بیٹے فائل جی ون اور ڈائری لے گئے ہیں تب ہی میں سمجھ گیا تھا کہ میرے باقی کے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھے گا۔ اس سے پہلے ہی مجھے ان سے وہ ڈائری اور فائل جیمین لینی چاہیے۔

اس وقت فخری فون ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا۔ پہلے نماز پڑھ لوں۔ پھر ان سے نمٹ لوں گا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسی پھرتی دکھائیں گے۔ جی فائل سے کراچی چلے جائیں گے۔

میرا جال نار عاقب ان کی کوشی میں پہنچا تو میری بہو نے کہا۔ ”وہ دونوں پندی گئے ہیں۔ اس نے عاقب سے اور انہیں جنس کے چیف رانا وشاد سے جھوٹ بول کر انہیں بھٹکا دیا تھا۔ میں ان کے لایا ہوتے ہی سمجھ گیا کہ وہ نشتے کراہتے طور پر کچھنے کے بعد لیسیا کی طرف گئے ہیں۔“

ان سے فون پر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے فون یا تو بند کر دیا تھا یا پھر سب بدل دی تھی۔ اگر وہ ملک سے باہر جا چکے ہوں گے تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں کس طرح ان کا اطمینان عمارت کر سکا ہوں؟

لیسیا کے وار السلطنت طرابلس اور دوسرے شہروں میں میرے جال نار موجود تھے۔ میں نے اسی مسئلے کے ذریعے مراد اور سلطان کی تصویریں ان سب کے پاس پہنچا دیں اور سمجھا دیا کہ انہیں غائب کرنے کے بعد سب سے پہلے فائل جی ون اور ڈائری حاصل کرنی ہے۔ اس کے بعد میں بتاؤں گا کہ ان کے ساتھ کیسا سلوک کرنا ہے۔

دن کے دس بجے تھے۔ میں اپنے بندہ آکر لیٹ گیا۔ پچھلی رات سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لیے لیٹے ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔ لیکن گہری نیند آئی کہ شاید میں شام تک یا رات تک سوٹا رہ جاؤں۔ مگر میرے ذہن میں نماز نہیں ہوئی تھی۔ میں تلہری اذان ہوئے ہی بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

ایسے ہی وقت فون کا بزرگ بجائی دیا۔ میں نے بھی سی اسکرین کو دیکھا۔ حجاب کال کر رہی تھی۔ میں نے فون دبا کر

فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ ”تم نے مجھے گہری نیند سونے کے لیے چھوڑ دیا۔ اب نماز کے لیے جگا رہی ہو۔“

وہ بولی۔ ”آپ پچھلی رات سے بہت تھکے ہوئے ہیں۔ وعدہ کر رہی ہوں نماز پڑھنے کے بعد کھانا کھا لیں گے پھر آرام سے سو جائیں گے۔“

”بس بہت آرام کر لیا۔ کچھ ایسی مصروفیات ہیں کہ ان سے نشتے کے لیے تازہ دم رہوں گا۔ ایک ٹھٹھے بعد کرنا گرم دھوئی لگاؤ۔ میں نماز پڑھ کر آؤں گا۔“

میں فون بند کر کے ہاتھ روم میں چلا گیا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر نماز ادا کی۔ آج شام چھ بجے شوکت شاہنواز سے ٹھٹھا تھا۔ میں نے اپنے دست راست اعظم مانی اور عاقب سے فون پر باتیں کیں۔ یہ معلوم کیا کہ وہ ادارہ تعلیم تربیت کی عمارت میں کچھ کرکس طرح موزے بنا رہے ہیں؟ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اس عمارت کے عربیہ ملازمین کو بھاری رقم دے کر خرید رہے ہیں۔ میرے وہ تمام جال نار شام چھ بجے سے پہلے ان ملازمین کی جگہ ڈیوٹی پر رہیں گے اور کوئی ان پر شبہ نہیں کر سکے گا۔

ہاسٹل کی انتظامیہ ایک پوزیٹو خاتون تھی۔ وہ نئے ملازمین کو دیکھ کر کچھ گڑبڑ کر رہی تھی۔ یہ طے کیا گیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں یا اندھ کر اسے کبھی قیدی بنا کر دکھا جائے گا۔ اس ہاسٹل کے پچھلے حصے میں ایک بڑا سا خوبصورت ساحل کدہ بنایا گیا تھا۔ جہاں بھی باپ جاتا تھا اور بھی بیٹا جا کر رنگ لیا کرتا تھا۔

میں نے سہ پہر تین بجے کے بعد حجاب اور عمارانی کے ساتھ کھانا کھایا۔ ان کے ساتھ خوب ہنستا ہوتا رہا۔ کھانے کے بعد ایک جال نار نے آکر ان دونوں بہنوں کی تصویریں اتاریں۔ تاکہ ان کے پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تیار کیے جا سکیں۔

ایسے وقت میرا فون ٹکٹاٹکٹا لگا۔ میں نے اسکرین پر شوکت شاہنواز کے نمبر پڑھے۔ پھر حجاب نے کہا۔ ”اب میں مصروف رہوں گا۔ ٹھوڑی دیر بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

واپسی میں کچھ دیر ہوگی۔ مگر رات کا کھانا تم دونوں کے ساتھ کھاؤں گا۔“

میں نے اپنے بندہ روم کی طرف جاتے ہوئے فون کا فون دبا دیا۔ اسے کان سے لگا دیا۔ پھر کہا۔ ”جناب! ابھی میں آپ ہی فون کرتے والا تھا۔“

شوکت نے کہا۔ ”میں صبح سے انتظار کر رہا تھا اب تک فون نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ کیا دوسری کے بھول رہے ہو؟“

ہم دونوں کرسیوں پر ایک دوسرے کے رو برو بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر صوفوں کے درمیان شراب اور خالی پائے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ ”یہاں جذبات کو بھڑکانے والی تصویریں بھی ہیں۔ شراب بھی ہے۔ مگر شراب کہاں ہے؟“

وہ بولا۔ ”نہم شاپ کے نہیں، نسیم من چھوڑیوں کے رسیا ہیں۔ وہ ابھی آجائیں گی۔ پہلے کام کی باتیں کی جائیں گی۔“

”پہلے میں یہ کیسا چاہتا ہوں کہ ہم عقل و شعور رکھنے والے انسان ہیں۔ آپ بتائیں ہم ایسے ہیں یا نہیں؟“

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”چیک ہم عقل و شعور رکھتے ہیں۔“

”ہم سیکھتے ہیں تو ہمارا ضمیر ہمیں سمجھاتا اور راستہ پلاتا ہے۔ آپ بتائیں لانا ہے یا نہیں؟“

”ہاں جیسی لانا ہے۔ مگر ایسی باتیں کرنے کا مطلب کیا ہے؟“

”میں معلوم کرنے آیا ہوں کہ تمہارے اندر ضمیر جاگتا ہے یا نہیں؟ تمہارے گھر میں آٹھ برس دس برس یا بارہ برس کی معصوم بھینس اور بٹیاں ہوں گی۔ کیا بچوں کی معصومیت کو بھنی کرتے وقت تمہیں اپنی بہنوں بیٹیوں کا خیال نہیں آتا؟“

وہ نامکوار سی بولا۔ ”تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ ہم حکومت کرنے اور دوسروں کی ذات سے فائدہ اٹھانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم بھی تو کم سن چھوڑیوں کے شیدائی اور شوٹین ہو؟“

”میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے شوق پر اور تھوکتا ہوں تم جیسے لوگوں پر۔۔۔“

وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ غصے سے گرجتے ہوئے بولا۔ ”کتے کہتے تو مجھ پر تھو کے گا؟ میں ابھی تجھے جہنم میں پہنچا دوں گا۔“

وہ ایسے تھلا رہا تھا جیسے میں نے سچ سچ اس پر تھوک دیا ہو۔ وہ فوراً ہی میرے سامنے آکر مجھے ایک الٹا ہاتھ رسید کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی گلائی پکڑ لی۔ پہلے اس نے بڑی آسانی اور آہستگی سے پھرتا چاہا۔ پھر زور لگاتے لگا۔ پتا چلا گلائی ٹھٹھے میں آگئی ہے۔ ہڈیاں بری طرح دکھ رہی ہیں۔ بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے جھٹکے دے کر خود کو پھرتا چاہا تو تکلیف اور بڑھ گئی۔

اس نے دوسرے ہاتھ سے مجھے ہاتھ پکڑا تو میں نے اسے بھی پکڑ لیا۔ اس بار میری گرفت کچھ زیادہ سخت ہو گئی تھی۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ

ہڈیوں کے ڈھانچے میں اتنی جان ہے۔ لیکن دونوں گلائیوں کی تکلیف اسے تیار رہی تھی۔ یقین دلاد رہی تھی کہ اس میں اتنی جان ہے کہ وہ جان بھی لے سکتا ہے۔

وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ ”چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی تم نے گلائیوں دی تھیں۔“

وہ بدستور کراہتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے الفاظ داپس لیتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”جو تم نے میرے لیے کہا وہ اپنے لیے کہو۔“

وہ انگار نکلیں کر سکتا تھا۔ تکلیف کی شدت سے ڈھرا ہو رہا تھا۔ ترپتے ہوئے بولا۔ ”میں کتا ہوں۔ میں کینہ ہوں۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔“

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا کر گر پڑا۔ فرش پر بیٹھ کر کبھی اس گلائی کو کبھی اس کاٹی کو سہلانے لگا۔ وہ ہاتھ ٹیک کر وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا۔ پھر تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ ”اودھ گاڈ! کیا تم نے میری ہڈیاں توڑ دی ہیں؟“

میں نے اپنے عصا کو اپنی کرسی پر رکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر اسے ایک جھٹکے سے اٹھاتے ہوئے کھڑا کر دیا۔

اس کمرے میں دو دروازے تھے۔ میں اسے سمجھاتا ہوا دروازوں کے پاس آیا۔ پھر انہیں اندر سے بند کر دیا۔ کھڑکیاں پہلے سے بند تھیں۔ اسے صوفے پر دھکا دے کر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”اب بولو۔ تمہارے کیا ارادے تھے اور اب کیا کرنا ہے؟“

وہ اپنی ایک گلائی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک ضروری کال کرنا چاہتا ہوں۔“

”اچھا تو اپنے کسی باپ کو دھوکے لیے بلانا چاہتے ہو؟ کوئی بات نہیں میں اجازت دے رہا ہوں۔ جسے کال کرنا چاہتے ہو کر۔“

وہ تکلیف برداشت کر رہا تھا۔ گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکالا۔ پھر نمبر ڈیٹ کرنے لگا۔ میں سامنے والے صوفے پر آرام سے بیٹھ گیا۔

اس نے فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو لے! میں مصیبت میں ہوں۔ فوراً آ جاؤ۔ ورنہ یہ مجھے مار ڈالے گا۔“

ادھر میں نے فون نکال کر نمبر ڈیٹ کیے۔ پھر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ایک باپ کو اس کے بیٹے کی آواز سناؤ۔“

یہ کبہ کمرش نے اپنا فون بند کر دیا۔ چند منیوٹ بعد ہی شوکت نے اپنے فون پر کالنگ ٹون سن لی۔ پھر اسکرین پر نمبر پڑا۔ ”میں نے کہا۔“ نمبر نہ پڑو۔ بات کرو۔“

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر مٹن دیا کہ فون کو کان سے لگایا تو دوسری طرف سے بیٹے کی آواز سنتے ہی چونک گیا۔ وہ بری طرح سہا ہوا کبہ رہا تھا۔ ”ڈیڈی! مجھے بچائیں۔ ورنہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”مرکت! میرے بیٹے! یہ تم بول رہے ہو؟ تم کہاں ہو؟“

اس نے کہا۔ ”پتا نہیں۔ یہ لوگ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر کہاں لے آئے ہیں؟ مجھ سے کبہ رہے ہیں۔ صرف آپ ہی مجھے بچا سکتے ہیں۔ جو آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ میری خاطر اس کے قدموں میں گر پڑیں۔“

فون بند ہو گیا۔ اگلوتے بیٹے کی محبت نے تڑپا دیا تھا۔ وہ ”ہیلو ہیلو۔۔۔“ کبہ کر چیتے لگا۔ ادھر دروازے پر دستک سائی دی۔ پھر بلے نے دروازہ پینے ہوئے کہا۔ ”غازی! دروازہ کھولو۔ اگر شوکت صاحب کی شان میں گستاخی کرو گے انہیں کوئی نقصان پہنچاؤ گے تو اس کمرے سے باہر نکل نہیں پاؤ گے۔ یہاں سے تمہاری لاش ہی ملے گی۔“

وہ پریشان ہو کر کبھی مجھے اور کبھی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہتے ہوئے کہا۔ ”ادھر بیٹے کی لاش اور ادھر تمہاری لاش اور تمہارا دھبہ جو کھٹے والا ٹھنڈا یہ نہیں جانتا کہ اس کی لاش اٹھانے والا بھی یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“

وہ بری طرح جھنجھٹ گیا تھا۔ اسے اپنی جان ہی نہیں بند کمرے کے پا رہنے کی بھی جان پہچانی تھی۔

میں نے کہا۔ ”ابھی تم نے تاش کا ایک پتہ کھلا۔ اسے ایک غنڈے کو بلایا۔ میں نے بھی ایک پتہ کھلا۔ تمہیں بیٹے کی آواز سنا دی۔ یہ نہ سمجھو کہ کھیل اتنی جلدی تم ہو جاؤ گے۔ تاش کے پاؤں سے ہوتے ہیں۔ ابھی دیکھو گے کہ میں کیسے کیسے پتے کھیلنے اور تڑپ چالیں چلے والا ہوں۔؟“

وہ بڑا ہی شاطر سیاستدان تھا۔ اسے سیاسی ہیرا پھیری میں مہارت حاصل تھی۔ وہ کالے دھن کو سفید کرنے اور سیاہ اعمال کو مفید بنانے کا ہنر جانتا تھا۔ مگر اس وقت ساری ہنر گریاں بھول گیا تھا۔

خوبصورت اور معصوم بچوں کی زندگیوں سے کھینچا آ رہا تھا۔ آج موت اس سے کھیلنے آگئی تھی اور اسے بچاؤ کا راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بلایا ہر سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ اپنے نئے حواریوں کے ساتھ اندر آنے کے لیے پیٹا تھا۔ اس

نے پوچھا۔ ”جناب عالی! آپ خیریت سے ہیں ناں۔؟ آپ غازی کو بتادیں کہ وہ حرام موت مرے آیا ہے۔ اگر آپ کو ہاتھ بھی لگے گا تو زندہ واپس نہیں جائے گا۔“

میں مسکرا رہا تھا۔ شوکت سچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے جھٹلا کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خاموش ہو جاؤ۔ شور نہ مچاؤ۔“

”جناب عالی! ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی پوزیشن کیا ہے؟ آپ اجازت دیں ہم دروازہ توڑ کر آ جائیں گے۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”تم اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر بڑے احکامات صادر کرتے ہو۔ چلو دروازہ توڑنے کا بھی گم دے دو۔“

اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے اپنی کلائیوں کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”مجھ سے یہ ہاتھ اٹھانا نہیں جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں یا ترخ گئی ہیں۔ میرے لیے فوری طبی امداد ضروری ہے۔“

”موت آنے والی ہو تو زندگی کی طرف لے جانے والا کوئی تسو ضروری نہیں ہوتا۔ دوا سیں بے اثر ہو جاتی ہیں۔ اسپتال کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں یہاں سے چلنے کی بات نہیں کروں گا۔۔۔ مگر تمہارے درمیان سمجھوتا ہونے تک میرا ٹیلی ڈائلنگ فون یہاں آسکتا ہے؟“

”آئے گا تو وہ بھی واپس نہیں جاسکے گا۔ بڑے ڈسپنٹ سیاستدان ہو۔ میں موت کو لازمی قرار دے رہا ہوں اور تم بڑے یقین سے سمجھوتا کرنے کی بات کر رہے ہو۔“

وہ بولا۔ ”ہم آج سے پہلے ابھی تھے۔ ہمارے درمیان نہ دوستی تھی نہ دشمنی۔ اس لیے جانی دشمن بن کر نہ بولو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں مجھ سے بھاری سے بھاری شرائط پر سمجھوتا کرو۔ مجھ پر امن و کرو۔ ایک بار مجھے آواز دے۔“

”آزاد ہو جاؤ۔ تم کیا کہتے ہو یہاں تمہاں؟ انہیں۔ تمہیں اس وقت معلوم ہو گا جب موت کی تاریکیوں سے اندھی گولیاں تمہارے غنڈوں کی طرف آئیں گی۔“

میں عصا کو تھام کر صوفے پر سے اٹھ گیا۔ ذرا اٹھنے کے انداز میں ادھر سے ادھر جاتے ہوئے بولا۔ ”مگر تم پر اندھا اعتماد کر کے یہاں بیٹھا آتا تو تم مجھے کیسے چوبے دان میں ڈال دیتے۔ خیریت حاصل کرنے تک مجھے زندہ رکھتے پھر مار ڈالتے۔“

میں نے پلٹ کر پوچھا۔ ”کیوں یہی کرنے والے

تھے ناں....."

وہ قانون پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی دونوں کھانیاں سونے پر رکھی ہوئی تھیں۔ چہرے سے تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بولا۔ "خدا کے لیے مجھے طبی امداد پہنچاؤ۔ تکلیف برداشت نہیں ہو رہی ہے۔"

"جب بھی بچوں پر ظلم کرتے تھے تو ان سے بھی تکلیف برداشت نہیں ہوتی تھی۔ تم ان کی طرح رفتہ رفتہ برداشت کرنا اور جیتا سیکھ جاؤ گے۔ بشرطیکہ میں تمہیں جینے دوں۔"

"ابھی بائیس نہ کرو۔ بڑے سے بڑا مطالعہ کرو۔ میں ابھی کروڑوں روپے تمہارے چیک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرانے لگا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اؤٹ کے منہ میں زیرہ دینے کی بات کر رہے ہو۔ جو سونے کا پتہ پاری ہے اور خزانہ چھپا کر رکھتا ہے۔ اس کے لیے کروڑوں روپے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟"

"میں اس سے بھی زیادہ دے سکتا ہوں۔"

"جان ہوں تم نے عمل کھلا کر قوی خزانہ لوٹا ہے۔ ٹھیک ہے میں سمجھتا کروں گا۔ باپ بیٹے میں سے کسی ایک کو زندگی ملے گی۔"

وہ گڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ "وہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ تو پھر میرا جاؤ۔ اسے زندگی دو۔"

"زندگی سب کو عزیز ہوتی ہے۔ پلیز غازی اسٹنڈل نہ بنو۔"

میں چلنے ہوئے اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے بولا۔ "پریس اور انٹیلی جنس کے ریکارڈز میں کریپٹ سائنڈن ہو۔ قابل بھی ہو۔ مگر شاطرات جاپانی چل کر قانون سے مکمل کر حفظ حاصل کر رہے ہو۔ میں بھی تمہیں ڈبیل وے سکتا ہوں۔"

وہ ذرا مطمئن ہو کر میرا منہ کھینچنے لگا۔ میں نے کہا۔ "تمہارے ملکی اور غیر ملکی لاکرز میں جتنی اہم دستاویزات ہیں۔ انہیں میرے حوالے کرو گے۔ کورٹ پیئر ذرا اپنے جرائم کی تفصیلات لکھ کر دیکھنا کرو گے اور انکوٹھے کے نشانات لگاؤ گے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "اس طرح تم مجھے زندہ چھوڑ کر ہریل مارتے رہو گے؟"

"ہاں۔ ایسی زندگی جیو گے کہ اپنی ذات سے جب بھی کسی کو نقصان پہنچانا چاہو گے تو میں چمکتے ہی تمہاری موت بن جاؤں گا۔"

باہر سے بلے کی آواز سنائی دی۔ "جناب عالی اہمیت دیر سے خاموشی ہے۔ میرا فرض مجھے بولنے اور کچھ کرنے پر

مجبور کر رہا ہے۔"

وہ تکلیف سے بے حال ہو رہا تھا اور میں اسے موت کا چہرہ دکھا رہا تھا۔ اس نے ہنستا کر کہا۔ "شٹ اپ۔ جہاں ہو وہاں خاموشی سے انتظار کرو۔"

پھر وہ مجھے دیکھتے ہوئے گڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ "جس طرح ابھی سمجھتا ہوتا ہے کہ داور فوراً ہی مجھے اسپتال پہنچاؤ۔"

میں نے اس کے سامنے آکر عصا کو قانون پر مارتے ہوئے کہا۔ "زیادہ تا تک نہ کرو۔ میں ایکٹنگ کرنے والوں کو خوب پچھاتا ہوں۔ بے شک تکلیف کچھ ناقابل برداشت ہوگی۔ مگر تمہارا ناں رفتہ رفتہ برداشت کرنے لگو گے۔ تم کم سن بچوں کو یاد کرتے رہو۔"

"میں تمہاری بات مان رہا ہوں۔ مگر تمام دستاویزات تمہارے حوالے کرنے کے لیے مجھے یہاں سے سوئیٹزر لینڈ کے بینکوں میں جانا ہوگا تمہاری مطلوبہ چیزیں میں ہی لاکرز سے نکال سکتا ہوں۔"

"مجھے نہ سمجھاؤ۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ تمہیں یہاں سے لے جایا جائے گا۔ تمہاری دیکھی ہوئی کلائیوں کو آرام پہنچایا جائے گا۔ کل میرے آجیوں کے کمراتی میں یہاں کے لاکرز سے میری تمام مطلوبہ چیزیں نکال کر لاؤ گے۔ اس کے بعد میرا ہر ستر پکے کاغذات پر تمہارے جرائم کی تفصیل لکھواؤ گے۔ تم مزید مطالبات پورے کرنے کے لیے سوئیٹزر لینڈ بھی جاؤ گے۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اس کے چہرے سے اطمینان بھٹک رہا تھا۔ اسے یہاں سے بیٹھ جانے پھر ملک سے باہر جانے کی چھوٹ ملنے والی تھی۔ وہ مجھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے شاطراتانہ چالیں چل کر یا تو مجھے قانون کی گرفت میں لے سکتا تھا یا ملک کر اسکا تھا یا ایک بار پھر قیدی بننے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے راستے مکمل رہے تھے۔

اس نے کہا۔ "تم جو کہو گے وہ کرتا ہوں گا۔ یہ میرے تمہارے معاملات ہیں۔ میرے بیٹے کو ہار کر دو۔"

"سو رہی۔ میں اسے ضمانت کے طور پر اپنا مہمان بنا کر رکھوں گا۔ اس کی سلامتی کی خاطر کل تم بیٹھ جا کر کوئی کہیتہ پن نہیں دکھا سکو گے۔"

وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "میں بیٹے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے عاقبت سے فون پر پوچھا۔ "برکت کا کیا حال ہے؟"

وہ بولا۔ "میرا ہم نے اسے مار چھ نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود وہ بری طرح سہا ہوا ہے۔ بہت ہی بزدل ہے۔"

"اسے بہت احتیاط سے قیدی بنا کر رکھنا ہے۔ ابھی باپ بیٹے کی بات کرنا۔"

میں نے فون بند کر کے شوکت سے کہا۔ "تمہارے بیٹے پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا گیا ہے۔ پھر بھی وہ سہا ہوا ہے۔ اسے سمجھاؤ جب تک تم سوئیٹزر لینڈ سے واپس نہیں آؤ گے وہ ہمارا قیدی بن کر رہے گا۔"

"پلیز۔ میرے بیٹے پر ایسا ظلم نہ کرو۔ میں تمہارے اشارے پر چلتا ہوں گا۔ اسے رہا کر دو۔"

"مجھ سے نادانی کی توقع نہ کرو۔ جو کہہ رہا ہوں۔ وہی کرتے رہو۔"

اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ کل آدھی قسطی۔ میں نے کہا۔ "تمہارا بیٹا کیا کر رہا ہے؟"

اس نے فوراً ہی فون آئینڈ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹے اتم خیریت سے ہو؟"

وہ بولا۔ "آپ کیا پوچھ رہے ہیں ڈیڑی۔ کیا دشمنوں کی قیدی میں کوئی خیریت سے رہ سکتا ہے؟"

"کیا تم سے قیدیوں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے؟"

"ایک بات نہیں ہے مگر ایسا کیا جا سکتا ہے۔"

"تھر نہ کرو۔ میں یہاں معاملات طے کر چکا ہوں۔ وہاں تمہیں کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"آپ معاملات طے کر چکے ہیں تو پھر مجھے رہائی کیوں نہیں مل رہی ہے؟"

"کچھ مجبوریاں ہیں۔ تمہیں وہاں دو چار دنوں تک قیدی بن کر رہنا ہوگا۔"

"میں آپ جیسے مشہور و معروف سیاستدان کا بیٹا ہوں۔ تو جین کے احساس سے مر جاؤں گا۔ آپ اپنے ذرائع اور اختیارات کیوں استعمال نہیں کر رہے ہیں؟"

"ہم دونوں بری طرح غلبے میں آگئے ہیں۔ میں اثر و رسوخ استعمال نہیں کر سکتا ہوں۔"

"آپ مجھے بتائیں یہ ہم سے کون دشمنی کر رہا ہے اور مجھے یہاں تک تک رہنا ہوگا؟"

"تم میرے معاملات کو سمجھ نہیں پاؤ گے۔ میں یہ سمجھ لو کہ تمہیں نہ جانے کے باوجود وہاں قیدی بن کر رہنا ہوگا۔ میں جلدی نہیں رہائی ولاؤں گا۔"

میں نے اس سے فون لے کر برکت سے کہا۔ "تم نے باپ کی بات سن لیں۔ اب وہاں آرام سے رہو۔ تمہیں میں

وقت کی روئیاں ملتی رہیں گی۔"

میں فون بند کر کے اسے شوکت کے سامنے صوفے پر پھینک کر بیٹھنے لگا۔ وہ میرا منہ کھینچنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ "جانتے ہو کیوں نہیں رہا ہوں؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ "بیٹے کی کال آتے ہی تم نے رگ کروٹ اٹھالیا۔ کلائی کا درد کہاں گیا؟"

وہ چونک کر اپنی کلائیوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "بڑے ڈراما باز ہو۔ اسی لیے تو سیاست میں ہو۔"

وہ تکلیف سے منہ جاتے ہوئے بولا۔ "میں سچ کہتا ہوں۔ بہت تکلیف ہو رہی ہے مگر میں برداشت کر رہا ہوں۔"

"اگر میں کہہ دوں کہ آؤ اور مگر بیروں سے چل کر جانے کی اجازت نہیں دوں گا تب ضرور ہاتھوں کے مل رہی گئے ہوئے چاؤ گے۔"

"میرا انداق نہ اڑاؤ۔ مجھ پر میری ہار نہ کرو۔ ڈاکٹر کو بلاؤ یا اسپتال لے چلو۔"

"میرے آدھی تمہیں مکن پوائنٹ پر یہاں سے لے جائیں گے۔ اس سے پہلے بلکہ حکم دو کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تمام ہتھیار پھینک کر دونوں ہاتھ اٹھا کر باہر چلا جائے۔"

وہ جلد سے جلد طبی امداد چاہتا تھا۔ پھر وہاں سے باہر جانے کا موقع ملنے والا تھا۔ اس نے فوراً ہی بلے فون پر حکم دیا کہ وہ ہتھیار پھینک کر اپنے حواریوں کے ساتھ وہاں سے دود چلا جائے۔ بعد میں اس سے فون پر رابطہ رہا۔

وہ حکم کا بندہ تھا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد فون پر کہا۔ "میں اپنے آدمیوں کے ساتھ عمارت سے باہر آ گیا ہوں۔ کیا آپ کو رہائی مل رہی ہے؟"

شوکت نے کہا۔ "میری فکر نہ کرو۔ میں غازی کے ساتھ یہاں سے جاؤں گا۔ تم کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہ کرنا۔"

میں نے کہا۔ "بلے سے کہو وہ ابھی اس کمرے میں تھا اور تھپتا اسکا ہے۔"

شوکت نے خیرانی سے مجھے دیکھا۔ پھر فون پر کہا۔ "غازی تمہیں میرے پاس تنہا آنے کی اجازت دے رہا ہے۔ کوئی ہتھیار اپنے ساتھ نہ رکھو غازی ہاتھ آجائے۔"

وہ بولا۔ "میرے من کی مراد پوری ہو رہی ہے۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

میں نے اعظم پانی سے فون پر کہا۔ "یہ دیکھو کہ بلے کے تمام ساتھی ہتھیار چھوڑ کر جا چکے ہیں بائیس؟ صرف یہاں بلے کو رہنے دو۔ باقی لوگوں پر لوز فائر کرو۔ وہ بھاگ جائیں گے۔"

ایسے وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ بلے نے کہا۔

سہیڈ الہجت 105 ستمبر 2010

گناہوں کو موت کے لکھتے اتار رہا ہے۔ تمہاری جھڑپا میں خدا کی سزاؤں سے بچتا رہا ہے جو غلط ہے وہ غلط ہے اور ایسے لوگ اپنی سزا کو ضرور پہنچتے ہیں۔ سوچو سمجھو کیا تمہارے ساتھ بھی ایسا ہوگا؟

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے حلق پر ایک پاؤں کا دباؤ ڈالا وہ نیم بیڈی کی حالت میں ذرا دیر بیٹھ گیا پھر بیٹھ کے لیے سناکت ہو گیا۔ دنیا کا برطانت و ایک معینہ مدت تک موت کو کچھا ڈاڑھ رہا ہے۔ پھر وقت پورا ہوتے ہی خود کچھا ڈاڑھ کھا کر مر جاتا ہے۔

اس کا قصہ تمام ہوتے ہی میں نے اچانک کمزوری محسوس کی۔ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ وہاں سے پلٹ کر ڈھکے جا ہوا ایک صوفے پر آکر گر پڑا۔ یوں ہانپنے لگا جیسے اب تک اپنی توانائی سے اپنی قوت برداشت سے زیادہ محنت اور مشقت کرتا رہا ہوں۔

یہ عجیب بات تھی۔ مگر مجھے اپنی اوقات معلوم ہو رہی تھی کہ میں جوان نہیں ہوں۔ ابھی بوڑھا ہی ہوں۔ جیسا کہ مجھے آگاہی تھی اس کے مطابق میں ایک ایک دن کے حساب سے جوانی کی طرف جاتا رہوں گا تب بڑھا پختہ ہوگا اور مستقل توانائی حاصل ہوتی رہے گی اور تب اس طرح باتیں ہونے کمزوری محسوس نہیں کروں گا۔

ابھی ایسے تجربے سے گزر رہا تھا جو نے اور ان کے تھے۔ جوانی بھٹکیاں دکھا کر جاری تھی۔ یہ یقین ہو رہا تھا کہ وجہ سے دھیرے ہی کبھی خوشگوار تبدیلیوں کی طرف رجھتا جا رہا ہوں۔

شوکت کو بے کی موت کا صدمہ تھا۔ وہ مجھ سے بری طرح سہم گیا تھا۔ مجھے توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ میں ان لحاظات میں بہت ہی بوڑھا اور کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ وہ خود کو کچھا رہا تھا۔ "نہیں نہ نظروں کا دھوکا ہے۔ ابھی اس نے غیر معمولی قوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ بے جیسے باڈی بلڈز بڑی آسانی سے موت کے لکھتے اتار چکا ہے۔ ابھی خواہ مخواہ ہانپ رہا ہے۔ کمزوری ظاہر کر رہا ہے۔ یہ یونہی ہم سب کو دھوکا دیتا ہے۔ یہاں وہ کل چیر پر آتا تھا۔ بہت ہی ڈراما باز ہے۔ تھوڑی دیر بعد میری ٹھکن دور ہوتی کمزوری کا احساس ذرا کم ہوا تو میں نے فون پر پوچھا۔ "اعظم کیا یہاں موجود ہو؟"

"نہیں سر! میں دروازے کے پاس ہوں۔ بے کے تمام آدمیوں کو یہاں سے ہٹا دیا گیا ہے۔ عرصہ کو تمام آدمی ہٹا دیے گئے ہیں وہاں سے اٹھ گیا۔ اسے کھول کر دیکھا۔ وہ دو

ساتھیوں کے ساتھ وہاں تھا۔ میں نے کہا۔ "شوکت شاہنواز کو اس کے بیٹے سے دور قیدی بنا کر رکھا جائے گا۔ وہاں میرا فیملی ڈاکٹر اس کا علاج کرے گا۔"

اعظم جاتی اور دو بہت جلدیوں نے اندر آکر بیٹے کی لاش دیکھی پھر بیڑی حیرانی سے مجھ کو دیکھا۔ ایک نے اسے چھو کر نونوں کر یقین کیا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس نے یقین کرنے کے باوجود بے یقینی سے پوچھا۔ "سر! اسے آپ نے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ ایک چھوٹی سی گناہی کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔ جب موت آتی ہے تو بڑے سے بڑا شہرور کمزور کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔"

ہماری دنیا میں بڑی عجیب و غریب باتیں ہوتی ہیں۔ ہم انہیں سنتے ہیں دیکھتے ہیں پھر اپنے کام میں لگ کر بھول جاتے ہیں۔ کوئی کہاں تک دیکھے اور یاد رکھے۔ دنیا کا عجیب خاندان ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں اور یہ سوچ کر گزر جاتے ہیں کہ ہماری زمین پر جو ہو جائے وہ کم ہے۔

وہ شوکت کو وہاں سے لے جانے لگے۔ میں نے اعظم ثانی سے کہا۔ "تم میرا رخصتا قریشی کے ساتھ کل شوکت کو بینک لے جاؤ گے۔ وہاں سے اس کی اہم دستاویزات حاصل کی جائیں گی۔ پھر گورنر جج پر اس سے اقبال جرم کرایا جائے گا۔ اب اسے لے جاؤ۔"

شوکت جرم کی طرح سر جھکا کر وہاں سے جانے لگا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو ناکارہ بنا دیا تھا اور بے کی موت نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود وہاں سے جاتے وقت وہ کسی قدر مطمئن تھا۔ اس چار دیواری سے باہر جا کر امید تھی کہ وہ مجھ سے نجات پانے کے لیے کچھ کر سکے گا۔

میں وہاں سے رخصتا قریشی کے گھر آیا۔ وہ میری اچانک آمد پر حیران ہوا۔ خوش ہو کر بولا۔ "آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت کی ہے۔ میرے ساتھ رات کا کھانا ضرور کھا لیں گے۔"

رات کے آٹھ بجے تھے۔ میں نے اس کے ساتھ کھانے کے دوران اپنے تمام حالات بتائے پھر کہا۔ "آپ ابھی وہاں جائیں گے جہاں شوکت شاہنواز کو قیدی بنا کر رکھا گیا ہے۔ اس سے بچنے کا غدار پر تمام جرائم کا اعتراف کرائیں گے۔ کل بینک سے جو اہم دستاویزات حاصل ہوں گی ان کے مطابق بھی اس سے کائنات کھولا کر اسے پوری طرح قانونی تھپتھپ میں بھڑکائیں گے۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ وہ قانونی قلعے سے کبھی نکل

نہیں پائے گا۔ ہیٹ آپ کے اشاروں پر تیار ہے گا۔"

کھانے کے بعد رخصتا قریشی اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے شوکت کے پاس چلا گیا۔ ان باپ بیٹے کی کشمکش سے گھر والے پریشان ہو سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے ہمارے حکم کے مطابق قون کے ذریعے اپنے گھر والوں سے رابطہ کیا۔ بیوی بچوں سے کہہ دیا کہ وہ ضروری کام سے پڑھی گئے ہیں۔ دو چار دنوں میں واپس آجائیں گے۔ گھر والے ان کی عدم موجودگی سے پریشان نہ ہوں۔

میں اپنی رہائش گاہ میں آ گیا۔ حجاب اور غدا رانی میرے انتظار میں بھوکے پیٹھے تھیں۔ میں نے ندا کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "سوری۔ قریشی صاحب نے اپنے ساتھ کھانے کو کہا تو میں انکار نہ کر سکا۔ کھانے میں ان کا ساتھ دینا ہی پڑا۔ تمہیں آدھی رات تک انتظار نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

میں نے حجاب کو دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملتے ہی جلدی سے ندا کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "بے یقینی بھوکے پیٹھے رہتی۔ چلتے پھرتے کھاتی پیتی رہتی ہے۔ اب ایسا نہ بنائے بیٹی ہے جیسے بیچاری کو بھوکا پیاسا رکھا گیا ہے۔"

وہ ہاتھ چھپا کر بولی۔ "چلتے پھرتے کھاتی اور بات ہے۔ رات کی روٹی تو نہیں کھاتی ہے۔"

پھر اس نے میری طرف کھمک کر کہا۔ "یہ دراصل آپ پر یہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ آپ کے انتظار میں صرف یہی بھوکا رہ سکتی ہیں۔ میں نہیں رہ سکتی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھئی میں مانتا ہوں تم میری خاطر بھوکا رہ سکتی ہو۔"

پھر میں نے حجاب سے کہا۔ "تم سے کہہ کر گیا تھا کہ مجھے دیر ہو جائے گی۔ پھر بھی تم انتظار کرتی رہیں۔"

اس کا ہاتھ ندا کے سر پر تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ سر جھکا کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں بار بار دروازے اور کھڑکی کی طرف جارہی تھی۔ باہر دور تک دیکھ رہی تھی۔ آپ کی آہٹ پر کان لگے ہوئے تھے۔ میں کیا بتاؤں مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔"

جودل میں اتر جاتے ہیں۔ روم میں بیٹھا جاتے ہیں۔ ان کے پیار کے انداز میں ایسی ہی بے چینی ہوتی ہے جیسا کہ حجاب کی اداؤں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے اب تک کی زندگی میں ہوس پرستوں کو دیکھا تھا۔ پہلی بار بے لوث محبوب کا چہرہ مجھ میں دیکھ رہی تھی۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میری زندگی میں جاتے کتنی حسینا کھینچی تھیں۔ کسی نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ پہلی بار وہ اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ شاید میں اس لیے بھی متاثر ہو رہا تھا کہ ایک نئی اور انوکھی زندگی کا پہلا قدم اٹھاتے ہی وہ میرے اندر آکر بیٹھ گئی تھی۔

میرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر تھا۔ ہم ایک دوسرے کو اپنے اندر گہرائیوں تک محسوس کر رہے تھے۔ ندائے آنکھیں ہٹا کر دیووں کو اوپر کی طرف گھما کر کہا۔ "یہ میرا سر ہے۔ پرندوں کا گھونسلہ نہیں ہے۔ یہ دیوئوں کا جوڑا تک تک بیٹھا رہے گا؟"

ہم نے ایکدم سے حجب کر اس کے سر پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ حجاب نے فوراً ہی پلٹ کر آنکھیں سر پر رکھ لیا۔ وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ "میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے ندا سے کہا۔ "تم بہت شریر ہو۔ وہ دیواری شرماتی ہوئی گئی ہے۔"

اس نے بڑی محبت سے کہا۔ "بائی شرماتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں ناں؟"

میں نے بڑے جذبے سے کہا۔ "بہت اچھی... دیکھتے رہنے کو بی چاہتا ہے۔"

"جب آپ نہیں ہوتے تو آپ کے بارے میں اتنا بولی ہیں اتنا بولی ہیں کہ میں سنتے سنتے تھک جاتی ہوں۔"

میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "کیا بولی ہیں؟"

"اب آپ مجھے تھکا دیں گے۔ یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بولنے رہیں اور سنتے رہیں؟"

میں نے خلا میں نکلتے ہوئے کہا۔ "جی تو چاہتا ہے وہ ہر لمحہ میرے ساتھ رہے۔ میں اس کے ساتھ مگر کھڑکی سر کر رہا ہوں۔ مگر میں مصروفیت کا قیدی ہوں۔ دنیا والوں نے مجھے اپنے اپنے طور پر بھڑک رکھا ہے۔"

واقعی مجھے شہوت سے احساس ہونے لگا کہ زندگی میں بہت کچھ پانے کے باوجود اب تک پیار کی پکی مسرتوں سے محروم ہوں۔ میرا خاندان دور تک پھیلا ہوا تھا۔ بیٹے بہو بیٹی داماد بھوتے پوتیاں تو اسے لو لیاں سب ہی رشتے تھے مگر رشتوں کی پکی ٹھکنیں نہیں تھیں۔

یہ میں جان کر آ رہا ہوں کہ وہ سب کس طرح میری زندگی میں ڈھکھولتے رہے تھے۔ میں حوصلے اور پامردی سے زہریلی بیڑیوں کا توڑ کر رہا تھا اور حجاب مجھے بڑے پیار سے جوڑ رہی تھی۔ دل کی دنیا کو سبز و شاداب بنا رہی تھی۔

میں خوش نصیب ہوں کہ خدا مجھ سے خوش ہے۔ آئندہ



درستگی

ثمر عباس

زندگی میں ہمیشہ سب کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ اگرچہ انسان پرلر یا پلاننگ کرتے ہوئے کوئی بھی غلط کام درست سمجھ کر انجام دے اور نتیجہ اس کے برعکس نکلے تو انسانی ذہن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو ہی جاتا ہے۔ اس کے بھی ایک ہاتھ میں بلین ڈالرز تھے اور دوسرا ہاتھ ایسے خالی تھا جیسے کسی مفلوک الحال کا ہو۔

لاکھوں کا وقت نوا کر سکھ کے چنریل پائے والے کا قصہ

کے چھپے آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ابھی کون ہے اور اس طرح وہ اٹھائے اس کے گھر میں کیوں محسوس آیا ہے۔ ویسے وہ اس سے خطرہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اسے اول جولائی صبح کے باوجود وہ خطرناک نہیں لگ رہا تھا۔ پھر بھی مار کرنے اطمینان محسوس کیا کہ کی اور بچے گھر نہیں تھے۔ گی کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ چند دن کے لیے اس کے گھر تھی۔ بچوں کے اسکول سرماہی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھے۔ اس لیے وہ بھی ماں کے ساتھ چلے گئے تھے۔

مار کرنے لچکا کر کہا۔ ”معاف کرنا میں نے تم کو پہچانا نہیں۔ کہیں تم فلا جاکہ تو نہیں آ گئے ہو؟“

”کیا تم مارکر نہیں نہیں ہو؟“ اس آدمی نے سوال کیا۔ ”آئیو اسکے ایک قصے راک مین کے رہنے والے؟“

”ہاں میں ہی مارکر نہیں ہوں اور میرا تعلق راک مین سے ہی ہے۔“

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک خراب چلیے والا شخص کھڑا تھا۔ اس نے ایک میلا کپڑا اور سخت حال سوٹ پہن رکھا تھا جو اتنا برا تھا کہ اس کی سلاخی بھی جواب دینے لگی تھی۔ اس کے بال نصف سفید تھے اور ستے ہوئے چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر اس نے منکر اکرا کہا۔

”ہیلو مارکر...“ یہ کہتے ہوئے وہ اندر آ گیا۔ مارکر اس کے زرد دانت دیکھ رہا تھا جنہیں شاید برسوں سے برش نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس کے پاس سے ایسی بو آ رہی تھی جیسے اس نے ایک مہینے سے غسل کی زحمت نہ کی ہو۔ وہ صید حمار کر کے گھر کے بچے سمجھے کیونکہ روم میں آیا۔ اس نے سوٹ کیمرہ کا کین پر رکھے اور خود آئینہ دیکھ کر اس پر اذہر ہو گیا۔ مارکر حیران پریشان سا اسے دیکھتے ہوئے اس

اس نے آنکھیں دکھائیں پھر منکر اکرا کہا۔ ”بس اتنی سی تنہائی غنیمت ہے۔ ہاتھ چھوڑیں وہ آتے والی ہے۔“
”وہ ہمارا دروازیہ ماں نہیں ہے۔ درزی کیوں ہو؟“
”آپ اسے نہیں جانتے۔ دیکھ لے گی تو ہمارا ریکارڈ لگائے گی۔ جب آپ نہیں رہیں گے تو ایک سے ایک ملکی گاٹا منگاتے ہوئے مجھے چھوڑی رہے گی۔“

مجھے آہستہ سی سنا دی۔ میں نے فوراً ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ دوواش روم کا دروازہ کھول کر منگاتی ہوئی آ رہی تھی۔

”سامجھی میرے من کے“
”میرے تن آئین کے“
”چاہے سانس یہ چھوٹے“
”ہاتھ سے ہاتھ نہ چھوٹے“

پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”ہائے جی جی! آپ نے تو ہاتھ چھوڑ دیا ہے۔“

حجاب نے جھنجھٹے ہوئے کہا۔ ”میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی یہ چنریل چپ گرد کچھ رہی ہوگی۔“

میں نے ہتے ہوئے غدار کو سمجھ کر چوم لیا۔ پھر کہا۔ ”میں ایسی ہی ہستی منگاتی ہوئی بیار بھری زندگی چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہے۔ انشاء اللہ ہم بہت ہی خوبصورت زندگی گزارتے رہیں گے۔“

میری بات ختم ہوتے ہی وہ بالوں میں چھج کر کہنے لگا۔ ”خوابوں کی جگہ سے واپس آ جاؤ۔“

”کون کون سا؟“ پھر بولا۔ ”ہیلو فرمائیے؟“

مراد کی آواز سنا دی۔ ”ہائے بابا جانی اہم یقین سے کہتے ہیں۔ آپ انگاروں پر لوٹ رہے ہوں گے۔“

میرا موڈ ایکدم سے خراب ہو گیا۔ حجاب اور ندا کے ساتھ ہتے ہوئے وقت جیسے پتھر آکر لگا تھا۔ میں نے ناگواروی سے کہا۔ ”بابا منٹ کے بعد کال کرو۔“

میں نے جواب سے بغیر فون بند کر دیا۔ پھر دونوں بہنوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جب تک حالات سازگار نہیں ہوں گے۔ سر تیں یونہی خوابوں کی طرح آتی جاتی رہیں گی۔“

سوری۔ میں ابھی ہنسنے لگا۔ تم دونوں آرام سے کھاؤ پھر سو جاؤ۔ صبح ملاقات ہوگی۔“

”کون چاہتا ہے کہ سرتوں کو چھوڑ کر باقی ماحول میں جائے؟ کیا کیا جائے جانا ہی پڑتا ہے۔“

”جس و تنہا سے بیرونی و مزید واقعات اٹھلے شمار ہیں۔“

”جس و تنہا سے بیرونی و مزید واقعات اٹھلے شمار ہیں۔“

”جس و تنہا سے بیرونی و مزید واقعات اٹھلے شمار ہیں۔“

”جس و تنہا سے بیرونی و مزید واقعات اٹھلے شمار ہیں۔“

”جس و تنہا سے بیرونی و مزید واقعات اٹھلے شمار ہیں۔“

ایک نئی ازروائی اور سرتوں بھری گریلو زندگی گزارنے کے لیے حجاب اور ندا آگئی تھیں۔ ندانے کہا۔ ”بابا جی کتنی ہیں میں آپ کو بھائی جان کہا کروں مگر میں نے انکار کر دیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیوں انکار کیا ہے؟“

”مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”پھر اچھا لگتا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”میں آپ کو کبھی بھائی جان نہیں کہتی ہوں۔“

”جی جی کیوں کہنا چاہتی ہو؟“

”اس لیے کہ آپ ابھی بھائی ہیں نہ بہنوں کی ہیں۔ تہ

ادھر ہیں نہ ادھر ہیں۔ اس لیے جی جی بھی نہیں کہہ سکتی۔ جی جی کو کہنا چاہتی ہوں۔“

”میری طرف سے اجازت ہے۔“

”بابا جی کل کرا جاؤ نہیں دیں گی۔ اوپر سے آنکھیں دکھائیں گی مگر دل میں لٹو چھوڑتے رہیں گے۔“

میں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت مارتے ہوئے کہا۔ ”چھوٹی ہو مگر عقل کی کسوٹی ہو جانی کا اندر سے خوب پرکھتی ہو۔“

حجاب دروازے سے کھانے کی ٹرائی لاتے ہوئے بولی۔ ”میری طرف سے ایک ہاتھ اور ماریں۔ اس نے ضرور ایسی ویسی بات کی ہوگی۔“

میں نے کہا۔ ”ایسی ویسی نہیں بڑی خاص بات کہی ہے۔ یہ آج سے مجھے ہی جو کہے گی۔“

وہ ایکدم سے شرمائی۔ اس نے سر پر آٹھل رکھتے ہوئے بہن کو گھور کر دیکھا۔ ندانے کہا۔ ”دیکھیں جی جی! یہ آنکھیں دکھائیں گی۔ اب ذرا ان کے دل کا حال پوچھیں؟ میں کھانے سے پہلے ہاتھ ضرور دھوئی ہوں۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔ حجاب نے میز پر ڈشیں رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت بولنے لگی ہے۔“

”اور جو بات بولی ہے وہ دل گوشتی ہے۔ بے ٹال؟“

وہ زرباب منکر لگی۔ ”ڈشیں رکھنے کے لیے قریب آئی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ کی ٹکڑیاں کتنی تھیں کہ وہ بھی میری طرح بدترین حالات سے گزرتی آئی ہے۔ وہ حالات کی ماری تھی۔ میں رشتوں کے لہو کا مارا تھا۔ خدا نے ہمیں پیار کی محنتی چھائیوں میں پہنچا دیا تھا۔“

وہ واش روم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاتھ چھوڑیں۔“

”ہاتھ چھوڑوں گا تو خیارہ جاؤں گا۔“

”اطمینان۔ کہیں میں آپ کو ہاتھ چھوڑنے نہیں آئی ہوں۔“

تو یقینی طور پر مسلحہ ہن جاؤں گا۔ میں اتنا سونا حاصل

مارکر ایک برٹش میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔
فرہنگ کے زمین میں واضح نہیں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے
مارکر باس ہی ایک فن کا کالج میں داخل ہو گیا تو فرہنگ نے
عمومی تعلیم کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ جب تک اس
مگر تجویز کیا مارکر نے فی ٹیک مکمل کر لیا۔ اب اس کا
مزید پڑھنے کا تھا لیکن مارکر کے باپ نے اس کی مزید
بوجھ اٹھانے سے معذرت کر لی تھی۔ کیونکہ وہ ریٹائرمنٹ
پاس تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے بڑے بچے کے لیے کچھ رقم
لے۔ اس لیے مارکر نے ملازمت کا فیصلہ کیا اور اس
راک ٹن انڈسٹریل کمپنی میں ایک کارخانے
ملازمت حاصل کر لی۔ اگرچہ اس کی تنخواہ کم تھی۔ صرف
چھتر ڈالرز ہفتہ اور وہ اس میں صرف اپنا کرایہ کرسکا
تھا۔

☆☆☆

کانٹوں میں چھڑی چھپے جانے والے چند افراد اس حالت میں مارے بھی گئے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ مقامی حکومت نے اس بار کانٹوں کے راستے بند کرانے کے ساتھ وہاں پولیس کا پتہ بھی لگھ دیا اور اگر کوئی پھر کانٹوں میں مٹھنے کی کوشش کرتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے

”جہیں۔“ فریک نے کہا اور مارکر کو ایک کاغذ دکھایا۔
 ”میں نے حکومت سے کانوں کے درمیان ایک ایکڑ زمین پر
 کام کرنے کا لائسنس حاصل کر لیا ہے۔“
 ”کام کرنے کا؟“ مارکر نے حیرت سے کہا۔ ”یعنی تم
 نے کان کنی کا لائسنس حاصل کیا ہے؟“
 ”لائسنس کام کرنے کا ہے، کان کنی کا نہیں ہے۔“
 فریک نے منہ ہٹایا۔ ”کان کنی کا لائسنس ایسے نہیں ملتا ہے۔“
 ”تب تم کیا کرو گے؟“

”میں اس زمین پر کھدائی کروں گا اور گڑھا بنا کر مٹی
 نکالوں گا اور پھر اسے پھیل کے پانی سے صاف کر کے اس
 سے سونا نکال لوں گا۔ اس میں وقت اور محنت تو بہت چاہیے
 لیکن مجھے کانوں میں کھسکا نہیں پڑے گا اور میں آسانی سے
 کام کر سکوں گا۔“
 ”سونا کیسے نکالو گے؟“

”میں نے اس سال گرمیوں کی چٹیلوں میں ٹیکسا
 کی سونے کی ایک کان میں کام کیا ہے اور مجھے تجربہ ہو گیا
 ہے۔“ فریک نے جواب دیا۔ ”اس کے علاوہ میں نے کچھ
 اوزار اور مشینیں بھی جمع کر لی ہیں جو اس سلسلے میں کام آتی
 ہیں۔ ان سے مجھے محنت نہیں کرتا پڑے گی اور میں کم وقت میں
 زیادہ کام کر سکوں گا۔“

مارکر سوچ رہا تھا۔ ”اس کام میں سالوں لگ جائیں گے۔“
 ”تقریباً پندرہ سال۔“ فریک نے اطمینان سے کہا
 ”جیسے پندرہ سال نہیں پندرہ دن یا پندرہ ہفتے کہہ رہا ہوں۔“
 ”پندرہ سال....“ مارکر دنگ رہ گیا تھا۔ ”تمہیں پتا
 ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”ہاں ایک عام آدمی کو ملینیر بننے میں اتنا وقت تو لگ
 جاتا ہے۔ وہ بھی اگر اپنا کام کر رہا ہو۔ اگر تو کدی کرے گا تو
 ریٹائرمنٹ تک ملینیر نہیں بن سکتا۔“

”پھر بھی پندرہ سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ تم
 ساری دنیا سے کٹ کر بس اس کام میں لگے ہو گے۔“

”نہیں ہفتے میں دو دن میں اسی دنیا میں گزاروں گا۔“
 فریک نے جواب دیا۔ ”یہ وہ دن مجھے تمہا ہونے سے بچائیں گے۔“
 مارکر کو اب احساس ہو رہا تھا کہ فریک نے جو کیا تھا
 بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس نے شاید خطرات کو بھی کم کر لیا اپنے
 لیے۔ مارکر حیران تھا۔ بیس سال کی عمر میں اس نے کتنی مہارت
 سے یہ سب طے کر لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے اسے اپنا
 مقصد بنایا تھا اور جب انسان کسی کام کو اپنا مقصد بنا لے تو وہ
 سب کچھ کر لیتا ہے۔ مارکر کو اس وقت لگتا تھا کہ فریک کا میاب

ہو جائے گا لیکن اسے یہ سب بہت عجیب سا لگ رہا تھا کہ ایک
 شخص شخص دولت کے حصول کو اپنا مقصد بنا لے اور اس کے لیے
 ساری دنیا کو چھوڑ کر بس اسی میں لگ جائے۔ وہ بھی ایک دو تین
 برس کے لیے نہیں پورے پندرہ برس کے لیے۔

مارکر نے ہنسیا کر کہا۔ ”باریہ بہت طویل عرصہ نہیں ہے
 جب میں اپنی جوانی کے دن لڑکیوں کے ساتھ تفریح گا ہوں
 اور آٹھ گھنٹے میں گزراؤں گا۔ جب ہم سب دوست مل کر
 پارٹیاں کریں گے اور چٹک منانے جائیں گے تو تم سب سے
 الگ ایک دیرانے میں ہو گے۔“

”ہاں لیکن اس دوران میں مجھے وہ مل جائے گا جو تم
 سب تفریحات کر کے بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔“ فریک
 نے جواب دیا۔ ”جب تم یہ ساری تفریحات کر کے تھک جاؤ
 گے اور زندگی کی جدوجہد شروع کرو گے تو تمہیں معلوم ہو گا
 کہ بہترین وقت جو کمانے میں استعمال ہو سکتا تھا تم نے
 تفریحات میں ضائع کر دیا اور اب تم تھکے ہوئے نیم اور
 ذہن کے ساتھ زندگی کی دوڑ میں شامل ہو گے۔ جب کہ میں
 کمانے کے بعد تازہ دم ہو کر اس طرف آؤں گا۔“

مارکر نے شانے اچکائے۔ ”یہ تمہاری سوچ ہے جو
 عام سوچ سے الگ ہے۔ ورنہ میں نے کسی کو پچھتاہے نہیں
 دیکھا ہے۔ دوسرے ہمیں کمانے کی کوشش کر لی جائے لیکن
 سب چھوڑ کر صرف اسی کا ہو جانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

مارکر اور فریک ایک دوسرے سے بحث کرتے رہے
 لیکن ایک دوسرے کو قائل نہیں کر سکے۔ فریک اپنا ذہن بنا چکا
 تھا اور اب وہ اپنے فیصلے پر اصرار تھا۔ مارکر نے مایوسی سے
 کہا۔ ”مجھے نہیں لگ رہا کہ تمہارا منصوبہ کامیاب ہوگا۔“

فریک بولا۔ ”شرط لگاتے ہو.... آج سے پندرہ
 سال بعد ہم میں سے کون ملینیر بن جائے گا۔“

”اس میں شرط لگانے والی بات ہی نہیں ہے۔“ مارکر
 نے کہا۔ ”کیونکہ میں تم سے کوئی شرط نہیں لگا رہا ہوں۔“

”لیکن تم یہ تو کہہ رہے ہو کہ میں ملینیر نہیں بن سکتا۔“
 اس پر تو شرط لگائے ہو؟“

مارکر کے خیال میں یہ بات فریک کے منصوبے کی
 طرح فضول اور احمقانہ تھی۔ اسے یقین تھا وہ چند سال میں
 جبکہ مارکر واپس آجائے گا اور اس وقت اسے افسوس ہو گا کہ
 اس نے چند سال بھی کیوں ضائع کیے اور اگر وہ اس سے
 جلدی آگیا تو یہ اس کی خوش قسمتی ہوگی۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک
 ہے اگر تم ملینیر بن گے تو تم جو کچھ میں مان لوں گا۔“

”اور اگر میں ملینیر نہیں بن سکا تو جو کچھ میں وہ مان لوں گا۔“

فریک اسے دو دن بعد اس زمین پر لے گیا جو اس
 نے حکومت سے حاصل کی تھی۔ یہ اس کے کہیں سے بہ مشکل
 ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ کہیں کے پاس ہی پھیل
 تھی۔ فریک نے مٹی سے سونا نکالنے والی مشین بھی لے لی تھی
 لیکن فی الحال وہ اسے یہاں نہیں لایا تھا۔ اس کے پاس ایک
 چھوٹا ٹریکٹر اور اس کے ساتھ مٹی لانے والی ٹرالی بھی
 تھی۔ اس میں ایک ہائیڈروک جیک بھی لگا تھا۔ جو گڑھے
 سے مٹی کھینچنے کے کام آتا۔ مارکر نے فریک سے کہا۔ ”یہ کام
 ایک آدمی کے بس کا نہیں ہے۔“

”نہیں ایک آدمی کام کر سکتا ہے لیکن اس میں وقت بہت
 لگے گا۔ کیا پندرہ سال اس مقصد کے لیے کافی ہیں؟“
 مارکر نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ہاں پندرہ سال بہت ہیں
 لیکن کیا ایک شخص اپنی زندگی کا اتنا طویل عرصہ کسی ایک ہی
 کام کے لیے مخصوص کر سکتا ہے؟“

”لوگ کرتے ہیں۔ کیا لوگ دس دس سال کے لیے
 انٹارکٹیکا جا کر نہیں رہتے ہیں۔ خدائی مشین میں خلا باز تین
 تین سال گزارتے ہیں اور بھی بے شمار کام ہیں جو انسان کوئی
 سال تک دوسروں سے کٹ کر کرتا ہے۔“

”یہ سارے کام بڑے مقاصد کے تحت کیے جاتے ہیں ان
 میں ذاتی مفاد سے زیادہ انسانی فائدہ نظر آتا ہے۔“
 ”نہیں بڑا ایک بھی ہوا کام ہے۔“

مارکر اگرچہ اسے روکنے کا ارادہ ترک کر چکا تھا لیکن
 پھر بھی اس کے منہ سے بے اختیار ایسی باتیں نکل جاتی
 تھیں۔ پھر فریک نے کام شروع کر دیا۔ اس دوران میں اس
 نے کہیں میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ کوئی ایک مہینے بعد مارکر
 اس سے ملے گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو فریک گڑھے کی
 کھدائی میں مصروف تھا۔ ایک مہینے میں اس نے کوئی تین فٹ
 گہرا اور تین فٹ قطر کا گڑھا کھود لیا تھا جو چاروں طرف سے
 بتدریج ڈھلان کی صورت میں تھا۔ گڑھے کے اندر آنے
 جانے کے لیے فریک نے دی کی دو سڑکیاں لگا رکھی
 تھیں۔ اوپر ٹریکٹر ٹرالی کے کھڑا تھا اور فریک نکالی جانے
 والی مٹی اس میں بھر کر کہیں دور پھینک آتا تھا۔ یہ بہت زیادہ
 مشقت والا کام تھا جسے کوئی چوتھی دھڑ سے دھڑے سے کسی پہاڑ کو
 کھوکھا کر رہی ہو۔ اس میں واقعی برسوں کا عرصہ درکار تھا۔

مارکر کو دیکھ کر فریک گڑھے سے نکل آیا۔ وہ مٹی میں
 لت پت ہو رہا تھا۔ اس نے گڑھے کی طرف اشارہ کیا اور غر
 سے بولا۔ ”یہ جو صرف ایک مہینے میں، میں نے اتنا بڑا گڑھا
 کھود لیا ہے۔“

”سونے کی کان کنی کا یہ کون سا طریقہ ہے؟“
 ”یہ طریقہ جتنی امریکا میں استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ
 وہاں پر زمین مٹی والی ہے اور پارٹیاں بہت ہوتی ہیں۔ اس
 لیے سرنگیں بنانے کی صورت میں ان کے پیٹھ جانے کا خطرہ
 ہوتا ہے اس لیے وہاں گڑھے کھود کر اس سے مٹی نکالی جاتی
 ہے اور اس مٹی سے سونا برآمد کیا جاتا ہے۔“
 مارکر نے سر ہلایا۔ ”اور یہ سونے والی مٹی کتنی مہربانی
 میں ہے؟“

”کوئی تین فٹ کی گہرائی میں۔“ اس نے کہا۔ ”جب
 میں تین فٹ تک گڑھا کھودوں گا تو سونے والی مٹی نکلنے لگے
 گی اور جیسے جیسے گڑھے کی تہ گہری ہوگی میں زیادہ مقدار میں
 مٹی نکال سکوں گا۔“

”مٹی سے کس تناسب سے سونا نکلے گا؟“
 ”ایک سو کو گرام مٹی سے تقریباً ایک گرام سونا نکل
 آئے گا۔ یعنی ایک ٹن مٹی سے دس گرام سونا۔“
 ”ایک ٹن مٹی تم کتنے دن میں صاف کر لو گے؟“
 ”نیر اخیال ہے میں ایک دن میں ایک ٹن مٹی صاف

یمنی احمد

کی شاعری کا مجموعہ

صحرا ہو کہ ساون

شائع ہو گیا ہے

قیمت: 250 روپے

خوبصورت کلام، دلکش کاغذ اور دیدہ زیب ترتیب
 پر مشتمل اندرون صفحات دو گہرا اور سرورق نور گھر

رابطے کے لیے رجسٹر کریں

دعیم بک پورٹ اردو بازار کراچی

فون نمبر: 0306-2939936
 ای میل: y_sehrahoksawan@yahoo.com

کرلوں گا۔" فرینک نے یقین سے کہا۔

مارکر کو یقین نہیں آیا تھا کہ وہ ایک دن میں اتنی مٹی جھان کر اس سے سونا نکال سکے گا۔ بہر حال یہ سہل سی دور تھا۔ فرینک گڑھا جس طرح کھود رہا تھا کہ اس کی دیواریں ڈھلائی رہیں اور ان کی تہ میں گرنے کا امکان باقی نہ رہے۔ مارکر کچھ دیر اس کے ساتھ رہا پھر واپس آ گیا۔ اس کے بعد وہ دو تین بار اور فرینک سے ملنے گیا۔ وہ مستقل مزاجی سے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ پھر مارکر کو ایک اور اچھی ملازمت مل گئی اور اسے اس کے لیے رچ موٹ جانا پڑا جو اس کے قہے سے کوئی تیرہ سو کوئی بیس ہزار کے فاصلے پر مشرق میں مگر اکیس نو سو کے ساحل کے ساتھ تھا۔ مارکر کو وہاں ایک اکیس نو سو کے ساحل کے ساتھ تھا۔ مارکر کو وہاں ایک بعد اس کی تنخواہ اچھی ہو گئی تھی اور اس نے وہ سال کی ملازمت میں بھرت کر کے اتنا جمع کر لیا کہ ملازمت چھوڑ کر نئے یارک میں ایک اچھے کالج میں ایم ٹیک میں داخلہ لے لیا تھا۔ صبح سے شام تک وہ کالج اور پھر لیب میں مصروف رہتا تھا اور رات کو ایک بار میں پاریٹ نام کا کام کرتا تھا کیونکہ اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ تعلیمی فیس ادا کرنے کے ساتھ اپنا بھی گزارا کر سکے۔ اپنے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی۔ اس لیے اس نے یہ ملازمت کر لی تھی۔ اگرچہ اس بچہ سے اسے سونے کا موقع کم ملتا تھا کیونکہ ہمارے اس کی چھٹی بار بجے ہوتی تھی اور گھر آ کر سوتے سوتے اسے ایک بج جاتا تھا۔ صبح سات بجے اٹھ کر وہ پھر سے ایک مصروف دن کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ باج بکے کالج سے آنے کے بعد وہ عین کھٹے میں اپنے کام نہلاتا تھا۔ کھانا بنا کر کھاتا اور آٹھ بجے بار میں اپنی ڈیوٹی پہنچ جاتا تھا۔

دو سال بعد اس نے ڈگری حاصل کر لی تھی۔ شروع میں اسے ایک سال مشکل ہوئی پھر اسے ایک اچھی کمپنی میں ملازمت مل گئی جو مختلف اکیس نو سو کے سامان کے لیے اکیس نو سو کے تیار کرتی تھی۔ مارکر نے سپروائزر سے چاب شروع کی اور تین سال بعد وہ گروپ لیڈر بن گیا تھا۔ جن دنوں اس نے یہ ملازمت اختیار کی تھی اسی سال اس کی ملاقات بار سے ہوئی جو ایک فیشن شاپ میں کام کر رہی تھی اس نے فیشن ڈیزائننگ کا کورس کیا ہوا تھا لیکن مارکر کی اصل دلچسپی ایک جہت کرنے والے شو پر اور ایک اچھے گھر سے تھی جسے وہ سجا سٹوار کرتی۔ جب مارکر اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ جیسے ہی مارکر نے اسے شادی کی پیش کش اس نے بھی قبول کر لی۔ شادی کے بعد اس

نے ایک سال اور کام کیا اور جب پہلی بار سید سے ہوئی تو اس نے مارکر کے اصرار پر نوکری چھوڑ دی۔ پہلے سام ہوا اس کے بعد جولی ہوئی اور سب سے آخر میں میٹس دنیا میں آیا تھا۔

مارکر کی تنخواہ اچھی ہوئی تو اس نے سب سے پہلے قسطوں پر مکان لے لیا۔ یہ مکان مارکر کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ اس میں ہر سہولت موجود تھی۔ رہی سہی کسر مارکر نے اسے اپنی خواہش کے مطابق سجا کر پوری کر لی۔ اوپر سے تین بچوں کی پیدائش سے مارکر کو مالی لحاظ سے کچھ پریشانی تو ہوئی تھی لیکن اس نے مارکر کے اصرار کے باوجود اسے نوکری کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مارکر کے نوکری کرنے سے انہیں رقم کی فکر تو نہیں رہے گی لیکن دوسری بہت ساری پریشانیاں لاحق ہو جائیں گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ جوڑی سی مالی پریشانی برداشت کر لیں۔ ان دنوں مارکر اپنے کام سے متعلق کچھ کورس بھی کر رہا تھا جن کی فیس ادا کرنے کی وجہ سے اس کے گھر کا بجٹ ذرا آٹ ہو گیا تھا۔ لیکن یہ پریشانی عارضی ثابت ہوئی تھی۔ ایک سال میں مارکر نے یہ کورس مکمل کر لیے اسے کمپنی میں اکیس نو سو پر لے کر اس کی تنخواہ ڈیڑھ گنا ہو گئی تھی۔ اب اسے کوئی مالی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ ان دنوں میٹس ڈیڑھ گنا ہو گیا تھا اور اسے دیکھ بھال کی بہت زیادہ ضرورت نہیں تھی اس لیے پورے دو سال بعد مارکر بیوی بچوں کو لے کر کمپنی تقریباً چار بجے کے لیے نکل گیا۔ اس کی ملازمت ٹیڈ پارک سے ذرا دور تھی۔ اتفاق سے اس کا پلاٹ اس کے گھر سے چند منٹ کی فاصلہ پر تھا۔ اس لیے اسے جواب پر آنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

راگ مین سے نکلنے کے بعد اسے دو پارسی وہاں جانے کا اتفاق ہوا ایک بار اپنے باپ کی تدفین پر اور دوسری بار ہائی اسکول کی سالانہ تقریب میں گیا تھا۔ دونوں بار اسے وہاں چند دن سے زیادہ رہنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس کے ذہن میں خیال بھی نہیں آیا کہ وہ فرینک کے بارے میں معلوم کرے یا اس جگہ جا کر اسے دیکھے جہاں وہ آخری بار اس سے ملا تھا۔ اصل میں فرینک اس کے ذہن سے ہی محو ہو گیا تھا۔

اب چانک ابی فرینک سامنے آیا تو اسے وہ سب یاد آ گیا تھا اور اسے تعجب بھی ہوا کہ وہ اپنی زندگی کی ان اہم ترین یادداشتوں کو کس طرح فراموش کر بیٹھا تھا۔ شاید اسی کا نام زندگی ہے۔ گزرا کل کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو انے والا کل اس سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ فرینک اس کے سامنے تھا تہ انداز میں بیٹھا اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے توقع ہو

کہ ابھی مارکر گھٹنوں کے بل اس کے سامنے کھڑا ہو کر تسلیم کر لے گا کہ وہ غلطی پر تھا اور فرینک نے ٹھیک کیا تھا۔ آج وہ وہ لین ڈالرز مالیت کے سونے کا ٹکڑا تھا۔ وہ سوچتا ہوا اس نے اپنے چند سال لگا کر جمع کیا تھا۔

"شاید ہمیں یقین نہیں آ رہا ہے۔" فرینک نے اسے خاموش دیکھ کر کہا اور اٹھ کر دونوں سوٹ کیسز کھول دیے تھے۔ ان میں اوپر تک سونے کی ایشیں رکھی تھیں۔ "یہ پورے پچاس کلو گرام سونا ہے۔"

"تم نے اسے چند سالوں میں جمع کیا ہے؟" مارکر نے پوچھا۔

"تقریباً۔" اس نے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو میں اکیلا آؤں تھا۔ ہر دن کے تین منٹ میں کاپیوں سے ہی نہیں ہولناک تھا۔ گڑھا صرف سے گھر جاتا تھا۔ پھر وہ نکلے وہ قہے سے ہونے والی بارشیں بھی کام میں خلی ڈالتی تھیں۔ ایک بار بارش ہو جاتی تو پانی ٹکانے میں کئی دن لگ جاتے تھے۔ پوچھ لو کہ میں نے اصل میں سال میں صرف چھ منٹ کام کیا اور اتنا سونا جمع کر لیا۔" فرینک کے کھٹے میں فخر آ گیا تھا۔ "تم اسے چندہ کے بجائے ساڑھے سات سال کی محنت کا ثمر بھی کہہ سکتے ہو۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم اس وقت پینتیس برس کے ہو اور مجھے میں چالیس کے لگتے ہو۔" مجھے جیسے جیسے ہے۔ اس محنت نے مجھے کچھ ڈیڑا ہے۔ مجھے جسمانی طور پر نقصان ہوا ہے لیکن مجھے اپنے آنے والے کل کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس رقم کو کہیں بھی انویسٹ کر کے میں آرام سے باقی زندگی کچھ کے بغیر گزار سکتا ہوں۔"

"زندگی کچھ کے بغیر گزارا کرتے کا نام نہیں ہے۔"

مارکر نے آہستہ سے کہا۔

فرینک نے قحاحات انداز میں اسے دیکھا۔ "اب تم مان گئے ہو گے کہ میں نے ٹھیک کیا تھا؟"

"اس کے برعکس مجھے پہلے سے زیادہ افسوس ہو رہا ہے کہ تم نے یہ سب کیا۔ تم نے اپنے اوپر بھروسہ کرنے اور اپنی ذاتی قابلیت پر جانے کے بجائے محض سونا جمع کرنے پر اپنا سارا وقت اور جوانی لگا دی۔"

فرینک کا منہ بن گیا تھا۔ "چلو تم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس گھر سے لگ رہا ہے کہ تم نے تعلیم بھی حاصل کی ہے اور کوئی اچھی نوکری بھی کر رہے ہو لیکن کیا تمہارے پاس ایک ملین تو چھوڑا ایک لاکھ ڈالرز بھی ہیں۔"

"نہیں اگر میرا بینک اکاؤنٹ دیکھو تو اس میں شاید

اسٹریٹل علاوہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

نورنٹو سے لنڈی کوئل تک

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا در سالانہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، برطانیہ اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے چے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیجیٹل ڈرافٹ، مانی آرڈر یا ڈیمون پونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادا بھی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ شدہ معلومات

(فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C III سٹیشن ٹریڈنگ ہاؤس اتھارٹی میں کوئٹہ روڈ، کوئٹہ
فون: 35895-313 ٹیکس: 35802551

پچاس ہزار ڈالر بھی نہ ملیں۔

”تم نے کوئی اسٹاک لیا ہے، کہیں اور تم لگائی ہے؟“

”نہیں اند میں نے کوئی اسٹاک لیا ہے اور نہ ہی کہیں کوئی رقم لگائی ہے۔ میرے پاس اس مکان، ایک گاڑی اور نوکری کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ مارکر نے اعتراف کیا۔

”میرے پاس دو ملین ڈالر کا سونا ہے۔“

مارکر نے اس کی طرف دیکھا۔ ”فرینک مجھے اعتراف ہے تم اس معاملے میں مجھ سے آگے نکل گئے ہو لیکن اصل میں تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔“

”تو کیا تم نے کیا ہے؟“ فرینک کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔ ”تم نے آج سے پندرہ سال پہلے کہا تھا کہ اگر میں ملینیر بن گیا تو تم میری ایک بات مانو گے۔ یہ شرط یاد ہے یا بھول گئے؟“

”مجھے وہ شرط یاد ہے۔“ مارکر نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن کیا تم واقعی ملینیر بن گئے ہو؟“

”یہ سونا دیکھ کر بھی تمہیں شک ہو رہا ہے؟“ فرینک نے طنز کیا۔

”نہیں اس لحاظ سے مجھے شک نہیں ہے لیکن فرینک تم نے ان پندرہ برسوں میں جو حاصل نہیں کیا ہے کیا تم آٹے والے برسوں میں حاصل کر لو گے۔ کیا تم جوانی کا وہ جوش و ولولہ دوبارہ پالو گے جو اس وقت کو زندگی میں ایک بار ملتا ہے۔ کیا تم کسی لڑکی سے ویسی محبت کر سکو گے جیسی ایک نوجوان کرتا ہے۔ کیا تم کسی سے محبت کی شادی کر سکو گے۔ ان پندرہ برسوں میں تم اولاد حاصل کر سکو گے۔ تم اس دوران میں انجوائے منٹ کر سکتے تھے کیا اس وقت کو دوبارہ اپنے قابو میں لا سکو گے۔ تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں نے کیا حاصل کیا۔ آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں کہ میں نے کیا حاصل کیا ہے۔ میرے پاس ایک ایک لمحے کی تصویریں محفوظ ہیں۔“

مارکر کھڑکھڑا کر اٹھ رہا گیا۔ وہ ایسے واقعات کو اس کے ہاتھ میں ایک بڑی اور ذہنی الیم بھی۔ وہ اس نے فرینک کے سامنے میز پر رکھ دی اور خود اس کے پاس قلمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلا صفحہ کھولا جو بیسے نوجوانی کا مارکر سامنے لگایا۔ اس میں ہائی اسکول کی اساتذہ کے ساتھ گروپ فوٹو تھا جس میں مارکر کے ساتھ فرینک بھی تھا۔ فرینک خود کو دیکھ کر جبرانہ رہ گیا۔ کیونکہ باپ کے مرنے اور ماں کے اولد پاؤں میں جانے کے بعد اس نے مکان سامان سمیت فروخت کر دیا تھا اور اس میں سے کوئی چیز نہیں لی تھی اسے بس رقم وہ رکھی کیونکہ سونے کی کان کنی جاری رکھنے کے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی۔ حاصل ہونے والے سونے میں سے اس نے ایک گرام بھی فروخت

نہیں کیا تھا۔ ہر مہینے وہ جا کر حاصل شدہ سونا ایک بینک لا کر میں رکھوا آتا تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ اس ویرانے میں کوئی اس سے جمع شدہ سونا چھین نہ لے اور اس کے ساتھ دو بار واردات بھی ہوئی تھی۔ پہلی بار میں دو سچ نوجوان اس سے تقریباً چار ہزار سونا چھین کر لے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ محتاط ہو گیا تھا اور جسے ہی اس کے پاس ایک افس سونا جمع ہوتا تھا وہ اسے بینک لا کر میں رکھ دیتا تھا۔ دوسری بار اس کے ساتھ واردات بینک جاتے ہوئے ہوئی تھی۔

پھر فرینک نے کہیں لے لی اور اس کے بعد کسی نے اسے لوٹنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جان بوجھ کر مگن کی تلاش کرتا تھا اور اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ مارکر کے ساتھ اپنی تصویر دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس یادوں کا ایسا کوئی خزانہ نہیں تھا۔ مارکر کی جوانی اور اسکول کے زمانے کی کچھ اور تصاویر بھی تھیں جن میں کسی میں وہ قات ہال کھیل رہا ہے اور کہیں دو سوتوں کے ساتھ چمک منار ہے۔

”یہ دیکھو جب میں لی ٹیک کے دوران میں کانچ کے دوستوں کے ساتھ نیاگرا آ رہا دیکھنے کیا تھا۔“ مارکر نے ایک تصویر پر انگلی رکھی۔ ”کیا تمہارے پاس ایسی کوئی تصویر ہے؟“

فرینک کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مارکر نے صفحہ پلٹا اب کانچ کی تقریب اساتذہ کی تصویریں تھیں۔ ان میں مارکر گاؤں چنے اور ڈگری لے کر رہا ہے لیکن اب فرینک اس کے ساتھ نہیں تھا۔ مارکر کا گروپ بدل گیا تھا۔ پھر مارکر مل میں کام کر رہا ہے۔ اس وقت کی تصویریں بھی اس الیم کا حصہ تھیں جب وہ ریج موٹی چلا گیا تھا۔

”میں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے بڑی محنت سے رقم جمع کی تھی۔“ مارکر نے اسے بتایا۔ ”پھر میں نے ایم ٹیک میں داخلہ لیا آج میں اپنے شعبے کا ماسٹر ہوں۔ میں نے کورس کسے تو مجھے کو ایف ایف ایف ایف کا درجہ مل گیا۔ کیا یہ اعزاز میرے لیے کم ہے۔ میری تنخواہ آٹھ لاکھ ڈالر سالانہ ہے۔“

اس نے صفحہ پلٹا اور اب اس کے ساتھ تصویریں تھیں حسین و دلکش مارکر بیٹھا تھی۔ یہ میری بیوی ہے۔۔۔۔۔ آج سے نو سال پہلے میری ماریتا سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ اس لیے ہم نے شادی کا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ یہ دیکھو ہماری شادی کی تصویریں۔۔۔۔۔ یہ ہمیں مون منانے کی یاد اور اس کے اس پاس کے ہاؤس پر لگے تھے۔ یہ میری زندگی کے حسین اور ناقابل فراموش دن ہیں۔ کیا تمہارے پاس گزشتہ پندرہ سالوں میں ایسا کوئی دن ہے۔“

فرینک خاموش تھا اور کم صم سے اعزاز میں مارکر کا الیم دیکھ رہا تھا۔ اب مارکر کے بچے بھی اس الیم میں شامل ہو گئے تھے۔ مارکر نے سام کی تصویر پر ہاتھ پھیرا۔ ”یہ آج سے سات سال پہلے پیدا ہوا تھا۔“ اس کے لہجے میں شفقت پوری آئی تھی۔ ”ابھی دوسرے درجے میں ہے لیکن اس کی ذہانت ہمیں حیران کر دیتی ہے۔ وہ ابھی سے سوچ چکا ہے کہ اسے آئی کی کا پتہ چتا ہے۔ وہ بڑے ہو کر ایسی کارٹون فلم بنانا چاہتا ہے جسے ایک ملحد پر کیپوٹر پر تحقیق کیا گیا ہو۔ جو بات آج کے گرافکس کے ماہرین سوچ رہے ہیں وہ سام نے پہلے ہی سوچ لیا ہے اور مجھے یقین ہے وہ اس میں کامیاب بھی ہو گا۔ ممکن ہے آٹھ سالے وقت میں ایک مکمل کیپوٹر انڈسٹری بنانے کا سہرا میرے بیٹے کے سر جائے۔“

فرینک نے پہلی بار ہاتھ کیا۔ ”ہاں یہ صورت سے ذہین لگ رہا ہے۔ ممکن ہے یہ ایسا کرکڑے۔“

”یہ میری بیٹی جولی ہے۔۔۔ اس دنیا میں مجھے کسی سے سب سے زیادہ پیار ہے تو وہ میری بیٹی ہے۔ یہ پانچ سال کی ہے۔ میرے بغیر نہیں رہتی ہے روزانہ رات سونے سے پہلے جب تک مجھے کال نہیں کر سکتی ہے۔ اسے نیند نہیں آتی ہے۔“

اس بار مارکر نے فرینک سے پوچھنے سے گریز کیا تھا کہ کیا اس کے پاس اولاد بھی ہے۔ اسے یہ سوال کرنا شاید اچھا نہیں لگا تھا۔ پھر اس نے بیٹن کی تصویر کی دکھائی۔ ”یہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہے ابھی صرف چار سال کا ہے لیکن ذہانت میں اپنے بھائی سے کم نہیں ہے۔ ابھی سے اسکول جاتے کے لیے بے تاب ہے لیکن ہم اسے اگلے سال اسکول میں داخل کرائیں گے۔“

مارکر اسے بتا رہا تھا کہ گزشتہ نو سالوں میں وہ کہاں کہاں سیر و تفریح کے لیے گئے تھے۔ ان سب مواقعوں کی تصاویر اس کے پاس موجود تھیں۔ ”صرف دو سال ایسے گزرے جب ذرا حالات سخت ہونے کی وجہ سے ہم کہیں جا نہیں سکے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ چھٹیوں میں کہیں دو کہیں جاسکے تھے۔ ورنہ میں نے ایک دو بار چمک منانے لائی طور پر آس پاس جاتے ہیں۔“

فرینک ان سب تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ ہر اہم موقع اور چمک کی تصویر اس الیم میں موجود تھی۔ مارکر نے گزشتہ پندرہ سالوں میں جو کیا تھا اور جو حاصل کیا تھا۔ الیم اس کی مکمل کہانی سنارہی تھی۔ الیم کا ایک حصہ مارکر کے گھر اور اس کی بیٹیوں کے بارے میں تھا۔ مارکر نے اس حصے پر آ کر کہا۔ ”نو سال پہلے میں نے یہ گھر قسطوں پر لیا تھا قسطیں تو

پندرہ سال کی تھیں لیکن میں نے دو مہینے پہلے ہی ساری رقم ادا کر دی ہے۔ اس دوران میں اس گھر کو مزید خوب صورت بنایا ہے۔ جب میں نے اسے خریدا تو اس کی مالیت ساڑھے چار لاکھ ڈالر تھی لیکن اب اس کی مالیت ایک اعشاریہ دو ملین ڈالر ہے۔ اس میں اوپر چھپے چار بیڑے بھی ہیں۔ ایک لیونگ روم اور ایک لائونگ ہے، ایک میرا اسٹڈی روم ہے۔ کار پارک ہے جس میں بیک وقت میری دونوں گاڑیاں آجائی ہیں۔ سامنے کالان ٹم نے دیکھ لیا ہے اتنا ہی بڑا اس میں بیک یارڈ ہے جہاں کبھی کبھی ہم بن ہاتھ لیتے ہیں اور گرامی راتوں میں باری کیو کرتے ہیں۔“

مارکر نے اپنی کاروں کی تصاویر دکھائیں۔ ”یہ نئی مشوٹی وین ہے۔ یہ میں نے ماریتا کے لیے لی ہے۔ وہ اس میں اپنی ماں کے گھر آتی ہے۔ جب ہمیں کہیں دور دراز جانا ہو تو ہم اسے ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک پانچ سال پرانی ہنڈا کار ہے لیکن اس کی حالت جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو بالکل نئی جیسی ہے۔ میٹش اور جولی کو ابھی تیرہ ماہ آتا ہے وہ تیرا کی سیکہ جائیں تو میں بیک یارڈ میں ایک چھوٹا سونگ پول بنواؤں گا۔“

الیم کا آخری حصہ مارکر کی کیریئر کی کہانی سنارہا تھا۔ اس نے دوران ملازمت جو جو کامیابیاں حاصل کیں اور جو اعزازات حاصل کیے ان سب مواقعوں کی تصاویر الیم میں موجود تھیں۔ مارکر کے شاندار دفتر کی تصویر بھی۔ جہاں بیٹھ کر وہ اپنے سیکشن کی نگرانی کرتا تھا۔ دفتر میں ایک شیشے کی چھوٹی سی الماری تھی جس میں مارکر کو ملنے والے سرٹیفکیٹس اور شیلڈ زمری تھیں۔ میز پر ایک جدید ترین کیپوٹر رکھا تھا۔ دفتر کی ہر چیز آجینے کی طرح چمک رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی انگریز کینو کا دفتر ہو۔ بیٹن مارکر اپنی فرم میں بہت اہمیت کا حامل تھا۔

مارکر نے الیم بند کی۔ ”لیکن میں نے بھی ان چیزوں کو رقم کے بیانیے میں نہیں تو لا۔ میرے اثاثے میرے بیوی بچے ہیں۔ میرا ایک بچہ میرا ملین ہے۔“

فرینک نے سونے کی انگٹوں کی طرف دیکھا۔ ”کیا میں اس دولت سے یہ سب حاصل نہیں کر سکتا؟“

”مجھے کہتے ہوئے افسوس ہے کہ شاید اب ایسا نہ ہو۔ محبت کرنے والی بیوی تمہیں کسی دکان پر نہیں ملے گی۔ اس دنیا میں بچوں کا کوئی اسٹور نہیں ہے۔ تم ٹھہر لے سکتے ہو لیکن اسے شوق سے جانے والی خوشی دولت سے نہیں ملتی ہے۔ سب سے اہم چیز تم نے خود کو آجینے میں نہیں دیکھا ہے۔“

مارکر اسے بازو سے جکڑ کر ایک آجینے کے سامنے

لایا۔ "خود کو دیکھو اور مجھے دیکھو۔"

فرینک نے آئینے میں خود کو دیکھا تو جیسے ڈر گیا۔ اس کے سامنے ایک جوانی میں بوڑھا اور سخت حال ہو جانے والا شخص کھڑا تھا وہ اپنی عمر سے دس برس بڑا لگ رہا تھا۔ اس کے خدو خال بڑھ گئے تھے اور اس کی جوانی ابڑھ گئی تھی۔ اس کے بال سامنے سے اڑ چکے تھے اور جو باقی تھے وہ سفید ہو چکے تھے۔ اس کے چہرے پر شقت کی داغ بیل لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔

اس کے برعکس مارک کے آئینے میں کسی نو جوان کا سا لگ رہا تھا۔ تروتازہ چہرہ جس پر چمک اور جوانی تھی۔ ہموار اور سلوٹوں سے پاک، اس کے بھرپور گھنے بال بہ مشکل کناروں سے مضبوط ہوئے تھے اور یہ بھی اچھے لگ رہے تھے۔ اس کا جسم مضبوط اور کسا ہوا تھا۔ ہاتھ صاف ستھرے تھے جس پر سادہ لباس بھی اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی اصل عمر سے دس سال کم لگ رہا تھا۔ مارک نے اہم کار کا وہ صفحہ اس کے سامنے کر دیا جس پر ان کے اسکول کا نوٹیشن کی تصویر تھی۔ "اسے دیکھو۔" مارک نے کہا۔ "جب ہم نے زندگی کا سفر شروع کیا تھا تو ایک جیسے تھے۔ آج ہم دونوں میں کتنا فرق آچکا ہے۔"

فرینک کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ اس نے دولت تو حاصل کر لی تھی لیکن اس کے بدلے بہت کچھ کھو رہا تھا۔ دو دہائیوں تک روم میں آگیا۔ مارک اس کے اور اپنے لیے برائے ہی نکال لایا۔ اس نے فرینک کو گھاس کھانسیا اور بولا۔ "اب کیا کہتے ہو ہم میں سے کون ختم ہو گیا؟"

"وہ ایک الگ بات ہے۔" فرینک نے چسکی لی۔ "لیکن شرط میں نے جیت لی ہے۔"

"یہ غلط ہے۔۔۔ شرط بھی میں نے ہی جیتی ہے۔ ایک اعشاریہ دو ملین ڈالر کا تو صرف یہ گھر ہے۔ اس کے علاوہ میری گزشتہ بارہ سال کی آمدنی کا حساب کیا جائے تو میں اب تک دو ملین ڈالر سے زیادہ کمائے ہیں اور زندگی سے پوری طرح لطف بھی اٹھایا ہے۔ تم نے صرف دو ملین ڈالر کمائے ہیں۔"

فرینک نے دونوں سوٹ کیسز کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تم لے لو اور اپنی زندگی بچھو دے دو۔"

مارک نے سکون کا سانس لیا۔ وہ جو چیز مانگ رہا تھا مارک اسے دے ہی نہیں سکتا تھا۔ فرینک جذباتی ہو گیا تھا۔ مارک نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "میرے دوست تم نے اپنی زندگی کا ایک بڑا وقت گھنوا دیا ہے لیکن اب کبھی تمہارے پاس بہت سارا وقت ہے۔ خوش قسمتی سے تمہارے پاس دولت بھی ہے۔ یہ گزرے وقت کو تو نہیں لوٹا سکتی لیکن آنے والے وقت میں تمہیں اتنے زیادہ مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تم فیصلہ کر سکتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تم اپنی شخصیت کو بہتر کر سکتے ہو۔ یقیناً تمہیں کوئی نہ کوئی محبت کرنے والی ملے گی۔ تم کھڑے لے سکتے ہو۔ اس دلم سے کوئی کام کر سکتے ہو۔ اس طرح تم گزرے وقت کی کسی حد تک تلافی کر سکتے ہو۔"

مارک اسے سمجھاتا رہا اور بات فرینک کی سمجھ میں آگئی۔ وہ مارک کے پاس سے رخصت ہوا تو اس میں ایک جوش و ولولہ آگیا تھا۔ مارک نے سکون کا سانس لیا۔

چھ مہینے بعد فرینک ایک بار پھر اس سے ملنے آیا تھا اور اس بار اس کی شخصیت بالکل مختلف تھی۔ وہ محنت مند اور تروتازہ لگ رہا تھا۔ اس نے سوٹ بھی اچھا پہن رکھا تھا اور اس کے ساتھ ایک نو جوان عورت بھی تھی۔ فرینک نے اس کا تعارف کرایا۔ "سوز فرینک۔۔۔ اور سلا۔"

اس وقت مارک بھی گھر میں تھا اور انہوں نے گرم جوشی سے فرینک اور سلا کا استقبال کیا تھا۔ فرینک نے سلا کو فروخت کر کے اس سے حاصل شدہ رقم سے ایک چھوٹا سا گھر لے لیا تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک کولڈ پریس مشین میں جاب حاصل کرتے میں کامیاب رہا تھا۔ یہاں اس کا سونا صاف کرنے کا برسوں پرانا تجربہ کام آیا تھا۔ اس سے اس کی ملاقات دو مہینے پہلے ہوئی تھی اور جب اس نے محسوس کیا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے تو اس نے اس کو پروپوز کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔ اب اس کا ایک گھر تھا اور سلا نے انہیں شرماتے ہوئے بتا دیا کہ وہ امید سے ہے۔

فرینک نے سلا کو بھیجی تھی۔ یہاں لایا جہاں اس نے سونے کی بول کے لیے کھدائی شروع کر دی تھی۔ یہ کام وہ خود کر رہا تھا اور تھوڑا تھوڑا آمدنی کو وہ اس کی منی نہیں دور بھیجتا تھا۔ اس نے فرینک سے کہا۔ "تم نے دیکھا۔ کسی قدر تاخیر سے تھی لیکن تمہارے پاس بھی وہ سب آگیا جو دوسروں کے پاس ہے۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے اب اپنی غلطی درست کر لی ہے۔" فرینک نے سر ہلایا۔ "ڈرا دیر سے مہی۔"



کٹ و کش کی چوری

نجمہ مولوی

چور کی چوری ہو یا اس کی بیوا بیوہ ہو۔۔۔ یہ ہر کسی کے دس کا کام نہیں ہوتا۔۔۔ بڑے باپ بچے پڑتے ہیں مگر۔۔۔ وہ کیا کرے جو باپ بچے کی تکلیف دے یہی بیگنا نہ ہو۔۔۔ ایسے ہیں عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی ایسا قدم ہی نہ اٹھایا جائے جس میں سر کے بال قدموں میں گرتے غلغلہ اٹھیں وہ بھی بذریعہ جوتا۔

مختلف میز پر ہوتے ہوئے کے کا دلچسپ حال

لگا اس وقت ڈینس میں واقع اپنے عظیم الشان نیچے کے بیڈروم میں کھڑا ہر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ تیار ہو کر اس نے لمبی چوڑی دیوار گیر ڈریسنگ ٹیبل کے پہلو وار آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔

یہ ممکن تھی کہ چپس سوٹ میں وہ خوب بیچ رہا تھا اور کافی حد تک راجہ مور معلوم ہو رہا تھا جسے نکلے کے حال ہی میں ایک فلم میں شہر باظر عرف زبردست دیو کے روپ میں دیکھا تھا۔ کے کو اپنی شخصیت میں راجہ مور کی بہت زیادہ شہادت نظر آرہی تھی۔ بس تھوڑا بہت ہی فرق تھا۔ مثلاً راجہ مور کا قد چھ فٹ سے لگتا ہوا تھا اور کے کا پانچ فٹ سے لگتا ہوا لیکن بہر حال لگتا ہوا تو تھا۔

راجہ مور کا جسم کسرتی اور کندھے پڑے تھے جبکہ کے کی ناک چوڑی تھی۔ راجہ مور کی رنگت سرخ و میدا اور آنکھیں

مالک مکان کو وہ کس طرح دھندے و عید پر لانا آیا تھا اور عید اور گور یا سے ادھار لے کر کس طرح گزارا داتا کرتا آیا تھا۔ یہ ایک الگ کہانی تھی۔ ایسی کہانی جس میں ہر قدم پر ایک ایسے موڑ تھا۔ موڑوں کی اس کثرت کی وجہ سے کہانی بالکل ہی مڑ مڑ کر رہ گئی تھی۔

گزشتہ چھ ماہ میں نکلا مالک مکان کو مختلف جیلے بیانونوں سے ٹرخانے اور اس کی تمام تر تنگی و برہنہ کا سامنا کرنے کا عادی ہو گیا تھا لیکن آج مالک مکان کے موڑ کا اندازہ کر کے وہ بھی کاٹ گیا۔

اسی بولکھا ہٹ میں وہ کپڑے پہنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر اسے بے حد حیرت ہوئی کہ اس کی قمیض کا گریبان جانے کہاں غائب ہو چکا تھا اور آستینیں بھی کچھ عجیب سی شکل اختیار کر گئی تھیں۔

”کمال ہے..... ادا تھک تو یہ بالکل ٹھیک تھی۔“ وہ بڑبڑایا۔ کئی لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ دراصل قمیض نہیں، شلوار تھی جسے وہ قمیض کی جگہ پہننے کی کوشش کر رہا تھا۔

بالآخر وہ کسی نہ کسی طرح اپنا چلیہ درست کر کے مل جل جلا تو آئی بلا کوئی آلہ کار جب وہ در کرتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر آیا۔ پہلے تو اس نے کچھ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا کہ عجب اس کی جو بے عزتی ہوئے وہی حال اس کا تماشا دیکھنے کے لیے ارد گرد کے کمروں سے تو کوئی باہر نہیں آیا؟

اس مکان کی اوپری منزل پر مالک مکان اپنی فیملی سمیت رہتا تھا۔ جو تقریباً ایک دائرے کی سی صورت میں سات کمرے تھے اور وہ ساتوں کے ساتوں اس نے چیمبروں کو کرائے پر دیے ہوئے تھے اور اس میں خاص بات یہ بھی کہ شہر میں وہ واحد مالک مکان تھا جو چیمبروں کو بیچتا تھا۔

چیمبروں کو کمرے کرائے پر دینے میں اس کا یہ فلسفہ کارفرما تھا کہ چیمبروں کو بہر حال ایک نہ ایک دن اپنا گھر آباد کرنے کی غرض سے کسی بہتر جگہ پر منتقل ہونا پڑتا تھا اس طرح اس کے کمروں پر مستقل قبضے کا احتمال نہیں رہتا تھا۔ حالانکہ نئے کے خیال میں وہ شخص چیمبروں کو اس لیے وہ کمرے کرائے پر دیتا تھا کہ چیمبروں کے علاوہ کوئی ان میں رہنے کی جرات ہی نہیں کر سکتا تھا۔

چیمبرے بھی وہ جنہیں دیتا تھا کہیں اور سر چھپانے کو ٹھکانا نہیں ملتا تھا۔

نئے کے گرد و پیش پر نظر ڈال کر یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ دیگر جگہ کے چیمبروں کے دروازوں پر تالے بھول رہے تھے۔ تمام چیمبرے اپنے اپنے کاموں پر مگھے ہوئے تھے۔ صرف نئے کی کوئی اگال کوئی کام نہیں تھا سوائے

کام تلاش کرنے کے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اس نے جو کام کرنے پر کرنا بعد ہی ہوئی تھی اس کے قدر داری جانے کہاں سر مگھے تھے۔

ایک وہ بد بخت تک ویلٹ تھا کہ تقریباً ہر ماہ وہ دنیا کے کسی نہ کسی کوئے کھد رے سے کوئی نہ کوئی کلائنٹ اس کے پاس پہنچ ہی جاتا تھا اور ایڈورڈ ڈی ہاک صاحب اس پر کہانی بھی لکھ رہے تھے۔

یہی سب کچھ دیکھ کر نکلا اکثر کڑھتے ہوئے سوچا کرتا تھا کہ اگر یہی حال رہا تو نکلا اس کی قوم ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بشانہ کیونکر کھڑی ہوگی؟ جب تک لوگ نئے کی صلاحیتوں سے استفادہ نہ کرنا نہیں سیکھیں گے بھلا ترقی کیا خاک کر دیں گے؟

سروست نئے نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اور اپنی تمام تر برائت کو مٹھ کر کرتے ہوئے مالک مکان کے چیمبرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی۔ وہاں چہرہ تو گویا ہوا نہیں تھا صرف تاثرات ہی تاثرات تھے خوفناک تاثرات۔

مالک مکان رازی صاحب کچھ اس طرح تیزی سے پاؤں چارے تھے گویا وہ پاؤں نہیں نکلے کا خرہ ہو۔ آنکھیں اٹلی پر رہی تھیں۔ اندیشہ تھا کہ اگر نئے میں مزید اضافہ ہوا تو یہ تم کچھیں حقوں سے نکل کر فریض پر دست بردار ہو۔ سراسر ان کی بوس بوس رہی تھی گویا کسی وکیل کی طرح کالوں کی اندرونی دوا و تراب ہو گیا ہو۔ ہونٹ یوں کاٹ رہے تھے جیسے قلموں کی ملکہ جذبات، ہر وہ کو یہ بتانے کی تیاری کر رہی ہو کہ اس کی عدم موجودگی میں جاگیر دار نے کیا کیا ظلم ڈھائے۔

غضب تو یہ کہ رازی صاحب نے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا بھی پکڑ رکھا تھا لیکن وہ خود اس قدر دہلے تھے کہ معلوم یہی ہوتا تھا کہ انہوں نے ڈنڈا نہیں پکڑا بلکہ ڈنڈے نے انہیں پکڑ رکھا ہے۔

نئے کو دیکھتے ہی رازی صاحب نے ڈنڈا ہوا میں اُپر اٹنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں وہ خود اُپر اکر رہ گئے۔ ان کی کمر شاخ کل کی طرح ٹپک کر رہ گئی۔ اگر وہ مرد کے بجائے خاتون ہوتے اور ان کا نام رازی کے بجائے داسی ہوتا تو ان کی اس ادھر کا بیعتاً ایک نزل لکھتے بغیر نہ رہتا اور یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ سچہ عرصے پہلے اس نے گوریا کی تعریف میں بھی ایک شعر لکھا تھا۔ اس میں صرف ایک ہی فقرہ تھا کہ اس کا ایک مصرع مفہوم میں ہی نہیں لسانی میں بھی دوسرے مصرعے سے کم از کم ڈیڑھ لاکھ پیچھے رہ گیا تھا۔

رازی صاحب نے بالآخر ڈنڈا اٹھائے کا ارادہ ترک کر کے اسے فرش پر کالیا اور ایک نہایت متاثر کن پود بنا کر

بانتے ہوئے کہا۔ ”ستو میاں! میں اس وقت تم سے فیصلہ کرنے تو نہیں البتہ فیصلہ کی وارنٹ دے دوں گا۔“ فیصلہ آج شام ہر حال میں ہو جائے گا۔ اپنا یہ مقبول کی طرح نکلا ہوا منہ بند کر دو اور منہ کی جگہ کان کھول کر میری بات سن لو۔ اگر آج شام تک تم نے کرائے کا بندوبست نہ کیا تو تمہیں صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔“

”صبح کا سورج دیکھنا تو مجھے ویسے بھی آج تک نصیب نہیں ہوا جناب!“ نئے نے کسی سی صورت بنا کر کہا۔ ”کیونکہ علی الصبح میں بھی اٹھا ہی نہیں۔“

”اگر تم نے شام تک کرائے کی مجموعی رقم کا بندوبست نہ کیا تو پھر تم بھی اٹھو گے ہی نہیں۔ ہمیشہ کے لیے لیٹ جاؤ گے۔“ رازی صاحب نے الفاظ کو جھٹکے دے دے کر کہا۔ ”اور اس مرتبہ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا کہ کاشت چیک دینے والا ہے۔ چیک جارے ہیں۔“ چیک آرہے ہیں۔ تینیس میں منسکیٹل ٹھیک ہو چکی ہے۔ اب یہ ہوا ہے۔ اب وہ ہو گیا ہے، اس قسم کی کوئی بات سننے سے پہلے

میرے آدمی مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دیں گے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے کرائے کے دو معاہدوں کی خدمات حاصل کر لی ہیں اور آج شام سے وہ اپنا کرائے کا میٹر ڈاؤن کر کے اپنا کام شروع کر دیں گے جس کے بعد تم اپنا کام تمام ہی سمجھنا۔“

یہ جبرن کرکھر دوافرش کے کئے بیروں تلے سے نکل گیا۔ اس نے بہ مشکل تمام اوسان جمع کیے اور گھو گھری آواز میں کہا۔ ”قبلہ رازی صاحب! آپ کی نوازش ہے کہ آپ نے آؤتے وقت میں سر چھپانے کے لیے یہ مقررہ..... اوہ معاف کیجیے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ کمراعت فرمایا۔ گوکہ میں آپ کی جگہ ہوتا تو ان کردوں میں رہنے والوں کو زبردستی کے طور پر براہ کچھ نہ پلے سے دیا کرتا۔“

اس جملے پر نئے نے ایک بار پھر رازی صاحب کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار گہرے ہوتے دیکھے تو جلدی سے بات بدل کر بولا۔ ”معاف کیجیے گا یہ کثرت زبان باہر پار پھسل جاتی ہے۔ میں اصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ بد قسمتی

سیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

- | | | | |
|---|---|---|---|
| <p>آخری معرکہ 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> | <p>آخری رات کے مسافر 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> | <p>آخری رات کے مسافر 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> | <p>آخری رات کے مسافر 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> |
| <p>آخری رات کے مسافر 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> | <p>آخری رات کے مسافر 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> | <p>آخری رات کے مسافر 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> | <p>آخری رات کے مسافر 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> |
| <p>آخری رات کے مسافر 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> | <p>آخری رات کے مسافر 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> | <p>آخری رات کے مسافر 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> | <p>آخری رات کے مسافر 350/-</p> <p>اب ہوتے کہتے کہ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ پہلی سلطان کے قتل میں شہر کے ہر گھرانے کی شمولیت ہے۔ یہ سیم حجازی کی ایک تاریخی ناول ہے۔</p> |

سے میرے حالات کافی عرصے سے دیگر لوگوں چلے آ رہے ہیں ورنہ میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیتا اور ہر ماہ یا قاعدگی سے کرایہ ادا کرتا رہتا۔ دوسری صورت میں نے یہ سوچی تھی کہ اگر میں اس کمرے میں رہنے کا تحمل نہیں ہو سکتا تو اسے چھوڑ دوں۔

”واجبات ادا کیے بغیر؟“ رازی صاحب نے اس کی بات کاٹ کر انہیں نکالتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا تھا؟“ نگے نے بھروسہ لگے میں کہا۔ ”میری رگوں میں شریف باب کا خون اور بیس براٹر کی جائے دوڑ رہی ہے۔ میں آپ کو دھوکا دے کر جھلا کیسے جاسکتا تھا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ میں واجبات ادا کرنے کے بعد بھی اس کمرے کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مجھے آپ سے اور اس کمرے سے اس قدر انس ہو گیا ہے کہ میں اسے چھوڑنے اور آپ سے ترکِ حلق کرنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ میں اس کمرے کی محبت میں اتنا آگے چلا گیا ہوں کہ مجھے واپسی کے لیے رکشامنا مشکل ہو گیا ہے۔ بہر حال۔۔۔۔۔ آپ واجبات کی فکر مت کیجیے۔ آج شام تک میں آپ کا حساب بے باقی کر دوں گا۔ پانی پانی چکا دوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ اسی طرح ہنسنے سے واپس مڑا جس طرح قلموں کے جذباتی مناظر میں ہیروئن کی ماں ڈائلاگ بول کر مڑتی ہے۔ اس نے مالک مکان کو مزید کہنے کا موقع دینے بغیر اندر آ کر کڑی چڑھائی اور سانس درست کرنے لگا۔ گوکہ اس کے خیال میں سانس درست کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اصل ضرورت تو حالات درست کرنے کی بھی جو بہت ہی سنگین ہو چکے تھے۔ چندے تک انکار مانے کی بے مہر پر غور کرتا رہا۔ گیسٹ رمانڈن تھا، دنیا کیسے بے درد ہو گئی تھی۔ صرف چھ ماہ کا کرایہ ادا نہ کرنے پر مالک مکان قتل کی دھمکیاں دینے لگے تھے۔ بار دوست چار سیر مرتبہ سے زیادہ اوجھار نہیں دیتے تھے۔ آدري دنيا لوگ بچ جیتے ہیں کہ سچے دوست اور چچی جیو بانیئیں دنیا سے ناپید ہوئی جا رہی ہیں۔

ایک ٹھٹھی آہ بھر کر نگے نے ایک غم تو کے ساتھ باہر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ زیادہ دیر غموم رہنا یا غور و فکر میں جکڑ رہنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

تیار ہو کر اس نے پچی بچی ریز گاری صبح کی اور کمرے سے نکل آیا۔ قریبی بس اسٹاپ سے اس نے بس پکڑی اور جان بچھل کر اس میں سوار ہو گیا۔ راستے بھر وہ کھنڈ بکھنڈ اس طرح کھوڑتا رہا گویا اس نے نگے کے لیے ہے۔ اس لیے کھنڈ بکھنڈ کو خاص طور پر اسے مخاطب کرنے کی جرات ہی نہیں

ہوتی۔ اپنے مطلوبہ اسٹاپ سے دو اسٹاپ پہلے ہی نگے نے بس سے نکلنے کی جلد جھڑوغ کر دی اور بالآخر اپنے اسٹاپ سے دو اسٹاپ آگے پہنچنے کے بعد وہ بس سے اترنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

وہ تو قسمت یہ رہا کہ جب وہ دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو کسی نے اس کی سرپرہات رسید کر دی ورنہ شاید وہ مزید ایک اسٹاپ تک دروازے پر ہی پھنسا رہتا۔ باہر آ کر اس نے اپنا سرسری سامنا کر لیا کہ جسم کا کوئی حصہ بس اسی میں تو نہیں رہ گیا۔ مطمئن ہو کر وہ واپس اس اسٹاپ کی طرف چل دیا جہاں درحقیقت اسے اترنا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے دوست حجاب کے دفتر میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر سٹیپن پر بھیجی ہوئی گوربا کل اچھی بہت دنوں بعد ایسا اتفاق ہوا تھا کہ گوربا اسے دیکھ کر کل اچھی بھی ورنہ کافی عرصے سے یہ عالم تھا کہ گوربا اسے دیکھ کر سہمی جاتی تھی۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ نگے اس سے مزید اوجھار نہ مانگ لے۔ پچھلے دنوں میں نگے کو اوجھار دینے دیتے اس کی اقتصادی حالت کسی پسماندہ ملک کی اقتصادی حالت سے مشابہ ہو چکی تھی۔

”اچھا ہوا تم آگے۔“ وہ منہائی۔ اسے تقریباً مستقل طور پر یہ زکا رہتا تھا جس کی وجہ سے اس کی آواز اس کی نگہ میں ایک زوردار ٹھیک کے ہنسنے کے بعد وہ مزید بولی۔ ”میں ابھی چیری آ کر تمہارے ہاں بیٹھنے ہی گئی۔“

”بی بی جی! میں نے آپ سے کتنی مرتبہ درخواست کی ہے کہ مجھے چیری نہیں کا صدمہ نہ کریں۔“

”گویا میلو نگے سے یوں کہوں۔ میں ابھی تمہارے ہاں قاصد کو بھیجے گی کئی؟“ حقیقت میں نگے نے یہ جملہ سراسر غم و غصہ سے کہے۔

”لوگ جانے اس کے کیا کیا معنی اخذ کریں گے۔“ گوربا نے برہمی سے چیری کو کھوڑا اور دوسرے کھانے لگا لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ وہ سر نہیں بلکہ سر پر جو ٹوٹی کو کھجیا رہا ہے۔ کھسیا نہ ہو کر اس نے ہاتھ ہٹا لیا۔

”جلدی تیار بات کیا ہے۔ آج تم اتنی خوش کیوں ہو؟“ نگے نے بتائی سے پوچھا۔

بولی۔ ”جلدی سے اندر چلے جاؤ۔ خوشی کی ایک خبر اندر تمہاری منتظر ہے۔“

”واہ خدا یا!“ نگے نے حسیبیت کی طرف دیکھ کر دل میں کہا۔ ”خوشی کی خبر یہاں میری شکر بھی اور میں بد بخت گھر بیٹھا مالک مکان کی پچھکار سن رہا تھا۔ بہت اچھے وقت پر ملنے مجھے غریب کی سنی ہے۔“

خدا کا شکر ادا کر کے اور مستقبل کے بارے میں دو تین دھماکوں مانگ کر نگے حجاب کے کمرے میں داخل ہوا۔ حجاب کے سامنے ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جو خاصے بھاری بھر کم تھے۔ اگر کسی آواز میں نگالے پر قادر ہوئی تو اس وقت یقیناً ان صاحب کے بوجھ سے بری طرح کراہ رہی ہوتی۔ ان کی عمر پچاس کچھن کے قریب معلوم ہوئی تھی۔ عینک لگائے ہوئے تھے اور اس عینک کا وزن بھی کھوپڑیہ کھوپڑیہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نگے کو دیکھتے ہی حجاب نے تالی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میز کے عقب سے نکل کر آگے آ کر اس نے نگے کو سینے سے لگا لیا اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”نارو! آج تو تمہیں دیکھ کر یوں خوشی ہو رہی ہے پیسے ڈاک میں میرا کوئی کشیدہ بارسل مل گیا ہو۔ میں ابھی گوربا سے کہہ رہی رہا تھا کہ نگے کی تلاش میں آؤں دو ڈاک جس پر اس کا حصول لڑی ہے جواب دیا کہ کوئی تو ہمارے دفتر میں گئی نہیں ہے۔ آپ کبیں تو چیری کو بھیج دوں۔“ خیر۔۔۔۔۔ چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔۔۔ ان سے ملو۔۔۔۔۔ اس نے بھاری بھر کم شخصیت کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میرے بچپن کے استاد۔۔۔۔۔ ان معاف ہیں۔۔۔۔۔ آج کل تو خیر سے پروفیسر ہیں، میرے زمانے میں صرف میجر ہوا کرتے تھے۔ انجی کی مہربانوں کا نتیجہ تھا کہ میں نے ٹھٹھ ڈویژن میں میٹرک کر لیا ورنہ آج شاید میں جاہل کا جاہل ہی ہوتا۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمہارے وہ کارنامے بھی سنا دے ہیں جو ابھی تمہیں انجام دینے ہیں۔ انہیں تمہاری خدمات کی سخت ضرورت ہے۔“

پھر وہ پروفیسر۔۔۔۔۔ ان معاف صاحب کی طرف مڑ کر بولا۔ ”پروفیسر صاحب! یہ ہے میرا دوست نگا۔ دیکھ تک ویٹو۔ تک ویٹو کو آپ جانتے ہوں گے۔ آپ تو باقاعدگی سے سٹپن پڑھتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ عتقرب اس کا عظیم شخص کی وجہ سے ویٹو کا نام ادا ہوا ہوگا۔ یہ آپ کا مسئلہ چکی جاتے ہی حل کر دے گا بلکہ بعض اوقات تو یہ مسئلہ چلے جا کر دینا ہے چکی بعد میں بجاتی پڑتی ہے۔“

پروفیسر معاف جن کے پورے نام میں م اور ان کی کچھ زیادہ ہی ریل میں تھی، نگے سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا

سرتا پاجانرہ لیے ہوئے بولے۔ ”آپ کو کیا کسی نے گھڑی میں پاندہ دیا تھا؟“

نگا اپنے کچلے سٹپے ہوئے شمن آلودہ کپڑوں کا جائزہ لے کر قدرے شرمندگی سے بولا۔ ”وہ دراصل۔۔۔۔۔ آج میری گاڑی خراب ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ اور کوئی رکشا کیسی وغیرہ بھی نہیں مل رہی تھی اس لیے بس میں آنا پڑا۔ اس لیے یہ حالت ہوئی۔“

”اود۔۔۔۔۔ بہت افسوس ہوا سن کر۔“ پروفیسر صاحب نے گویا تعزیت کی۔

وہ جیوں بیٹھ چکے تو حجاب نے کافی مشکواتی۔ پروفیسر صاحب کافی مقدار میں کافی پی چکے تو بائیں شروغ ہوئیں۔ پروفیسر صاحب اصل موضوع پر آتے ہوئے بولے۔

”دراصل میں ایک کدو کش چوری کرنا چاہتا ہوں۔“

”کدو کش؟“ نگے نے حیرت سے کہا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”کمال ہے۔“ پروفیسر صاحب نگے سے بھی زیادہ حیران ہوتے ہوئے بولے۔ ”آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کدو کش کیا ہوتا ہے؟“

”میرے خیال میں غالباً یہ حیرت کش قسم کی کوئی چیز ہوگی۔“ نگے نے غماز انداز میں اظہار خیال کیا۔

”ارے بیٹی۔۔۔۔۔ نگے اتم بھول گئے کیا؟“ حجاب نے کھنکھار کر نگے کو اپنی طرف متوجہ کر کے آنگھ مارے ہوئے کہا۔ ”کدو کش تو خیر نہیں نے نم کے کسی حصے میں ضرور دیکھا ہوتا ہے۔ ہمارے معاشنے میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ چار ٹانگوں والا ایک برتن سا ہوتا ہے جس کی کٹا خاریشت کی طرف ہوتی ہے۔ اس پر کدو، گاجر، مولیٰ کو رگڑ کر باریک کیا جاتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ میں سمجھ گیا۔ یاد آ گیا مجھے۔“ نگا جلدی سے بولا۔ ”میرے ذہن سے اتر گیا تھا ورنہ بچپن میں، میں نے ہزاروں مرتبہ کدو کش گھر میں دیکھا تھا اور نام بھی سنا تھا۔ اب آپ مطمئن ہو کر تعینات تھے۔“

”قصہ دراصل یہ ہے جناب نگا صاحب!“ پروفیسر صاحب نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”کہ جوانی میں ہم بہت ہی کنگھے ہوا کرتے تھے اور ایک صاحب کے ہاں کوٹھری نما ایک کرا کرانے پر لے کر رہتے تھے۔ عبدالملک ہمارے مالک مکان کا نام تھا۔ انہوں نے ہم سے ہمیشہ ہی بہت برا سلوک کیا۔ کنگھی کنگھی کنگھی! اہاری عمر بچپن کے قریب ہے اور ہم نے اس پورے عمر میں عبدالملک صاحب جیسا کتھن آدمی نہیں دیکھا۔ ان کی کتھن کا عالم یہ ہے کہ تیز ہوا میں اگر ان

کے ہاتھ سے روئی کاغذ کا ایک ٹکڑا چھوٹ کر اڑ جائے تو وہ اسے پکڑنے کے لیے پرانی نمائش سے ٹاور تک چلے جاتے ہیں۔ یعنی اس شخص نے ہمیں بہت ہی ذہنی ایڈیٹنگ کیا۔

”خاتہ“ کا لفظ کی بات کاٹ کر کے بغیر نہ رہ سکا۔ ”تو آپ بھی مالک مکان کے ستارے ہوئے ہیں۔ کیا عجیب اتفاق ہے۔ ہمارا معاملہ تو وہ ہے کہ.....“ عندلیب ل کے کہیں آہ و زاریاں۔

”خبردار“ پروفیسر صاحب اچانک ہی لال چلے ہو کر بولے۔ ”تمہیں یہ جرات کیسے ہوئی کہ عندلیب کے ساتھ مل کر آہ و زاریاں کرو۔“

”جی.....؟“ کنگے کا مزاحرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

سجاد نے جلدی سے دوش درمختلات کرتے ہوئے کنگے کو مخاطب کیا۔ ”دراصل پروفیسر صاحب کی چھوٹی صاحبزادی کا نام عندلیب ہے۔“ پھر اس نے پروفیسر صاحب کو سمجھایا۔ ”قلہ! کنگے تو مصغر پڑھا تھا۔ غالباً یہی ایک مصغر تو اسے یاد ہے۔“

”اچھا..... اچھا.....“ پروفیسر صاحب شغفے پڑ گئے۔ پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولے۔ ”ہم کافی عرصہ مجبوری کے تحت عبدالملک صاحب کے کراہے دار رہے۔ پھر رفتہ رفتہ ہمارے حالات بدل گئے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے آج مکان بھی ذاتی ہے اور ہر طرح سے آسودگی و خوشحالی حاصل ہے اور مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ عبدالملک صاحب وہیں کے وہیں رہا۔ اسی ننگ و ہار یک مکان میں رہ رہے ہیں۔ اصولاً تو ہم نے انہیں معاف کر دیا ہے، ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے لیکن بیٹے دونوں کی ان کی و سرکیش یاد آتی ہیں جن کی وجہ سے ہمیں بڑی اذیت پہنچی تھی تو بس دل کو زچہ کیا ہوئے لگتا ہے۔ اب تم سے کیا چھپا..... ہم کوئی بہت ہی زیادہ اعلیٰ ظرف انسان تو ہیں نہیں کہ اپنے ساتھ ہونے والی ہرزادی کو بھول جائیں..... بلکہ ہمارا خیال ہے کہ اعلیٰ ظرف تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے دل میں لاکھ عبدالملک صاحب سے کوئی چٹکا چٹک کا انتقام لینے کی خواہش کرو نہیں لیتی رہتی ہے۔ ہم عبدالملک صاحب کو کھوڑی سی زک پہنچانا چاہتے ہیں۔“

”بہت خوب۔“ کنگا کو ان کی بات اچھی طرح سمجھ کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تو اس کا طریقہ آپ نے یہ ہے جو چاہے کہ ان کا کدو کش چوری کر دیا جائے؟“

”جی ہاں۔“ پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

”وہ تو خیر عبدالملک صاحب کی کوئی بھی بے وقعت سے

بے وقعت چیز چوری ہو جائے انہیں یکساں صدمہ ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ اس کدو کش کے چوری ہونے کا انہیں نسبتاً زیادہ صدمہ ہوگا، گو کہ اس کدو کش کی حالت یہ ہے کہ اس پر رنگ اور سیاہی کی اس قدر گہری جھلجھلی ہے کہ یہ بتانا لانا مشکل ہے کہ وہ کس وحالت کا بنا ہوا ہے۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے تن ناگھوں سے ہی کام چلایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود عبدالملک صاحب اسے سینے سے لگاتے ہوئے ہیں گو کہ استعمال بھی نہیں کرتے۔ یہ تو ہم نہیں اس وقت کی بات بتا رہے ہیں جب آخری بار ہم نے اس کدو کش کو دیکھا تھا۔ اب تو اس سے بھی زیادہ بری حالت ہوگی۔ بہر حال ہم نے یہ جان کر لیا ہے کہ وہ اب بھی حائلت سے کدو کش کو پیچیدہ رکھتے ہیں جہاں پہلے رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک اصل میں یہ کدو کش ایک طرح کی تاریکی امیت کا حامل ہے۔“

”وہ کس طرح؟“ کنگے نے دلچسپی سے پوچھا۔

”دراصل ایک بار اپنی ساس کی قرمانش پر طوعاً و کرہاً عبدالملک صاحب نے ایک باز کدو کا جلوہ تیار کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے کدو کشی اپنی تاجدار کدو کش پر کی گئی تھی۔ پروفیسر صاحب کی ساس نو پوا نرنگ کا شکار ہو کر اللہ میاں کو پیاری ہوئی تھیں۔ تب سے یہ کدو کش عبدالملک صاحب کو زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔“

”میں سمجھ گیا۔“ کنگے نے نہایت مدبرانہ انداز میں گردن ہلائی۔ ”آپ کا کام ہو جائے گا۔“

”مجھے پر خوردار سمجھانے تمہاری فیس بتا دی ہے پر خوردار کنگے! ابھی بہت زیادہ فیس رہی ہے تم نے۔ میں اپنی تمام تر خوشحالی کے باوجود اس فیس کا کھل نہیں ہو سکتا۔ بہر حال تمہیں میرے شاکر دگا دوست ہونے کے ناطے کچھ رعایت تو کرنی ہی پڑے گی۔ میں تو صرف دس ہزار روپے دے سکتا ہوں۔ سجاد نے مجھے بتایا ہے کہ تم پندرہ ہزار سے کم ہرگز نہیں لیتے۔“ پروفیسر صاحب ہنس نکلتے گئے۔

فرخہ مسرت سے ٹکار کرتی سے گرتے گرتے بھا۔ پہلے تو بے احتیادہ کہنے لگا تھا۔ جی میں اتنی رقم کا کیا کروں گا؟ لیکن بروقت اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنے آپ کو اس کجواس سے باز رکھا اور دل ہی دل میں حساب لگا لگا تو اسے تقریباً اتنی ہی رقم کی ضرورت تھی۔ مالک مکان کو کرایہ دینا تھا۔ کچھ گویا، کچھ سجاد اور کچھ محلے کے دکاندار کا اس پر احوار چڑھا ہوا تھا۔ اللہ واقعی مسبب الاسباب ہے کہ اس نے نہایت غیر متوقع طور پر بندوبست کر دیا تھا۔ لگاتار مالک مکان کے سامنے بڑا بانک آیا تھا کہ آج شام وہ ہر حال میں اس کا

حساب بے باقی کر دے گا حالانکہ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرح بے باقی کرے گا۔ لیکن غلی جھڑی والے کو شاید اس پر ترس آگیا تھا اور اس نے آج کنگے کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ وہ اپنا وعدہ وفا کر سکے۔

پروفیسر صاحب نے سو سو کے نوٹ گن کر کنگے کے ہاتھ میں تھمائے تو کنگے نے انہیں یوں دبوچ لیا جیسے وہ نوٹ نہیں پرندے ہوں اور اسے اندیشہ ہو کہ موقع پاتے ہی وہ اڑ جائیں گے۔

”رقم تو یہ تم سے.....“ کنگے نے ہمت کر کے کہا۔ دل میں ڈر بھی رہا تھا کہ اس ریمارک پر پروفیسر صاحب ناراض ہو کر کدو کش چوری کرانے کا ارادہ ہی منبوی نہ کر دیں اور رقم وہاں نہ لے لیں۔ لیکن بہر حال آپ تھوڑے کام دیا ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے بھی استاد ہی ہوئے۔ اس لیے اسی فیس میں آپ کا کام کرنا پڑے گا۔ اب آپ ذرا مجھے مکان کا محل وقوع سمجھا دیں۔“

”محل وقوع ہی نہیں مکان کا پورا نقشہ بھی بنا کر دوں گا۔“ پروفیسر صاحب پینل کا قدیمیز پر اپنی طرف کھدکاتے ہوئے بولے۔ ”اور یہ بھی بتا دوں کہ آج عبدالملک صاحب ایک قرضی حصار پر قویاں سننے جا رہے ہیں اور رات کو وہاں سے واپس آئیں گے۔ ان کا معمول ہے کہ گھبراتے کو قویاں سننے ضرور جاتے ہیں حالانکہ ہر مرتبہ رات کو وہیں سے گھر آنے پر انہیں مسز عبدالملک سے بہت بری طرح تھوڑیں کھائی پڑتی ہیں۔ مسز عبدالملک کو کراہے شوہر ہی کی طرح عمر رسیدہ ہیں۔ لیکن میں بے حد محترم اور پست و چالاک۔ مسز عبدالملک ان کے سامنے ایسے ہی لگتے ہیں جیسے کسی چٹیل بیٹیس کے سامنے کوئی غمزہ بکرا۔ بس ان قانون سے تم ذرا رنج کر رہا۔ امید ہے تمہیں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئے گی۔“

”دشواریوں کی کسے پروہ ہے جناب!“ کنگے نے سینہ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”دشواریوں سے نکرنا ہی تو اپنا کام ہے۔ اسی چیز کی تو فیس لیتا ہوں میں۔“

”بہت خوب۔ بہت خوب۔ تم جیسے بلند ہمت نوجوانوں کی میں ہمیشہ بڑی قدر کرتا ہوں؟“ پروفیسر صاحب نے کنگے کے کندھے پر ہتھی دی پھر کاغذ پینل سنہال کر اسے مکان کا محل وقوع اور پھر اس کی ساخت سمجھانے لگے۔

نگا سب کچھ سمجھ چکا تو پروفیسر صاحب جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے جاتے کنگے سے مخاطب ہوئے۔ ”ابھی آج ہر حال میں یہ کام کر گزرتا رہ نہ مناسب موقع کے لیے تمہیں آئندہ جسرات کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ویسے تو خیر

تمہاری مرضی ہے۔ جب چاہو قسمت آزمائی کر سکتے ہو لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم زیادہ خطرہ مول لو کیونکہ تمہیں کچھ ہونے کی صورت میں ہم پر بھی آج آسکتی ہے اور ہمیں اپنی عزت بہت پیاری ہے۔“

”آپ مطمئن رہیے۔“ کنگے نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”آپ کی عزت میری بھی عزت ہے کیونکہ میرے پاس اپنی تو کوئی عزت ہے نہیں۔ اور..... معاف کیجئے..... مجھے آج کے آخر میں خواہ تو از زبان پوسل گئی۔ میرا مطلب ہے میں بھی آپ ہی کی طرح عزت دار آدمی ہوں۔“

پروفیسر صاحب کے جانے کے بعد میں ممکن تھا کہ کنگا خوشی کے مارے قالمین پر قلابازیاں کھانے لگا کر سجاد نے اسے بازو سے پکڑ کر اس کام سے باز رکھا۔ اسی دوران گویا بھی اندر آگئی اور کنگے کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”تمہارے پلڑے پھڑاتے ہوئے تھے، بدلتی ہوئی رنگت اور کاسینے ہوئے ہاتھ بتا رہے ہیں کہ معاملہ سٹے ہوگا۔ اور فیس تمہیں مل گئی ہے۔“

”تمہیں لگ رہی ہوگی کہ میں تمہارا قرض ادا کرتا ہوں یا نہیں۔ ہے نا؟“ کنگا فوراً بولا۔

”الغبت ہے تمہاری ذہنیت پر۔“ گویا برا مناتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں کسی کے غلوں کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ مجھے تو جی خوشی تھی کہ تم کسی دھندے سے تو گئے۔ اپنے قرض کے حلقے تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ مینہ پھیر کر واپس کرے سے باہر کھیل دی۔ وہ ناراض ہو چکی تھی۔“

کنگے نے بڑی مشکل سے اسے منایا۔ زیادہ مشکل سجاد کی موجودگی کی وجہ سے پیش آئی۔ سکا کی خوشی میں انہوں نے قرضی دکان سے لڑوٹھوکر کھائے، چائے پی۔ کنگے نے ان دونوں کا پچاس پچاس فیصد قرض ادا کیا۔ لگا بھیس ملتے ہی باقی پچاس فیصد بھی ادا کرنے کا وعدہ کیا اور سجاد کے دفتر سے نکل کھڑا ہوا۔

واپسی میں اس نے بھر پور بازار سے نئی ڈاڑھی مونچھ خرید کر ایک لفافے میں ڈالی اور پھر ایک ہوٹل سے نہاری کھا کر گھر واپس چلا گیا۔ اپنے گھر سے منہ سے پہلے اس نے اوپر جا کر دستک دے کر راضی صاحب کو باہر بلایا۔ راضی صاحب اس کی اس جرأت پر بے حد حیران نظر آ رہے تھے کہ اس سے پہلے تو وہ کنگے کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور وہ ان کے ہاتھ نہیں آتا تھا جبکہ آج وہ خود انہیں بلانے چلا آیا تھا۔

کنگے نے نوٹ ان کے چہرے کے قریب لہراتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ برائے نام تو میں بے لوث آپ کے منہ پر مار دوں۔“ یقین کیے بالکل چوٹ نہیں لگے گی۔“

”کیا مطلب؟“ راضی صاحب حیران ہو کر بولے۔

”وہ..... دراصل رقم کے معاملے میں ایک محاورہ بولا جاتا ہے، ”منہ پر مارنا“ تو میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ جیسے ہی پیسے آئے میں آپ کے منہ پر ماروں گا۔ براہ کرم آج مجھے اپنی حسرت پوری کر لیتے دیں۔“ نکلے نکلے ہاتھ نہ بچھیں کہیں۔

”کوئی بات نہیں پر خود ارادیت پر مارو منہ پر۔ نوٹ تو چیز ہی ایسی ہے کہ منہ پر بھی مارا جائے تو برا نہیں لگتا۔ تم سے رقم مل رہی ہے اس خوشی کے موقع پر تو میں ایک بار انہیں دو بار تمہیں نوٹ منہ پر مارنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ میری کون سی شکل بگڑ جائے گی۔“ رازنی صاحبہ بولے۔

”جی ہاں..... اس میں بگڑنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔“ نکلے نے ذریعہ کہا اور نوٹ ان کے منہ پر دے مارے۔ نوٹ فرش پر پھڑپھڑے۔ رازنی صاحبہ نے جلدی سے سمیٹ لے۔ ان کی ہاتھیں کھلی جاری تھیں۔ لیکن پھر ایک لخت ہی وہ فکر مند سے ہو گئے۔

”سیدھے کھڑے ہو کر نکلے کو کھڑتے ہوئے بولے۔

”یہ تمہارے پاس ایک لخت ہی رقم کہاں سے آگئی؟ کوئی بینک وغیرہ تو نہیں لوٹ لیا؟ شہر میں اس قسم کی وارداتیں ہوتی ہیں۔“

”میں آپ کو کھٹل سے ڈاکو لگتا ہوں؟“ نکلے نے برا مٹاتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک معزز آدمی ہوں۔“

”چلو فیر..... آج تو میں تمہاری دانتے سے متفق ہو جا رہا ہوں۔“ رازنی صاحبہ نے کہا۔

”نکلے اپنے کمرے میں آیا اور ڈاڑھی مونچھ کا لٹافہ احتیاط سے کارنس پر رکھ کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اپنی عمر کے سلسلے میں اسے آج رات جاگنا پڑے گا۔ اس کی کوئی گنجائش بھی نہیں کہ سوتے میں بھی اس کا ہاتھ جیب پر رہے۔

رات گئے وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ روشنیوں کے شہر پر آج کل چمکے کئے اسی کی زیادہ مہربان ہے اس لیے سر شام ہی اندھیرا چھا جاتا تو یوں نکلے کو کچھ ظہیمان تھا کہ اس کے کام میں کافی آسانی رہے گی۔ عبدالمالک صاحب کا مکان جس علاقے میں واقع تھا وہ اس علاقے سے تقریباً تین ہی تھا جاں نکلا رہتا تھا۔

مطلوبہ مکان کے سامنے پہنچ کر اسے اچھی طرح پہچان کر اور مطمئن ہو کر نکلا مگر وہی گلی کے راستے اس کے عقب میں جا پہنچا۔ چاروں طرف سناٹا اور سکوت چھایا ہوا تھا۔

نکلے نے بغل میں دے ہوئے لٹافے سے لٹکی ڈاڑھی مونچھیں نکال کر نگاہیں تاک کر دروازے کے بجائے وقت کوئی دیکھ بھی لے تو اس کی سچ شاخت تھیں نہ ہو سکے۔ آئینہ دیکھے بغیر

ہی اپنے میک اپ سے مطمئن ہو کر نکلے کے مکان کی عقی دیوار چھاندی اور اندر پہنچ گیا۔ مکان کا نقشہ اس کے ذہن میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عقی دیوار اسے بائیں طرف ڈال کر کمرے طرح کڈی کھولی جاسکتی ہے۔ اس کام میں اسے ذرا بھی دشواری پیش نہ آئی اور دروازہ کھول کر اس نے تاریکی میں لیکن میں قدم رکھا مگر یہ قدم اسے کافی مہکا پڑا کیونکہ قدم رکھنے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے چوہہ ملحق روشن ہو گئے۔

کوئی خاصی وزنی چیز ٹھک سے اس کے سر پر پڑی تھی اور ساتھ ہی اندھیرے میں ایک گرخت نسوانی آواز گونجی۔

”مجھے معلوم تھا عبدالمالک صاحب! کہ آپ اسی دانتے سے واپس آئیں گے۔ میں پوچھتی ہوں آخر آپ کو کتنی رات گئے تھک باہر رہنے کی ضرورت کیا ہے؟ بڑھے ہوئے مگر آوارگی نہیں گئی..... میں اب ان بہانوں سے بے وقوف نہیں ہوں گی کہ آپ قوالی سننے جاتے ہیں۔ قوالی تو اب آپ کو نہیں سنانا کروں گی اور طلبہ آپ کی کھوپڑی پر بجا کرے گا۔ میں آپ کی یہ ہر جمعرات کو دہرے گھر آنے کی عادت چھڑا کر ہوں گی۔“

نکلے لڑکھڑا کر دیوار سے جاگتا تھا اور سینگ کی کوشش کر رہا تھا۔ اندھیرے میں آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے کھانا کھا ہوا اور کچن میں روشنی بج گئی۔ نکلے نے چند سیانی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بوڑھی مگر کچھ نیم اور چہرے کے سخت کیم نظر آنے والی عورت سوچ بوجھ کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بیلن تھا۔ یقیناً وہ مسز عبدالمالک تھیں اور ان کے ہاتھ میں سو سو روپے تھیں ہی وہ آتا تھا جس نے نکلے کے سامنے چوہہ ملحق روشن کیے تھے۔

”ارے.....“ بڑھیا اسے دیکھ کر کچھ حیران ہی ہو کر بولی۔ ”تم تو کوئی اور ہو.....“ وہ نکلے کے قریب آئیں۔

”کون ہو تم؟“

”جی..... وہ..... میں چور ہوں۔“ بولکھا ہٹ میں نکلے کے منہ سے نکل گیا۔ بیلن کی طرف دیکھتے ہوئے وہ ہر قدر کانپ رہا تھا۔

”چور؟ اور اس گھر میں چوری کرنے آئے ہو؟“ مسز عبدالمالک نے حسرت زدہ درو دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ایک لمحے کے لیے یہ محسوس ہوا کہ وہ بے تحاشا قہقہے لگاتے لگتیں گی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔

”اگر چوری ہی کرتے آئے تھا تو یہ عقی ڈاڑھی مونچھ لگا کر آنے کی کیا ضرورت تھی؟“ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر نکلے کی ڈاڑھی مونچھوں کو لی۔ نکلے کو کچھ حیرت ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے سر بازار اس کی فیض اتار لی ہو۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ ڈاڑھی مونچھ عقی ہے؟“ نکلے نے بغلوں میں ہاتھ دیتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے یہ یاں دھوپ میں سفید نہیں کیے۔“ بڑی بی نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے تو تمہاری آنکھوں جیسی صورت دیکھ کر ترس بھی آ رہا ہے اور یہی بھی تم اس گھر میں چوری کرنے آئے ہو، جہاں چوری کرنے کے قابل تو کیا کہاؤ گی کو دینے کے قابل بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں کی سب سے قیمتی چیز میں ہی ہوں مجھے اچھے لگتے ہو تو چروالو۔“

”میرا خیال ہے میں اس کام میں کم از کم چالیس برس لیٹ ہو گیا ہوں اس لیے اسے اب رہنے ہی دیں۔“ نکلے نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

بڑی بی نے بیلن کو جنم دی مگر پھر شاید نکلے کو خوفزدہ ہوتے دیکھ کر کھائیں ترس آگیا اور وہ قدرے نرم لہجے میں بولیں۔

”غالباً بی بی وی سی پرل۔“ بیلن نے ”نکلے کی آخری قسط دیکھ کر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اور تم نے بھی آصف رضا میر کی طرح قسمت آزمائی کی کٹھالی ہے؟“

”جی نہیں۔“ نکلے بڑا احسان سے کہہ کر میرے پاس بی بی نہیں ہے۔“ نکلے نے جرات کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بیسے بی بی دادے..... کیا ہوا تھا اس قسط میں؟“

”اس میں ٹیلی اور بشری انصاری نے چور یعنی آصف رضا میر کے ساتھ تقریباً دو سو روپے لوٹ لیا تھا جو ایک بڑا بڑا خاتون نے اپنے گھر میں آنے والے چور کے ساتھ کیا تھا۔“ بڑی بی نے بتایا۔

”لیکن میں چونکہ خدا کی ایک گناہ گاری بندی ہوں اس لیے میں تمہارے ساتھ ذرا مختلف سلوک کروں گی۔“

بڑی بی نے نکلے کا گریبان پکڑ کر ایک زوردار ہتھکا دیا اور بیلن لہراتے ہوئے کہا۔

”نکلے! جو کچھ تمہاری جیب میں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ نکلے کا چہرہ گھبرا گیا۔

”مطلب یہ کہ اب تم یہیں ہی گئے ہو تو کچھ دے بغیر جان تمہارا ہی چھوٹے گی۔ میں تو اکثر دعا کرتی تھی کہ اس گھر میں کوئی کمزور قسم کا چور داخل ہو تو اس سے کچھ چھین چھان کر چند دن اچھے کھانے کھانے لگتا ہی بندوبست کیا جائے۔“

عبدالمالک تو رات نہ پانے کے لیے چند رات اٹھاتے ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے بڑی بی نے خود ہی اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ یہ تھمت تھا کہ نکلے والی باقی بیس تھمت کے پیچھے رکھ آیا تھا۔ اس کی جیب میں وہی تقریباً ساٹھ سو روپے تھے جو آج سو روپے لوٹ خزانے کے بند بچے تھے۔

”میں یہی ہے کل رقم تمہارے پاس؟“ مسز عبدالمالک نے حسرت سے کہا۔ ”بہت ہی مفلوک الحال چور معلوم ہوتے ہو۔“ خبر..... چلو مصافحہ کیا۔ ایک دن تو اچھا کھانا تک ہی جائے گا۔“ پھر انہوں نے نکلے کو دروازے کی طرف دھکیلے ہوئے کہا۔ ”چلو اب بھاگ جاؤ۔“

نکلے کا مشن دھرے کا دھراہ گیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ پرو فیٹرم۔ ان مٹان صاحب کو کیا سہ دکھائے گا۔ درحقیقت ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ وہ بڑی بی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

”میں آپ کا بہ احسان سمجھتی نہیں بھولوں گا کہ آپ نے میری جان بخش دی لیکن ایک چھوٹی سی مہربانی بھی پورا کر دیجئے۔“

”وہ کیا؟“ بڑی بی نے نکلے کے لیے میں پوچھا۔

”دراصل میں چوروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کا رکن ہوں۔ اگر میں نے واپس جا کر ٹھیک ٹھیک رپورٹ دی کہ میرے ساتھ کیا ہوا تو ہمیشہ کے لیے میرا منہ کالا ہو جائے گا۔ گروہ والے مجھے نااہل قرار دے دیں گے۔ میرا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ آپ مجھے کوئی چھوٹی مولی چیز ہی دے دیں تاکہ میں بطور ثبوت گروہ کے سامنے پیش کر سکوں کہ میں واردات میں کامیاب تو رہا مگر ہاتھ غلط جگہ پڑا تھا۔ وہاں کوئی قیمتی شے تھی ہی نہیں۔ پلیز.....“

”کیا دے دوں میں تمہیں؟ یہاں سے کون سی چیز لے جاتے تم اچھے لگو؟“ بڑی بی نے پاک پڑھا کر ادھر ادھر دیکھا۔

نکلے نے سب سے اونچی کارنس پر ایک کوٹے میں رکھے ہوئے تین ٹانگوں والے گڈو کوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ گڈو کوش ہی دے دیجئے۔ یہ بھلا آپ کے کس کام کا.....“

”ہاں۔ اسے تم بے شک لے جاؤ۔“ بڑی بی نے ہلاتا تھا۔

”میں نے تو اسے کئی مرتبہ بیچنے کا ارادہ کیا مگر عبدالمالک گڑگڑاتے لگے۔ اور پڑھو اور اتار لو اسے۔“

نکلے پر شادی مہر کی کئی کیفیت طاری ہو گئی۔ چوتھے کی سلیب پر چڑھ کر اس نے اتنی سے تالی سے گڈو کوش کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ ادا نہ دے منہ نہ کرتے گرتے۔ بچا۔ سنبھل کر اس نے قدرے مہربانوں سے گڈو کوش اتار لیا اسے سینے سے لگایا اور جس راستے سے آیا تھا اسی سے واپس مڑ کر پڑ کر بگھٹ دوڑ پڑا۔



ایڈیٹر کیٹ ہرزا امجد بیگ

بہیدوں بھری اس دنیا میں جانے کیا کچھ چھپا ہے..... لوگ چہروں پر نقاب ڈالے اپنی فن کاریاں آزما رہے ہیں۔ ایسے میں جب سپر کو سو سپر ڈگر اچانے تو ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کے بارے میں انسان عام حالات میں گمان تک نہیں کر سکتا۔ اس نے بھی ایک چھوٹی سی نیکی کر ڈالی تھی، جس کا خمیازہ اسے جیل جاکر بھگتنا پڑا..... ایسے میں بیگ صاحب کی ہنرکاری نے وہ دائرہ آزمائے کہ دیکھنے والے دیکھتے وہ گئے۔

تین حالات کے تین واقعات اور بیگ صاحب کی تین باتیں

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی چہرے کو دیکھ کر ہم چونک جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کو ہم نے پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔ کہاں..... یہ یاد نہیں آتا لہذا ذہن ابھرنے کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

میں بھی اس وقت کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھا۔ میں ایک عدالت سے نکل کر دوسری عدالت کی طرف جا رہا تھا کہ ایک اس بریبری نگاہ پر گئی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر ہنک گیا تھا۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ یا تو مجھے پہچان چکا ہے یا پھر پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہر حال، لمبائی تک دو دو کے بعد وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا اور سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”بیگ صاحب!“

اس لمحے مجھے بھی یاد آگیا کہ میں نے اس شخص کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اس کی آواز سننے ہی اس کا نام بھی میرے ذہن میں تازہ ہو گیا اور اس کی ہکار کے جواب میں، میں نے پوچھا۔

”فیصل..... تم یہاں؟“

”تم یہاں“ کے الفاظ میں نے ایک خاص چھوٹن کے پیش نظر استعمال کیے تھے۔ کیونکہ فیصل اس وقت دو پولیس والوں کی کھڑکی میں تھا جو اسے جیل کی گاڑی کی طرف لے جا رہے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی تین برس کے سلسلے میں، جیل میں بند تھا اور اسے قیصر عدالت میں لایا گیا تھا اور اب واپس جیل لے جایا جا رہا تھا۔ میرے انتشار کے جواب میں فیصل نے دہمی لہجے میں بتایا۔

”بیگ صاحب! میں پچھلے چھ ماہ سے جیل میں بند ہوں۔ مجھ پر کل کا الزام ہے۔ یہ نہیں عدالت میں چل رہا ہے

لیکن ابھی تک کسی قسم کی کوئی پیش رفت دیکھنے میں نہیں آئی۔ مجھے جوکیل میسر ہے وہ بہت ہی ڈھیلا ثابت ہو رہا ہے۔ لگتا ہے، وہ جیال فارنی سے جا ملا ہے اور.....“

”او بس بیٹی، لاٹ صاحب کی اولاد.....“ جس پولیس والے کے ہاتھ میں جھکڑی کا دوسرا سرا تھا، اس نے ایک بھکا دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہمارے پاس اتنا ناقص وقت نہیں ہے جو تمہیں ان مسئلوں کا سونچا دے۔“

”ایک منٹ.....!“ میں نے پولیس والے کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے ملزم سے ایک دو سوال کرنے دو، پھر تم اسے جہاں دل چاہے، لے جانا۔“ پولیس والے نے سر سے پاؤں تک ٹھوکر مجھے دیکھا۔

میں نے اسے اور اس کی نظر کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصل سے پوچھا۔

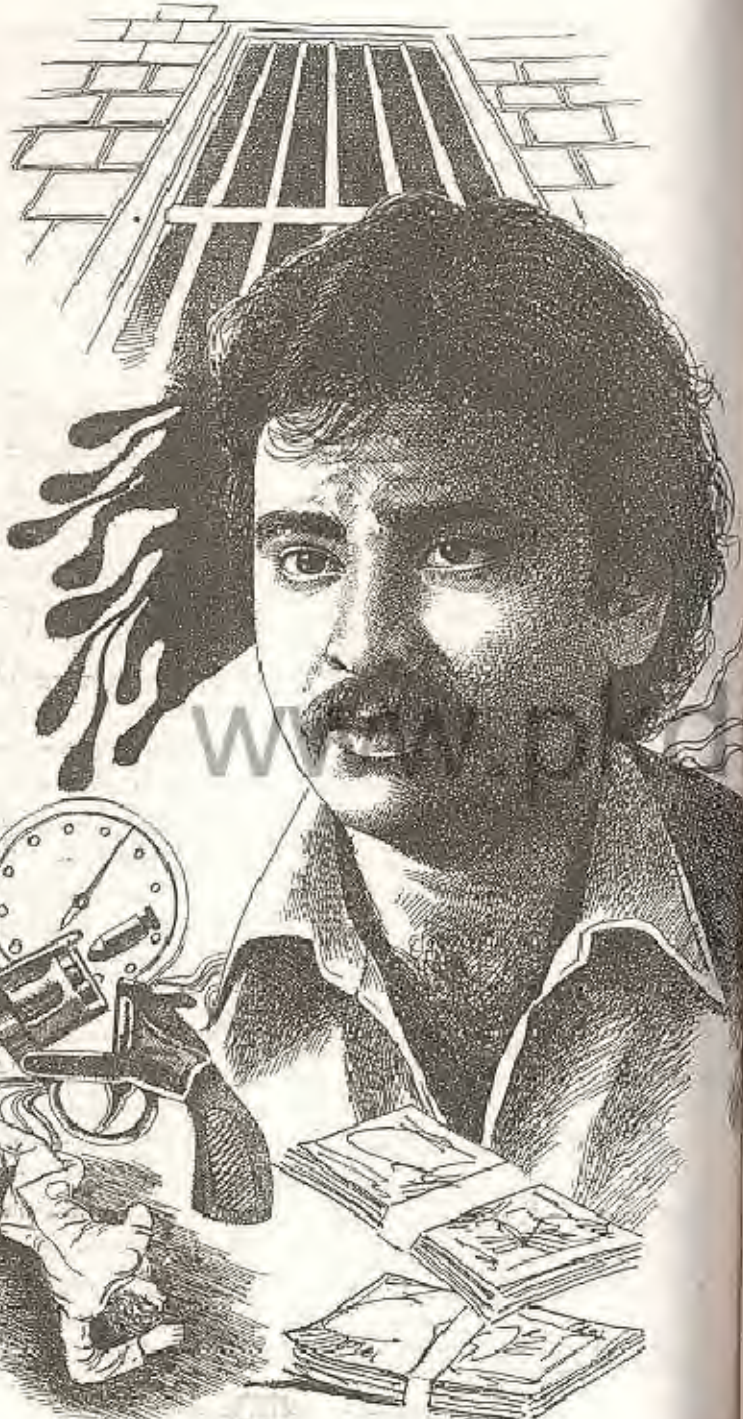
”تم نے وکیل خود کیا ہے یا وہ وکیل سرکار نے تمہیں مہیا کیا ہے؟“

”وکیل تو پراپیٹیٹ ہے جناب!“ اس نے جواب دیا۔ ”میری بیوی نے باقاعدہ فیس دے کر میرے لیے اسے کھڑا کیا ہے لیکن اس عرصے کے دوران میں یہ ثابت ہوا ہے کہ میرا وکیل ایک بے خبر اور لالچی انسان ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ مخالف پارٹی کے ہاتھوں کا ٹھکانا بنا ہوا ہے جب ہی چھ ماہ گزار جانے کے باوجود میں جوں کا توں ایک ہی جگہ کھڑا ہے۔“

”ہوں.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔“

”بیگ صاحب.....!“ وہ امید بھری نظر سے مجھے



دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اچھا ہوا، یہاں آپ سے ملاقات ہوگئی۔ میں چاہتا ہوں، آپ میرا کس اپنے ہاتھ میں لے لیں۔“
میں نے رسٹ وریج پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”دوسری عدالت میں میرے کسی کی آواز پڑنے والی ہے، تم اپنی بیوی کو میرے آفس بھیجنا۔ میں دیکھتا ہوں، تمہارے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔“
”بہت بہت شکریہ بیک صاحب!“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”اگلی پیشی کب ہے؟“
”پندرہ دن بعد۔“
”پھر تو کافی وقت ہے!“ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
”آج فرزانہ مجھ سے ملنے آئے گی۔“ فیصل نے بتایا۔
”میں اسے آپ سے ملنے کے لیے کہہ دوں گا۔ وہ کل آپ کے دفتر پہنچ جائے گی۔“
فرزانہ فیصل کی بیوی کا نام تھا۔ میں نے دائیں بائیں نگاہ دوڑانے کے بعد کہا۔ ”کیا فرزانہ آج پیشی پر عدالت نہیں آئی؟“

”نہیں جناب۔۔۔“ اس نے لڑتی میں سر ہلایا۔ ”وہ آج کہیں اور مصروف ہے۔“
میں نے فرزانہ کی ”مصروفیت“ کے حوالے سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس طرح خواہ مخواہ بحث کا ایک تیار رکھل جاتا اور ایسے کسی کام کے لیے میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔
دونوں پولیس والوں نے فیصل کو ٹیل وین کی جانب دھکیلا تو میں متعلقہ عدالت کی طرف بڑھ گیا۔

فیصل سے میری پہلی ملاقات کلشن کی ایک پارٹمنٹ بلڈنگ میں ہوئی تھی۔ وہ تو ملاطبت سے متعلق رکھنے والا ایک شریف انٹس انبان تھا۔ دراصل، مذکورہ پارٹمنٹ بلڈنگ میں میرا جانا ایک خاص مقصد سے تھا۔ وہاں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ صدر نامی وہ دوست بہت اچھا میڈریشن تھا لیکن جتا نہیں اچانک قدرت کس بات پر اس سے ناراض ہوگئی تھی۔
صدر پر قہر آگیا یا خطرناک حملہ ہوا کہ وہ زندگی بھر کے لیے اپنے بستر تک محدود ہو کر رہ گیا۔ وہیں کیوڈ کرنا تو دور کی بات، وہ اپنی مرضی سے حرکت کرنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا۔ میں پچھلے دنوں میں صدر کی دل جوئی کے لیے اس کے قہر پر چلا جاتا تھا اور گھٹنا دو گھٹنا پیٹ کر واپس آ جاتا تھا۔ فیصل، صدر کے سامنے والے قہر میں رہتا تھا اور اکثر اس

سے بھی میری ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ فیصل اور اس کی بیوی فرزانہ بہت اچھے لوگ تھے اور اپنے بڑی صدر کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ صدر اور اس کی بیوی شائستہ ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ کچھ عرصہ قبل صدر کا انتقال ہو گیا تھا لہذا اس بار عدالت بلڈنگ میں اب میرا جانا نہیں ہوتا تھا۔ شائستہ گراچی سے لاہور شفٹ ہوگئی تھی جہاں اس کا میکا تھا۔
اگلے روز میں عدالتی بیسیروں سے فارغ ہو کر اپنے دفتر پہنچا تو فرزانہ کو وہاں موجود پایا۔ اس وقت وزیر لائی میں زیادہ رش نہیں تھا لہذا میں نے فرزانہ کو فوراً اپنے پیچیر میں بلا لیا۔ رکی ٹیک ملک کے بعد میں نے کہا۔
”جی فرزانہ! مجھے تفصیل سے بتائیں، آپ کا شوہر کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے؟“

فرزانہ کی عمر لگتے لگتے تیس سال رہی ہوگی۔ وہ دہلی پتی اور اسٹارٹ عورت تھی۔ ان کی شادی کو میری معلومات کے مطابق آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اس جوڑے کی صرف ایک اولاد تھی۔ سات سالہ عطشی جو کلاس نو کی اسٹوڈنٹ تھی۔ فرزانہ، اپنی بیوی عطشی کو گھر چھوڑ کر مجھ سے ملنے آئی تھی۔ آج کل فرزانہ کی بیوی بہن شائستہ اس کے گھر میں رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی جو فرزانہ کی غیر موجودگی میں اس کا خیال رکھتی تھی۔
میرے سوال کے جواب میں فرزانہ پانچ چھ منٹ تک مختلف زاویوں سے مجھے سے بتانے کی کوشش کرتی رہی کہ فیصل کا کلک کتنا بدیت اور بڑا حرام ہے۔ ابھی تک اس نے کوئی قابل ذکر یا قابل ذکر کارکردگی نہیں دکھائی اور۔۔۔ یہ کہ وہ فیصل کی وجہ سے سخت پریشان ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔
مجھے سمجھو رازد اختلافت کرنا بڑی کیونکہ اس کی فراہم کردہ معلومات میرے لیے کسی بھی کام کی نہیں تھیں۔ میں نے قطع کار کی کرتے ہوئے گھبراہٹ میں کہا۔

”فرزانہ صاحب! آپ کے شوہر کا کس اب میرے ہاتھ میں آئے والا ہے۔ اس لیے یہ قصہ تو بھول ہی جائیں کہ پہلے والے وکیل نے کیا کیا ہے۔ تمہیں، آج سے اس وکیل کی پھٹی ہوگئی۔“
وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ مجھے دیکھنے لگی تاہم زبان سے کچھ نہ بولی۔
میں نے کہا۔ ”فرزانہ بی بی۔۔۔ آپ مجھے اس کیس کے بارے میں بتاؤ۔۔۔؟“
”جی۔۔۔ کیس کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔“ وہ نے کسی سے مجھے سننے لگی۔
میں نے ابھرنے زدہ انداز میں کہا۔ ”کچھ نہیں

جانتی۔۔۔ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ۔۔۔“ وہ متذبذب لہجے میں بولی۔ ”حالات و واقعات اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آ رہا، کہاں سے شروع کروں اور۔۔۔ کیا بتاؤں، کیا نہیں بتاؤں۔۔۔؟“

اچانک کوئی اقدام دوسرے پر آن پڑے تو انسان بری طرح ہلکا کر رہ جاتا ہے۔ فرزانہ نے چار کی کمانی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ میں اس کی راہم کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن میری یہ مجبوری تھی کہ جب تک مجھے اس کیس کے حوالے سے مناسب بنیادی معلومات حاصل نہ ہو جائیں، میں ہاتھ پاؤں ہلانے اور ذہن کے گھوڑے دوڑانے کی پوزیشن میں نہیں آ سکتا تھا۔ لہذا فرزانہ کی مدد کے خیال سے میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”فرزانہ صاحب! مجھے آپ کی پریشانی کا بخوبی احساس ہے۔ ٹھہریں، اس سلسلے میں، میں آپ کے لیے آسانی پیدا کر دیتا ہوں۔۔۔“
میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی تو فرزانہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”آپ کے شوہر فیصل پریس کے قتل کا الزام ہے؟“
”اس بندے کا نام عدنان تھا۔۔۔“ اس نے جواب دیا۔
”کیا آپ متوکل کو جانتی ہیں؟“ میں نے استفسار کیا۔
”صرف نام کی حد تک۔“ اس نے بتایا۔ ”اور وہ بھی نہیں نے فیصل ہی کی زبان سے سنا تھا کیونکہ فیصل اس شخص کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔“

”فیصل متوکل کی وجہ سے کیوں پریشان تھا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔ یہ ایک اچھا زاویہ سامنے آیا تھا۔
فرزانہ نے برا سامنے بٹاتے ہوئے بتایا۔ ”عدنان جب سے اس دفتر میں آیا تھا، اس نے فیصل کے خلاف سازشیں شروع کر دی تھیں۔ ہر روز کوئی نیا بیڑا کھینچتا رہتا اور فیصل کے لیے ٹکس کا سامان ہو جاتا۔۔۔“

”ایک منٹ۔۔۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے بتایا ہے کہ جب سے عدنان۔۔۔ فیصل کے دفتر میں آیا تھا، بد مزید پیدا ہونا شروع ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے، متوکل کو اس میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا؟“
یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی کہ فیصل کا شعبہ مارکیٹنگ تھا اور وہ ایک آگس بنانے والی فرم کے لیے کام کرتا تھا۔ مذکورہ فرم ایک مشہور ”بیسٹ آگل“ بناتی تھی جو اندرون

شہنشاہ

ہذا خاتون خانہ نے قدموں سے غصے کے ساتھ پی اور توجہ ملازمہ سے کہا۔

”میں جب بھی کچن میں آتی ہوں، تمہیں کوئی کام کرتے نہیں دیکھا۔ تم بس بیٹھی فلفلی رسالے پڑھتی رہتی ہو۔“

”بیکم صاحب! ایک تو آپ جو تپاں ایسی بہتی ہیں، جن کی آواز ہی نہیں آتی۔۔۔؟“ ملازمہ نے لاشعور کر ڈالا۔

مرسلہ راجیل نواب۔۔۔ ملتان

ملک کے علاوہ بیرون ملک بھی فروخت کے لیے ایکسپورٹ کیا جاتا تھا۔ فرزانہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔
”جی بیک صاحب! جب یہ اندوہناک واقعہ پیش آیا، متوکل کو وہ دفتر جواکس کے صرف چار ماہ ہوئے تھے۔ فیصل اور عدنان کے بیچ جو چپقلش چل رہی تھی، اسی کی بنا پر فیصل کو عدنان کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔“

”تو عدنان کیس آیا تھا؟“ میں نے رف پڑ پڑ کاٹم کھتے ہوئے پوچھا۔

”مترہ اپریل کی شام کو۔“ فرزانہ نے جواب دیا۔
”اور فیصل کو کب گرفتار کیا گیا؟“ میں نے سوال کیا۔
”اتحادہ اپریل کی صبح۔“
”گھر سے۔۔۔؟“

”نہیں!“ اس نے قطعی انداز میں سر کھٹی میں جھٹکا اور کہا۔ ”اگلے روز یعنی اتحادہ اپریل کو جب فیصل حسب معمول دفتر پہنچا تو وہاں پولیس موجود تھی۔ انہیں فیصل کی آمد کا ہی انتظار تھا۔ اگر اس روز فیصل بروقت اپنے آفس میں نہ پہنچتا تو پولیس اسے گرفتار کرنے گھر کا رخ کرتی کیونکہ اس وقت تک پولیس نے یہ طے کر لیا تھا کہ عدنان کے قتل میں فیصل کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

”اور پولیس نے یقیناً متوکل اور ملزم کی باہمی چپقلش کی روشنی میں یہ بات طے کی تھی؟“ فرزانہ سانس و رمت کرنے کے لیے سچی تو میں نے ایک اسکا کی سوال کیا۔
”جی ہاں۔۔۔!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”اب آج مجھے اس ”چپقلش“ کے بارے میں کچھ بتائیں؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ چند لمحات تک خاموش رہ کر ذہن میں بکھرے ہوئے مختلف خیالات اور سوچوں کو ایک مقام پر جمع کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر بتانے لگی۔

”بیک صاحب! آپ کو یہ تو پتا ہی ہے کہ فیصل اپنی فرم کے لیے مارکیٹنگ کیا کرتا تھا اور فرم کا مالک اس کی کارکردگی سے بے اعتنا خوش بھی تھا لیکن یہ کجنت عدنان پتا نہیں لگا سکتا اس سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ عدنان کا تعلق بھی مارکیٹنگ ہی کے شعبے سے تھا۔ میں نہیں جانتی، وہ کس کے ریفرنس سے فرم میں ملازم ہوا تھا بہر حال عدنان کو فیصل کے ساتھ ہی تھی کہ دیا گیا تھا لیکن چند دنوں بعد ہی اس نے پر پڑے لگانا شروع کر دیے۔“ وہ لمبے بھر کے لیے سانس لینے کو رکھی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”عدنان نے بڑے غیر محسوس انداز میں فرم کے مالک کے کان بھرنا شروع کر دیے۔ مثلاً یہ کہ فیصل جس کیشن پر کام کر رہا ہے وہ اس سے آدھے پر بھی کام کرنے کو تیار ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فرم کے مالک کو یہ یقین بھی دلایا کہ اگر مارکیٹنگ کا شعبہ مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ بڑی کم پوزیٹیو تیزی سے بڑھ کر کھلا دے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”اور اس نوعیت کی پرمٹش باتیں ہر باس کو اچھی لگتی ہیں!“ میں نے لہجہ دیا۔

”آپ بالکل سچ کہہ رہے ہیں بیک صاحب!“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ”عدنان کی پڑھائی ہوئی پتی کے بعد فرم کے باس کا وہ فیصل کے ساتھ خاصا دل گیا ہوگا؟“

”خاصا نہیں بلکہ مکمل طور پر۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”عدنان کی پھلانی ہوئی سازش بڑی تیزی کے ساتھ کامیابی سے بندھ رہی تھی اور باس کو فیصل کے کام میں بہت زیادہ کڑے نظر آنے لگے۔ وہ بات، بے بات فیصل کو اپنے کمرے میں بلا کر کونٹے کا بلکہ بعض اوقات تو فیصل کے ساتھ باس کا رویہ بڑا تحقیر آمیز ہو جاتا تھا۔ اس صورت حال نے فیصل کا ذہنی سکون چھین لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چڑا اور بد مزاج ہو گیا۔ وہ مجھ پر غصہ ہوتا اور علیٰ برہمی بسا اوقات برس پڑتا تھا۔ مجھے اس کے دفتری حالات کا چونکہ علم تھا لہذا اس کی تنقید دہانہ کو برداشت کر لیتی تھی لیکن ایسے مواقع پر علیٰ بہت زیادہ پریشان اور خوفزدہ ہو جاتی تھی۔“

وہ اپنی بات مکمل کر چکی تو میں نے لیٹر لکھ میں کہا۔ ”ان دفتری تشدد حالات میں عدنان کا فعل ہو جاتا ہے اور

فیصل کو اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ لیکن بات ہے نا۔۔۔؟“

”بالکل یہی بات ہے جناب۔“ وہ تندی انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ”مہم اچھی ایک پریشانی سے لگے نہیں تھے کہ یہ دوسری افادہ سر پران پڑی ہے۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا فیصل اور عدنان کی باہمی چٹچٹش اور عدنان کے کمن کے الزام میں فیصل کی گرفتاری سے پہلے بھی آپ کو کون کے ساتھ کوئی پرالہم رہی ہے۔۔۔؟“

”جی ہاں۔۔۔ وہ ایک الگ مصیبت تھی۔۔۔“ فرزانہ نے جواب دیا۔

”اس مصیبت کو الگ نہیں رہنے دیں بلکہ میرے ساتھ شیئر کریں۔“ میں نے خصوصی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگ اس معاملے سے پہلے کس قسم کی پریشانی میں مبتلا تھے۔ ہو سکتا ہے، ان دونوں معاملات کے ڈانڈے آگے جا کر نہیں آپس میں مل جائیں!“

”مجھے تو ایسا نظر نہیں آ رہا، بہر حال آپ کو وہ قصہ سنائی ہوں۔۔۔“ وہ بدلتی سے بولی۔

”جی ضرور۔۔۔“ میں ہر تن کوش ہو گیا۔

وہ بتاتے لگی۔ ”بیک صاحب! کچھ عرصے پہلے فیصل نے وفا کی امداد دینی کے بارے میں ایک بھگدور سے کسی چٹائی کی کچھ اخلاقی مدد کو دی تھی۔ یہ سچی بعد میں فیصل کو بہت ہلکی پڑی۔“

”ذرا تفصیل سے بتائیں گی؟“ وہ خاموش ہوئی تو میں نے سرسائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”مجھے اس بارے میں زیادہ تو معلوم نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ فیصل نے جس ضرورت مند فیملی کی اخلاقی مدد کی تھی ان کی ایک لڑکی بعد میں کسی پولیس کس میں ملوث پائی گئی تھی اور اسی وجہ سے بعض خطرناک جرائم پیشہ لوگ فیصل کو طرح طرح کی خوفناک دھمکیاں دیتے رہے تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ معاملہ دب دیا گیا اور ہم نے بھی سکون کی سانس لی۔“ ایک لمبے کوک کر فرزانہ نے واقعات سکون کی سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”اور اب یہ مصیبت اچھ کڑی ہوئی ہے۔“

”میں فیصل کی اس افسانہ پسند روی کے بارے میں مزید جانتا چاہتا ہوں جو اس نے کسی مصیبت زدہ فیملی کے ساتھ کی تھی؟“ میں نے فرزانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ فیملی لاڈھی کے علاقے میں رہتی تھی۔“ فرزانہ نے جواب میں بتانا شروع کیا

”کیا۔“ وہ عبد الغفور کی کوئی بوڑھا شخص تھا۔ اس کی جوان بیٹی نورین کو بعض برسے لوگ جک کرتے تھے۔ فیصل کا ایک دوست پولیس میں ہے۔ عبد الغفور نے فیصل سے مدد کی درخواست کی۔ فیصل نے اپنے پولیس والے دوست کے تعاون سے جو ہو سکا تھا وہ احسان عبد الغفور پر کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد نورین نامی وہی لڑکی، یہاں ہمارے تعلق علاقے میں کسی جرائم پیشہ شخص کے ساتھ ایک معاملے میں ملوث پائی گئی۔ اس مرحلے پر فیصل نے پولیس کی بھرپور مدد کی تھی جس کے نتیجے میں مذکورہ جرائم پیشہ شخص رستے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد اس کے ساتھی فیصل کو الٹی سیدھی دھمکیاں دیتے رہے تاہم اس سلسلے میں انہوں نے کسی عملی کمپنی کا مظاہرہ نہیں کیا اور ہم بھی مطمئن ہو گئے۔“ اس نے تھوڑا توقف کر کے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر بولی۔

”میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی۔ فیصل آپ کو اس بارے میں تفصیل سے بتا سکتا ہے۔“

”فیک ہے، میں کل کسی وقت جیل جا کر فیصل سے بھی ملاقات کروں گا۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”مقام حالات کھل کر سامنے آئیں گے تو پھر ہی فیصل کی مدد کی کوئی صورت پائیگی۔“

”بیک صاحب! آپ فیصل کو اس مصیبت سے نکال دیں گے نا؟“ وہ بڑی امید بھری نظر سے مجھ پر دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں ہاں، کیونکہ نہیں۔“ میں نے حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔ ”میں فیصل کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ وہ ایک شریف اور امن پسند شخص ہے۔ اس کے سینے میں انسانیت بھرا ایک امداد اور حساس دل ہے۔ آپ لوگوں نے جس جھڈے اور جال کشائی سے میرے ملوث دوست صفر کا خیال رکھا وہ بھی میرے سامنے ہے۔ اگر فیصل نے عدنان کو کٹ نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے، وہ بے گناہ ہے۔ اور اگر وہ بے گناہ ہے تو اسے اس کس سے با عزت بری ہونا چاہیے۔

جس، اپنی ہی بات ہے۔“

”بہت بہت شکریہ بیک صاحب!“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ”آپ نے تو میری بہت بھجھادی ہے۔“

پھر وہ اپنا پرس کھولنے ہوئے گیا ہوئی۔ ”میں رقم ساتھ لے کر آئی ہوں۔ آپ اپنی فیس تو مجھ سے لے بھی لیں۔“

”فیس میں آپ سے لے لوں گا۔“ میں نے ضمیر سے کہنے لکھ میں کہا۔ ”پہلے میں ایک تفصیلی ملاقات فیصل سے کروں۔“

”فیصل سے آپ ضرور ملاقات کریں لیکن فیس آپ کو

ابھی لینا پڑے گی۔“ وہ اصرار میں لہجے میں بولی۔ ”اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کون سی وجہ؟“

”میں فیصل کو اس کس میں بے گناہ سمجھتی ہوں اور آپ بھی میرے ہم خیال ہیں۔“ وہ بچے تلے الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”جب وہ بے قصور ہے تو ہر صورت میں اس کا کس آپ کو لینا ہے۔ جب کس آپ کو لینا ہے تو پھر فیس بھی آپ کو لینا ہوگی۔ اچھی لیں یا بعد میں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو پھر کیوں نہ ابھی لے لیں۔۔۔۔۔!“

فرزانہ نے دیکھ کر اصرار کیا تو میں انکار نہ کر سکا تاہم اس سلسلے میں، میں نے اس کے ساتھ خصوصی رعایت کر دی تھی۔ وہ میری اس مہربانی پر بڑی مطمئن اور پرسکون ہو کر میرے دفتر سے رخصت ہو گئی۔

آئندہ دو تین جیل جا کر میں نے فیصل سے ایک بھرپور ملاقات کی اور بہت سی نئی باتیں میرے علم میں آئیں۔ خصوصاً اس لڑکی کے حوالے سے، فرزانہ نے جس کا نام نورین بتایا تھا۔ یہ بڑی سنسنی خیز اور انکشاف انگیز معلومات تھیں۔ آگے بڑھتے سے پہلے میں اس کس کا پلپ پس منظر آپ کو بتاتا ہوں جس میں سنسنی خیزی کے علاوہ بہت سا سامان غبرت بھی ہے۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ میں جو کچھ آپ کی خدمت میں پیش کرنے جا رہا ہوں اس میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں بتا چکی تھیں تاہم واقعات کے تسلسل اور ترتیب کے پیش نظر انہیں یکجا کر کے تحریر کر رہا ہوں تاکہ آگے چل کر عدالتی کارروائی کے دوران میں، کسی مرحلے پر آپ کا ذہن ابھرنے کا شکار نہ ہو۔!

☆☆☆

فیصل کے بارے میں آپ کو بنیادی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ اس تمام تر بکھیرے کی ابتدا اس کی ذات سے ہوتی ہے۔ ایک روز وہ اپنے قلم سے نکل رہا تھا کہ عبد الغفور سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ مارکیٹنگ سے وابستہ افراد عموماً آؤٹ ڈوری رہتے ہیں۔ اپنے معمول کے مطابق، وہ لوگ سچ آفس آکر حاضری لگاتے ہیں، مالکان کو اپنی شکل دکھاتے ہیں اور پھر فائلز میں نکل جاتے ہیں۔ آفس کلوز ہونے سے ٹھوڑی دیر پہلے ان کی واپسی ہوتی ہے پھر وہ گھٹنا، دو گھٹنا دفتر میں بیٹھ کر اپنا حساب کتاب کرتے ہیں اور بالآخر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ فیصل کی

کا نام درج نہیں کیا جاسکا۔ وہ ایسے بھی زہر نظر کیا۔ بلکہ کس سے بلا واسطہ یا بالواسطہ اس کی فیکٹری کا کوئی تعلق نہیں۔

عبدالغفور نے فیصل کو بتایا۔ "ابتدا میں نورین وقت پر گھر سے نکلتی تھی اور مقررہ وقت پر ہی وہ واپس بھی آ جایا کرتی تھی۔ میں اس کے کام اور آمد و رفت سے مطمئن تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے معمولات میں تبدیلی آئی گئی۔ وہ گھر سے تو اپنے وقت پر ہی نکلتی تھی لیکن اس کی واپسی میں تاخیر ہونے لگی اور یہ "تاخیر" بھی دیر سے دیر سے آگے بڑھتے ہوئے رات کے آٹھ نو اور نو تک پہنچ گئی درنا ابتدا میں وہ مغرب کی اذان سے پہلے گھر میں ہوتی تھی۔" وہ ایک مرتبہ گھر سے باہر صبح کی حالت میں نکلتی تھی۔ فیصل نے اس بار بھی اسے نوٹ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ دوبارہ بلکہ بارہ بار گویا ہوا۔ "میں نے نورین کے یہ تصور دیکھے تو مجھے گہری تشویش نے آگن گھیرا۔ میں نے اس کی وہ درویش سے گھر آنے کی وجہ جاننا چاہی تو وہ اور وہ نام وغیرہ کا بہانہ کرتے لگی۔ مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا تو میں نے اس کے علم میں لائے بغیر، ایک روز فیکٹری جا کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میری اس کوشش کے نتیجے میں بہت سے انکشافات ہوئے۔ اور وہ نام والی کہانی تو میرے سے سمجھوتی نکلی۔ علاوہ ازیں چند افراد نے مجھے دھکے جیسے الفاظ میں یہ بھی بتایا کہ نورین کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ فیکٹری سے چھٹی کے بعد وہ کسی نہ کسی مروجہ ساتھ جاتی ہے۔ کبھی موٹر سائیکل پر اور کبھی کسی گاڑی وغیرہ میں۔ جب نورین سے اس کے چند قریبی ساتھیوں نے ان افراد کے بارے میں استفسار کیا جو چھٹی کے وقت فیکٹری سے اسے ایک کیا کرتے تھے تو اس نے "کڑوا، انکل، وغیرہ" کا بہانہ کر کے بات کو گھما دیا۔ پیکنگ ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ نے تو مجھے یہ بھی بتایا کہ نورین پختے میں ایک دو چھپان بھی کرتے لگی ہے۔ میں نے یہ بہانہ ہی تحقیق اس وقت کی تھی جب نورین فیکٹری میں موجود نہیں تھی۔ بہر حال وہاں سے حاصل ہونے والی اذیت ناک معلومات نے میرے دماغ کا فیور اثر دیا اور اس روز میں نے گھر آ کر نورین سے سخت جھگڑا کیا۔"

عبدالغفور چند لحاظات کے لیے تھا تو فیصل اس کے درود کو محسوس کر کے خود بھی رنجیدہ ہو گیا لیکن اب بھی اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات میں وہ عبدالغفور یا اس کی بیٹی نورین کی کیا بددست کر سکتا ہے۔ ابھی تک تو وہ یہ بھی نہیں جان پاتا تھا کہ کس شخص نے عبدالغفور کو اس کے پاس بھیجا تھا اور کیا سوچ کر بھیجا تھا۔ بہر حال، فیصل کی نگاہ میں اس ریزننس کی

اب کوئی اہمیت نہیں رہی تھی کیونکہ وہ عبدالغفور کی دھک بھری کہانی کی گرفت میں آ چکا تھا۔ عبدالغفور کے خاموش ہونے پر اس نے پوچھ لیا۔

"ہاں انکل۔۔۔۔۔ اس جھگڑے سے کوئی مثبت نتیجہ بھی برآمد ہوا یا۔۔۔۔۔؟"

"تو نتیجہ تو برآمد ہوا۔۔۔۔۔" عبدالغفور نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن اسے مثبت نہیں کہا جاسکتا۔"

"کیا مطلب؟" فیصل نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"میرے ایک کھٹے کے پینے چلانے کے بعد جو نتیجہ برآمد ہوا اسے ایک پینے میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ نورین نے بڑے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں یہ فیصل سنایا تھا۔ میں کچھ بھی غلط نہیں کر رہی ہوں اور جو بھی کر رہی ہوں اس گھر کی خوش حالی کے لیے کر رہی ہوں۔ بس۔"

"کیا اس موقع پر نورین کی ماں نے اسے کچھ نہیں سمجھایا؟" فیصل نے پوچھا۔

"ماں۔۔۔۔۔" عبدالغفور کے ہونٹوں پر بڑی کڑوی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اگر شاہین گھر چھوڑ کر نکلتی جاتی تو شاید آج صبح سے گھر میں اس کی سکن دماغ ہوتا۔"

"شاہین، تو وہ نورین کی ماں۔۔۔۔۔ گھر چھوڑ کر نکلتی جاتی تھی؟" فیصل نے بھڑکی ہوئی لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں، جی ہاں، جی ہاں۔۔۔۔۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے نظریہ لہجے میں بولا۔ "لگ بھگ دس سال پہلے وہ ہمیں چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ اس وقت نورین تیرہ چودہ سال کی ہوئی اور میرا بیٹا صرف دو سو دو سال کا تھا۔ اس ظالم عورت کو اس معصوم کا بھی خیال نہ آیا اور وہ اپنے بچے بچے گھر پر لٹ مار کر رہتی دیکھا۔ چل نکلی۔ میں تو کہتا ہوں، نورین میں دودھ کا اثر آیا ہے۔ میں شاہین کے چھٹوں سے لہجہ کی طرح واقف ہوں ابھی لیے میں نے بھی صاف الفاظ میں نورین سے کہہ دیا ہے کہ اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی تو اس کے فرار سے پہلے میں اسے گھر سے نکال دوں گا حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایسا کرنا بہت خطرناک ہوگا۔ جب نورین کو گھر سے نکل کر آزاد مل جائے گی تو چاہے کس، پھر وہ کون کون سا گھر کھائے گی اسی لیے۔"

وہ سانس ہمارا کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اسی لیے فیصل بیٹا۔۔۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ تم نورین

کو سمجھاؤ۔ مجھے یقین ہے، تمہاری بات اس کی سمجھ میں آ جائے گی۔"

"پائینس، آپ کو کس بنا پر ایسا یقین ہے۔" ابھن زوہ لہجے میں فیصل نے کہا۔ "بہر حال۔۔۔۔۔ آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس نوٹ کر دو، میں کسی کسی وقت شام میں۔۔۔۔۔"

"کسی وقت نہیں بیٹا، ابھی۔" وہ فیصل کی بات کا منہ ہونے اصرار کی لہجے میں بولا۔ "تم ابھی میرے ساتھ چلو۔۔۔۔۔"

اس وقت نورین گھر میں ہے۔"

"کیا وہ آج فیکٹری نہیں گئی؟"

"نہیں۔" عبدالغفور نے لٹی میں گردن ہلائی اور بتایا۔

"وہ کچھ عرصہ پہلے تک جاتی رہی ہے اور اب اس نے کئی دنوں سے فیکٹری کی جانا چھوڑ دیا ہے۔ بڑی دیر تک سوئی رہتی ہے اور وہ پھر کے کھانے کے بعد گھر سے نکل جاتی ہے۔"

"کیا۔۔۔۔۔" یہ میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔ اور اس سے پوچھتا ہوں تو کوئی نہ کوئی ایسی جواب دیتی ہے۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں بیٹا۔۔۔۔۔" بولتے بولتے اس کی آواز رندہ گئی۔ اپنی آنکھوں میں آنسو آنے والی تھی کو صاف کرنے کے بعد اس نے منت ریز لہجے میں کہا۔

"دیکھو فیصل بیٹا، میں بڑی آس لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ میری آمد کو تو تم میرے ساتھ چلو کہ تو تمہارا کچھ نہیں کہو گے گا لیکن ہو سکتا ہے تمہاری اس کوشش سے نورین کی زندگی سنور جائے۔ یہ ایک بڑھاپے، مجبور اور بے بس باب کی انتہا ہے۔ اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر عظیم دے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے انکل لیکن۔۔۔۔۔" فیصل نے ہچکچاہٹ بھری لہجے میں کہا۔ "میں اس وقت کپتانی کے کام سے نکلا ہوں اور شام تک مصروفیت ہی مصروفیت ہے۔"

"کپتانی کا کام تو تم روزانہ ہی کرتے ہو۔ کرتے ہو کر نہیں؟"

"بالکل کرتا ہوں۔" فیصل نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "کام نہیں کروں گا تو گھر کیسے چلے گا۔"

"اللہ تمہارا بھلا کرے اور تمہارے گھر کو ہمیشہ اچھی طرح چلاتا رہے۔" عبدالغفور نے دعا یہ اقرار میں کہا۔ "میں، ایک آدھ کھٹے کی بات ہے۔ میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

عبدالغفور کی سمجھوری اور منت خوشامد کو کچھ کر فیصل کا دل پکھل گیا۔ اس نے ایک لمحہ سوچا پھر عبدالغفور کو اپنی بات ایک بار موار کر کے لاٹھی کی جانب روانہ ہو گیا۔ ویسے بھی لاٹھی

کا علاقہ وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور یہ مختصر سا فاصلہ طے کرتے ہوئے بھی وہ عجیب سی کشش میں مبتلا رہا تھا۔ وہ دل کے انھوں مجبور ہو کر عبدالغفور کی مدد کرنے کے لیے تو نکل کھڑا ہوا تھا لیکن دماغ مسلسل اسے ڈرا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ ایسی قسم کی سوچیں ابھری تھیں۔

"تم عبدالغفور سے آج چٹکی مرچ ملے ہو۔ تم اسے جانتے ہو اور نہ ہی وہ تم سے واقف ہے۔ اس نے تم سے رابطے کا انکر کوئی ریزننس بھی استعمال کیا ہے تو اس شخص کے بارے میں تمہارے پاس کوئی معلومات نہیں ہیں۔ ان حالات میں عبدالغفور کی ذات بے انتہا مشکوک ہو جاتی ہے اور۔۔۔۔۔ اس نے اپنی بیٹی کے حوالے سے جو کچھ بھی نہیں بتایا ہے، تم اس کی تصدیق کس طرح کرو گے؟ ہو سکتا ہے، یہ بڑھا کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تمہیں کسی مصیبت میں پھنسانے کا ارادہ رکھتا ہو اور تم۔۔۔۔۔ بغیر کسی تحقیق اور تصدیق کے، کسی گدھے کے ہاتھ اس کے ساتھ چل پڑے ہو۔ اللہ تمہارے حال پر رحم کرے۔" اگرچہ ایسے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے۔"

فیصل اپنے دماغ کی ان تلخیوں میں برحقیت باتوں کو رو نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جو کچھ بھی سوچ رہا تھا وہ کل کا تھا۔ واقعتاً اس صورت حال میں اسے چپ چاپ عبدالغفور کے ساتھ نہیں چلے جانا چاہیے تھا۔ وہ اپنی اسی بے خبری کے باعث کسی بہت بڑے وہاں میں بھی آسکتا تھا۔

چند لمحات تک وہ اپنی متضاد اور دراؤنے خیالات میں گھرا رہا پھر اس کا جذبہ بھڑکی، اس کے دماغ کی ڈھکی بھری سوچوں پر غلبہ آ گیا اور اس نے ان تمام تر خیالات کو اس عزم کی غور سے رد کر دیا۔ "جب لوگ میں سروے دیا تو پھر موصول سے کیا ڈرنا۔۔۔۔۔"

تھوڑی ہی دیر کے بعد، عبدالغفور کی راجھائی اور ہدایت پر مختلف آڑی ٹیڑھی اور تنگ گلیوں میں مڑنے کے بعد وہ دونوں اپنے مطلوب مقام پر پہنچ گئے۔ یعنی عبدالغفور کے گھر، فیصل نے اپنی بات ایک بار بھی نہیں کی اور عبدالغفور کی تھید میں اس کے گھر کے اندر پہنچ گیا۔

عبدالغفور نے فیصل کو ڈرائنگ روم میں بلھایا اور خود گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ فیصل بخود ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ ڈرائنگ روم کی جگہ اور سٹیک سے لگتا تھا، وہ کسی آسودہ حال ٹیلی کا گھر ہے۔ اس کا مطلب تھا، اس گھر میں آمدنی کے نام پر ابھی تاسی ریم آمدنی تھی۔ ابھی تک فیصل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بڑے میاں یعنی عبدالغفور کیا کرتے ہیں

اور اس کے چھوٹے بیٹے کا سران کے کیا مشاغل ہیں۔ اگر اس گھر کے معاش کی گاڑی صرف نورین ہی چلا رہی تھی تو پھر اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان دنوں خوب کماری ہو گئی، یہ الفاظ دیکر خوب جی بھر کے تباہ و برباد ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد عبدالغفور وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں دو کولڈ ڈرنک بھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ فیصل کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا پھر ایک کولڈ ڈرنک فیصل کی طرف بڑھاتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولا۔

”لو پیو جیٹا۔۔۔۔۔ آج تو اپنی خاصی گری ہے!“ دوسری کولڈ ڈرنک اس نے خود اپنے لیے اٹھا لی تھی۔

فیصل نے نظریں سے ہونے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ غالباً اندر نورین کو بلائے گئے تھے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔!“ عبدالغفور نے اثبات میں گردن ہلاتی۔ ”میں نے اسے چکا دیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں فریٹش ہو کر آ رہی ہے۔“

فیصل نے ایک اطمینان بھری سانس لی پھر کولڈ ڈرنک کا سپ لیٹے کے بعد عبدالغفور سے سوال کیا۔ ”آپ کا بیٹا کہیں نظر نہیں آ رہا۔ غالباً وہ اسکول گیا ہوگا!“

”اسکول۔۔۔۔۔!“ عبدالغفور نے تنخ لہجے میں کہا۔

”کامران کو پڑھنے لکھنے سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ اس کا مطلب ہے، آپ نے اسے کسی کام وغیرہ پر لگا دیا ہوگا؟“

”میں نے کوشش تو کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔“ وہ بدلی سے بولا۔ ”کامران کی پڑھائی کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد میں نے چاہا تو یہی تھا کہ وہ کوئی ہنر وغیرہ ہی سیکھ لے تاکہ کل کو کسی کی فنی جی نہ رہے لیکن اس نے میری تمام امیدوں پر پانی پیسیر دیا۔“ وہ لہجے بھر کے لیے رک پھر طنز پر انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”جب شیخہ بھنائے انسان کی ضرورت پوری ہوتی رہے تو پھر کس کم محنت کا کام کرنے کو بھی چاہے گا!“

”ضرورت پوری ہوتی رہے کیا مطلب؟“ فیصل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ عبدالغفور کے گھر پہلو معاملات میں ہمدردی کے علاوہ اس کی دلچسپی بھی قائم ہو چکی تھی۔

”وہ ہاں، حاتم ملانی کی کچھ لکچریں ہمارے گھر میں۔ میرا مطلب ہے نورین!“ اس نے چپچپے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”کامران کو جس شے کے لیے جتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے وہ نورین سے لے لیتا ہے۔ اس کا کام ہو جاتا ہے ان حالات میں اس کی جوتی کام کرتی ہے۔ سارا سارا دن آوارہ

گردی کرتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ اس وقت بھی وہ آوارگی ہی کے کسی مشن پر ہوگا!“

فیصل نے فوری خیال کے تحت ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ”نکل! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ نے ہوش میں مجھے بتایا تھا کہ نورین سال بھر سے نوکری پر مبنی تھی۔ میں یہ چاہتا تھا ہوں کہ اس سے پہلے آپ کا گھر کس طرح چلتا تھا۔ اس گھر کے اخراجات کون اٹھاتا تھا؟“

”میں اٹھاتا تھا۔۔۔۔۔ اور کون اٹھاتا تھا؟“ وہ غریب انداز میں سینہ تان کر بولا۔

”کیا آپ کوئی کاروبار وغیرہ کرتے تھے یا کہیں ملازمت تھی آپ کی؟“

”ملازمت تو نہیں، البتہ تم اسے کاروبار کہہ سکتے ہو۔“ عبدالغفور نے پروجی انداز میں جواب دیا۔

فیصل نے پوچھا۔ ”آپ کس نوعیت کا کاروبار کرتے تھے؟“

”میرا اربوں کا کام تھا۔“ عبدالغفور نے بتایا۔ ”میں ایلو پیٹیم کے برتن سائیکل پر لاؤنگر، کچلی کچلی کھاتا تھا۔ جب تک جسم میں جان تھی، میں نے اتھک محنت کی ہے اور اپنی اسی محنت سے ان بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ میں تو اب بھی ہاتھ پاؤں ڈال کر آرام نہیں کرتا جانتا تھا لیکن پچھلے سال نورین نے مجھ سے کہا کہ وہ اب کھانے کے لیے گھر سے باہر قدم نکالے گی۔ میں نے جب اس سے پوچھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے تو اس نے بتایا کہ وہ فی الحال ایک سکنٹ بنانے والی فیکٹری میں چیکنگ کا کام کرے گی۔ آگے اللہ مالک ہے۔ نورین نے مجھ سے بھی بتایا کہ اس کی ایک دوست نے اس کے لیے نوکری کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ میں نے بسکٹ فیکٹری اور کام کے حوالے سے چند سوالات کیے تو نورین نے تسلی بخش جواب دے کر مجھے مطمئن کروا دیا۔ اگلے دن سے وہ فیکٹری جانے لگی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن۔۔۔۔۔ ایک دن۔۔۔۔۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمبات کی خاموشی کے بعد وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے تو محنت اور رزق حلال کی کمائی سے اپنے بچوں کی پرورش کی تھی۔ پتا نہیں یہ یہ نادان کن رہا ہوں پرچہ پڑے ہیں۔ کامران کو آوارہ گردی سے فرحت نہیں اور نورین نے تو حد بھی کر دی ہے۔ کاش! میں اس کا کوئی علاج کر سکتا۔ کاش! اتہارہی بات اس کی سمجھ میں آ جائے۔ کاش! وہ خندی لڑکی تباہ و برباد ہونے سے محفوظ رہے۔ کاش! اسے کاش!“

وہ ہلکتے خورہ انداز میں خاموش ہوا تو فیصل کو اس

کی حالت پر شش آنے لگا۔ اس کی نظر میں عبدالغفور ایک بے بس، مجبور اور قابل رحم باپ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے فیصل سے بہت ساری امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ فیصل کی محنت میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ عبدالغفور کی توقعات پر پورا کیسے اترے گا۔ عبدالغفور اسے اپنے ہمدردی کو سمجھانے کی غرض سے لے کر آیا تھا وہ ابھی تک ڈرائنگ روم میں طلوع نہیں ہوئی تھی۔

اس نے اپنی رسد واضح پر ایک گھبرایا ہوا ڈائل پھر عبدالغفور سے پوچھا۔ ”نورین پتا نہیں کہاں رہ گئی مجھے یہی کام سے بھی فکرتا ہے۔“

”غیر، میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔“ عبدالغفور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ ڈرائنگ روم سے قدم باہر نکلا، ایک طرح دار لڑکی اندر داخل ہوئی۔ وہ ٹھنک کر رک گیا پھر فیصل کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

”لو۔۔۔۔۔ نورین آگئی۔۔۔۔۔!“

”السلام علیکم۔۔۔۔۔“ نورین نے فیصل کی طرف دیکھتے ہوئے زبردست مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بڑی شان سے فیصل کے سامنے اس صوفے پر بیٹھ گئی جہاں سے ابھی ابھی عبدالغفور اٹھا تھا۔

نورین نے ”سلام“ چونکہ فیصل کو کیا تھا لہذا اس نے نورین کی مسکراہٹ کا جواب دینا ضروری سمجھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”و علیکم السلام۔۔۔۔۔!“

”تم لوگ باتیں کرو۔“ عبدالغفور نے پر مبنی انداز میں فیصل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا پھر دوئے سخن نورین کی محنت موڑتے ہوئے بولا۔ ”جب تک میں تمہارے لیے ناشتا لے کر آتا ہوں۔“

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ فیصل کو اس کی حالت پر بے حد اندھنوں ہوا۔ کہیں سے غصوں کی لہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ نورین کا باپ ہو۔ عبدالغفور کے مصلحت آمیز جہانم دہویے سے تو یہی تاثر ابھرتا تھا کہ وہ اس گھر کا کوئی لازم و غمیرہ ہے۔

بڑھاپا ایک بہت بڑی مجبوری ہے۔ جب اس مجبوری کے ساتھ کوئی معذوری بھی شامل ہو جائے تو انسان کی زندگی ٹوہرے غلاب سے دو چار ہو جاتی ہے۔ نہ جینا اپنے بس میں رہتا ہے اور نہ ہی موت پر اختیار ہوتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت عبدالغفور کی بھی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے نورین کو گھر سے نکالنے کے حوالے سے بات کی تھی اور پھر خود ہی یہ

بھی کہا تھا کہ وہ محض اس لیے اسے گھر سے بے دخل نہیں کرتا جانتا کہ اس عمل کے بعد نورین کے سامنے جانی و بربادی کی نئی ہی شاہراہیں کھل جائیں گی لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ حقائق یہ تھے کہ نورین اس گھر کی معاشی گاڑی کا انجن تھی، پیٹرول تھی، اس کے بغیر یہ گاڑی چلتا تو درکنار ایک قدم اپنی جگہ سے اوجھل رہ نہیں سکتی تھی جب ہی عبدالغفور ”کافڈول“ میں اس گھر کا سربراہ ہونے کے باوجود بھی چھوٹوں، مجبوروں اور نورین کی زندگی گزار رہا تھا۔ دولت بہت بڑی اور تلخ حقیقت ہے۔ یہ سچ ہے کہ دولت کے ترازو میں پلڑوں کا جھکاؤ اور اٹھائی انسان کو امیر اور غریب بہ الفاظ دیکر حاکم اور محکوم بناتا ہے۔

”کہاں کھو گئے ممبر فیصل۔۔۔۔۔؟“

نورین کی چپک بھری آواز نے فیصل کو چونکا دیا وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مم۔۔۔۔۔ میں یہیں تو ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے سامنے۔۔۔۔۔!“

”ممبر سے سامنے بیٹھے والا صرف مجھے دیکھتا ہے، صرف مجھ سے باتیں کرتا ہے۔“ وہ فیصل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے اعتبار سے بولی۔ ”تمہاری طرح کم صدم نہیں پیشا رہتا۔“

درحقیقت فیصل نورین کے رعب حسن میں آ گیا تھا۔ بلاشبہ نورین ایک پرجوش اور دل آویز لڑکی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش میں ایک خاص قسم کا چمکھان پایا جاتا تھا۔ ایک بار اس کو دیکھنے کے بعد اس کے سر ہاں سے لگا چھانا آسان کام نہیں تھا۔ گندمی رنگت پر اس کا زرخیز بدن اور بھی قیامت ڈھاتا تھا۔ ان تمام تر خوبیوں کے ساتھ اس کا غیر متزلزل اعتماد و جو رنگ دکھارہا تھا اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

فیصل نے قدرے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کم صدم نہیں ہوں بلکہ پوری توجہ سے نہیں ہی دیکھ رہا ہوں۔ شاید میرے نام سے بارے میں عبدالغفور نے نہیں بتایا ہے۔“

نورین نے کوئی جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر ڈالا۔ ”کیا ہم اس سے پہلے بھی ملے ہیں؟“

”میرا خیال ہے نہیں۔“ فیصل نے ٹٹنی میں گردن ہلاتی۔

”کسی اور حوالے سے ہماری جان پہچان رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

”بالکل نہیں!“ فیصل نے اس بار بھی قطعی لہجے میں

جواب دیا۔

”تو پھر.....“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”شاید اور غالباً وغیرہ نہیں بلکہ یقیناً ابھی نے مجھے تمہارے نام کے بارے میں بتایا ہے اور کام میں خود ہی جانتی ہوں!“

”کام تم خود ہی جانتی ہو..... کیا مطلب؟“ فیصل نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

نورین کی بے باکی اور کھلاؤلا پن فیصل کو قدرے نروس کر رہا تھا۔ پہلے بھی ایسی بولنے لڑکی سے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک نیا، اٹوٹھا اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔ اس کے انتشار کے جواب میں نورین نے ایک مرتبہ پھر سوال داغ دیا، انداز مضطرب اور افسانہ وار تھا۔ اس نے فیصل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مسٹر فیصل! اب تمہیں کہاں سے پکڑ کر لائے ہیں؟“ ”پکڑ“ کا لفظ اس نے کچھ ایسی اداسے ادا کیا تھا کہ فیصل کو بڑے واضح طور پر اپنی تحقیر کا احساس ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی انسان نہ ہو بلکہ گائے بکری ہو جسے قربانی کی غرض سے عبدالغفور منڈی مویشیوں سے پکڑ کر اپنے گھر لے آیا ہو۔ اس نے اپنی غلطی کا اظہار کرنے میں زرا دیر نہ لگا لی اور جھٹلا جھٹلا آسمان کے لیے بولا۔

”یہ کیا کہو اس ہے؟“ ”آلی امیر رنگی ویری سویری۔“ موقع کل کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے نورین جلدی سے بولی۔ ”میرا کوئی ایسا دینا مطلب نہیں تھا۔ دراصل اب.....“

”ایسا ایسا مطلب نہیں تھا تو پھر.....“ فیصل قطع کاوی کرتے ہوئے بولا۔ ”پھر تم نے کیا سوچ کر وہ بات کی۔“ ”مسٹر فیصل! میں نے اپنے الفاظ کے لیے سواری کبہ دیا ہے نا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”آپ پوری بات سنو گئے تو سارا غصہ جاتا رہے گا۔ دراصل اب.....“

”ہاں..... کیا دراصل اب.....؟“ ایک مرتبہ پھر فیصل نے اسے ٹوک دیا۔ ”اب کچھ بات بھی چکو.....!“ ”میں وہی تو بتاتے جا رہی ہوں۔“ فیصل کی برہمی کے جواب میں نورین نے منہ پھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دراصل ابو آئے روز کسی نہ کسی کو پکڑ کر لے آتے ہیں اور وہ بھی ایک ہی مقصد کے لیے.....!“

فیصل کے کان کھڑے ہو گئے۔ نورین کے اظہار میں ایک خاص نوعیت کا اسرار اور سنسنی پائی جاتی تھی۔ اس کا حسن اور جوانی ان عناصر میں اور بھی شگفتی بھر دیتا تھا۔ اس کے

ڈرامائی جواب پر فیصل نے سوال کیا۔

”کس مقصد کے لیے.....؟“ ”مجھے سمجھانے کے لیے!“ وہ برا سامہ بناتے ہوئے بولی۔ ”اور یہی وہ ”کام“ ہے جو میں خود ہی جانتی ہوں اور..... تمہیں بھی بتانا چاہ رہی تھی کہ تم ایک دم بھڑک اٹھے۔“ وہ لمحے بھر کے لیے توقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”اب تو بات راس نہیں ہوتا.....؟“ ”فیصل کو نورین کا اس طرح پوچھنا بہت اچھا لگا۔ اب وہ اسے کہیں سے کبھی بدتمیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تنے ہوئے نشوونما بالکل ریلیکس ہو گئے۔ وہ خوش دلی سے بولا۔

”نہیں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں واقعی تم سے خفا نہیں ہوں اور امید کرتا ہوں، تم میری بات کو پوری توجہ سے سنو گی؟“

”ہاں..... سنوں گی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”اگر وہ بات مجھے سمجھانے سے متعلق نہ ہو تو.....!“ ”وہ بہت چالاک اور چال بازی۔“ پک جھپکتے میں اس نے جیسے فیصل کا ذہن پڑھ لیا تھا۔ اس کی تجزیہ اور طراری اگرچہ فیصل کو پسند نہ آئی، تاہم اس نے نورین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے غمیرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نورین..... تم خود ہی کیوں نہیں سمجھ جاتی ہو.....؟“ ”مثلاً..... میں کیا سمجھوں؟“ وہ خود اس آگے کو جھکتے ہوئے متفکر ہوئی۔

اس کے جھکاؤ کا زاویہ اور سوال کا انداز انتہائی خطرناک تھا۔ فیصل کو اپنے پورے وجود میں ایک کرنٹ سا دوڑتا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بدن پیدائش لگے لگا۔ وہ بنیادی طور پر ایک شریف اور بے حد شرمیلا شخص تھا۔ نورین کی بے باکی نے اسے شرم سے ”پانی پانی“ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے وہ چار گہری سانسیں لینے کے بعد خود کو سنبھالا اور قدرے مستحکم لہجے میں بولا۔

”دیکھو نورین! تمہارا باپ ایک شریف اور عزت دار انسان ہے.....!“

”اس لیے مجھے ایو کی عزت اور شرافت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی بات مان لیتا چاہیے۔“ وہ فیصل کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”جو بھی آتا ہے وہ جیت کا آغاز نہیں سے کرتا ہے، میرے کان پک گئے ہیں اس قسم کی باتیں سن کر.....!“

فیصل نے اس کی برہمی اور جھٹلاہٹ کا ذرا برا نہ منایا اور محفل انداز میں بولا۔ ”سب لوگ تمہیں اس طریقے سے اس لیے سمجھاتے ہیں کہ تم جو کچھ کر رہی ہو وہ تمہیں زیب نہیں دیتا..... تمہارے باپ کی گردن جھک جاتی ہے..... مجھے عبدالغفور نے تمہارے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا ہے۔“ ”میں کیا غلط کر رہی ہوں۔“ وہ چپک کر بولی۔ ”دوستی کرنے میں کون سی برائی ہے.....؟“

”کسی بھی شریف لڑکی کے نامحرم مردوں سے دوستی کرنے کو ہمارا معاشرہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔“ فیصل نے اپنا فرض پورا کرنے کا مکمل جاری رکھا۔ ”تم ناٹو یا ٹوٹو مگر یہ حقیقت ہے کہ تمہاری مصروفیات سے عبدالغفور کو ملے گی جس قدر اپنی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو.....؟“

”یہ ایو کی غیرت جھپٹے کچھ عرصے سے کوئی زیادہ ہی بیدار ہو گئی ہے۔“ وہ مڑھڑا انداز میں بولی۔ ”جھپٹے کچھ عرصے سے..... کیا مطلب؟“ فیصل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”پہلے وہ بالکل پرسکون اور خوش تھے لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ شرم میں چار ماہ سے انہیں میری کچھ تڑاؤ ہی مل رہا ہے جا رہی ہے۔“ ”اچھا.....!“

فیصل کے ذہن میں عبدالغفور کی وہ بات تازہ ہو گئی جو اس نے قینبری کا گھر نورین کے پاس سے حقیقت کرنے کے حوالے سے بتائی تھی۔ اسی تناظر میں اس نے نورین سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے، عبدالغفور کو اس سے پہلے تمہاری سرگرمیوں کا علم نہ ہو.....؟“

”سب بے کاری کا تھیں ہیں.....!“ وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

”کمال ہے.....!“ فیصل نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم سنے اہم اور سنگین معانے کو بے کار کی باتیں کہہ رہی ہو.....“

”فرض کرو، تم ایک شادی شدہ شخص ہو اور تمہاری ایک جوان بیٹی ہے.....!“

”میں اس معاملے کو فرض نہیں کر سکتا۔“ نورین نے بات شروع کی ہی تھی کہ فیصل پیچ میں بول اٹھا۔ ”کیونکہ میں شادی شدہ ہوں اور میری ایک بیٹی بھی ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ ابھی محض سات سال کی ہے۔“ ”لیکن تم شادی شدہ نظر تو نہیں آتے؟“ نورین نے

بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔

”وہ بے ساختہ بولا۔“ اس میں میرا کوئی تصور نہیں!“ ”نورین بھی بے اختیار غصہ پڑی۔

فیصل کے سامنے ہرگز نہ آنے والے لمحے کے ساتھ نورین کا ایک نیا شیدا بھر دیا تھا۔ وہ دونوں اس وقت جیتے حساس اور تازہ موضوع پر بات کر رہے تھے اس میں کوئی لڑکی اتنی بھادری اور بے باکی سے گفتگو نہیں کر سکتی جس فن کا مظاہرہ نورین کر رہی تھی۔ وہ نورین کے اس انداز اور رویے پر چٹنی بھی حیرت محسوس کرتا وہ کم تھی۔ یہ اس کی زندگی کا بڑا یادگار اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔

نورین نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”فرض کرو، تمہاری بیٹی جوان ہے..... اتنا تو فرض کر سکتے ہو.....؟“ ”ہاں، کر سکتا ہوں۔ آگے بولو۔“ فیصل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”تمہاری بیٹی کسی فیکٹری میں کام کرتی ہے اور اسے صرف بارہ سو روپے تنخواہ ملتی ہے۔“ نورین نے سلسلہ گفتگو کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ”گھر کے اخراجات اسی کو پوری کرنا ہوتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ اپنی تنخواہ سے دو گنا خرچ کر رہی ہے۔ اس وقت تمہیں چاہیے کہ کوئی بیٹی سے پوچھو کہ یہ ادب کی رقم کہاں سے آ رہی ہے؟“ ”بالکل، یہ تو میرا فرض بنتا ہے۔“ فیصل نے جلدی سے کہا۔

”کاش! اب بھی اپنے قرض کو یاد رکھتے۔“ وہ کبھی لہجے میں بولی۔ ”وہ تو میری زیادہ کمانی پر خوش ہوئے رہے۔ اس طرح میرا حوصلہ بڑھتا چلا گیا اور اب.....“ وہ سانس لینے کے لیے ٹھہری بھر بڑے ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”اور اب..... جبکہ میں اس راہ پر بہت آگے نکل چکی ہوں تو ایو کی غیرت کروٹ لے کر سالک اٹھی ہے۔ اسے میری حرکتوں میں بے شرمی اور بے غمخیز نظر آنے لگی ہے لیکن وقت گزرنے کے بعد وہ اپنی کٹھن کی رات کھائیں رہتا۔ انسان کو اپنی چٹنی ہوئی راہ پر آگے ہی آگے بڑھنا پڑتا ہے، چاہے اس راہ کا نام تاجاں ویربادی ہو یا حصول ضرورت!“

نورین نے ابھی حالات کی جو صورت فیصل کے سامنے پیش کی تھی وہ عبدالغفور کی بیان کردہ کہانی سے قطعاً فکا نہیں دکھائی تھی لیکن وقت کے زیاں کے پیش نظر فیصل نے کسی نئی بحث کا دروازہ کھولنے کے بجائے نہایت ہی غمیرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”نورین! انسان کو کسی بھی حال میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا چاہے کیونکہ مایوسی بہت بڑا گناہ ہے!“
”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ آنکھیں سکیڑ کر فیصل کو دیکھنے لگی۔

”میرے خیال میں تمہاری والدہ کے لیے ایک دروازہ کھلا ہوا ہے۔“ فیصل نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ راستہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ تمہاری زندگی کی آخری سانس تک۔“
”ایسا کون سا راستہ ہے بخئی؟“ نورین نے متذبذب انداز میں پوچھا۔

”وہ بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”بنا دوں۔“
”ہاں، بتا دو، اتنا سہل کیوں پیدا کر رہے ہو۔“ وہ بے تابی سے بولی۔ ”شبابش، جلدی کرو۔“

”میرا تمہارے لیے یہ مشورہ ہے کہ جتنا جلدی ممکن ہو۔ تم شادی کر لو۔“

”شادی؟“ اس کے لبوں پر طنز پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”میرے فیصل! یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں ممکن نہیں ہے۔“ وہ ضدی لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”تمہارے دوستوں میں سے کوئی تو ایسا ہوگا مجھے تم زندگی کا ساتھی بنا لو؟“

”یا تو تم حد درجے وقوف ہو یا پھر مجھے اٹوچتے ہو؟“ نورین نے مشکوک نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں!“ فیصل نے گہری بیچیدگی سے کہا۔ ”ہاں۔ ایسی ہی بات ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”وہ سب دوستی کے خواہاں ہیں۔“

”شادی کرنے کو کوئی تیار نہیں ہوتا۔“

”پھر کبھی اگر تم کو شکر کرو تو کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔“ فیصل اپنی ضد پر قائم رہا۔ ”وہ کیا کہتے ہیں۔ نیت صاف، منزل آسان!“

”وہ کیا کہتے ہیں۔ یہ کیا کہتے ہیں۔ سب کہنے ہی کی باتیں ہیں۔“ نورین نے بڑے سنجیدگی سے بولی۔ ”حقیقی زندگی سے ایسے خوبصورت جملوں کا کوئی لفظ نہیں ہے۔“

”بہر حال، تم اتنا اصرار کر رہے ہو تو کوشش کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ ارے ہاں مل گیا۔“

نورین نے بڑے سنجیدگی سے خیر مرے پر بات نامکمل چھوڑی تو فیصل نے بے ساختہ پوچھا۔ ”کون مل گیا؟“

”بھئی! تم نے مشورہ دیا ہے کہ اگر میں کوشش کروں تو

شادی کے لیے کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔“ وہ بڑے پراسرار انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے بیچیدگی سے تھوڑی کوشش کی تو ایک ایسا شخص میری نگاہ میں آ گیا جس سے میں شادی کر سکتی ہوں۔“

”مومن ہے وہ؟“ فیصل نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”تم۔۔۔۔۔“ نورین نے گویا ایک دھماکا کر دیا۔

”کیا مذاق ہے۔۔۔۔۔“ وہ بولکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”میں۔۔۔۔۔“

نورین نے کہا۔ ”اسے مذاق نہ سمجھو فیصل، میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“

”میں تو شادی شدہ ہوں۔“ وہ نرمی سے انداز میں بولا۔ ”تم سے کیسے شادی کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔“

”میرے دوستوں کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی نوعیت کی پرالہم ہے۔“ وہ بڑا گہرا طنز کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ بھی سب اطلاق سے شادی شدہ ہیں اور مزید شادی کا نام نہ کر ان کی جان جاتی ہے۔۔۔۔۔ بالکل تمہاری طرح!“

اس سے پہلے کہ فیصل، نورین کی اس چوٹ کا کوئی معقول اور مدلل جواب دیتا، عبدالغفور ناشتے کی ٹرے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ دونوں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ عبدالغفور ناشتے کی ٹرے کو نورین کے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”مجھے کچھ دیر ہوگئی شاید۔۔۔۔۔“

”شاید نہیں یقیناً اب۔“ نورین نے خشکی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اور آپ ایسا جان بوجھ کر کرتے ہیں جب بھی آپ مجھے سمجھانے کی غرض سے کسی کو پکڑ کر لاتے ہیں تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں؟“

”نہیں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ عبدالغفور نے تجاوت بھرے انداز میں کہا۔ ”اور یہ بھی سچ ہے کہ تم نے نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“

”نورین بی بی نے آج یہ قسم توڑ دی ہے اٹکل۔“ فیصل نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب فیصل بیٹا!“ عبدالغفور نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔ ”اور یہ قسم اٹھ کر کھڑے کیوں ہو گئے۔ میں نے تم دونوں کے لیے ناشتا بنایا ہے۔۔۔۔۔“

نورین بھی فیصل کے اچانک کھڑے ہوجانے پر ابھین کر وہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ فیصل نے نورین کو نظر انداز کرتے ہوئے عبدالغفور سے کہا۔

”ناشتے کی تیاری کوئی گنجائش نہیں ہے اور میں اٹھ کھڑا اس لیے ہوا ہوں کہ میرے خیال میں، اب مجھے چلنا چاہیے۔“ آپ مجھے جس کام کے لیے پکڑ کر یہاں لائے تھے وہ میں نے کر دیا ہے۔ نورین کی طرف سے آپ کو زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ کو تنگ نہیں کرے گی اور جلد ہی کوئی بہت بڑی خوشخبری سنائے گی۔۔۔۔۔ پھر اس نے نورین کی جانب مڑتے ہوئے تمدنی طلب انداز میں پوچھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔“

یہ انوکھی چال فیصل نے ایک فوجی اور اچھوتے خیال کے تحت چلی تھی۔ اسے اچانک محسوس ہوا تھا کہ وہ دونوں باپ بیٹی نفسیاتی مرئیض ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان میں کون غلط ہے اور کون سچ، اسے ان کے معاملات میں نہیں اچھٹا چاہیے۔ وہ جابین اور ان کا کام۔ بلاشبہ، اس نوعیت کے خیالات اس کے ذہن ہی کی کرشمہ کاری تھی جو اسے کسی بڑی مصیبت سے بچانا چاہتا تھا۔ نورین نے اس کے استفسار کے جواب میں متذبذب انداز میں کہا۔

”مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آیا، تم کیا اوٹ پٹانگ بول رہے ہو۔۔۔۔۔“

عبدالغفور نے تمدنی انداز میں پوچھا۔ ”تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم نے نورین کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے؟“

”اچھی طرح سمجھ گئی یا ہے اور اسے اچھی طرح سمجھا بھی دیا ہے۔“ فیصل نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ لوگ مجھے اجازت دیں تو بڑی مہربانی ہوگی!“

نورین نے جھوٹے مزاجی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ عبدالغفور نے بھی ایسا کوئی اصرار نہیں کیا اور سادہ سے لہجے میں بولا۔

”آؤ بیٹا۔ میں تمہیں رخصت کر دوں۔“

فیصل نے ایک سکون بخش گہری سانس لی اور نورین کو الوداع کہہ کر عبدالغفور کے ساتھ بولیا۔

جب فیصل اپنی بائیک پر سوار ہو کر وہاں سے رخصت ہونے لگا تو عبدالغفور نے امید بھری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو بیٹا۔ میں مطمئن رہوں؟“

”ہاں ہاں، بالکل۔ آپ فکر نہ کریں۔“ فیصل نے جان چھڑانے والے انداز میں تسلی دی۔ ”نورین کی وجہ سے اب آپ کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”اٹھ تمہارا بھلا کرے بیٹا۔“ عبدالغفور نے دعا یہ

انداز میں کہا۔ ”یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا۔ اب تم لوگوں کی آنکھوں سے زندگی بڑی خوشگوار گزرے گی۔ میں نے ناشتا لانے میں جان بوجھ کر دیر کی تھی تاکہ تم لوگوں کو اچھی طرح باتیں کرنے کا موقع مل سکے، میں تو۔۔۔۔۔“

”ایک منٹ اٹکل۔۔۔۔۔“ فیصل نے ہاتھ اٹھا کر اسے حریفہ بولنے سے روک دیا اور بے حد اچھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ ہماری آنکھوں کی خوشگوار زندگی۔۔۔۔۔ کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”بڑی سیدھی اور آسان ہی بات ہے بیٹا۔“ عبدالغفور نے شفقت بھرے انداز میں کہا۔ ”تم نورین سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہوتا اور۔۔۔۔۔ اس نے بھی تمہیں پسند کر لیا ہے۔۔۔۔۔“

”ایسی کوئی بات نہیں چاہا جی،“ فیصل نے بھجلا کر کہا۔ ”آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں شادی شدہ ہوں اس لیے دوسری شادی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”میں ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے دروازے سے باہر ایک طرف رک گیا تھا اور میں نے وہاں کھڑے کھڑے، ہم دونوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کا ایک حصہ سن لیا ہے۔“ عبدالغفور نے ٹھہرے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”نورین نے تمہارے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ۔۔۔۔۔ اس نے شادی کے لیے اپنے ذہن میں جس فیصل کو محفوظ کر رکھا ہے وہ تمہی ہو۔ میں تو خوش ہو گیا تھا کہ۔۔۔۔۔“

”وہ نورین کے ذہن کا فوڑ تھا۔“ فیصل نے قدرے ٹھنڈے آواز میں کہا۔ ”اور میں نے اپنے جواب سے اس کی تسلی بھی کر دی ہے۔ آپ کو خواہ مخواہ زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔“

اب فیصل کو واضح طور پر محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ باپ بیٹی ایک ٹھنڈے پامانی ہیں لہذا اسے جلد از جلد جان چھڑا کر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

فیصل کے جواب نے عبدالغفور کے چہرے اور آنکھوں میں گہری مایوسی بھری دی، وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”بیٹا! تم نے تو مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔۔۔۔۔“

”وہ میری زبان کی لغزش اور آپ کی سماعت کا حوصلا تھا چاہی!“ فیصل نے اپنی یا ٹیک اشارت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے معاف کر دیں۔ اللہ حافظ!“

پھر وہ عبدالغفور کی کوئی بھی بات سنے بغیر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

چند روز بعد اس کی اپنے ایک دوست اشتیاق سے ملاقات ہوئی۔ اشتیاق پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اسے ایس آئی کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ فیصل نے نورین اور عبدالغفور کے بارے میں اشتیاق کو پوری تفصیل سے بتا دیا۔ اشتیاق نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی اور خیر خواہی سے کہنے لگا۔

”فیصل! تم مجھے چاہا غفور کے گھر کا ایڈریس بتاؤ، یہ دو نمبر لوگ ہیں۔“

”دو نمبر لوگ ہیں تو تمہیں ان سے کیا کام؟“

”میں دو نمبر لوگوں سے زیادہ کام چاہتا ہوں۔“

اشتیاق نے غمی خیز انداز میں کہا پھر آٹھ دہائیوں کا کر بولا۔ ”تمہیں کچھ بتاؤں گا۔“

”تو کیا تم بھی نورین کے دوستوں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہو۔“

”فیصل نے متاملانہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔“

”الاحول دلاقوہ۔“ اشتیاق نے برا سادہ بنا تے ہوئے کہا۔ ”مجھ میں لاکھ بڑائیاں ہوں کی لیکن تم جانتے ہو کہ میں اس لاکھ کا بندہ نہیں ہوں۔“

”پھر کیا تم ان باپ بیٹی کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ فیصل کی آنکھیں پوری چلی جا رہی تھیں۔

”میں بھی کوئی بات نہیں یار۔“ اشتیاق کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس سے ملتی جلتی بات ضرور ہے۔“

”کیا مطلب؟“ فیصل سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

اشتیاق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نورین یا عبدالغفور کو گرفتار نہیں کروں گا لیکن نورین کا چار لاکھ کر میں ایک جگہ دے کر ان کو روک سکتا ہوں۔“

”میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔“ فیصل نے متذبذب انداز میں کہا۔

اشتیاق بتانے لگا۔ ”عامر ملک نامی ایک شاطر آدمی، وحید اللہ نام کے ایک سیدھے سادے شخص کے دو لاکھ روپے کھائے بیٹھا ہے۔ وحید اللہ کے پاس اس رقم کے لین دین کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور عامر ملک خوبصورت بہانوں سے اسے ہار چلا آ رہا ہے۔ میں نے وحید اللہ کا کیس ”پروٹیکشن“ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں عامر ملک سے اس کی رقم ٹھکانے میں

کا مخاب ہو جاؤں تو وہ آدمی رقم مجھے ”غذرائے“ میں دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نورین کی مدد سے عامر ملک کو بہ آسانی فریب کر سکتا ہوں۔“

”تم پولیس والوں کا بھی کوئی اصول قاعدہ نہیں ہے۔“ فیصل نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”جو کام تمہارے فرائض کا حصہ ہے، اسے تم ”پروٹیکشن“ کر کے اپنی جیب گرم کرتے رہتے ہو۔“

”یار! لوگوں کو بھی تو ذرا عقل نہیں ہے۔“ اشتیاق نے مضبوط انداز میں کہا۔ ”وحید اللہ کو چاہیے تھا کہ دو لاکھ کا لین دین کرتے ہوئے کوئی کھٹ پخت نہ کر لیتا۔ اگر آج اس کے ہاتھ میں کوئی ثبوت ہوتا تو پولیس کو عامر ملک کے خلاف کارروائی کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ ہم خواہواور بے بنیاد تو اسے کیس دبا سکتے۔ اور ویسے بھی۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”ویسے بھی وحید اللہ کے دو لاکھ تو ڈوبے ہی ہوئے ہیں۔ میری کوشش سے اگر اسے ایک لاکھ مل جائیں گے تو اس بے چارے کی تو قید ہی ہو جائے گی۔“

”تم لوگ جو بھی کرنا چاہو کر سکتے ہو۔“ فیصل نے چوت کی۔ ”کوئی تمہیں روکنے والا نہیں۔“

”فکر نہ کرو یار۔“ وہ زبردست مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نورین کے ساتھ کسی قسم کی نا انصافی نہیں کروں گا۔ اس مشن کی تکمیل پر میں پانچ دس ہزار اس کے ہاتھ پر بھی ضرور رکھ دوں گا۔“

”تمہارا جو جتنی چاہے کرو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔“ فیصل اشتیاق کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ ان باپ بیٹی کو کسی نئی مصیبت میں نہیں ڈال دیتا۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ وہ دو نمبر سے تین یا چار نمبر بن جائیں۔“

”تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ کر بے فکر ہو جاؤ۔“ اشتیاق نے بڑے اعتماد سے کہا۔

اور فیصل واقعی بے فکر ہو گیا۔

اس واقعے کے چند روز بعد اشتیاق نے فیصل کو فون کیا اور کہا۔ ”یار! تم کس کے علاقے میں رہتے ہو، مجھے ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں۔“

”اپارٹمنٹ بلڈنگ کا نام بتاؤ۔“ فیصل نے کہا۔

جواب میں اشتیاق نے جس بلڈنگ کا نام لیا اسے سن کر فیصل کا دماغ ہلچل مچ گیا۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”مذاق کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟“

”کیا مطلب۔“ تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو۔“

”اس سے بڑا اور بے ہودہ مذاق اور کیا ہوگا کہ تم مجھ سے اس بلڈنگ کے بارے میں پوچھ رہے ہو جہاں میں رہتا ہوں اور تم مجھ سے ملنے کی سہولت میرے گھر بھی آچکے ہو۔“

”فیصل نے شامی لہجے میں کہا۔ ”کیا تمہارا حافظہ بالکل ہی جواب دے گیا ہے؟“

”الاحول دلاقوہ۔“ اشتیاق نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”ابے یار! بالکل دھیان میں نہیں رہا تھا۔“

”جب ایک لاکھ کے خواب دیکھو گے تو دھیان کہاں کام کرے گا۔“ فیصل نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

”تمہارا حیران کن نشانے پر لگا ہے یار۔“

”تیر۔۔۔۔۔ میں نے کون سا حیران چلایا ہے؟“ فیصل کے لہجے سے حیرت مٹ رہی تھی۔

”میں جو تم نے ایک لاکھ کے خواب والی بات کی ہے۔“ اشتیاق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں آج رات یہ ایک لاکھ میری جیب میں آچکا ہے۔“

”کیسے آچکا ہے؟“ فیصل نے پوچھا۔

”کیا تم نے عامر ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے؟“

آج سے پچیس سال پہلے ایک لاکھ روپے کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ اشتیاق نے فیصل کے جواب میں بتایا۔ ”آج رات وہ میری گرفت میں آچکا ہے گا اور وہ بھی رستے ہاتھوں، اس کی گرفتاری کے لیے تم مجھ سے تعاون کرو گے۔“

”میں۔۔۔۔۔ بھلا وہ کیسے؟“ فیصل نے ابھین زدہ انداز میں پوچھا۔

”وہ اس طرح کہ عامر ملک آج کی رات نورین کے ساتھ تمہاری بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں موجود ہوگا۔“ اشتیاق گہری سنجیدگی سے اسے بتانے لگا۔ ”میں نے جس فلیٹ کا ذکر کیا ہے وہ پچیس کئی ماہ سے بند ہے۔ عامر ملک کی فلیٹ کے مالک سے گہری جان بچکان ہے۔ وہ بھی کبھی مالک سے جانی لے کر رات گزارنے وہاں آجاتا ہے۔ رات گزارنے کا مطلب سمجھتے ہو نا؟“

”انہی طرح سمجھتا ہوں تم آگے بتاؤ۔“ فیصل نے کہا۔

یہ بات فیصل کے علم میں تھی کہ ان کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے چند فلیٹس میں مشکوک نوعیت کی نقل و حرکت دیکھنے میں آئی تھی۔ اشتیاق نے عامر ملک اور نورین کے حوالے سے جس فلیٹ کا ذکر کیا تھا اس کا شمار بھی مشتبہ فلیٹس ہی میں ہوتا

تھا۔ لہذا اس کا انشلیش میں جلا ہو جانا لازم تھا۔ اشتیاق ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے تفصیل سے آگاہ کرتے لگا۔

”میری بلائنگ کے تین مطابق نورین نے عامر ملک کو اپنے شیشے میں اتار لیا ہے۔ آج کی رات وہ عامر ملک کے ساتھ تمہاری بلڈنگ کے اس فلیٹ کے اندر مل چھڑے اڑائے گی جس کا میں نے ذکر کیا ہے اور میں ان دونوں کو رستے ہاتھوں پکڑ لوں گا اور وہ بھی بلڈنگ کے تین چار کیمنوں کی موجودگی میں تاکہ عامر ملک کے فرار کے مارے راستے مسدود ہو جائیں اور میں یہ آسانی اس کے ساتھ کم مکا کر سکوں۔“ وہ لمبے بھر کے لیے توقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

”اس کام کے لیے مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔“

جب نورین کی اطلاع پر میں وہاں پہنچوں تو تم جتنا چاہو افراہ کو اس کارروائی میں حصہ لینے کے لیے تیار کر لیتا۔ ان میں اگر بلڈنگ کی کبلی کا کوئی مہر شامل ہو تو یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ اس طرح میرا کیس زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔ میں لوگوں کے سامنے ان دونوں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا پھر ذرا دھماکا کر میں اپنا مقصد حاصل کر لوں گا۔ کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے؟“

”تمہاری مدد کرنے میں تو کوئی قیادت نہیں۔“ فیصل نے کہا۔ ”لیکن کیا نورین اس کام کے لیے تیار ہوگی ہے؟“

”میں نے اسے آدمی بات بتائی ہے۔“ اشتیاق نے چالاکی سے کہا۔ ”اس لیے وہ فوراً تیار ہوگی ہے۔“

”آدمی بات۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟“ فیصل نے سوال کیا۔

”میں نے اسے رستے ہاتھوں، ناز یا حالت میں گرفتاری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ اشتیاق نے بتایا۔

”حالانکہ وہ اسی لاکھ کی لڑکی ہے لیکن اگر میں اسے اپنے پروگرام کے بارے میں سب کچھ بتا دیتا تو وہ اس مشن کے لیے تیار نہ ہوتی۔“

”پھر تم نے اسے کیا بتایا ہے؟“

”میں کہ جیسے ہی عامر ملک اسے اپنے ساتھ لے کر اس فلیٹ کی طرف روانہ ہوگا، وہ مجھے اطلاع دے گی اور میں ان کے تعاقب میں لگ جاؤں گا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”پھر جب وہ دونوں فلیٹ کے اندر بند ہو جائیں گے تو میں فوراً چھاپا مارنے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔“

”اور عامر ملک اتنا ہی بے وقوف انسان ہے کہ اس نے نورین کو نہ کوہ فلیٹ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا

”فیصل! تمہیں بالکل بھی اندازہ نہیں کہ یہ تہیاری
 ٹوریں کتنی زبردست ہے۔“ اشتاق نے معنی خیز انداز میں
 کہا: ”اس نے عامر ملک کے دل و دماغ کو انٹھا مٹی میں
 دھریج کر رکھا ہے اور جہاں تک عامر ملک کی عقل مندی اور بے
 وقوفی کا تعلق ہے۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رک بھر اضافہ
 کرتے ہوئے بولا۔

”وہ ترہات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا!“
 ”وہ تو میں دیکھ ہی لوں گا لیکن تم سے میری ایک چھوٹی سی محنت ارش ہے۔“

”ایک نہیں، دس گزارشات کرو۔۔۔۔۔ بلکہ دس حکم کرو میرے مار؟“ اسحاق نے بڑے دلو لے سے کہا۔

نہیں کرو گے۔“ فیصل نے حدودِ برجہ بنیدہ لکھ میں کہا۔ ”ایک آوارہ لڑکی کے ساتھ اپنا تعلق جوڑے دیکھ کر مجھے اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔۔“

”وہ.....!“ اشتیاق نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”مر
آجیہ، اس بات کا خاص طور پر خیال رکھوں گا۔“

”ایک بات اور یاد رہے،“ فیصل نے دو ٹوک انداز میں کہا۔
 ”یہاں،“ یو یو یو.....“

”میں تمہارے کہنے اور ضرورت کے مطابق اس بلڈنگ سے تین چار کمروں کو، بشمول ایک آدھ کمینٹری ممبر، اس مشن کے لیے تیار کروں گا لیکن ان افراد میں، میں جرنلز، جرنل شامل نہیں ہوں گا۔“ فیصل نے بڑے واضح انداز میں کہا۔

”کیونکہ فورسز مجھے شکل و صورت سے بڑی اچھی طرح پہچانے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے اس کارروائی میں شریک

”مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے“ اشتیاق نے
 لہجے میں کہا۔ ”بس اتنا ہندوستان کو دینا کہ میرا کام
 آئے۔“

پھر ایک دو مضمونی باتوں کے بعد ان کے سچے علمی فرائض
سلسلہ موقوف ہو گیا۔

اس رات فیصل والی بلڈ گپ کے ایک فلیٹ میں جو پیش آیا وہ اس واقعے کے تمام اہم کرداروں کے لیے غلط تو فیصحا۔ نورین نے سوچ کر عامر ملک کے ساتھ وہاں آکر کہا سے پورا دھماکا تھا کہ شتیق ان کے تعاقب میں ہے جیسے ہی فلیٹ میں بند ہوں گے، پولیس اپنی کارروائی کرے گا، دوسری جانب عامر ملک کے ذہن میں کچھ اور

چل رہا تھا۔ وہ نورین کو "بیلا نام" مشورہ دے کر اپنے لیے
ہاں نہیں لے کر آیا تھا۔ بات جیت تو اس کرم پالرز اور
ریٹائرمنٹ میں بہت ہو چکی تھیں۔ وہ آج کی رات اپنے
خصوصی جذبات کی تسکین چاہتا تھا۔ تیری جانب اشتیاق کا
منصوبہ تھا کہ وہ ان دونوں کو بچہ حارس میں پڑے۔ وہ نہ
تو اس کنارے پر کھڑے ہوں اور نہ ہی تیرے دوسرے کنارے
پر پہنچ سکے ہوں۔ وہ مزید وجہ بات اور بے لگم خواہشات
میں چڑھتی ہوئی تیری میں ڈیکال کھا رہے ہوں تو وہ انہیں
رنگے ہاتھوں اپنی گرفت میں لے لے۔ لیکن اگلے چند
منٹ میں جو واقعات پیش آئے انہوں نے سب کو چونکا کر
ٹکا دکھا کر رکھ دیا تھا۔

عالم ملک اپنے ”قن“ میں کچھ زیادہ علی ماہر ثابت
نہا، نہ ”جائے بنائے“ کے نام میں ”کھانا تیار“

نہوا۔ اس نے مجھے بنانے کے نام سے جھٹکا کر لیا۔ اشتیاق کو اس کی جانب سے ایسی تیزی اور طراری کی امید نہیں تھی۔ دوسری طرف نورینا بھی عام ملک کے ماہرانہ اشتیاق کے ساتھ نہ تھی۔

سے پیشتر اس کی معمول بن چھنی۔ نور بن ابو اشتہاق کو عامر ملک کا بھرتہ ایک اندازہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ مار کھائے۔ جسے

تواند ملیوں کے سچے اور دوسرے بہت سارے پانی میں نہکا تھا۔

وہا۔ دروازے پر ہونے والی دھڑ دھڑاہٹ اور کیفیوں کے

پھر اپنی سیٹھی میں ایک ایسا ٹھکین قدم اٹھایا جس نے اشتیاق

اس کو جگہ جگہ سے پھاڑ ڈالا اور جیسے ہی پولیس، بلڈنگ

مکینوں کی معیت میں فلیٹ کے اندر داخل ہوئی، وہ جلد سے ایک بیڈ روم کو اپنے بدن پر لپٹ کر مقلوم بن گئی۔

آئسوویک سے روتے ہوئے اس نے ٹھف دوجین القزاد
سامنے بیان دیا کہ وہ شخص (عامر ملک) دوستی کی آزمائش میں

پھر اس کے اپنے ساتھ اس فلیٹ پر لے آیا تھا پھر ڈرامہ
کراے بے آبرو کر ڈالا۔ خود کو بچانے کی کوشش میں اس

اگر دو نامحرم افراد ایک کیفیت میں بند پائے جائے

دوسری بات تھی۔ اشتیاق انہیں نازیبا اور شرمناک حرفوں کے الزام میں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جاتا اور بعد ازاں وہ نازیبا اور شرمناک کلام کے ساتھ کہہ کر کہہ کر لیتا۔ اس عمل

وہ ڈرا دھمکا کر عامر ملک سے پیچھے ہٹ کر لپکا۔ اس نے
اشعیا یاق کے علاوہ وحید اللہ کا بھی بھلا ہو جاتا کیونکہ یہ با-

تقریریں، سیمینار، مذاکرے

گھر کے ہر فرد کیلئے

قدرتی اجزاء اور جڑ کی یونیٹوں سے تیار شدہ

۳۰

دواخانہ (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ایک پیچہ
ابن
سحر اور افطار
 رمضان میں کھون ہونے خواتین بحال



ٹا ہرچی کے عامر ملک کسی بھی صورت جیل جانا پسند نہ کرتا لیکن وہاں فورین کی ایک بے ساختہ اور خطرناکی حرکت نے جو چوہین پیدا کر دی تھی اور وہ بھی نصف درجن معزز گواہوں کے سامنے، اس کا تھنسا ہی تھا کہ اشتیاق باقاعدہ قانونی کارروائی کو عمل میں لائے۔ اب وہ اپنی سہ ماہی اور جوتوز کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا کیونکہ انہی معزز گواہوں میں ایک شخص اخباری رپورٹر بھی تھا۔

جب اس نوعیت کی قانونی کارروائی کو بروئے کار لایا گیا تو کچھ عرصے بعد فورین کو تسلیم قرار دیتے ہوئے چھوڑ دیا گیا۔ عامر ملک اپنے کیے کی پاداش میں سزا پانچ جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا اور وحید اللہ کے ساتھ ساتھ اسے اس آئی اشتیاق بھی چلا گیا اور وحید اللہ کا تھا۔ ان کے حصے میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

کچھ ہی عرصے بعد یہ بات کھل گئی کہ پولیس کارروائی میں سب سے اہم کردار فیصل نے ادا کیا تھا لہذا عامر ملک سے متعلق چند جرائم پیشہ لوگ نہایت ہی خفیہ انداز میں فیصل کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگے۔ فیصل ان حالات سے پریشان تو ہوا اور اس نے اس بارے میں اشتیاق کو بھی بتایا لیکن پھر دھمکیوں کا یہ سلسلہ خود ہی رک گیا۔ فیصل نے سکھ کی سانس لی۔

دو ماہ گزرے تھے کہ فیصل اور اس کی فیملی کا سکھ چین غارت ہو کر رہ گیا۔ اسے عدالتان علی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور اب وہ پچھلے چھ ماہ سے جیل میں بند تھا۔ یہ بھی فیصل کی جیتا جیسے مین نے کچھ زیادہ ہی مفصل انداز میں آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یہ ایک خلاف معمول بات ہے، بہر حال.....!

☆☆☆

جیسا کہ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کیس کو عدالت میں لگے سات ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ پچھلے چھ ماہ سے فیصل جیوڈیشل ریٹائرڈ پرنٹنگ میں بند تھا۔ اس کے سابق وکیل نے اب تک کیس بگاڑنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا اور اب یہ کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے فیصل سے ایک بھر پور ملاقات کرنے کے بعد اس کیس کا بھی اچھی طرح مطالعہ کر لیا تھا اور فیصل کے حق میں مجھے اس کیس میں اچھی خاصی جان نظر آتی تھی۔ اگر میں خود ہی بہت "خصوصی" بھاگ دوڑ کر کے چند اہم معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کیس کو پراسیٹوٹنل کیا جاسکتا تھا۔ یہ بھاگ دوڑ اول آخر مجھے ہی گمراہی کیونکہ یہ کام اس کی بیوی فرزانہ کے بس کا نہیں تھا۔

بہر حال، آئندہ پیشی سے پہلے میں نے اپنے اس مقصد میں براہسن طریق کا مایابی حاصل کر لی۔

آگے بڑھنے سے پہلے پوسٹ ماڈم کی رپورٹ کے بارے میں بتانا چلوں۔ اس رپورٹ کے مطابق، مقتول عدالتان علی کی موت سترہ اپریل کی رات سات اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ مقتول کو سائیکس لگے ریوالتور سے فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ ریوالتور سے چلائی گئی دو گولیاں چشم زدن میں مقتول کے سینے میں گھسیں اور اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔ مقتول کو آفس کے اندر ای کے کمرے میں قتل کیا گیا تھا۔ اگلے روز صبح اس کی لاش دریافت ہوئی اور پھر جیسے ہی فیصل دفتر پہنچا، اسے عدالتان علی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

ابھی تک اس کیس کے حوالے سے کوئی قابل ذکر عدالتی کارروائی نہیں ہوئی تھی لہذا مجھے اپنے انداز میں اس کیس کو لے کر چلنا پڑا۔ میں عدالتی کارروائی کے حوالے سے زیادہ تفصیلات میں نہیں جاؤں گا، بس انتہائی اہم گواہوں پر ہونے والی جرح کا احوال آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ کیس کی ابتدا میں وکیل استغاثہ ملزم فیصل پر بھرپور جرح کر چکا تھا۔ میں نے چند ایک ضروری سوالات اس کے لیے اسے سچ کر لیا۔ سچ سے اجازت حاصل کرنے کے بعد میں ایکویڈز اس کے قریب چلا گیا اور ملزم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"اب تو تمہیں دنیا کی حقیقت کا پتا چل گیا ہو گا؟"

"بہت اچھی طرح۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"اب کسی کے ساتھ نیکی یا ہمدردی کرو گے؟"

"جی تو نہیں چاہتا لیکن کچھ کہہ نہیں سکتا۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لیچے میں کہا۔ "انسان اپنی فطرت سے مجبور ہو جاتا ہے۔"

"بالکل درست کہا تم نے۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "یہ شک افسان اپنی فطرت کے تابع ہے۔ اگر کوئی بندہ بھڑکے، افسان فراموش اور وجوہ کے باز ثابت ہو جائے تو اس کا یہ مطلب ہو کہ وہ نہیں کہ اس تجربے کے بعد انسان دوسروں کے ساتھ ہمدردی ہی کرنا چھوڑ دے۔ بہر حال۔" میں نے تھوڑا تو وقت کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم روڈ نہ کہتے تھے آفس پہنچتے تھے؟"

انکوائری آفیسر اور وکیل استغاثہ میری ابتدائی جرح پر خاصے متذہب دکھائی دے رہے تھے تاہم میرے مندرجہ

بالا سوال کے بعد ان کے چہروں پر اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ میرے سوال اور اس کیس کے ملزم نے جواب دیا۔

"مک ویش گیارہ بجے.....!"

"اور تمہاری چھٹی کتنے بجے ہوئی تھی؟" میں نے اٹھا سوال کیا۔

"اس کا کوئی تاخیر نہیں تھا۔" ملزم نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "میری شام چھ بجے، کبھی ساڑھے چھ اور کبھی سات بجے۔"

"کیا تم یہ تمام وقت آفس ہی میں گزارتے تھے؟"

"نہیں۔" اس نے بڑے قطعی انداز میں سر کوئی جھٹکی دینی پھر کہا "میرا کام مارکیٹنگ سے متعلق ہے۔ میں سچ آفس آ کر پندرہ بیس منٹ وہاں گزارتا تھا پھر ساڑھے گیارہ بجے بائیک پلازہ قیلمہ میں نکل جاتا تھا۔ وہاں سے میری واپسی لگ بھگ شام پانچ بجے ہوا کرتی تھی پھر میں گلوڑنگ وغیرہ کے لیے گھٹنا آدھا گھٹنا مزید آفس میں بیٹھتا تھا۔ اس کے بعد اپنے گھر چلا جاتا تھا۔"

"مجھ ابھی بات ہے۔" میں نے سادہ سے لیچے میں کہا۔ "ذرا اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، وقوعہ کے روز تم گھر جانے کے لیے دفتر سے کتنے بجے نکلے تھے؟"

"....." یا تو وہ سے زیادہ سوچا ہے۔ "ملزم نے بڑے ہمتا سے جواب دیا۔

"جب تم دفتر سے رخصت ہوئے تو کیا مقتول اس وقت آفس میں موجود تھا؟"

"جی ہاں، موجود تھا۔"

"موجود تھا۔" میں نے تصدیق طلب نظر سے ملزم کی طرف دیکھا۔ "یعنی زندہ تھا؟"

"بالکل زندہ تھا جناب۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں اسے اس کے کمرے میں زندہ ملاعت چھوڑ کر گیا تھا۔"

"یعنی گھر کے لیے روانہ ہونے سے پہلے تم مقتول کے ساتھ اس کے کمرے میں موجود تھے۔" میں نے مستوی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، مقتول کا کمرہ کھلے کتبے میں۔" وہ شکی لیچے میں بولا۔ "حالا کہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ میرا کمرہ بنا کرتا تھا۔"

"یہ کیا ماجرا ہے۔" ذرا تفصیل سے بتاؤ.....؟"

"کچھ کیسشن ہو رہا تھا۔" وکیل استغاثہ نے عدالتی مداخلت بلندی کی۔

سچ نے حیرت بھری نظر وکیل استغاثہ پر ڈالی۔ اس کی نظر میں اس استغاثہ کی جھلک تھی۔ "کیا آپ کیسٹن ہے وکیل صاحب؟"

"جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے احتجاجی انداز میں کہا شروع کیا۔ "وکیل صفائی غیر متعلقہ سوالات میں الجھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں جبکہ اس کیس کے سلسلے میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے۔"

"ایگزیکٹو یور آفرا۔" میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بے آواز بلند کیا۔ "میں اپنے فاضل دوست کی بات سے کلی طور پر اتفاق کرتا ہوں۔"

وکیل استغاثہ نے بے یقینی سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کیونکر اس کی بات سے اتفاق کر سکتا ہوں۔ سچ نے دھجی لیتے ہوئے مجھے کہا۔

"ایک صاحب! ذرا وضاحت کریں، آپ کو وکیل استغاثہ سے کس نوعیت کا اتفاق ہے؟"

میں نے کھار کر گھا صاف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لیچے میں کہا شروع کیا۔ "جناب عالی! اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اب تک اس کیس کے حوالے سے عدالت کا بہت سا قیمتی وقت برباد ہو چکا ہے اور کارروائی کا وہ حال ہے کہ....." میں نے جلد جلد کچھ..... کیس ایک اچھے آگے نہیں کر سکتا لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" میں نے لگائی تو وقت کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں اس لیے قصور دار نہیں ہوں کہ آج میں پہلی مرتبہ اس کیس کی وکالت کر رہا ہوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وقت کی بربادی کا ذمے دار میں نہیں تو پھر کون ذمے دار ہے.....؟ اس سوال کا بہت ہی آسان جواب ہے، یعنی وہ وکیل جو آج سے پہلے اس کیس کی کارروائی کا حصہ تھے..... مطلب یہ کہ..... میرے فاضل دوست۔" میں نے وکیل استغاثہ کی جانب اشارہ کیا پھر مزید کہا۔ "اور وہ وکیل صفائی جو مجھ سے پہلے اس کیس کو ڈھنڈھ کر رہا تھا۔ اب یہ دونوں افراد آپس میں فیصلہ کریں کہ وقت کی تباہ و بربادی میں ان دونوں کا کتنا کتنا حصہ ہے؟"

وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظر سے گھور کر مجھے دیکھا تاہم زبان سے کچھ نہ بولا۔

سچ نے ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "تو اس کا مطلب ہے، آپ نے ملزم سے جو سوال کیا ہے وہ غیر متعلق نہیں؟"

”قلمی نہیں!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”وہ سوال اس کیس سے انتہائی متعلق ہے اور..... اس کے پوچھنے سے معزز عدالت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہوگا!“

”بیک صاحب..... چلیزہ پروسیڈ!“ جج نے گہری تجویز دی۔

”وکیل! استغاثہ کے سینے پر گویا سب لوٹ گیا۔ میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی اور ایک یونٹ پاس میں کھڑے ملزم سے استفسار کیا۔

”تم کمرے کے حوالے سے کوئی اثبوت ناک کہانی سناتے والے تھے؟“

”یہ ماجرہ بہت ہی مختصر ہے جناب!“ وہ ایک حشمتی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”کچھ عرصہ پہلے تک انھاری صاحب نے جو کرا مجھے دے رکھا تھا وہ عدالت کی آمد کے چند روز بعد ہی اسے دے دیا گیا تھا اور.....“

”ایک منٹ.....“ میں نے قطع کاہی کرتے ہوئے کہا۔ ”انھاری صاحب..... مطلب؟“

”اسد انھاری صاحب!“ وہ فوراً میرا سوال کی تہ میں اترتے ہوئے بولا۔ ”انھاری صاحب ہماری قلم کے مالک ہیں۔“

”تھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اب آگے بتاؤ..... پھر کیا ہوا تھا.....؟“

”ہو گیا تھا جناب۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”پتا نہیں، انھاری صاحب کو عدالت میں کون کون سی خوبیاں نظر آتی تھیں کہ انہوں نے مجھے گویا نظر انداز ہی کر دیا تھا۔ سروس اور تجربے کی بنا پر، اصولی طور پر مجھے سینئر اور عدالت کو جو نیوٹر سمجھا جاتا چاہیے تھا اور اسی لحاظ سے ہمارے ساتھ سلوک بھی ہونا چاہیے تھا لیکن ہوا اس کے برعکس۔“

”وہ مجھے بھڑکے لیے تھا، ایک نظر حاضرین عدالت پر ڈالی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میرا کمرہ عدالت کے حوالے کر دیا گیا۔ کام کی کٹاؤ بھی اسی کو سونپ دی گئی۔ وہ آرام سے دفتر میں بیٹھ کر حکم چلاتا تھا اور میں پورا دن وجہ گرمی میں، شہر کی سڑکیں پاتا پھرتا تھا اور شام میں واپسی پر اسے حساب بھی دینا ہوتا تھا۔ میں چھوٹی سے چھوٹی بات کے لیے بھی متحول ہو جاتا تھا۔ دفعہ کے روز بھی۔“ وہ ایک سرخ چہرہ متوقف ہوا، ایک گہری سانس لی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”دفعہ کے روز بھی میں کم از کم ایک گھنٹہ تک متحول کے سامنے کرسی پر بیٹھا، اس کے مختلف اٹنے سیدھے سوالات کے جوابات دیتا رہا تھا اور پھر اٹھ کر اپنے کمرہ چلا گیا تھا۔ اگلے

روز جب میں دفتر پہنچا تو مجھے عدالت کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا حالانکہ گزشتہ روز میں اسے زخمی سلامتی دفتر میں بیٹھا چھوڑ کر گیا تھا..... یہ سب کچھ کہانی جناب!“

”یہی وہ گہری اور افسوس ناک کہانی ہے۔“ میں نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”ذرا سوچ کر بتاؤ..... دفعہ کے روز جب تم اپنے دفتر سے رخصت ہوئے تو اس وقت متحول کے علاوہ دفتر میں اور کون کون موجود تھا؟“

”میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔“ وہ معذوری کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”متحول کی بیٹی اور ترش تحقیر آمیز باتوں نے میرا دماغ اس قدر گرم کر دیا تھا کہ میں نے کسی بات پر دھیان نہیں دیا۔ میں کمرے سے نکلا، کچنی سے باہر آیا اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔“

”ایک آخری سوال.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”اس کیس میں عدالت ملی کے قتل کے ساتھ ہی پچاس ہزار روپے کی کہانی بھی جڑی ہوئی ہے۔ استغاثہ کے مطابق تم متحول سے شدید ترین نفرت کرتے تھے۔ اس نے چند ہی روز میں تمہارا مقام اور تمہارا کام پھینک لیا تھا لہذا تم نے موقع ملنے ہی اپنے چریف کو قتل کر دیا اور پچاس ہزار روپے کی رقم لے کر چلے گئے تو دفعہ سے فرار ہو گئے..... یہ پچاس ہزار کی کہانی ہے؟“

”کہانی جس احمق ہی ہے کہ وہ تو میں نے عدالت ملی کو قتل کیا ہے اور نہ ہی پچاس ہزار روپے لوٹے ہیں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”یہ سراسر جھوٹ ہے الزام ہے، بلکہ بہتان ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اس وقت عدالت کے پاس پچاس ہزار کی رقم موجود تھی اور یہ رقم اسے میں نے ہی لاکر دی تھی۔“

”تم نے لاکر دی تھی.....!“ میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کہاں؟“

”کہاں؟“ وہ لاکر دی تھی اور میں متفقد کے لیے.....“

”ان دنوں مارکیٹنگ کے علاوہ اگلی (کلیکشن اینڈ ریکوری) کا کام بھی میرے ذمے تھا۔“ ملزم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”کچھ لوگ چیک دیتے تھے اور بعض پارٹیاں کیش بے منٹ دیا کرتی تھیں۔ یہ رقم اسی سلسلے میں، میں مختلف کلکٹس سے جمع کر کے لایا تھا۔“

”آج کل کی طرح، چالیس سال پہلے بے منٹ کا سسٹم کلی طور پر چیک پر انحصار نہیں کرتا تھا۔ اکثر لوگ کیش بے منٹ کو ترجیح دیتے تھے۔ میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔

”اس کے بعد استغاثہ کو گواہ صابر حسین گواہی کے لیے

وٹس پاس میں آکر کھڑا ہوا۔ صابر حسین مذکورہ قلم میں چرائی کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس نے جج بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر بیان ریکارڈ کرادیا۔ وکیل استغاثہ لگ بھگ پورے منٹ تک ٹھہرا پھر اسے گواہ سے مختلف سوالات کرتا رہا جس کا سبب لہاب یہ تھا کہ ملزم، متحول کو سخت ناپسند کرتا تھا اور وہ اکثر متحول کے خلاف باتیں کرتا تھا۔ وکیل استغاثہ، متحول کے لیے ملزم کی نفرت اور ناپسندیدگی کو محض اس لیے رجسٹر کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ قتل اور لوٹ کے کیس کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جاسکے۔ جب وکیل استغاثہ نے گواہ کو فارغ کیا تو میں جج سے اجازت لینے کے بعد وٹس پاس کے قریب پہنچ گیا۔

صابر حسین کی عمر پینتیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ میانہ قد اور دلا پٹلا شخص تھا۔ رنگت گندمی، بال کھنکھریالے اور شکل و صورت عام سی، میں نے کھارکھا صاف کیا پھر گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ دفعہ آپ ہی کھولے ہو؟“

”جی ہاں..... یہ سچ ہے۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”یعنی دفتر میں تم ہی سب سے پہلے داخل ہوتے ہو؟“ میں نے ذرا حیل کر کے پوچھا۔

”جی ہاں!“ اس نے ایک سرخ چہرہ اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”میں اور جاوید تقریباً آگے پیچھے یا ایک ساتھ ہی دفتر پہنچتے ہیں۔ میں دفتر کھولتا ہوں اور تم دونوں اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ دفتر کی چابیاں چونکہ میرے پاس ہوتی ہیں لہذا جاوید اگر مجھ سے پہلے بھی آجائے تو وہ میرا انتظار کرتا ہے۔“

”جاوید کون؟“ وہ لمحے بھر کے لیے رکا تو میں نے پوچھ لیا۔

”اس نے بتایا۔“ جاوید ہمارا سوچر ہے۔ وہ دفتر کی صفائی وغیرہ کرتا ہے۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ اٹھارہ اپریل کی صبح متحول کی لاش سوچر نے دریافت کی تھی؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی ہاں، یہ حقیقت ہے۔“ گواہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس روز ہم ٹنگ جھگ ساڑھے آٹھ بجے دفتر میں داخل ہوئے تھے۔ میں اپنے کام میں اور جاوید اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے آکر مجھے بتایا کہ ادھر کمرے میں عدالت صاحب (عدالت ملی) کی لاش پڑی ہوئی ہے۔“

”پھر..... پھر تم نے کیا کیا.....؟“ میں نے حیرت لہجے میں استفسار کیا۔

”میں جاوید کے ساتھ فوراً اس کمرے میں پہنچا تھا۔“ گواہ نے بتایا۔ ”جاوید نے غلط نہیں کہا تھا، کمرے میں واقعی عدالت صاحب کی لاش موجود تھی۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور گردن، ایک جانب لڑکھی ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے..... وہ کھلی ہوئی تھی۔ ان کی ٹرٹ سینے کے مقام سے خون میں تر نظر آ رہی تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ انہیں سینے میں گولی مار کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور بعد میں ثابت بھی ہوئی ہوا۔“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ایک جھرجھری کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”ایک نہیں دو گولیاں..... پوسٹ مارٹر کی رپورٹ سے پتا چلتا تھا کہ عدالت صاحب کو دو گولیاں مار کر ختم کیا گیا تھا۔“

”اور تمہارا خیال ہے کہ یہ کام میرے موکل نے کیا تھا؟“ میں نے کھورکھور کی طرف دیکھا۔

”نہیں.....“ وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”میں نے تو ایسا کوئی خیال ظاہر نہیں کیا۔“

”تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ میرے موکل نے عدالت ملی کو قتل نہیں کیا؟“ میں نے اسے چکرے کی کوشش کی۔

”وہ جلدی سے بولا۔ ”میں یہ بات بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔“

”تم نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں ملزم کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کا مقصد کیا تھا؟“ میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے تھے.....؟“

”میں تو کچھ بھی ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا جناب۔“ وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ ”وکیل استغاثہ تم مجھ سے جو سوال پوچھے، میں نے تو صرف ان کے جواب دیے تھے۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ ملزم فیصل، عدالت ملی سے شدید نفرت کرنے لگا تھا اور اٹھتے بیٹھتے اس کو برا بھلا کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔“

”اوکے.....“ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”متحول کی لاش دیکھنے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟“

”میں نے فوراً رہائی صاحب کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔“ استغاثہ کے گواہ نے جواب دیا۔

”رہائی صاحب..... تمہارا مطلب ہے..... ظلام

ربانی۔ اس فرم کے جزل شیجر۔۔۔ میں نے سوالیہ نظر سے گواہ کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں۔“ صابر حسین نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں انہی کا ذکر کر رہا ہوں۔“

”اس کے بعد کیا ہوا تھا۔۔۔؟“

”تھوڑی ہی دیر کے بعد ربانی صاحب وہاں پہنچ گئے تھے۔“ گواہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے کمرے میں جا کر عدنان صاحب کی لاش کا جائزہ لیا اور پھر پولیس کو فون کر کے بلا لیا۔۔۔ پولیس آئی، اس نے موقع کی نگارروائی کی اور اس سے پہلے کہ وہ فزمن کی گرفتاری کے لیے اس کے گھر کا رخ کرتے، یہ خودی دفتر پہنچ گیا۔۔۔ بات کے اختتام پر استقامت کے گواہ نے دوسری طرف اکیوڑ پاس میں کھڑے فزمن کی جانب اشارہ کر دیا۔

”گواہ۔۔۔ تم نے اب بعد میں شیجر صاحب نے مقتول کے درخت سے راہلہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟“ میں نے جیسے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ”اں بے چاروں کو عدنان علی کی المناک موت کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔۔۔!“

”وہ جی۔۔۔ پریشانی اور افراتفری میں، میں اور شیجر صاحب تو یہ کام کرنا بھول گئے تھے۔“ وہ دامت آسمان بے میں بولا۔ ”لیکن پولیس نے موقع کی کارروائی کے دوران ہی میں عدنان صاحب کے گھر فون کر کے انہیں اس اندوہناک واقعے کے بارے میں بتا دیا تھا۔“

”صابر حسین! میں نے ایک سوالات کا تروید پوچھ کر بتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارے دفتری اوقات کار کیا ہیں؟“

”جناب! میں صبح تقریباً ساڑھے آٹھ بجے دفتر پہنچ جاتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پھر رات کو سات بجے میری چھٹی ہوتی ہے۔“

”کافی لمبا نام ہے۔“ میں نے ہمدردانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا وقوعہ کے روز بھی تم نے سات بجے ہی چھٹی کی تھی؟“

”نہیں جناب۔ اس روز میں جلدی چلا گیا تھا۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”کتنا جلدی؟“ میں نے ٹٹولا۔

”کوئی ساڑھے پانچ۔۔۔ یا پونے چھ بجے جناب۔“

”اس جلدی کا کوئی خاص سبب تھا؟“

”جی ہاں۔۔۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”مجھے اپنی بیوی کو لے کر ایڈمیڈا کٹر کے پاس جانا تھا اور اس کے

لیے میں نے شیجر صاحب سے باقاعدہ اجازت لے لی تھی۔“

”وقعہ کے روز جب تم دفتر سے نکلے تو اس وقت دفتر میں اور کون کون موجود تھا؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”سب ہی موجود تھے۔“ وہ مقتول انداز میں بولا۔

”صرف پاس جا چکے تھے۔۔۔ وہ عموماً پانچ بجے دفتر سے اٹھ جاتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”عام دنوں میں تم سات بجے چھٹی کرتے ہو کیا دفتر کو بند بھی تم کرتے ہو یا۔۔۔؟“

”دفتر کو بند کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ جب سب لوگ چلے جاتے ہیں تو میں دفتر کو لاک کر دیتا ہوں۔“

”کیا انفرادی طور پر دفتر کے ہر ہر کمرے کو لاک کیا جاتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ”نہیں جناب! ہر ایک کمرے کو لاک کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی آئی۔ بس، میں دروازے کو اچھی طرح لاک کر دیا جاتا ہے اور جب بھی۔۔۔“ وہ سانس لینے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اگر سچی جگہ جلدی جانا ہوتا ہے تو پھر سب سے آخر میں جانے والا شخص دفتر کو لاک کرتا ہے۔“ وقوعہ کے روز بھی یہی ہوا ہوگا۔ لیکن اگلے روز میں نے دروازہ کھولا تو عدنان صاحب کے قتل کا انکشاف ہوا۔“

”دشیں آں پورا تر۔۔۔“ میں نے بیچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اور بچہ نہیں پوچھا۔“

عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ کسی اور گواہ کو شہادت کے لیے پیش کیا جاتا ابتدا میں نے آئندہ پیش کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

☆☆☆

آئندہ چوٹی پر استقامت کی جانب سے دو گواہ پیش کیے گئے لیکن ان کے بیان اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جسے آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ ان کے بعد کچھ کے مالک یعنی پاس اسد نظامی کی گواہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ اسد نظامی وٹس باکس میں آکر کھرا ہوتا، میں نے بیچ کو غلط کرتے ہوئے کہا۔

”یور آنر! میں گواہ کے بیان سے پہلے اس شخص کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

کسی بھی ذریعہ ساعت میں انکو آری افسر یعنی تفتیشی افسر کی حیثیت استقامت کے گواہ ایسا ہوتی ہے اور ہر چوٹی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ بیچ کے

اشارے پر آئی اور وٹس باکس میں آکر کھرا ہوا گیا۔ میں مذکورہ کمرے کے پاس پہنچا اور اپنی مختصری جرح کا آغاز کر دیا۔

انکو آری افسر (آئی او) عہدے کے اعتبار سے سب انکیز تھا۔

”آئی او صاحب! میں نے اسے مقابلہ کرتے ہوئے سوال کیا۔“ آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟“

”مہارے پاس مقتول کی فرم سے فون آیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”شیجر غلام ربانی نے تقریباً دس بجے صبح، اٹھارہ اپریل کو فون کر کے ہمیں اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔“

”اور آپ جانے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”یہی کوئی ساڑھے دس بجے۔“

”مقتول کی حالت کو دیکھ کر آپ کو فوراً اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ اب اس مقام میں باقی نہیں رہا۔“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔۔۔ بالکل۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پہلی نظر ہی میں یقین ہو گیا تھا کہ اسے موت کو گلے لگنے کی کتنی گز رہ سکے ہیں اور بعد ازاں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی یہی ثابت ہوا ہے۔“

”ہوں۔۔۔“ میں نے معنی خیز انداز میں ہنکارا پھر اور چیتے ہوئے کہنے میں کہا۔ ”موقع پر موجود پولیس کے بیان سے آپ نے اندازہ قائم کیا کہ مقتول کے قتل میں فزمن کا ہاتھ ہو گیا ہے بعد ازاں میرے ہی دفتر میں داخل ہوا، آپ نے اسے گرفتار کر لیا۔“

”فزمن اور مقتول کے درمیان جاوی سرد اور گرم جنگ کے حوالے سے حاصل ہونے والی سنی خیز معلومات نے اس گرفتاری میں نہایت ہی اہم رول ادا کیا تھا لیکن۔۔۔“ وہ سانس لینے کے لیے رک پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہم نے اس حملے میں اپنے طور پر تحقیق نہ کی ہو۔“

”مفتی۔۔۔؟“ میں نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”اس سلسلے میں آپ نے کیا تحقیق فرمائی تھی؟“

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے اس کمرے میں متعدد مقامات سے فنگر پرنس اٹھائے تھے جس سے یہ ثابت ہوا کہ فزمن اس کمرے میں گیا تھا اور۔۔۔“

”یہ کوئی خاص بات نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مقتول اور فزمن کا تعلق چونکہ ایک ہی خیمے سے تھا لہذا فزمن کو اس کمرے میں جانا ہی پڑتا تھا۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن۔۔۔“ وہ متاملانہ انداز میں

بولے۔ ”مقتول کی میز اور میز کی درازوں کے ہینڈلز پر بھی فزمن کے فنگر پرنس ملے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فزمن نے مقتول کی میز کی درازیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔“

بلکہ درازیں کھولی تھیں۔۔۔“ وہ لمبے بھر کے لیے توقف ہوا پھر انکشاف انگیز انداز میں بولا۔

”مقتول کی دراز میں سے پچاس ہزار روپے بھی گئے ہیں۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔۔۔“

”حقیقت چھوٹی ہو یا بڑی اسے دانستہ نظر انداز کرنا جرم کے زمرے میں آتا ہے۔“ میں نے لفظ انداز میں کہا۔ ”لیکن پچاس ہزار روپے کے غیاب سے بھی بڑی اور اہم ایک حقیقت کو آپ مسلسل نظر انداز کرتے چلے آ رہے ہیں۔۔۔!“

”کون سی حقیقت؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

میں نے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔ ”عدنان علی کا قتل!“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔۔۔!“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے ٹٹلے لگا۔ ”میں نے قتل کی اس واردات کو کب اور کہاں نظر انداز کیا ہے؟“

”جبرج۔۔۔ اور ہر وقت۔۔۔!“ میں نے تو معنی انداز میں کہا۔

”آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی وکیل صاحب۔۔۔!“ اس کی حیرت اور ابھمن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

”میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ مقتول کو سہ ماہی لنگر لگے رہا اور اسے قتل کیا گیا تھا۔“ مذکورہ رویہ الوری دو جان لیوا گولیاں مقتول کے سینے میں اتریں اور وہ قید حیات سے آزاد ہو گیا۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔ یہ سچ ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس امر کی تصدیق کرتی ہے۔“

”پوسٹ مارٹم کی تصدیق کو چھوڑیں، اپنی تحقیق اور تفتیش پر رضیاں دیں آئی او صاحب۔“ میں نے روکے پھٹکے انداز میں کہا۔ ”جائے وقوعہ پر بہت سے مقامات سے آپ نے فزمن کے فنگر پرنس تو اٹھائے لیکن آپ کو فزمن کی انگلیوں کے نشانات کا کہیں کوئی ذکر نہیں اور ذکر بھی کیسے ہو۔۔۔“

”میں نے کوئی توقف کر کے ایک نظر یہ نگاہ اس کے اوپر ڈالی پھر چیتے ہوئے انداز میں کہا۔

”آؤ قتل باز یا ب ہوتا تو اس پر کسی کے فنگر پرنس ڈھونڈے جاتے۔۔۔!“

”ہاں، یہ حقیقت ہے کہ ہم آئینہ کو تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔“ وہ شرمندہ صورت بناتے ہوئے بولا۔ ”گلتا ہے، ملزم نے اس ریوالور کو کسی گٹر وغیرہ میں پھینک دیا تھا۔“

”آئینہ کو بازیاب کرنے میں ناکام رہے ہیں۔“ میں نے خودکامی کے انداز میں دہرایا پھر پوچھا۔ ”اور پچاس ہزار کی رقم کے بارے میں کیا کہتے ہیں آئی او صاحب۔ کیا ملزم نے وہ رقم بھی آرگنل کے ساتھ ہی گٹر میں پھینک دی تھی یا نذرِ قتل کر کے اس کے شعلوں پر اپنا انڈر ویر سکھاتا رہا تھا۔ استغاثہ کی رپورٹ میں مذکور رقم کی برآمدگی کا کوئی ذکر نہیں ہے؟“

”رقم بھی برآمد نہیں کرائی جاسکی۔“ وہ عداوت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”حالانکہ ہم نے کوشش تو بہت کی تھی۔“

”آئی او صاحب۔“ میں نے بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور شک مجھے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ ہی سے ہے نا۔۔۔؟“

”کیا مطلب۔۔۔؟“ وہ کسی طاقت ور اسپرنگ کے مانند اچھلا پھر اپنی وردی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو نظر نہیں آ رہا۔ میں ہوں وقار حسین۔ سب انسپکٹر۔“

”ہاں ہاں، مجھے آپ کی پولیس یونیفارم تو نظر آ رہی ہے۔“ میں نے اس کے ذمہ پر نمک کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ کے نام کا بلا (بچ) بھی دکھائی دے رہا ہے لیکن میں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی جو پھرتیاں سنی اور دیکھی ہوئی ہیں وہ آپ میں نہیں نظر نہیں آ رہیں۔“

”مثلاً۔۔۔ کون سی پھرتیاں۔۔۔؟“ وہ ہراساں بنا کر معترض ہوا۔

”میںی کر آپ کے ذریعہ تفتیش تو پھر بھی بولے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“ میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ لوگ اگر کسی شیریں کو بھی پکڑ کر تفتیشی کر سہے میں لے جائیں اور اس سے اپنے مخصوص انداز میں پوچھ پچھ کریں تو وہ بھی بالآخر آپ کی زبان بولنے لگتا ہے۔ جرم کا اقبال کرنا تو آپ لوگوں کے لیے جیسے پتھروں کا کام ہے لیکن میرا موکل ایک پختہ تک رہنا نہ آپ کی کمزوری میں رہا ہے اور آپ اس سے نہ تو پچاس ہزار روپے برآمد کروا سکتے ہیں اور نہ ہی آرگنل کا کوئی سراغ ملا ہے۔ یہ حیران کن بات نہیں ہے؟“

”حیران کن بات بالکل نہیں۔“ وہ بڑی ذہناتی سے بولا۔ ”بعض معاملات میں ایسا ہو جاتا ہے اور جہاں تک آپ کے خیالات کا تعلق ہے۔۔۔“ اس نے لمبی توقف کر کے

ایک پوجل سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”آپ نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کے تفتیشی عمل کے بارے میں جن ذریعہ خیالات کا اظہار کیا ہے، میں اس کی کٹی کرنا ہوں، ہمارے ہاں ایسا سمجھ نہیں ہوتا۔ ہم بھی انسان ہیں۔“

”بے شک۔۔۔ آپ بھی انسان ہیں لیکن آپ لوگوں کے غیر انسانی رویوں کی کہانیاں اور قصے اسے مقبول عام ہیں کہ آپ کی چیخ کر وہ صفائی ایک تفریحی مذاقِ محسوس ہو رہی ہے، بہر حال۔۔۔“ میں نے دوبارہ موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”آئی او صاحب! آپ نے مقتول کے درخت سے رابطہ کرنے میں اچھی خاصی تاخیر سے کام لیا تھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟“

”جی ہاں، خاص وجہ تھی۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”مقتول کا تعلق چونکہ کراچی سے نہیں تھا لہذا اسی لیے اس کے گھر والوں سے رابطہ کرنے میں دیر ہوئی۔“

پھر خود ہی اس نے وضاحت بھی کر دی۔ ”مقتول، میر پور خاص کا رہنے والا تھا۔ اس کی پوری ٹہلی میر پور خاص میں آباد ہے۔ کراچی میں وہ بالکل اکیلا تھا اور کسی کرایے کے کوارٹرز میں رہتا تھا۔ میں نے اس کے گھر کا نمبر حاصل کیا پھر فون کر کے انہیں اس اعداد تک واقعہ کی اطلاع دی تھی۔“

میں نے دوپہر کے ملاقات کے بعد جرح کے وقت کو دیکھا تھا۔

”تھوڑی ہی دیر کے بعد فرم کے مالک اسد نظامی کو عدالت کے اندر بلایا گیا۔ اسد نظامی کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال تھی۔ وہ اپنی وضعِ قیام اور صورتِ محفل سے ایک باس نظر آتا تھا۔ نظامی نے حلیہ بیان دیکر ڈگرا دیا تو ویل اسٹاٹڈ جرح کے لیے قفس بائیں کے بائیں چلا گیا۔ وہ گواہ سے اپنی مرضی اور ضرورت کے سوالات کرتا رہا جس سے یہ تاثر قائم کرنا مقصود تھا کہ مقتول اور ملزم کے درمیان بڑی خطرناک نوعیت کی پچھلی چل رہی تھی اور اس کا سبب ملزم کا جھوٹا۔ وہ مقتول کی بے پناہ صلاحیتوں سے جلنے لگا تھا۔“

”غیرہ وغیرہ!“

میں اپنی باری پر رنج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد وٹس بائیں کے نزدیک چلا گیا اور وہاں موجود استغاثہ کے گواہ سمر اسد نظامی سے بڑے فحشووار کچھ میں سوال کیا۔

”نظامی صاحب! آپ کیسے ہیں؟“

”الحمد للہ۔ میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”کاروبار کیا چل رہا ہے؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ کاروبار بھی اچھا چلا رہا ہے۔“ وہ

بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آپ اس برس میں کب سے ہیں؟“

”ماشاء اللہ! تیسری سہ ماہی۔“ اس نے فخریہ انداز میں بتایا۔ ”والد صاحب نے یہ برس کھڑا کیا تھا، میں نے اسے چھوٹے چھوٹے لیے بالکل تیار ہے۔“

”کیا آپ کے بیٹے وغیرہ بھی برس میں آپ کا ہاتھ بناتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی الحال نہیں۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”میری تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ چنانچہ سے بڑا ہے اور آج کل امریکا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یہ اس کی اسٹڈی کا آخری سال ہے۔ آئندہ سال وہ بھی آپ کو میرے ساتھ اس برس میں نظر آئے گا۔“

”ماشاء اللہ۔۔۔“ میں نے تشریفی نظر سے اسے دیکھا اور فوراً اپنے مطلب کی طرف آگیا۔ میں نے پوچھا۔ ”ملزم کو آپ کی فرم میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا تھا؟“

”کم و بیش چار سال۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس دوران میں آپ نے ملزم کو کیا اور کیا کیا تھا؟“

”وہ ایک تفتیشی ملازم تھا۔“

”آپ نے میرے موکل کی محنت کو جسر کر دیا ہے۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”اب بھی بتائیں کہ وہ معاملات کا کیا تھا؟“

”میرے خیال میں وہ کام کا کمر تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس نے بھی اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتی تھی۔“

”اور بھی آپ کے ساتھ کوئی فراڈ یا بددیانتی کی ہو۔۔۔؟“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو کسی بھی حوالے سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہو۔۔۔؟“ اسے کام کے حوالے سے بھی کسی بڑی شکایت کا موقع دیا ہو؟“

ویل اسٹاٹڈ نے اپنی جرح میں جن نکات کو موضوع بنا کر سوالات کیے تھے، میں نے انہیں ”ہاتھ لگنے“ کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ میرے استفسار کے جواب میں اسد نظامی نے بڑے طبعی انداز میں کہا۔

”بھئی۔۔۔ بالکل نہیں مگر۔۔۔؟“

”مگر کیا؟“ وہ جملہ اوجود اچھوڑ کر خاموش ہوا تو میں نے فوراً سوال کر دیا۔

”مگر یہ کہ۔۔۔“ عدنان کی آمد کے بعد ملزم نے آگلی چھٹی ساری سہ ماہی نکال دی تھی۔ اسد نظامی نے جی سے بتایا۔

”بھئی، یوں سمجھ لیں کہ اس نے گویا شکایات کے اندر کھڑے کر دیے تھے۔ کام پر سے اس کی توجہ بالکل ہٹ گئی تھی۔ یہ بڑی بھیا تک خطرات کرنے لگا تھا اور اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ اسے عدنان کا فرم میں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ یہ مقتول سے اور اس کی صلاحیتوں سے جلیں ہو گیا تھا۔ یوں سمجھیں کہ اسے مقتول سے شدید ترین نفرت ہو گئی تھی۔“

”ایک بات کی وضاحت چاہوں گا نظامی صاحب؟“

میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی فرما میں۔“ وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے نہایت ہی گھبر لہجے میں فرمایا۔ ”جب آپ کو ملزم کے کام سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ آپ اس کے کردار اور رویے سے بھی پوری طرح مطمئن تھے تو پھر مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ میں مقتول کو رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ یہ آپ کی ایک سنگین غلطی تھی؟“

”گرہر نہیں! وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”میں بیٹھ دس قدم آگے سوچنے کا عادی ہوں۔ میں نے مقتول کی تقرری کا فیصلہ اپنی فرم کے مینجر اور ورکش مشققل کی خاطر کیا تھا۔“

”معزز عدالت آپ کی دورانہی کے فلسفے کو سمجھنا چاہتی ہے نظامی صاحب؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اس نے کھار کھار صاف کیا پھر بڑے مدبرانہ انداز میں بتانے لگا۔ ”اکثر لوگوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ میں نے کیا دیکھ کر مقتول کو اپنی فرم میں رکھ لیا تھا۔ اسے کراچی میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس دوران میں اس نے دو چار چھوٹی موٹی بیٹیوں پر کام کیا تھا۔ میں نے آج تک کسی گواہ سوال کا جواب نہیں دیا لیکن اب ضرور دوں گا کہ میں نے اس میں کون سا جوہر چھپا دیکھا تھا۔“

وہ سانس ہوا کر کے لیے متوقف ہوا تو میں نے کوئی نیا سوال کر کے اسے ”ڈسٹرب“ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں غیر محسوس انداز میں اسے سوالات کی آگلی پکڑا کر اسد نظامی کو ایک خاص مقام تک لے آیا تھا جہاں مجھے اس سے ایک انتہائی خطرناک سوال کرنا تھا۔ میں پوری طرح مطمئن تھا کیونکہ میری یہ کوشش راگاکا نہیں تھی۔ اسد نظامی دھیرے دھیرے میرے مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”مقتول میں جوہر نہیں بلکہ جواہر چھپے ہوئے تھے۔ میں اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو گیا تھا۔ جب ہی میں نے اسے چار سال سے کام کرنے والے ملزم پر فوقیت دی۔ یہ

ٹھیک سے کہ ملزم ایک ایماندار اور مخلص تھا لیکن مقتول میں
کئی گن گنا زیادہ ہوتے تھے۔ وہ ملزم کے مقابلے میں آدمی گناہ
پر دس گنا زیادہ کام کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ مارکینٹ
کے علاوہ اکاؤنٹس اور سیکڑ کے رموز سے بھی واقف تھا اور اس
میں انتظامی انداز کی صلاحیت بھی۔ درجہ اتم موجود تھی۔ میں
اپنے بہت سارے کام اس کے سپرد کر کے بے فکر ہو جاتا تھا
اور..... وکیل صاحب اسید کی اور کئی بات یہ ہے کہ ہر انسان
اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ میں نے بھی مستقبل کے حوالے سے
بہت کچھ سوچ کر مقتول کو اپنی فرم میں اکاؤنٹس کیا تھا۔
"بالکل بجا فرمایا آپ نے۔" میں نے تائید کی انداز
میں کہا۔ "ہر انسان..... خصوصاً ہر کاروباری انسان کو سب
سے پہلے اپنی فائدہ سوچنے کا حق ہے، یہ الگ بات کہ آپ
کا سوچا ہوا پورا نہیں ہو سکا اور آپ دونوں سے ہاتھ دھو
بیٹھے..... مقتول اور ملزم، دونوں سے!"
"یہ سب زندگی کا حصہ ہے....." وہ بے پروائی سے
کنڈھے ہچکاتے ہوئے بولا۔
میں نے پوچھا۔ "نظامی صاحب! آپ نے مقتول کی
بہت سی صلاحیتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ میں جانتا چاہوں گا کہ کیا
اس میں ایک اچھا جنرل فیکٹریتے کی بھی اہلیت موجود تھی؟"
"بالکل موجود تھی۔" وہ پوری قطعیت سے بولا۔ "اور
یہ میرے پروگرام میں بھی شامل تھا۔"
"یعنی آگے چل کر آپ مقتول کو اپنی فرم کا قیصر بنانے
کا ارادہ رکھتے تھے؟"
"جی..... میرے بیٹے کی، امریکا سے واپسی کے
بعد.....!"
"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!"
☆ ☆ ☆
منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں
استفسار کا آخری گواہ یعنی فرم کا جی ایم غلام ربانی کھڑا تھا۔
غلام ربانی کی عمر پینتالیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔
وہ ایک موٹا چاقو اور صحت مند شخص تھا۔ قد کاٹھ، ڈیل ڈول
اور قد و خال میں وہ بڑی حد تک فلمی اداکار خالد سلیم موٹا سے
مما جلتی تھا۔ اس وقت گواہ کے چہرے پر گہری شہید کی نظر
آ رہی تھی۔ وہ جیسے ہی مختصر سا حلیہ بیان دے کر فارغ ہوا
وکیل استفسار اس سے لپٹ گیا۔ مقصد یہی ثابت کرنا تھا کہ
ملزم کو مقتول سے اس درجہ نفرت تھی کہ وہ دل کا غبار اور ذہن
کا بخار نکالنے کے لیے اسے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔
اس سلسلے میں اس نے ملزم اور مقتول کے بیچ ہونے والی مختلف

باتوں کو بھی کوڑا کیا جن سے مقتول کے لیے ملزم کی برائی اور
غصہ ظاہر ہوتا تھا۔
اپنی باری پر میں نے استفسار کے گواہ کو بالکل مختلف
انداز میں لیا۔ میں نے اب تک جو ورگ کیا تھا اس کے
استعمال کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے اب تک جوئے والی
عدالتی کارروائی کے نتیجے میں، پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ غلام
ربانی کو کس طرح اپنی جرح کی چٹنی میں چیرنا ہے۔ میں نے
ہلکے ہلکے اور دوستانہ انداز میں سوالات کا سلسلہ آغاز کیا۔
"ربانی صاحب! آپ اردو کے محاوروں پر یقین
رکھتے ہیں؟"
اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ "کیوں نہیں۔
محاورے چاہے کبھی زبان کے ہوں، برسوں کے تجربے کے
نچوڑ سے تشکیل پاتے ہیں، یہ ایک محسوس حقیقت ہوتے ہیں۔"
"ویری گڈا!" میں نے سانس کی نظر سے اسے دیکھا پھر
پوچھا۔ "تیک فٹھ، دو کالج..... کا مطلب تو آپ کو چاہی
ہوگا؟"
"جی ہاں....." اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
"مطلب یہ کہ..... ایک تیر، دو شکار!"
"کام ایک فائدہ دہرا.....!" میں نے سوالیہ نظر
سے اسے دیکھا۔ "جی ہاں....."
"جی..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ مختصر سے
ہوئے لہجے میں بولا۔
"شکر ربانی صاحب!" میں نے معنی خیز انداز میں
کہا۔ "آپ نے میرا کام بہت آسان کر دیا ہے۔"
"کون سا کام؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
میں نے اس کی خیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے اگلا
سوال کیا۔ "نظامی صاحب کی فرم میں کام کرتے ہوئے آپ
کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"
"پانچ سال!" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔
ان کلمات میں، میں نے گواہ پر اپنے سوالات کے تین
کیمرے لگا رکھے تھے اور ان تینوں کے ٹریک ایک دوسرے
سے بالکل مختلف تھے۔ میں اسے سوچنے کا موقع نہ دینے کی
خاطریہ چال چل رہا تھا۔ بعد ازاں میں اپنی جرح کے انتقام
پر..... اس شوٹ کو ایڈٹ کر کے اپنے کام کی باتیں نکال لیتا۔
استفسار کا گواہ مختصر نگاہ سے مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔
"ربانی صاحب! کیا آپ کبھی (بی سی) وغیرہ ڈالنے
کا شوق رکھتے ہیں؟"
"نہیں..... بالکل بھی نہیں۔" وہ ٹٹی میں گردن ہلاتے

ہوئے بولا۔ "یہ خود کو دھوکا دینے کا ایک خوبصورت انداز
ہے۔ اس سے اچھا ہے، انسان اپنی رقم کسی اسکیم میں انویسٹ
کر دے تاکہ کچھ منافع تو بڑھ کرے۔ اگر کچھ بھی سمجھ میں نہ
آ رہا ہو تو انسان پرانے باغری لے کر رکھ لے۔ کبھی نہ بھی
قسمت کھلنے کے امکانات تو ہوتے ہیں۔"
"کیا آپ پرانے باغری وغیرہ لے کر رکھتے ہیں؟"
"جی ہاں۔"
"کبھی آپ کا باغری کبھی ہے؟"
"کبھی کبھار چھوٹے موٹے لگ جاتا ہے۔" اس نے بتایا۔
"میں اتنا خوش قسمت نہیں ہوں کہ پہلا، دوسرا تیسرا انعام
لگے۔"
"یہ بھی آپ کی خوش قسمتی ہی ہے ربانی صاحب کہ کبھی
کبھار چھوٹے موٹے لگ ہی جاتا ہے۔" میں نے دوستانہ انداز
میں کہا۔ "ورنہ بعض لوگ تو سالوں کے پیٹھے رہتے ہیں اور بھی
چھوٹی لسٹ میں بھی ان کے پرانے باغری کا نمبر نظر نہیں آتا۔"
"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی
انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"آج تک آپ کا بڑے سے بڑا باغری کس مالیت کا لگا ہے؟"
"کبھی..... کبھی دس ہزار..... کبھی پندرہ ہزار....."
"آپ کو ملزم سے کتنی تنخواہ ملتی ہے؟" میں نے جرح کا
زاویہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔
"آٹھ ہزار روپے!" اس نے جواب دیا۔
"گھر اپنا یا کرائے کا.....؟"
"فی الی تو میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہ رہا ہوں
جو کہ میری ذاتی ملکیت ہے۔" اس نے بتایا۔ "لیکن مستقبل
قریب میں، میں کسی بنگلے میں شفٹ ہونے کا ارادہ رکھتا
ہوں۔"
"کیا کوئی لازمی وغیرہ لگنے کی امید ہے؟" میں نے
معنی خیز نظر سے اسے دیکھا۔
"نہیں جناب! میں نے تنکا تنکا جوڑ کر کچھ رقم جمع کی
ہے اسی سے بنگھا خریدوں گا۔" اس نے جواب دیا۔ "پرانا کھر
خرودت کروں گا تو اس سے کبھی کچھ رقم مل جائے گی اور اس
دوران میں اگر کوئی پرانے باغری مل جائے تو مزہ آ جائے گا۔"
"آپ کا آخری باغری کب لگا تھا؟"
پندرہ گات تک سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔
"خردری میں۔"
"کس مالیت کا؟"

"دس ہزار روپے کا۔"
"یعنی خردری سے لے کر آج تک آپ کا کوئی باغری
نہیں لگا؟"
"جی نہیں!"
"اس دوران میں آپ نے کوئی قیمتی شے بھی خریدت
نہیں کی؟"
"بالکل نہیں!" وہ قطعی لہجے میں بولا۔
"مقتول کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے تھے؟" میرا
انداز پھر تہل ہوا۔
"خوشگوار.....!"
"اور ملزم کے ساتھ؟"
"اس کے ساتھ بھی اچھے ہی تھے۔" وہ میرے موکل
کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن پچھلے کچھ عرصے سے یہ
خاصا چڑا اور بد مزاج ہو گیا تھا، اس لیے میں نے اسے نہ
لگنا چھوڑ دیا تھا۔"
"اس کے چڑے پن کا سبب وہی ہے نا جو آپ
نے وکیل استفسار کے سوالات کے جواب میں ثابت کرنے
کی بھرپور کوشش کی ہے؟"
"جی ہاں، جی ہاں..... وہی....." وہ جلدی سے بولا۔
"یعنی مقتول بے پناہ خوبیوں کا مالک تھا....." میں
نے اس کی سوچ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ "ملزم کے
ذہن میں یہ ڈیرینج تھا کہ نظامی صاحب بہت جلد اس کی
چھٹی کر دیں گے جب ہی وہ مقتول کی پیٹھے پیچھے ڈیرا لگا رہا تھا؟"
"اللہ آپ کا بھلا کرے وکیل صاحب! بالکل صحیح!"
"اللہ آپ کا بھی بھلا کرے شیخ صاحب! اب آپ
بھی حقیقت بیان کر دیں!"
"جی کون سی حقیقت؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے
دیکھنے لگا۔
میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ حقیقت کہ کیا
مقتول واقعی اتنی خوبیوں کا مالک تھا کہ ملزم کو اس کی ذات
سے اپنا تک خطرہ پیدا ہو گیا تھا؟"
"جی ہاں..... اس امر میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش
ہی نہیں!"
"مجھے آپ کی بات سے اتفاق کرنا پڑے گا شیخ
صاحب!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔
"نظامی صاحب نے بھی مقتول کی ایک حیرت انگیز صلاحیت
کا ذکر کیا تھا.....؟"
میرے انکشاف انگیز انداز کے جواب میں وہ پوچھنے

بنا رہا۔ رکھا۔" نظامی صاحب نے مقتول کی کون سی حیرت انگیز صلاحیت کا ذکر کیا تھا۔؟
 "بچی کو وہ۔۔۔ ایک بہترین فیبر بھی ثابت ہو سکتا تھا۔۔۔"

"فیبر کا تو مجھے پتا نہیں۔۔۔" وہ بد مزہ سا ہو کر بولا۔
 "لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ میٹر اور ماریٹنگ کا پتہ تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ سامہریا کے برف داروں میں فریج فروخت کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔"

"ربانی صاحب! میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔" آپ کے پاس اسد نظامی نے اپنے بیان کے اختتام پر توبہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی امریکا سے واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے بعد مقتول کو اس فرم کا جی ایم بنا دیا جاتا۔"

"آپ نے سنا ہوگا۔" پاس از آکویز راعٹ! وہ کہہ رہے اچکاتے ہوئے بولا۔ "اگر نظامی صاحب نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر کیا ہے تو ان کی مرضی ہے۔ میں بھلا اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب۔۔۔"

"آپ کہیں نہیں بلکہ فرمائیں ربانی صاحب! میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ قریباً اس کی کیا پاس کے اس فیصلے سے آپ کو کوئی خوف محسوس نہیں ہوا تھا؟ ایک فرم میں کوئی ایک جی ایم ہی رہ سکتا ہے نا۔ اگر مستقبل قریب میں نظامی صاحب، مقتول کو اپنی فرم کا جنرل مینجر مقرر کر دیتے تو آپ خود کو کہاں کھڑا دیکھتے۔۔۔؟"

"اپنی نوکری کے حوالے سے ڈراور خوف صرف انہی لوگوں کو ہوتا ہے جو اندر سے خالی ہوں! جی ایم نے طویر انداز میں میرے موہلی کی طرف دیکھا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "اللہ نے مجھے "میرے کام" کی بھرپور صلاحیت دی ہے۔ اگر نظامی صاحب کو واقعی میری ضرورت نہ رہتی تو میں کہیں اور چلا جاتا۔" نظامی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر فلسفیانہ انداز میں بولا۔

"پائے کہ دلانگ نیست، ملک خدا جنگ نیست!" میں نے اس کے فلسفے کو ایک طرف رکھتے ہوئے، انتہائی مختلف موڈ سے سوال کیا۔ "ربانی صاحب! دفتر میں آپ کی آمد و شد کے اوقات کیا تھے؟"

"میں عموماً صبح دس بجے دفتر پہنچ جاتا کرتا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اور چھ بجے آف کرتا تھا۔ نظامی صاحب چونکہ اس سے پہلے ہی اٹھ جاتے تھے لہذا چھ کے بعد بیٹھے رہنے کی کوئی تک نہیں بنتی تھی۔"

"میری معلومات کے مطابق، وقوعہ کے روز اسد نظامی صاحب پانچ بجے دفتر سے رخصت ہو گئے تھے۔" میں نے اس کے پلٹے اور فریج پر سے پرگاہ جھاتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے، آپ اس روز بھی حسب معمول چھ بجے اپنی گھر گئے ہوں گے؟"

"جی ہاں۔۔۔ بالکل، بالکل۔۔۔!"
 "آپ کا گھر کراچی کے کس علاقے میں واقع ہے؟"
 "محمود آباد میں۔"

"مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ آٹھ بجے کے قریب اپنے گھر پہنچے تھے۔" میں نے ٹوٹنے والے انداز میں کہا۔ "بچی کے دفتر سے آپ کے گھر تک کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کا ہے کیونکہ آپ کے پاس اپنی کار ہے۔ اس حساب سے آپ کو ساڑھے چھ بجے یا زیادہ سے زیادہ پونے سات بجے اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کیا آپ کہیں اور سے ہوتے ہوئے گھر آئے تھے جو اتنی دیر لگ گئی۔۔۔؟" میں نے ذرا دیر کو کر ایک گہری سانس خارج کی پھر وارننگ بجرے الفاظ میں کہا۔

"ربانی صاحب! ایک بات کو ذہن میں رکھیے گا کہ اگر وقوعہ کے روز آپ گھر جانے سے پہلے نہیں اور بھی گئے تھے تو آپ کون سا وقت کا حساب دیتا ہوگا مطلب، یہ ثابت کرنا ہوگا کہ آپ نے وہ وقت کہاں اور کس کے ساتھ گزارا؟"

"میں کہیں۔۔۔ بھی نہیں گیا۔ تھا۔" وہ ہاتھ کی پشت سے اپنی پیشانی کو پونچھتے ہوئے بولا۔ میرے انتہائی اس کے سینے پھڑپھڑا رہے تھے۔ "ایک تو اس دن مجھے ٹریک بڑا جم ملا تھا۔ پھر گھر اور فرم کے راستے کے درمیان اچانک میری کار خراب ہو گئی۔ آدھا، پونا گھنٹا اس کا مرض کھٹنے میں لگ گیا تھا۔"

"وقوعہ کے روز، جب آپ دفتر سے رخصت ہوئے تو اس وقت وہاں اور کون کون موجود تھا؟" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"اس وقت صرف مقتول اور طرم ہی وہاں موجود تھے۔" اس نے جواب دیا۔ "اور یہ دونوں ایک ہی کمرے میں رو رہے بیٹھے ہوئے تھے۔"

"آپ نے کتنے وقت ان میں سے، کسی سے کوئی بات کی تھی؟"

"جی نہیں۔۔۔!" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر سوالات کا زرا پوچھ لیا اور

تکبیر انداز میں، استغاثہ کے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔
 "کیا آپ کا بینک اکاؤنٹ سے ربانی صاحب؟"
 "جی ہاں۔۔۔ بالکل ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔
 "ایک اکاؤنٹ یا۔۔۔ ایک سے زیادہ؟"
 "صرف ایک!"

"یہ وہی اکاؤنٹ ہے؟ جہاں آپ تنکا تنکا جمع کر رہے ہیں؟" میں نے سنسناتے ہوئے انداز میں پوچھا۔
 "بھلا خریدنے کے لیے؟"

"جی ہاں۔۔۔" وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔
 "اگر میں کوئی غلطی نہیں کر رہا تو آپ کا اکاؤنٹ نمبر یہی ہے نا۔" میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "دن، تحری، بو، فانیو، فور، ڈیش، بیون۔۔۔؟"

"جی ہاں، جی ہاں۔۔۔" وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن آپ کو میرا اکاؤنٹ نمبر کس نے بتایا؟"

"معلومات حاصل کرنے کے میرے اپنے ذرائع ہیں جو میں آپ پر ظاہر نہیں کر سکتا۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ کے اکاؤنٹ میں اس وقت کوئی رقم موجود ہے؟"

"آپ سمجھیں پور آفر! ویکی استغاثہ کو اچانک ہوش آ گیا۔" میرے فاضل دوست پٹری سے اتر گئے ہیں۔ یہاں مردانہ مڑو ریس کی ساعت ہو رہی ہے اور موصوف استغاثہ کے معزز گواہ کے اکاؤنٹ کی جانچ پر مثال میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ تو عدالت کے قیمتی وقت کا سراسر زیاں ہے۔ میری عدالت سے درخواست ہے کہ ذہنی کو ایسے فضول جھگڑدوں سے یاز رہنے کی تاکید کی جائے۔"

رج نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا اور ضمیر سے ہوئے لہجے میں مستشرق ہوا۔ "بیک صاحب! کیا اس بینک انکماری کا زبردستی کس سے کوئی تعلق ہے؟"

"بالکل ہے جناب۔۔۔ اور بڑا گہرا تعلق ہے۔" میں نے اپنی فائوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "اور چند لمحات کے بعد یہ تعلق کل کمر سامنے آنے ہی والا ہے۔"

"آپ جرح جاری رکھیں بیک صاحب۔۔۔!" جج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میں استغاثہ کے گواہ غلام ربانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"جی ربانی صاحب! آپ مجھے اپنے بینک بیکس کے بارے میں بتانے والے تھے؟"

"میں انگریز بینک اکاؤنٹ تو نہیں بنا سکتا۔" وہ گھبرائے

ہوئے انداز میں بولا۔ "اس کام کے لیے مجھے بینک سے رجوع کرنا ہوگا۔"

"انگریز بینک گھر کی ضرورت نہیں ہے ربانی صاحب۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "آپ اندازاً بتا دیں، ویسے۔۔۔" نظامی توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا۔

"جو شخص کسی خاص مقصد کے لیے رقم جمع کر رہا ہو، اسے صحیح شدہ ایک ایک پیسا انگلیوں پر یاد ہوتا ہے۔" اس نے صوف گن کر اپنے طاق کو تکرار کیا پھر بھیجے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرے جیسے طاعن انداز کے کے مطابق، اس وقت بینک میں ڈیڑھ لاکھ کی رقم جمع ہوگی۔"

"اور یہ رقم آپ نے تنکا تنکا، قطرہ قطرہ جمع کی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "بھی یک مشت کوئی بڑا اکاؤنٹ آپ نے اپنے اکاؤنٹ میں کر لیتے نہیں کیا۔؟"

"جی نہیں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔" وہ گڑبڑا گیا۔
 "ایک جواب دیں ربانی صاحب! مجھرا انداز جارحانہ ہو گیا۔" آپ نے اپنے اکاؤنٹ میں بھی کوئی بڑا اکاؤنٹ ڈیپازٹ کیا یا نہیں۔۔۔؟"

"بڑے اکاؤنٹ۔۔۔ سے آپ کی کیا مراد ہے۔۔۔؟"

"وہ ایک مرتبہ پھر پینا صاف کرتے ہوئے بولا۔
 "مطلب۔۔۔ پچاس ہزار یا اس سے زیادہ رقم۔۔۔؟"

میں نے پوچھا۔
 "نہیں۔۔۔" وہ بے حد پریشانی کے عالم میں بولا۔

اس کے انکار نے میرا کام آسمان کر دیا۔ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "سسر ربانی! انہیں اپریل کی صبح آپ کے اکاؤنٹ میں سسر سسر ہزار روپے جمع ہوئے ہیں۔ پچاس ہزار کمیشن اور تیس ہزار کا ایک کراس چیک۔۔۔"

"وہ چیک تو میرے۔۔۔ ایک دوست۔۔۔ نے دیا تھا۔" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "میرا اس دوست کے ساتھ کچھ لین دین تھا۔"

"جنید خان۔۔۔" میں نے طویر انداز میں کہا۔ "آپ کے اس دوست کا نام جنید خان ہے نا جس نے آپ کو تیس ہزار کا کراس چیک دیا تھا۔۔۔؟"

"آپ جنید خان کو۔۔۔ کس طرح جانتے ہیں۔۔۔؟"

اس کی حیرت میں خوف بھرا ہوا تھا۔

"میں نہ صرف جنید خان کو اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ



گمشدہ

عمیر شاہ

چاہے کوئی افسانہ ہو یا کوئی قیمتی چیز... اکثر اوقات پاس رہنے پران کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا — مگر جب اچانک وہ شے دسترس سے دور ہو جائے تو دل خزان رسیدہ ہونے کے مانند لڑکھٹا رہتا ہے۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھا۔

گوئے ہوئے رستوں اور چروں کے پائے کا عجیب انداز

ایک ایک دھماکے سے اڑ جائے گی۔ یہ تھکا فٹاؤں میں گم ہو جائے گا۔ یہ چلتے پھرتے لوگ اچانک مر جائیں گے۔ یہ سب دکائیں، بلکہ تیس جاو کیوں نہیں ہو جائیں۔ اتنی بڑی قیامت ٹوٹنے کے بعد اب تک یہ سب کچھ ملامت کس طرح ہے؟ لڑلہ بار بار صرف ٹیکے کوئی میں لکھتا ہوں آتا ہے۔ تمام رنگ، خوشبو اور ہوا میں شرم ہو جاتی چائیں، قیامت آج ہی برپا ہونا چاہیے۔

”ایک بچہ گم ہو گیا ہے۔ اس کی عمر چار سال ہے۔ گندی رنگ، گھالی کپڑے اور سرخ چمیل پہنی ہوئی ہے جسے نے مہربانی فرما کر نئی پولیس اسٹیشن پہنچا دیا اور ہزار روپے انعام پائے۔“
تھکنے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک شخص اعلان کرتا جا رہا تھا۔ تاہم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ عجیبی سیٹ پر بیٹھا ہوا تقریباً تیس برس کا نوجوان سوچوں میں غرق تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں مارل معلوم نہیں ہوتا تھا، وہ سوچ رہا تھا۔ ”یہ سڑک

حیرہ دو شکار... ایک کام، دہرا فائدہ... تم نے ایک کام سے دہرا فائدہ حاصل کر لیا۔ عدنان علی کے کھل سے تہا رہی میجر کی پوسٹ بھی محفوظ ہو گئی اور تمہیں چھکا نہیں، بلکہ ایک نئی بھارت پوسٹ میں چل میں کھل ملا کر ستر ہزار روپے بھی مل گئے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

یقیناً میں غلط نہیں کہہ رہا تھا لہذا وہ کوئی مدلل جواب نہ دے سکا۔ میں نے اس کی شکست کو یقینی بناتے ہوئے فرار کی تمام راہیں سدھو کر دی تھیں۔ وہ لاکھ ہاتھ پاؤں اور زبان کو حرکت میں لاتا لیکن اس کے لیے کوئی بھی جانے نہا ہوا نہیں پتہ تھی۔ میں نے اپنی جرح کے چال میں اسے جھنسا کر بے بس اور بے کسر کر دیا تھا۔

جب میرے پیچھے استفسارات اور مسلسل پوچھنا چھپنے میں وہ کوئی بھی معقول جواب نہ دے سکا تو مجھ نے غلام ربانی کو شال نشین کرنے کے احکام صادر کر دیے۔

آئندہ جوشی پر عدالت نے میرے موکل کو اعزت بری کر دیا۔ کیونکہ غلام ربانی نے عدنان علی کے گم ہونے کا اقبال کر لیا تھا۔ اس نے کچھ اس قسم کا بیان دیا تھا۔

”عدنان کے تھیر کی سے بوھتے ہوئے دفتری عمل و عمل میں جہاں فیصل کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا وہاں میں بھی ہے۔ حد نظر محدود تھا۔ کیونکہ اسد نظامی ڈھکے پیچھے غلطی میں پڑا وہ ظاہر کر کے تھے کہ وہ مستقبل قریب میں عدنان کو میجر کی سیٹ پر بیٹھا دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ ان حالات میں، جب میرے دوست جیل خان نے ایک کام (فیصل کو کسی مصیبت میں ڈالنے کا کام) کی پرکشش آفر دی تو میں فوراً تیار ہو گیا۔ یہ

میرے لیے بہت آسان ثابت ہوا تھا۔ میں نے چند روز تک ایک مخصوص پروپیگنڈا کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فیصل کسی بھی وقت عدنان کو شہید نہ نکال سکتا تھا۔ پھر موقع ملے اس میں نے عدنان کا کام اس صفائی سے کر دیا کہ اس کے قتل کے الزام میں فیصل بچا ہی چڑھ جائے لیکن... میری بدقسمتی کہ تین وقت پر میرا منصوبہ ٹل ہو گیا۔“

میرے جو کچھ بھی ہوا تھا اس میں غلام ربانی کی بدقسمتی کا ہاتھ تھا یا فیصل کی خوش قسمتی کا شغل لیکن ایک بات طے تھی کہ اس سارے معاملے میں فیصل کی ”ہمدردی“ چشم چرخ رہی تھی۔ وہ ہمدردی جو اس نے ابتدا میں نورین کے ساتھ کی تھی اور بعد ازاں اشتیاق کے ساتھ۔ اس عمل میں درحقیقت، فیصل کا کوئی قصور نہیں لیکن وہ کیسی کہتے ہیں کہ بعض اوقات ہمدردی بڑی اہمیت رکھتی ہے!

(تحریر: خدام ہٹ)

اس کے گرو عامر ملک کو بھی ”ا“ میں نے زیریے انداز میں کہا۔ ”جو اس وقت جیل کاٹ رہا ہے اور جیل کے اندر بیٹھ کر ٹیویاں بلا رہا ہے۔ اسی کے ایک ”کلمہ“ گئے لیے جیل خان نے نہیں میں ہزار کا چیک دیا تھا۔ تم نے عامر ملک کا کام سلی آئیز انداز میں کر دیا ہے؟“ میں ”آپ“ سے ”تم“ پر آگیا تھا۔

”کلمہ... کون... ما کام...؟“ وہ ہلکا ہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ”مم... میری تو کچھ... سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

بات ختم کر کے ربانی نے کپڑے کی ریبلنگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور گہری گہری سانس لینے لگا۔ ان لحاظ میں وہ دھماکا نہیں نظر آ رہا تھا۔

”تمہارے دماغ میں اس وقت ہر شے بڑی آسانی سے بیٹھ جائے گی جب تمہیں ایکوڈ باکس میں کھڑا کر کے کڑی جرح سے گزارا جائے گا۔“ میں نے درشت انداز میں کہا۔ ”جیل خان اور عامر ملک کی سسٹی خیر کہاں بعد میں پھینچی جائے گی۔ پہلے یہ بتاؤ، بیس ہزار کے چیک کے علاوہ جو پچاس ہزار روپے تمہارے اکاؤنٹ میں، انیس اپریل کی صبح جمع ہوئے وہ کہاں سے آئے تھے؟“ میں نے کھانی تو تھک کر کے حاضرین عدالت پر ایک حائلانہ نگاہ ڈالی پھر وکیل استغاثہ کو غرور سے انداز میں دیکھنے کے بعد اپنی بات مکمل کر دی۔ ”کیا یہ وہی پچاس ہزار روپے ہیں جو ہتھولی کی میز کی دراز سے غائب ہوئے تھے؟“

”پپ... پانی...!“ وہ بے حد گھبراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔

”پانی ملے گا... لیکن میرے سوالات کے جواب کے بعد۔“ میں نے بڑے ظالمانہ انداز میں کہا۔

غلام ربانی کے چہرے پر زردی گھنڈی۔ سچ نے گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے سمجھ سے پوچھا۔

”بیک صاحب! یہ عامر ملک اور جیل خان کا کیا قصہ ہے؟“ میں نے شہادت ہی مختصر مگر جامع انداز میں معزز عدالت کو وہ کہاں بنا دی جس کے اہم کرداروں میں فیصل، نورین، اشتیاق اور عامر ملک شامل تھے۔ میں خاموش ہوا تو سچ نے کہا۔

”بیک صاحب! پلیز کنکلیو۔“ میں دوبارہ استغاثہ کے گواہ غلام ربانی کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو اس کو کہتے ہیں... ایک چٹھ، دو کاج... ایک

چہ عادتیں

خلیفہ ہارون رشید نے لوگوں سے کہا کہ ”نیک بننا چاہتے ہو تو بچوں جیسی عادتیں بنالو۔“

خلیفہ ہارون نے کہا کہ بچوں میں 6 ایسی عادتیں ہوتی ہیں اگر بڑے انہیں اپنائے تو سب دلی بن سکتے ہیں۔

- (1) رزق کا غم نہیں کرتے۔
- (2) مل کر کھاتے ہیں۔
- (3) لڑتے ہیں تو دل میں کینہ نہیں رکھتے۔
- (4) اپنے بڑوں سے ڈرتے ہیں۔
- (5) ذرا سی دھکیلے تو روتے ہیں۔
- (6) مستقل دشمنی نہیں کرتے۔

مرسلہ: ذی حادش۔ سحر

رکھنے کا اشارہ کیا۔

”تھاٹے چلو۔“ اس نے بانیے ہوئے دیکھنے والے کو کہا۔ رکشا مناسب رفتار سے چلتے دکھائی دے رہی تھی۔ آج کا وہ رشتے والے کو تیز چلنے کا کہے۔ ”شاید پولیس والوں نے اس کے بچے کو تلاش کر لیا ہو اور وہ معصوم تھاٹے میں رو رہا ہو۔“ کئی سی گھنٹے دوسرے خیال نے سہرا ہار۔ ”بھئی رشتے کو تو آہستہ چلنا چاہیے، شاید میرا شہزادہ راستے میں کہیں ہو اور رشتے کی تیز رفتاری کے سبب میں اسے نہ دیکھ سکوں۔“ نہیں، رشتے کو تیز چلنا چاہیے۔

وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ رکشا تھاٹے کے سامنے رگ گیا۔ کرایہ وے کر وہ جلدی جلدی اندر چلا گیا۔ وہ سیدھا جا کر بوئے مٹی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”سامیں! امیر سے بچے کی کوئی خبر ملی؟“ اس نے آس کی کھینک میں امید کا پتھر پھینکا۔ بڑے مٹی نے بڑی مونچھوں کو سر دھرتے ہوئے سر اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اس نے کہا۔ ”بیٹھو، بیٹھو، مبارک ہو۔“

بکھٹ گیا تو کیا تار کی جھٹکتی تھی۔ جیسے سورج، چاند، ستارے اور روشنی کے تمام وسیلے ایک رنگ روشن ہو گئے ہوں۔

”میں نے تو تمہارے گھر سہا سہی بھی جانتا تھا کہ یہ بچان کر اپنا بچہ لے جاؤ، سہا سہا تمہارے گھر پہنچ نہیں کیا؟“

”نہیں سامیں، لیکن کیا اس ہے وہ۔“ میرا بچہ کہاں ہے؟

”تو راجہ گرو، دو رو رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے کارو پر اپنے بچوں کے پاس بھیج دیا ہے۔“ بوئے مٹی نے بتایا پھر اس

کر گیا ہوش میں آگئی۔ ”ٹریاٹے تو بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے مضبوط مہارے بھی، کئی اچانک کمزور ہو سکتے ہیں، آج کے دن بچے کے کم ہو جانے کے بعد ٹریاٹے کے لیے یہ دوسرا بڑا سانحہ تھا۔ ازواج زندگی کے چھ برسوں کی مدت میں آج اس نے اپنے شوہر کو بالکل ایک نیا روپ دیکھا تھا۔ ٹوٹا ہوا تاج کا ایک نیا منظر جس نے اسے روح کی گہرائیوں تک چل کر رکھ دیا تھا۔ دفعتاً ٹریاٹے خود کو سمجھایا، وہ اپنا نیا زو پھیلا کر اسے اپنی آغوش میں لے کر بیوی۔“ تم بھی۔“ تم بھی اس طرح رو رہے ہو؟ پھر میرے بچے کو کون دھوئے گا۔ مجھے کون کھلی دے گا؟“

اس نے چہرہ اٹھا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا پھر اس کے سینے میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح مسکنے لگا۔ بالکل اس طرح جیسے کئی کئی اس کا چار سالہ بیٹا اس کے سینے میں منہ چھپا کر روتا تھا لیکن اب بیوی کے سینے میں چہرہ چھپا کر سکتے ہوئے روتے روتے اس کے حواس بحال ہونے لگے، چند لمحوں کے بعد وہ بیٹا ہوا چہرہ اٹھا کر بولا۔ ”میرے گھر ٹریاٹے میں تمہارے شہزادے کو تلاش کر کے لے آؤں گا۔ اسے ضرور لے آؤں گا۔“

ٹریاٹے اور اس کے لیے پانی کا گلاس بھرا لائی، اس نے دو مٹھوت کی گلاس فرسٹ پر رکھ دیا پھر اسے وجود کے منتشر حصوں کو سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ٹریاٹے دھیمی آواز میں دعا میں بات کرتی تھی۔

وہ پرامید اور متلاشی کیوں تھی اسے ابھر اُٹھ کر دیکھنا چاہتا تھا۔ بڑھ چلا جا رہا تھا۔ سڑک پر گزرتے والے تانکوں اور رکشوں پر بھی نظر ڈال رہا تھا۔ اس خیال کے تحت کہ شاید اس کا چاند نظر آجائے لیکن اسے ہرمت تاریکی نظر آ رہی تھی۔ اماں کی رات گئی تار کی۔

اچانک اس کے ذہن پر بے لگام اور منتشر خیالات نے دوبارہ بغاوت کر دی۔ ”رکشوں کے چار پہیے بھی تو ہو سکتے ہیں اگر آگے بھی دو پہیے لگے ہوئے ہوں تو کیا فرق پڑ جائے گا؟“ سائیکل ایک پیسے پر چلتی چاہیے اگر مہارادی ایک پیسے والی سائیکل چلا سکتا ہے تو دوسرے لوگ بھی چلا سکتے ہیں، ہم سب کو مہارادی ہونا چاہیے۔ ویسے بھی امہ مہارادی ہی تو ہیں۔ ہم اپنا قصا شاخو ہیں ہمارے والی بلفنگ کو اگر جڑ سے اکھاڑ کر الٹا رکھ دیا جائے تو تو بلا رنگ کے گھونٹلوں میں رہنے والے انسان ہاتھوں پر اٹے چلتے ہوئے خود ہی باہر نکل آ سکیں گے۔ اوہ۔“ اچانک وہ گھونٹوں کے بل سڑک پر آن کر اٹھ چلتے چلتے فٹ ہاتھ پر کی جڑ سے ٹھوکر لگی تھی۔ قریب سے گزرنے والے لوگ اسے چھٹی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ جلدی سے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور قریب سے گزرنے والے خالی رکشے کو

بھول کر حیرت اور خوف سے اعلان سننے لگے۔ ان کے کھلتے ہوئے پھول سے چہرے سر جھانکے۔ وہ سوچنے لگا۔ ”ممکن ہے ان بچوں میں سے کوئی میرے چالی کے ساتھ کھلا ہو۔“ ان معصوموں میں سے کسی نے میرے بچے کے ساتھ ہاتھ لگایا یا ماری ہوں۔“

دفعتاً اس کے دل میں آیا کہ وہ تانگے سے اتر کر ایک ایک بچے کو چوم لے، انہیں پیار کرے لیکن اس خیال سے وہ باز رہا کہ ممکن ہے بچے اس کے عمل سے ہراساں ہو جائیں۔ وہ خود پر جبر کے بیٹھارہا۔ اعلان مکمل ہوا تو تانگہ آگے بڑھنے لگا۔ بچے حیرت اور خوف سے تانگے کو چاٹنا ہوا دیکھتے رہے۔ معلوم ہوا تھا کہ اب وہ اپنا کھیل جاری نہیں رکھ سکیں گے، اسے انہوں نے ہونے لگا۔ اسے اپنے اندر طوفان مارتا تھا محسوس ہونے لگا۔

اس کا چار سالہ بچہ تانگے سے لاپتا تھا، گیارہ بچے اس نے تلاش شروع کی تھی اور دیکھتے تھے اسے جا کر یا قاعدہ رو پورٹ درج کرادی تھی پھر اس نے شہر بھر میں اعلان گراتا شروع کر دیا تھا۔ اب شام کے سات بج چکے تھے۔ اس دوران میں وہ دھیرے دھیرے جانے لگا کہ معلوم کیا گیا تھا لیکن بچے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

اعلان کرنے والے کی آواز بھی اب جواب دینے لگی تھی۔ ”وہ گردن گھما کر بولا۔ ”بھائی! اللہ سے امید رکھو۔ اکتاہٹ اللہ تمہارا بچہ مل جائے گا۔ تم نے پورے شہر میں اعلان کر دیا ہے۔“

پھر اس نے تانگے والے کو گھر واپس چلنے کا کہا۔ وہ جیسے ہی اپنے گھر کے سامنے پہنچے اسے اترا۔ اس کی پاپوں نگاہ اپنی بیوی پر پڑی جو دروازے سے کئی باہر جھانک رہی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی بیوی نے اس کے کندھے سے ہاتھ کر پوچھا۔ ”کہاں ہے میرا بچہ؟“ کہاں ہے۔؟ تم اسے کھلے رکھو آئے ہو؟“

وہ پانچوں کی طرح چپٹے گئی۔ پہلے تو وہ میرے کام لیتا رہا، سینے میں اٹھنے والے دریا کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب دریا میں طوفان اٹھ رہے ہوں تو مضبوط سے مضبوط انسان بھی اپنا جھنڈا کھینچتے ہیں۔ اس کے ضبط کے تمام بند زمین ٹوٹ گئے۔ وہ اپنی بیٹائی پر ہاتھ مار کر زمین پر بیٹھ گیا اور دھڑکیں مار مار کر روتے لگا۔ ”میں کیا کروں۔ کہاں سے لادوں اپنے جانی کو۔ کہاں تلاش کروں اسے۔ میری دنیا تباہ ہو گئی۔“

وہ سسکیوں میں بہتا چلا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حالات نے اسے مکمل طور پر شکست دے دی ہے۔ اس کی بیوی اس کے قریب بیٹھ گئی لیکن وہ اپنے شوہر کو اس طرح ٹوٹا ہوا دیکھ

وہ اچانک منتشر خیالات سے چونک کر ابھر اُٹھ کر کھینچے لگا۔ اس کی نگاہوں میں گلابی رنگ اٹک کر رہ گیا تھا۔ تانگہ کسی نامراد عاشق کی طرح آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اعلان کرنے والا چلتے ہوئے تانگے سے ریڈیو ٹانگہ لڑکھڑکی طرح رتنے ہوئے بھلے دہراتا رہا۔ ”ایک بچہ کم ہو گیا ہے۔“

وہ سوچتا رہا۔ ”میرا بچہ کون سے گم ہے۔ اس نے تاشا بھی کیا ہو گیا یا نہیں۔ اس تانگے کا کھڑا اس قدر آہستہ کیوں چل رہا ہے؟ اس وہابیات کھڑے کو سر جانا چاہیے۔ اس سر میں کھڑے کو گولی مار دینی چاہیے، بد بخت سے چلا ہی نہیں جاتا۔ اس نے تو مجھ سے شریعت بھی نہیں لی تھی۔“

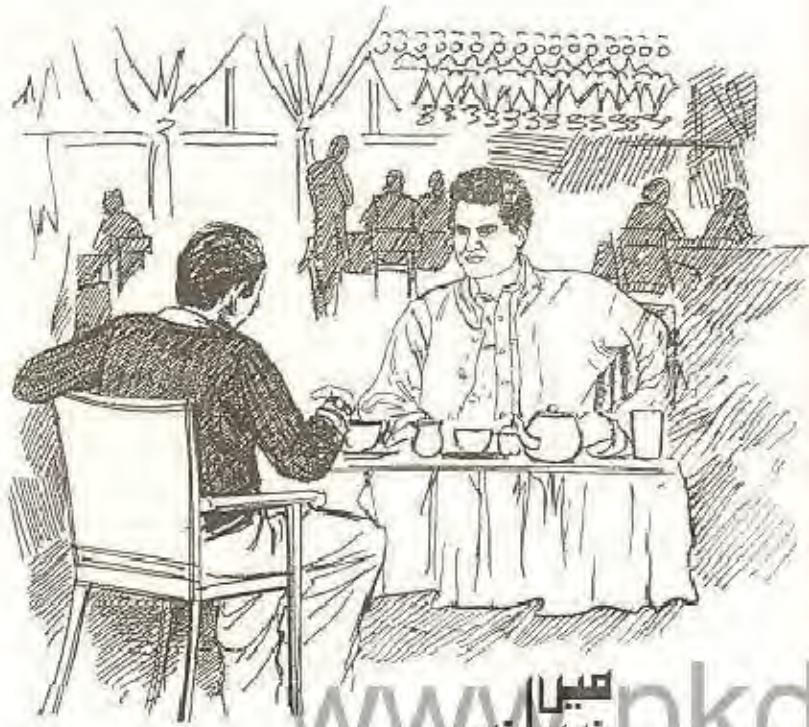
تا کچھ شہر کے ایک اہم چوراہے پر جا کر رگ گیا۔ اعلان کرنے والے کی زبان کا ٹیپ چلنا شروع ہو گیا۔ ”حضرات ایک ضروری اعلان سنئے۔ ایک بچہ کم ہو گیا ہے۔“

کچھلی بیٹ پر بیٹھا ہوا شخص بار بار چونک کر ابھر اُٹھ دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں چاروں طرف گردش کرنے لگیں۔ دفعتاً اس کی نگاہ گلابی رنگ پر جا کر اٹک گئی۔ کسی نے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے لیکن وہ گلابی کپڑے کسی چار سالہ بچے نے نہیں تھے جس برس کے نوجوان نے پہنے ہوئے تھے جو سڑک کے کنارے کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

تا کچھ کچھلی بیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ”وہابیات آدمی۔۔۔ اسے گلابی رنگ کے کپڑے پہننے کی کیا ضرورت تھی آخر؟“ وہ واہت نہیں کر سوتے لگا۔ ”اف۔۔۔ خدا یا ازراہ کیوں نہیں آ جاتا۔ میرے بچے، میرے لعل تم کہاں ہو؟“ اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلی۔ اس نے کوئی چیز خلق سے اتارنے کی کوشش کی لیکن اسے محسوس ہوا جیسے کوئی گولا اس کے ترخے میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کی گود میں گر گئے۔ اس نے گردن جھکا کر دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ دیے۔

تا کچھ دھیرے دھیرے چلتا رہا۔ اعلان مسلسل دہرایا جا رہا تھا، ایک جگہ سڑک کے قریب واقع پارک میں چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے خوب شوہر رہے تھے۔ اچانک وہ تانگے والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”کو۔۔۔ کو۔۔۔“ پھر وہ اسی غیر متوازن آواز میں اعلان کرنے والے سے بولا۔ ”ان بچوں کی طرف منہ کر کے اعلان کرو واپس ان بچوں نے میرے بچے کو دیکھا ہو۔“

اعلان کرنے والے نے چہرہ گھما کر اسے گھورا پھر وہ بچوں کی طرف منہ کر کے اعلان کرنے لگا۔ ایک بچے کے کم ہو جانے کا سن کر پارک میں کھیلنے والے معصوم بچے کسم گئے۔ وہ کھیلنا



میں تہ سناؤں

منظر اہام

اس دنیا میں ہٹ دھرم لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ اس کی سرپرست میں بھی یہی ایک خوبی بڑی نمایاں تھی جس کی بدولت دنیا جہاں کی دولت اس کے قدموں میں ڈھیر تھی مگر وہ پھر بھی مان کر تہ دیا۔ شکر کیا..... یہی تو ایک مسئلہ تھا جسے کوئی متوانا چاہتا تھا اور وہ مانتے کے لیے تیار نہ تھا

بے حس اور متاثر پرست معاشرے کی ایک ٹکڑی سی جھلک

وہ ایک مفلوک الحال آدمی تھا۔

میں نے اسے ایک معمولی سے ہوٹل میں چائے پیئے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی نگاہیں برابر والی میز پر تھیں۔ جہاں کچھ لوگ چائے کے ساتھ بیکٹ اور ایک دلچسپ فلم بھی کھا رہے تھے۔ اس مفلوک الحال کی نگاہیں ان بیکٹوں پر لگی ہوئی تھیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے پاس صرف چائے کے ہی پسے تھے۔

بیکٹ اور ایک دلچسپ فلم کھانے والوں کے درمیان اس بات

بند ہو گیا ہو۔
ایک سپاہی نے اس کے قریب آ کر سرگوشی کی۔ ”انعام کی رقم کہاں ہے؟“
”حاضر سائیں!“ اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو وہ پہری سے جیب میں لیے پھر رہا تھا۔“
لیکن پھر اس نے کہاں ہے؟“
سپاہی اسے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف لے گیا۔ ”تو یہاں ان کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر آئی۔“
”انعام رہا تو جارا حق ہے سائیں!“ سپاہی نے چلتے چلتے کہا۔ ”کیونکہ تمہارے بچے کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ ہم نے اسے برآمد کیا ہے۔“

”اغوا.....؟ اغوا کیا کیا تھا.....؟“ وہ بری طرح چونک گیا۔
اس کے خوشی سے مہکتے ہوئے چہرے پر دوسوں کا جال سا بھیل گیا۔ ”لیکن میں نے اغوا کیا تھا میرے بچے کو..... اور کیوں؟“
”وہ دیکھو۔“ سپاہی نے لاک اپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہے وہ شخص جس نے تمہارا بچہ اغوا کیا تھا۔“

لاک اپ کے فرش پر ایک ادیبو عمر..... شخص لیٹا ہوا کڑوا رہا تھا۔ وہ دونوں نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سلاخوں کے قریب چلے گئے۔ ان دونوں کے چہروں پر نظر پڑنے ہی سلاخوں کے پیچھے قیدی نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم اور چہرے پر پتھروں کے بے شمار نشانات تھے، بچے کو ماں کی آغوش میں دیکھ کر قیدی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر وہ اپنے مضروب جسم کو تھکیت کر سلاخوں کے قریب آیا، کافی جلد و ہمد کے بعد وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکا پھر وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

”بھائی! میں نے آپ کا بچہ دوپہر کے وقت بچانک کے پیچھے روتے ہوئے دیکھا تھا..... میں اسے اپنے ساتھ لے کر بہت بھگتا رہا لیکن اس کے وارثوں کا پتا معلوم نہیں ہوسکا..... آخر کار میں تھانے میں رپورٹ کرنے کے لیے یہاں پہنچا..... اور انہوں نے مجھے ہی بند کر دیا۔ ظالموں سے بہت مارا ہے۔ آ..... آ.....“

قیدی ایک لمبے کے لیے خاموش ہوا۔ اس نے پھٹے ہوئے ہونٹ پر زبان پھیری اور تھرا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر شفقت کی چاندنی بھیل گئی۔ ”بھئی! مبارک ہو..... تمہارا بچہ تمہیں مل گیا..... مم..... میرے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں بھئی.....“



نے ہاتھ لگائی۔ ”اگو..... اڑے ادا کو!“
”میں بعد کے بعد پوئل کا جن آن حاضر ہوا۔“ جی سائیں!“
”اڑے جاؤ، میرے گھر سے مالک کو لے آؤ۔“
”حاضر سائیں!“ پوئل صاحبی اکبر جانے لگا تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ بڑے شکی نے قدرے تیزی سے کہا۔ ”اتنی جلدی مت کرو پیارے، آرام سے میرے سامنے بیٹھو۔“
”میں آجائے گا تمہارا بچہ۔“
سپاہی کے جانے کے بعد وہ بچپن سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے ٹرنے والا ہر لمحہ صدی کی طرح پھیلتا ہوا عموں محسوس ہونے لگا۔ گویا کائنات ساکت ہو گئی تھی، اچانک تھرا ایک سپاہی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ آتے ہی کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظر شوہر پر بھی پڑی لیکن اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔

”کہاں سے میرا شہزادہ؟“ اس کے ہونٹوں سے جھج سی نکلی۔ وہ بھلی سی جھج اپنے اندر صدیوں کا کرب سموئے ہوئے تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چوٹی کا بازو وقام کر اسے اپنے قریب شہج پر بٹھالیا۔ ”ابھی آ رہا ہے.....“ اس نے تھرا کو نکلی دی۔ ”یہ شکی صاحب نے اسے اپنے کمرے کھینچ دیا تھا۔ سپاہی اسے لینے گیا ہے۔“

تھرا کی آنکھوں میں یکا یک کئی دے روشن ہو گئے۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم بھی یہاں پتا کرنے ضرور آئے ہو گے لیکن جیسے ہی سپاہی پیغام لے کر آیا تو مجھ سے رہا نہیں گیا اور چلی آئی۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں کی بے چینی نگاہیں دروازے پر گڑھی تھیں۔ اس دروازے پر چہاں سے چند لمحوں کے بعد زندگی کی نئی ہوائیں چلنے والی تھیں۔ اچانک سپاہی کمرے میں داخل ہوا۔ ساکت کائنات میں گویا جان پڑ گئی۔ سپاہی کی گود میں ان کی زندگی کی کائنات کا روشن اور جھمکا ہوا چاند تھا۔ وہ دونوں بیک وقت اٹھے اور سپاہی کی طرف لپکے، بچے ماں باپ کو دیکھ کر خوشی سے روتے لگے۔ دونوں کے چادر ہاتھ ایک ساتھ بچے سے لپٹ گئے۔ دونوں ایک ہی وقت میں اپنے بچے کو گلے سے لگنا چاہتے تھے۔

کچھ دیر کے بعد اس نے بچہ تھرا کے حوالے کر دیا اور تھرا اسے اپنے سینے سے لپٹا کر چومنے لگی۔

”سائیں! آپ کے بڑے احسان ہیں ہم پر.....“ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے شکی سے کہا۔ ”کوشش کے باوجود وہ تھرا کے کچھ نہ بول سکا۔ گویا حلق سے نکلنے والے الفاظ کا راست

پر بھرت پھڑی ہوئی تھی کہ اس دریا میں جنوں کا وجود ہے یا نہیں۔
میں نے دیکھا کہ وہ مفلوک الحال ان کی باتوں میں
بھی دلچسپی لے رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک خطرہ سی
مسکراہٹ بھی تھی۔
میں اس مفلوک الحال کے برابر والی خالی کرسی پر بیٹھ
گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لیے ہوئے اپنی چائے کی پیالی
اٹھائی۔ اس کی حالت پر مجھے ہنسنے سے روکنا تھا۔ کچھ سوچ کر
میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”بھائی جان، یہ لوگ کیا بحث کر رہے
ہیں۔“ میرا اشارہ برابری میز والوں کی طرف تھا۔
”ارے سب بے کار کی باتیں ہیں۔“ مفلوک الحال
نے کہا۔ ”بھلا بتاؤ، اس دور میں جن وغیرہ کہاں ہوتے ہیں۔“
”نہیں بھائی ایسی بات نہیں ہے۔ ہر دور میں ہوتے ہیں۔“
”میں نہیں مانتا۔“ اس نے زور سے اپنی گردن کو جھٹکا
دیا۔ ”میرے پاس ایسی باتوں کو ماننے کا وقت ہی نہیں ہے۔“
”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ تم ایک چٹائی کو جھٹلانے کی
کوشش کر رہے ہو۔“
”رہے دو بھائی۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔ ”بہت
سنی ہیں ایسی باتیں۔ مجھے تو آج تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔“
اسی دور میں ہوا آؤر دلیے میرے پاس آگیا تھا۔ میں
نے اس ٹیکل پر آنے سے پہلے اسے چائے اور ٹیک وغیرہ کا
آؤر دے دیا تھا۔ پھر میں نے اس مفلوک الحال سے کہا۔
”بھائی۔ برائے مانو تو ایک بات کہوں۔“
”ہاں کہیے۔“
”میں نے ٹیک وغیرہ منگوا لیے ہیں۔ تمہیں بھی میرا
ساتھ دینا ہوگا۔“
وہ اپنے ہونٹوں پر زبان بھیرنے لگا، یعنی وہ بے چارا
واقعی بھوکا تھا۔ میرا مطلب یہ چیزیں لے آیا تھا اور مجھ سے زیادہ
اسی مفلوک الحال نے کھایا تھا۔ کھانے کے دوران ہم ادھر
ادھر کی باتیں بھی کرتے رہے تھے۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“
میں نے اس سے پوچھا۔
”شاید کہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”اور تمہارا؟“
”فرطوس۔“
”فرطوس؟“ اس نے حیرت سے دہرایا۔ ”یہ کیا نام ہوا۔“
”یہ ایک یونانی نام ہے۔ میرے گیارہ اجداد یونان
سے آئے تھے۔ اس لیے میرے خاندان والوں کو اس قسم کے
نام رکھنے کا جنون ہے۔“
”عجب بات ہے۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”ویسے نام ہے
مزیدار۔“

”تم کرتے کیا ہو۔“ میرا مطلب ہے کیا کام کرتے
ہو؟“ میں نے دریافت کیا۔
”کام ہی تو کوئی نہیں ہے میرے پاس۔“ اس نے
ایک گہری سانس لی۔ ”کچھ بھی نہیں ہے، بس دن بھر کام کی
تلاش میں رہتا ہوں اور رات ہوئی ہے تو اپنی کوٹھری میں جا کر
سو جاتا ہوں۔ آج میری جیب میں صرف دس روپے تھے،
جن سے میں نے یہ چائے پی لی ہے، بس اس کے علاوہ اور
کچھ نہیں ہے۔“
”تمہاری چائے کے پیے بھی میں دے دوں گا۔“
”ارے نہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”کیوں اتنی
مہربانی کر رہے ہو۔“
”اس لیے کہ تم مجھے اچھے لگے ہو۔“ میں نے کہا۔
”بات یہ ہے بھائی کہ میں اس شہر میں آگیا ہوں، کسی دوست
کی تلاش میں بیٹھ کر رہا ہوں۔“ میں دیکھا تو دل چاہا کہ تمہیں
اپنا دوست بتا دوں۔“
”چلو، اس میں کوئی نقصان والی بات نہیں ہے۔“ وہ
بے نیازی سے بولا۔ ”تم میرے دوست بن گئے۔“
”تم رہتے کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”رہتا کہاں ہے۔ بزرگالا میں ہزار روپے مہینے پر
ایک کوٹھری لے رکھی ہے، اسی میں وقت گزارنے کی کوشش
کرتا رہتا ہوں۔“
”کیا میں تمہارے ساتھ تمہاری کوٹھری تک چل سکتا ہوں۔“
”تم؟“ اس نے پھر حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔
پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”چلو تم بھی کیا یاد کرو گے۔“
میں نے پیسے ادا کیے اور اس کے ساتھ اس کوٹھری میں
آگیا جس میں وہ رہا کرتا تھا۔ اس کوٹھری کی حالت خود اسی کی
طرح خستہ تھی۔
صرف ایک چار پائی، ایک کونے میں مٹی کے تیل کا
ایک چولہا، جس کے ساتھ کچھ برتن۔ ایک کڑی اور ایک چھوٹی
سی میز کے علاوہ یہاں اور کچھ نہیں تھا۔ ”میں بھائی فرطوس۔“
اس نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں ہے میری
کل کائنات۔ اگر تم کو تو میں تمہارے لیے چائے بنا دوں۔“
”ضرور بناؤ۔“
”لیکن معاف کرنا۔ یہ چائے ذرا چائنی اسٹائل کی
ہوگی۔“ اس نے بتایا۔
”یہ چائنی اسٹائل کی چائے کیا ہوتی ہے؟“
”یعنی جس میں دو دو اور شکر وغیرہ نہ ہو۔“ اس نے
بتایا۔ ”کیونکہ میرے پاس ایسی عیاشیوں کے لیے پیسے ہی

نہیں ہوتے۔ اس لیے صرف چائے کی پیچ خرید لیتا ہوں اور
چائے کچھ کر اسی کو پیتا رہتا ہوں۔“
”کوئی بات نہیں، مجھے بھی ہر قسم کی چائے پینے کی
عادت ہے۔“
”پھر تو میں ابھی چائے بنا دیتا ہوں۔“
اس نے چائے بنا دی۔ یہ اس کا حوصلہ تھا کہ وہ ایسی
بد مزہ اور کڑی چائے بنا کر رہا تھا۔
”یار شاہد نہیں ہاں ہے۔ ہونٹ والے ہندے کس بات پر
بحث کر رہے تھے۔“ میں نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے پوچھا۔
”ہاں یاد ہے۔“ اس نے براسمانہ بتایا۔ ”وہ بے وقوف
اس بات پر اٹھے ہوئے تھے کہ جنوں کا وجود ہے یا نہیں۔“
”تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“
”مجھے کچھ ہے کہ میں ایسی چیزوں کو نہیں مانتا۔“ اس
نے کہا۔ ”میرا اعتقاد ہی نہیں ہے۔“
”اگر میں یہ کہوں کہ میں ایک جن ہوں تو پھر تمہارا کیا
ری ایکشن ہوگا؟“
”جائے دے یار، کوئی اور بات کر۔“
”میں کچھ کہہ رہا ہوں، میں جن ہوں۔“ میں نے کہا۔
”میں نہیں مانتا بھائی۔ چاہے تم کچھ بھی کہتے رہو۔“
”اچھا تو پھر میں غائب ہو کر دکھاتا ہوں۔“ میں نے
کہا۔ اور اس کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ اس
منٹ کے بعد میں پھر اس کے سامنے حاضر ہو گیا۔ ”ہاں، اب
بتاؤ، اب کیا کہتے ہو۔“
”میں نے کہا تھا کہ میں نہیں مانتا۔“
”کیا؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
”تم پاگل تو نہیں ہو؟“
”ارے بھی، آج کل سائنس کا زمانہ ہے۔“ وہ مسکرا
کر بولا۔ ”سائنس کو ہی بہت ایڈوائس ہو گئی ہے۔ انسان نہ
جانے کیا کیا کرنے لگا ہے، اس لیے تم نے کوئی خاص کام نہ
نہیں کیا ہے۔“
”غیب آدی تھا، میرے اتنے واضح ثبوت دینے کے
بعد بھی مان کر نہیں دے رہا تھا۔“ اچھا۔ اب اگر میں تمہاری
حالت تبدیل کر دوں تو؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس وقت تم کیا
کہو گے؟“
”وہ ایک دوسری بات ہوگی۔ اس وقت میں سوچوں گا۔“
”تو پھر اپنی آنکھیں بند کر لو اور جب میں کہوں اس
وقت کھول دینا۔“
پندرہ منٹ کے بعد میں نے اس سے کہا کہ دو اپنی

آنکھیں کھول لے۔ اس نے جب آنکھیں کھولیں تو سب کچھ
بدل چکا تھا۔ اس کے جسم پر اب ایک مناسب لباس تھا۔ وہ
اپنی کوٹھری کے بجائے ایک فلیٹ میں تھا۔ تین کمرے کا ایک
خوبصورت سا فلیٹ، جس میں فرنیچر بھی تھا اور ایک ٹی وی
بھی، غرضیکہ وہ سب کچھ تھا جو اس قسم کے کسی پارٹمنٹ میں
ہو سکتا ہے۔ وہ بہت حیران ہو کر ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ ”یہ میں
کیاں آگیا؟“ اس نے پوچھا۔
”اب یہ فلیٹ تمہارا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا مارا
فرنیچر یعنی ہر چیز تمہاری ہے اور تمہارے پاس اتنی رقم بھی ہے
کہ تم کوئی چھوٹی موٹی دکان کھول سکو۔“
”اور وہ رقم کہاں ہے؟“
”سامنے والی میز کے دروازے۔“ میں نے اشارہ کیا۔
”چار لاکھ روپے رکھے ہوئے ہیں۔ جو تمہارے ہیں۔“
”تمہارا بہت بہت شکر ہے بھائی۔“
”شکر یہ تو ہے لیکن اب تم کیا کہتے ہو؟“
”بھئی، کچھ تو یہ ہے کہ میں اب بھی نہیں مانتا۔“ اس
نے کہا۔
”کیا؟“ اس کا ہوتا میرا دماغ ہی ہٹا گیا۔ دل چاہا اس
کے کمرے کے کچھ ہی محنت کا گواہی محنت دوں۔ ”اتنا سب کچھ ہونے کے
باوجود تو میں یقین نہیں کر پاؤں؟“
”نہیں بھائی، میرا مزاج ذرا دوسرا ہے۔“ اس نے کہا۔
”اس قسم کی ٹیکنالوجی اب عام ہو گئی ہے، اس کے علاوہ بعض
شعبہ باز بھی اس قسم کا تماشہ دکھا دیتے ہیں، کیا کہتے ہیں
اسے نظر بندی، کچھ دنوں کے بعد چائے سامنے آ جاتی ہے۔“
”لیکن یہ نظر بندی نہیں ہے۔“
”میں نے کہا تھا کہ میں نہیں مانتا۔ ہاں اس کا اثر کچھ
دنوں تک قائم رہ جائے تو پھر سوچنا چاہتا ہوں۔“
”تمہیک ہے، اب میں تمہارے پاس دو مہینوں کے
بعد آؤں گا۔ اس وقت تک تو نظر بندی باقی نہیں رہے گی نا۔“
”چلو کچھ لیتے ہیں۔“
میں اس شخص کو دل میں برا بھلا کہتا ہوا واپس
آگیا۔ کچھ جنت کی طرح ہانکے ہی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن وہ
مہینوں کے بعد تو اسے مان ہی لینا پڑا۔
میں جب دو مہینوں کے بعد بیٹھا تو پتا چلا اس نے اسی
محلے میں ایک چھوٹی سی دکان کر لی تھی اور اس کی دوکان انچھی
خاصی چل رہی تھی۔ اس نے اپنی مدد کے لیے ایک ملازم بھی
رکھ لیا تھا۔ میں جب اس کے پاس پہنچا تو اس وقت وہ ایک
عورت سے جھگڑا کرتے میں مصروف تھا۔ ”نہیں اماں۔ اب

اس سے زیادہ کم نہیں کر سکتا۔ ایک تو آپ کو ایسے ہی سستا دے رہا ہوں۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”ہاں، جی، اب چھپیں کیا چاہیے؟“

”تم نے مجھے نہیں پہچانا، میں فرطوں ہوں۔“
”اوہ۔“ وہ جس بڑا، معاف کردہ تیار، مصروفیت ہی ایسی ہے، تم لایا کرو، دو بھٹے بعد ملوں، میں دکان بند کر کے تم سے ملتا ہوں۔“

وہ ٹھنڈوں کے بعد جب وہ میرے پاس آیا تو ہم ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ اس بار اس نے میرے لیے چائے اور کیک وغیرہ کا آرڈر دیا تھا۔ ”ہاں اب بتاؤ، کام کیا چل رہا ہے۔“

”اوپر والے کی مہربانی ہے بھائی، سب ٹھیک چارہا ہے۔“ اس نے کہا۔

”اب تو مان لیا یا کہ یہ نظر بدی نہیں ہے بلکہ میں واقعی جن ہوں۔“

”نہیں بھائی، برا مت ماننا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا۔“
”کیا بگو اس کر رہے ہو؟“ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ ”اب کیسا ثبوت چاہیے تمہیں۔“

”دیکھو بھائی، میں ذرا آدمی دوسری قسم کا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”آسانی سے مطمئن نہیں ہوتا، بلکہ سیکھا ہی نہیں ہے۔“
”ہی تو پوچھ رہا ہوں کہ اب کیسے ثبوت کی ضرورت ہے۔“
”دیکھو یارہ، ویسے تو سب ٹھیک چل رہا ہے، لیکن ایک پریشانی بھی ہے، جھوک مارکیٹ سے سودا لینے کے لیے میں خود ہی جاتا ہوں۔ گاڑی وغیرہ کی اتنی دشواری ہوتی ہے کہ اس بچھمت پوچھو۔ میں نے پرسوں ایک سوزوکی کی قیمت معلوم کی ہے۔ کم بہت چار لاکھ بتا رہا ہے، اگر کسی طرح دو سوزوکی آجائے تو پھر میری پریشانی ختم ہو جائے گی۔“

”اس کے بعد تو ان لوگوں کے پاس میں کون ہوں؟“
”ہاں۔ اس کے بعد میں واقعی پوری پیچیدگی سے غور کروں گا۔“

میں تھلا کر رہ گیا تھا۔ پھر میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے، اپنی جیب میں دیکھ لو، چار لاکھ روپے دیکھے ہوئے ہیں۔“

اس نے اسی وقت اپنی جیب سے نوٹوں کی گٹری نکالی اور تنہی کرتے دکھائی کرتے گئے بعد اس نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”بہت بہت شکر ہے تم نے میری ایک پراپرٹی مل کر دی۔“

”تو اب کیا کہتے ہو؟“
”ابھی نہیں بھائی، ابھی تو سوزوکی چلا کر دیکھ لوں۔“

پتے پر وہ مجھے ہٹے جا رہے تھے کہ یہ نظر بدی ہے یا کیا ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ میں غصے سے بنگارنے لگا تھا۔ ”میں اب تمہارے پاس نہیں دوںوں کے بعد ہی آؤں گا۔“

میں دوںوں کے بعد پہنچا تو اس نے سوزوکی بھی خرید لی تھی اور ایک ڈرائیور بھی رکھا ہوا تھا۔ ”یار تم واقعی بہت زبردست چیز ہو۔“ اس نے کہا۔

”میں پتہ نہیں ہوں، جن ہوں۔“
”یہ تو تم خود کہہ رہے ہو نا، جگہ میں نہیں مانتا۔“
اب صورت حال میری برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔

میں نے جھلا کر اس کا گریبان تھام لیا۔ ”پاکل انسان، اب کیوں نہیں مان رہا؟“
”یار یہ بھی کوئی زندگی ہے جو میں گزار رہا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”رات دن سخت کرتے رہو، اس کام میں آج کل بچت ہی کہاں ہوتی ہے۔“
”پھر تو کیا چاہتا ہے؟“

”ہاں۔ کوئی بڑا سپرائسور ہو تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ آرام سے کاؤنٹر پر بیٹھے رہو۔ صاف ستھرا ماحول، کئی ملازم کام میں لگے ہوئے ہوں، مختصات کی زندگی، یہ سب ہو تو پھر میں تمہارے بارے میں سوچ مکتا ہوں۔“

”چل، یہ بھی ہو جائے گا۔“ اس کے بعد تو سونے کے لیے جیت ہمارے چلے گئے۔ اس نے کہا۔ ”لیکن ٹھیک بات یاد رکھو، کوئی بڑے سپرائسور کا مالک ایسے معمولی سے فلیٹ میں نہیں رہے گا۔ اس کے پاس فلیٹ بھی اچھا ہوتا چاہیے اور خارجہ اس کے ساتھ گاڑی بھی اچھی ہوگی۔“

”چل، تو بھی کیا یاد کرے گا، تیری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔“

اس کی یہ دونوں خواہشیں بھی پوری ہوئیں۔ بہت زبردست سپرائسور تھا اس کا جس کا نام بھی اس نے انگریزی میں رکھا تھا۔ ”ہارکیز“ اور اس کے پاس ایک شاندار گاڑی بھی آ گئی تھی۔

اس بار وہ مجھے دیکھ کر مجھ سے لپٹ ہی پڑا تھا۔ ”یار، میں زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں، تم نے تو میری قسمت ہی بدل دی ہے، میں نے ایسی چیزوں کا صرف تصور ہی کیا تھا۔“

”چلو، اب تو یقین آ گیا نا کہ میں جن ہوں۔“
”نہیں یار وہ معاملہ دوسرا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے اب بھی یقین نہیں آیا ہے۔“

”حق انسان، تجھے یقین دلانے کے لیے کیا میں آسمان سے لنگ جاؤں، زمین چھاڑ دوں، بتا کر کیا کروں؟“

”مجھے اپنے ایک دوست سے مشورہ کر لینے دو۔“ اس نے کہا۔

”کیوں، وہ کیا کر لے گا؟“ میں نے پوچھا۔
”وہ بہت عقل مند انسان ہے اور جنوں کے بارے میں اس کی معلومات بہت زبردست ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”ٹھیک ہے، تو اس سے مشورہ کر لے، ساری صورت حال بتا دینا اس کو۔“

”خفا رہے، اس سے کیا چاہتا۔“
”تو پھر میں کب آؤں تمہارے پاس۔“
کم از کم ایک مہینے کے بعد کیونکہ وہ کہیں دورے پر گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی کے بعد ہی صورت حال واضح ہوئی۔

ابھی میں بکھینک رہا تھا۔
”ٹھیک ہے، میں ایک مہینے کے بعد آ رہا ہوں۔“
ایک مہینے کے بعد اس کے پاس پہنچا تو اس نے بتایا۔

”ہاں یار، دوست سے ملاقات ہو گئی اور میں نے اس سے مشورہ بھی لے لیا۔“
”کیا کہا اس نے؟“

”اس نے کہا کہ یہ سب کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس کی بنیاد پر کسی کو یقین کیجھ لیا جائے۔ یہ سب تو معمولی کرشمے ہیں، اصل کام تو یہ ہے کہ تم مجھ سے کہو میں کوئی عہدہ دار ہوں۔“

”میں تمہارا کون سا عہدہ دوں گا؟“ میں بھٹکا تھا۔ ”سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے، اس کے باوجود تم مان کر نہیں دے رہے، اب اس سے زیادہ ہٹ دھرمی اور کیا ہوگی۔“
”ختم کر کے کوئی عہدہ دلا دو۔ پھر سوچوں گا۔“

”اچھا نا ظف انسان، یہ جا عہدے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔“
”ایکشن آنے والے ہیں، ایکشن میں کامیابی دلا دو۔“

اس نے کہا۔ ”میں آزاد امیدوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔“
”ٹھیک ہے، تو اپنی یہ حسرت بھی پوری کر لے۔“

اس نے اس بار جو کام بتایا تھا۔ اس میں جن ہونے کے باوجود مجھے ابھی خاصی محنت کرنا پڑی تھی۔ اس کے لیے ایکشن کی مہم چلا تا۔ اس کو اس قابل کرنا کہ وہ زوردار تقریریں کر سکے۔ پھر لوگوں کے ذہنوں کو اس طرف راغب کرنا کہ وہ صرف اسی کو ووٹ دیں۔

اس کے لیے اخبار میں خبریں شائع کروانا۔ غرضیکہ اس کی طرف سے مجھے ابھی خاصی محنت کرنی پڑی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انتخابی شاندار طور پر کامیاب ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے مخالفین کو ہزاروں ووٹوں سے شکست

دی تھی۔ بڑے بڑے بغاوری پیکر اکبرہ گئے تھے کہ آخر یہ کیا ہو گیا کسی کو بھی اس کی کامیابی کی توقع نہیں تھی، لیکن اس نے جیت کر ایک مثال قائم کر دی تھی۔

پھر حال ہی حکومت بنی اور اسے ایک انتہائی اہم وزارت بھی مل گئی۔ یعنی اس کی عہدے والی شرط بھی پوری ہو گئی تھی۔

جب یہ سب ہو چکا تو میں اس کے پاس پہنچ گیا۔
”ہاں، اب بتاؤ، اب کیا کہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں یارہ،“ وہ اپنا سر کھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ میرے ساتھ یہ سب کچھ ہو گیا ہے، لیکن میں تمہیں اب بھی جن حلیم نہیں کر سکتا۔“

”بے وقوف نالائق، بد معاش، دھوکے باز۔“ میں اس پر برس پڑا تھا۔ ”اب اور کیا کی رہ گئی ہے، کیا چاہتا ہے تو؟“
”ہاں ایک بات ہے۔ اگر تم وہ پوری کرو تو پھر میں تمہیں جن مان لوں گا۔“

”بھل، وہ بات بھی بتا دے۔“
”تم آئندہ سے اگر میرے سامنے نہ آئے تو پھر میں تمہیں جن مان لوں گا۔“

”کچھ کہہ رہے ہو؟“
”پاکل جی!“

”ٹھیک ہے، پھر میں کبھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔“
اور میں پھر اس کے سامنے نہیں گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اب اس نے مجھے جس قسم تسلیم کر لیا ہو، میں نے یہ بات جب اپنے استاد جن کو بتائی تو وہ سر پیٹنے لگا۔ ”بے وقوف، اس آدمی نے تجھے بے وقوف بنایا ہے کیونکہ یہ اس طرح سے ترقی کرنے والوں کی پرانی پرکھش ہے۔“

”کیا مطلب استاد؟“
”تو جا کر دیکھ، یہ جو بڑے بڑے صنعت کار، لیڈر سیاست دان ہیں۔ انہوں نے کس طرح ترقی کی ہے، ان سبوں کے پیچھے کوئی نہ کوئی جن ضرور ہوتا ہے۔ چاہے وہ ان کا استاد ہو۔ ان کے والدین ہوں، کوئی دوست ہو، بیوی ہو، کوئی بھی ہو اور جب ترقی کر جاتے ہیں تو پھر ”میں نہ مانوں“ بن جاتے ہیں۔ انہیں مانتے کسی کا احسان بلکہ انتہا ہے کہ یہ اپنے خدا کا احسان بھی نہیں مانتے۔ جس نے انہیں زندگی دی، بولنا اور چلنا سکھایا، جب یہ اس کا احسان نہیں مانتے تو پھر تو کس حکیت کی مولیٰ ہے۔ ہر دار آئندہ سے لایا تج پر مت کرنا۔ ورنہ پیشہ دہی رہے گا۔“

اس نے کہا۔ ”میں آزاد امیدوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔“
”ٹھیک ہے، تو اپنی یہ حسرت بھی پوری کر لے۔“

اس نے اس بار جو کام بتایا تھا۔ اس میں جن ہونے کے باوجود مجھے ابھی خاصی محنت کرنا پڑی تھی۔ اس کے لیے ایکشن کی مہم چلا تا۔ اس کو اس قابل کرنا کہ وہ زوردار تقریریں کر سکے۔ پھر لوگوں کے ذہنوں کو اس طرف راغب کرنا کہ وہ صرف اسی کو ووٹ دیں۔

اس کے لیے اخبار میں خبریں شائع کروانا۔ غرضیکہ اس کی طرف سے مجھے ابھی خاصی محنت کرنی پڑی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انتخابی شاندار طور پر کامیاب ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے مخالفین کو ہزاروں ووٹوں سے شکست

مکمل شعرو سنو

✽ معید الظفر صدیقی.....کراچی
یہ جیتی جاتی ہستی ہوئی کھنڈر کیے
ہوا یکبیر حنی تیرے میرے گھر کیے
جنہیں تھا زعم بہت اسے ہوش و دانش پر
بھٹکتے رہ گئے وہ لوگ عمر بھر کیے

✽ جنید احمد ملک.....کراچی
کتنی دیر لگائی میں نے بکڑے کام بنانے میں
بیت گئے ہیں کئی زمانے جا کر واپس آنے میں

✽ محمد قاسم.....خوشاب
مجھ میں بے لوث محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
تم اگر چاہو تو میری سوچوں کی تلاشی لے لو

✽ ✽ ✽ ✽ ✽

✽ مائیں قاضی.....اداکشاہ
یہ رکھ رکھاؤ محبت سکھائی اس کو
وہ روکھ کر بھی مجھے ہنسنے لگا ہے

✽ مظہر.....قلندہ
مرے قریب جو آیا، وہ ڈوب جائے گا
اہل رہے ہیں میرے درد کے چناب ابھی

✽ صوبیدار (ر) انوار بخش.....بلیر چھاؤنی
قلم کے ماتھے پہ پھر ابھری ہے اک تازہ شکن
پھر کوئی دنیا میں غوثی انقلاب آنے کو ہے

✽ یاسکون اسمن کو ڈس لے گی ناگن، ظلم کی
یا کہ پھر انسانیت پر اک شباب آنے کو ہے

✽ ظہور احمد فارغ.....قونہ شریف
ہمارے پیار کی دنیا مثال دینے لگی
یہ خوف ہے کہ جہاں کی اسے نظر نہ لگے

✽ سہمی جو سونے لگوں میں تو یہ دعا مانگوں
بڑی طلب میں مری آنکھ تا سحر نہ لگے

✽ ظفر عباس زیدی.....بھوآند
تراپہ نے اس خیال سے تسبیح ہی توڑ دی
کیا گن گن کے اس کا نام لوں جو بے حساب دے

✽ چوہدری مقبول احمد.....جملہ جٹاں والا
کبھی ہوتی تھی تیرے لیے جس دل میں محبت
دل آج بھی وہی ہے مگر پہلہ جیسی وفا نہیں

✽ حسین عباس بلوچ.....ڈسٹرکٹ ہل سرگودھا
بیاوردہ اور میرے دل میں بڑھا دیتا ہے
بھی روتا ہے بھی مجھ کو کرا دیتا ہے

✽ میرا چاند میری آنکھوں سے اوجھل ہو کر
اک ستارہ میری آنکھوں میں سجا دیتا ہے

✽ عبداللطیف شام.....مرشد آباد پشاور
اس شخص کے چہرے کی اداسی کو تو دیکھو
لگتا ہے کہ مدت سے وہ رویا ہی نہیں ہے

✽ ایم افضل انصاری.....ڈنگہ شہر
ملے نہ تجھے ردِ کندگی میں
پھول کی طرح تو جسکے خدا کرے

✽ زعمہ رہے نام اب تک تیرا
عید کی خوشیاں مبارک تجھے خدا کرے

✽ اشتاق شاہین.....کھارادر، کراچی
ہماری رات کے جنگل میں آگ پھیلی ہے
بجھا نہ پاؤ تو جلنے کا حوصلہ رکھنا

✽ رقیہ تنویر.....کراچی

اس سمندر میں طوفان بڑے آتے ہیں
اس کے ساحل پہ گھر بنانے کی خد نہ کر

✽ عبدالغفور خان خٹک.....چھب ضلع ایک
بے وفا کہنے کی جرات بھی نہ کرنا اس کو جی
اس نے اقرار کیا کب تھا مسکرا نہ کیا

✽ کرن ایوب.....نارتھ کراچی
مدتوں کے بعد تم نے رخ کیا اس کی طرف
کیا یہی تھا آئینے کے ٹوٹ جانے کا سبب

✽ جعفر حسین.....ضلع چنیوٹ
وہ بھی کیا عجیب شخص تھا کہ جس کی ذات پر محسن
جب اعتبار بڑھ گیا تو اختیار نہ رہا

✽ شبیر ناقد.....ڈیرہ غازی خان
تو ہی میری زندگی کا راز ہے
تو ہی میری بے خودی کا ساز ہے

✽ محمد عقیل چھٹہ.....حافظ آباد
وہی اصل مکان و لامکان ہے
مکان کیا شے ہے؟ انداز بیاں ہے

✽ اختر مہدی.....کراچی
خضر کیوں کر بتائے، کیا بتائے
اگر مہدی کہے دیا کیاں ہے

✽ راجیل نواب.....ملتان
اب تو کچھ غیر سا لگنے لگا تیرا غم بھی
دیکھ مایوس ہوئے جانتے ہیں کتنے ہم بھی

✽ لبنی کنول.....دادہ
ہمدردیاں، خلوص، دلا سے، تسلیاں
دل ٹوٹنے کے بعد تماشے بہت ہوئے

✽ چاگیر اسلم نونل.....ڈسٹرکٹ ہل، منڈی بہاؤ الدین
وہ آنکھیں دیواریں مٹتی رتی ہیں
ان آنکھوں میں شاید کوئی قصہ ہے

✽ محمد اشتاق سیال.....شکوہ کوٹ شہی
اس کے ہاتھوں سے جو خوشبوئے حنا آتی ہے
ایسا لگتا ہے کہ جنت سے ہوا آتی ہے

✽ جمشید مسٹر.....منڈی صادق
جس بڑھ جائے تو مینائی چلی جاتی ہے

کھڑکیاں کھول کے رکھ تازہ ہوا آتے دے
تیرے روکے سے وہ بد عہد کہاں رکستا ہے؟

✽ محمد احمد.....ملتان
یادوں چھوٹنے سے تو بہتر ہے اسے جانے دے

✽ الطیر حسین.....کراچی
تجھ کو پا کر بھول گئے ہیں اسے آپ کا کھونا بھی
اب کیا اپنا ہونا بھی اور کیا نہ ہونا بھی

✽ نیفیس بی جب خوب ہوئی ہوں کیسے دن اور کی رات
کروٹ کروٹ آگ لگے ہے اپنا نرم چھوڑا بھی

✽ شازیہ بتول.....سکھر
کسی ہوئی کلیاں ہیں سر شاخ تمنا
نیفیس ہوئی قبروں کے مناظر ہیں نظر میں

✽ محمد قانز.....اردو بازار، کراچی
تمہاری بزم سے میں بے خودی کے عالم میں
جو اٹھ گیا تو اجالوں نے راستہ نہ دیا

✽ عالیہ رزاق.....لاہور
جو دن ڈھلا تو گرا شام کے اندھروں میں
پس سحر جو گزری دھوپ کا مسافر تھا

✽ انیسہ محمد.....سیالکوٹ
پیڑوں کو درکار تو ہے ہریالی مٹی
لیکن کہاں سے لائے بوڑھا مالی مٹی

✽ بنیادوں میں چھپا ہوا بیضا ہے پانی
دیواروں سے چھٹکتی ہے ٹیالی مٹی

✽ کاشف ثوم.....نارتھ کراچی
جن پیڑوں کا سایا کوئی نہیں
وہاں مسافر ٹھہرا کوئی نہیں

✽ اسماعیل نوید.....کوئٹہ
پھر آئے بڑی یاد کے منبے ہوئے جھونکے
پھر اوڑھ لیے آنکھ نے خوابوں کے لبادے

✽ ارہیر یوسف.....الاندھی، کراچی
دب بن جائیں گے جو یادیں میں چھالے ہوں گے
ہم جو پیچیں گے تو منزل پہ اجالے ہوں گے



در انداز

مریم کے حالات

سائنسی تحقیق کے مطابق اس دنیا کے علاوہ اور بھی بے شمار سیارے آباد ہیں، جہاں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسے ہی سیارے میں جا رہے تھے جہاں مخلوق نہ زندوں میں شمار ہوتی تھی اور نہ مردوں میں۔ جو مر چکے تھے مگر پھر بھی زندگی سے بھرپور تھے۔ ان کے جسم جراثیموں کا گڑھ تھے لیکن وہ پر لحاظ سے صحت مند دکھائی دیتے تھے۔ اور پھر ایک لمحہ وہ آیا جب لڑوہ خیز حالات میں اسے ایک طویل خاصوشتی اختیار کرنا پڑی۔ اتنی طویل کہ اس پر مردنی چھاگتی مگر۔ وہ پھر بھی زندہ تھا۔ بس ایسی بات نے ہماری دنیا کے کرتا دھوتائیوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

دوسریں میں تحلیل ہونے والی مخلوق کے شیر کر دینے والے واقعات

جاتی ہے اور اس دوران میں اسے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہتی ہے۔ دور دراز جانے والے خلائی مشن جو سالوں پر محیط ہوتے ہیں ان کے خلا باز اپنے طویل سفر کے دوران میں منزل مقصود تک کا وقت سو کر گزارتے ہیں۔ اس فینڈ کی وجہ سے ان کا جسم طویل عرصے خلا میں رہنے کے باوجود ناکارہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ کشتی نقل کے بغیر انسان کا جسم تیزی سے

جیسے بارش عالمی اسپیس ایجنسی کے بورڈ کے سامنے بیٹھا تھا۔ ایک سو پچیس پہلے نظام کی کمرحدوں پر گشت کرنے والے ایک جنگی خلائی جہاز نے ایک چھوٹے سے خلائی جہاز کو وارہ پا کر اسے چپکے کیا تو اس میں جس بارش سوتا ہوا پایا گیا تھا۔ وہ خاص ہائی بریٹ چہر میں سورہا تھا جس میں لینے والے پر ایک مخصوص مدت کے لیے فیکٹوری ہو

﴿شادہ ریاض﴾ اسلام آباد
دل تو کہتا ہے کہ یوں وقت کو زنجیر کریں
خواب بھی لوبح مکافات پہ تحریر کریں
لے کے اسے درد تھے آتے گئے ہم دل تک
اب بھلا اور کہاں تک جری تو تیر کریں
﴿فکلی الرحمان عوام یار﴾ بہاولنگر
ایوں نے وہ رخ دیے ہیں، بیگانے یاد آتے ہیں
دیکھ گئے اس ہستی کی حالت ویرانے یاد آتے ہیں
﴿ملک محمد انور﴾ جی ٹی روڈ لاہ کینٹ
کسی سے حال دل دار مت کہو سامیں
یہ وقت جیسے بھی گزرتے گزرتے لو سامیں
﴿تحریک کانگڑی﴾ لاہور کراچی
کیا ہے عشق تو کھوکھو نہ کر زمانے کا
بیاں ہوا تو گیا حسن اس فسانے کا
﴿امتیاز خان خلک﴾ ضلع انک
درخت سوکھ گئے رک گئے ندی ٹالے
کس سحر کو روانہ ہوئے گھر والے
کہانیاں جو سناتے تھے عہد رفت کی
نشان وہ گروہ ایام نے مٹا ڈالے
﴿محمد سرور اویوہ﴾ جی ٹی
مجھے میرے تغافل نے وہاں بچایا دیا آخر
جہاں اب تیری نظر بھی پہ آسانی نہیں جاتی
﴿ذاکر عثمان ناصر﴾ ڈسٹرکٹ ہیکل ریم بارخان
مجھے اتنا نہ یاد آؤ میں خود کو تم سمجھ بیٹھوں
مجھے احساس رہے دو مری اپنی بھی ہستی کا
﴿ٹائید زیدی﴾ گجراتوالہ
دن بھر سورج کے ڈر سے گلیوں میں چپ رہتے ہیں
شام آتے ہی آنکھوں میں وہ رنگ پانے آ جاتے ہیں
جن لوگوں نے ان کی طلب میں جھڑوں کی جھول اٹھائی
اب یہ جس ان کی قبروں پر چھول چڑھانے آ جاتے ہیں
☆☆☆☆

﴿عبدل افروز﴾ کراچی
صد سے سحر کے عشق کیا ٹوٹ کر وفا
دیکھو تو اک جنوں میں کیا کیا نہیں کیا
﴿محمد صادق﴾ نیوکراچی
میں سے رہا ہوں کب سے کڑے امتحان دیکھ
پھر بھی ہے زندگی پہ ہر کشتا مان دیکھ
﴿عاصم قار﴾ لاہور
کسی نے رکھ دیا تھا دل بساط پر لاکر
یونہی نہیں دل و جاں ہار کر گئے ہم لوگ
﴿غذرا صوبہ﴾ جہلم
غربت میں کیا بتائیں گزری ہے کس طرح سے
دن تھا بہت ہی ظالم ہاں رات مہریاں تھی
﴿انیر اکرم﴾ میرپورخاص
یوں تو قدم قدم پر تھی ہر گزشت زبان
اک بے زیاں محبت بھی اپنے درمیاں تھی
﴿محمد حفیظ طاہر﴾ شوگر ٹونٹ
اسے زہریلی خوشبوؤں کے زلیں ہار دیتا ہوں
میں جس سے پیار کرتا ہوں اسی کو مار دیتا ہوں
﴿احمد رضا﴾ شائع فیصل کراچی
میلے ہے یہ گاؤں کا، سب ڈھول بجاتے آؤ
جستی خوں کی سبوں کو طوفان ہانے آؤ
﴿بتین اصغر﴾ کورنگی کراچی
لاکھوں شکلوں کے میلے میں جہا رہنا میرا کام
بیمیں بدل کر دیکھتے رہتا تیر ہواؤں کا کہرام
﴿اختر روجیل﴾ ملتان
”اپنے گھر کو واپس جاؤ“ رو رو کر سمجھاتا ہے
جہاں بھی جاؤں میرا سایہ پیچھے پیچھے آتا ہے
﴿اسلم اقبال﴾ گلشن اقبال کراچی
شور کرتے، گونجتے، ہنسنے کالے باوا
لاؤ اس بھولے سے کی دل جلائی شام

محقق شاعر و سیخت

نام : _____
پتا : _____



مکروہ ہونے لگتا ہے۔

چھان بین کے بعد پتا چلا کہ جیسے دو سال پہلے ملکی وے کھکشاں کے ایک بازو میں بھیجی جانے والی خلائی مہم کا حصہ تھا۔ رواد کے ایک سال بعد جب اس مہم کے خلا باز اپنی منزل پر پہنچ کر جاگے اور انہوں نے ایک سیارے کا جائزہ لینا شروع کیا تو اس کے بعد زمین سے ان کا رابطہ منقطع ہو گیا اور جب دوبارہ رابطہ بحال نہیں ہوا تو اس خلائی مشن کو ناکام ٹوٹی کر لیا گیا تھا۔ اس مہم کے مشن جو نظام شمسی سے بہت دور جاتے تھے انہیں بہت زیادہ خطرات رہتے تھے اور عام طور سے ایسے مشن جالیس فی صد ہی کامیاب رہتے تھے۔

جیسے گوگل لیا گیا تھا۔ اس نے جو ابتدائی بیان دیا، اس کے مطابق ان کے خلائی جہاز پر پراسرار قسم کی مخلوق نے حملہ کیا تھا۔ اس کا بیان تفصیلی نہیں تھا اور پھر جلی خلائی جہاز میں کوئی ایسا ماہر نہیں تھا جو اس کی بات سمجھ سکتا۔ انہوں نے اسے زمین کی طرف روانہ کر دیا۔ جہاں تک وہ تو جیس کے جسمانی اور ذہنی معائنے میں گزر گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے اسے فٹ قرار دیا تھا۔ تب اس سے انٹرویو کے لیے عالمی خلائی ایجنسی کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا جو اس سے سوالات کر کے اس سارے معاملے کی چھان بین کر رہا تھا۔ وہ جس مہم کا حصہ تھا اس میں تین افراد شریک تھے اور وہ واحد فرد تھا جو شہر کو دیکھ کر واپس آیا تھا۔

بورڈ تین افراد پر مشتمل تھا۔ تین گھنٹہ کی بورڈ کا سربراہ تھا اور اس کے دو نائب بیٹ شیری اور مائیکل سٹینی۔ مل بذات خود بلاز پکستان رہ چکا تھا۔ بیٹ نفسیاتی تجزیے کی ماہر تھی اور مائیکل کائنات میں پائی جانے والی دوسری مخلوقات کا ماہر تھا۔ اپنی آمد کے ایک ہفتے بعد جیس ان کے سامنے موجود تھا۔

”سٹر جیس“۔ میں نے انٹرویو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بتا پتہ کرو گے کہ تم اور تمہارے ساتھیوں کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”جی ضرور۔۔۔ لیکن یہ ایک طویل داستان ہے کیا معزز زار کان کے پاس اتنا وقت ہے؟“

”تم فکر مت کرو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ بورڈ اسی کام کے لیے تشکیل دیا گیا ہے۔“

”تھیک ہے جناب۔“ جیس نے گہری سانس لی۔ ”میری کوشش ہوگی کہ کوئی بات رو نہ جائے۔“

☆☆☆

ملکی وے کے بعید ترین بازو کی طرف جانے والی یہ اولین مہم تھی۔ اس سے پہلے اتنے طویل فاصلے پر زمین سے

کوئی خلائی مہم نہیں بھیجی تھی۔ اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑا خلائی جہاز بنایا گیا تھا جو طویل سفر کی موجودگی کو برداشت کر سکتا تھا اور اس میں تمام ضروری آلات موجود تھے۔ علمہ تین افراد پر مشتمل تھا اور اس خلائی جہاز کا پکستان میخانک ایوری تھا۔ جیس کا تھوڑا فیصر تھا یعنی اس خلائی جہاز میں اس کی حیثیت تیسرے نمبر پر تھی۔ تیس چفٹ پائلٹ بھی تھا اور خلائی جہاز اڑاتا اس کی ذمہ داری تھی۔ کیونکہ یہ ایک طویل مہم تھی اور انہیں منزل مقصود پر پہنچنے میں ایک سال کا عرصہ لگ جاتا۔ اسی لیے نظام شمسی سے باہر آنے کے بعد اور خلائی جہاز کو اس کے راستے پر آٹو پائلٹ کرنے کے بعد وہ سب ہائی برینٹ چمبرز میں لیٹ کر سو گئے۔ ایک سال بعد خلائی جہاز کا کیپوٹران کو خود بخود دیکھا جاتا۔

خلائی جہاز برقی رفتار سے بھی زیادہ رفتار سے سفر کرتا رہا اور ایک سال بعد اس مقام پر پہنچ گیا جس کا ان لوگوں کو جائزہ لینا تھا۔ مخصوص مدت پوری ہوتے ہی کیپوٹران نے ہائی برینٹ چمبرز کھول دیے اور وہ جاگ گئے۔ جیس کو اگرچہ پہلے ہی ہائی برینٹ نیند کا تجربہ ہو چکا تھا لیکن اتنی طویل مدت کے لیے وہ پہلی بار سو رہا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس کا خیال تھا کہ وہ بہت مشکل سے حرکت کر سکتے جا رہے ہیں جب وہ اٹھا تو اسے لگا جیسے وہ محض رات بھر کی بھڑک بھڑک کے بعد تازہ اٹھا ہے۔ اسے اپنے جسم اور حرکت میں کوئی کمی نہیں لگ رہی تھی۔ ایسا ہی اس کے ساتھی بھی محسوس کر رہے تھے۔

انہوں نے اپنی دریاں بہنیں اور سب سے پہلے کھانے کے کمرے میں پہنچے۔ کھانے کی میز پر ایوری نے انہیں بتایا کہ اس مقام پر بے شمار ایسے سیارے ہیں جو سائز اور ماحول کے لحاظ سے زمین جیسے ہیں۔ انہیں ان سیاروں کا سروے کرنا تھا اور اندازہ لگانا تھا کہ مستقبل میں اگر انسان یہاں آباد ہونا چاہے تو اس کے کیا امکانات ہیں۔ یہاں ایک ایسا سورج تھا جس کے مدار میں زمین جیسے درجنوں سیارے تھے۔ انہیں ان سیاروں کا بھی جائزہ لینا تھا۔

کھانے کے بعد وہ پکستان بریق میں آئے یعنی وہ ہال جہاں سے اس سارے خلائی جہاز کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ انہوں نے کیپوٹران سے کماٹھ کے لیے اس علاقے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کیپوٹران نے از خود اس نظام شمسی میں آنے والے اولین سیارے کے گرد خلائی جہاز کا مدار قائم کر لیا تھا۔ اعداد و شمار سے پتا چل رہا تھا کہ یہ ٹھوس سیارہ تھا۔ اس کا سائز زمین سے معمولی سا بڑا تھا اور سطح کا درجہ حرارت صفر سے ذرا اوپر تھا۔ ہوا میں آکسیجن کا تناسب بھی زمین سے ذرا زیادہ تھا اور

امکان نہ تھا کہ انہیں اس کی ہوا میں سانس لینے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ابھی یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ سارے پر زندگی کی کوئی قسم موجود ہے یا نہیں۔ خلائی مہمات کے آغاز سے کئی ایسے سیارے دریافت ہو چکے تھے جہاں زندگی مختلف صورتوں میں پائی جاتی تھی لیکن ان کی نوعیت زمین کے جانوروں جیسی تھی۔ ان میں کوئی ذہین مخلوق نہیں تھی۔ اب تک انسان اپنے جیسی ذہین مخلوق تلاش نہیں کر سکا تھا۔

اس نظام شمسی میں ہم جیسے کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہاں انسان جیسی کسی ذہین اور عقلی صلاحیت رکھنے والی مخلوق کا پتا چلا جا سکے۔ اس کام کے لیے ان کے پاس صرف دو مہینے کا وقت تھا۔ دو مہینے میں انہیں اپنا کام مکمل کر کے واپس کا سفر شروع کرنا تھا جس میں مزید ایک سال لگ جاتا۔ انہیں کل تین سیاروں پر تحقیق کرنا تھی۔ اس میں سے ایک سیارہ یہ بھی تھا۔ جیس ایوری کی ہدایت کے مطابق خلائی جہاز کو موزوں مدار میں لانے لگا۔ سیارے کو چاروں طرف سے گھرے بادلوں نے گھیر رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی سطح نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ان کے پاس معلومات حاصل کرنے کے اور بھی طریقے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ پہلا مشن سیارے کے خطا استوا پر اتر جائے گا۔

فیصلہ ہونے لگا کہ اس پر عمل درآمد کی تیاری کی جائے گی۔ خلائی جہاز پر ایک درجن سے زیادہ چھوٹی خلائی مشینیں جو کہ بھی سیارے پر اترنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ جیس جانے والی پہلی ٹیم کا سربراہ تھا اور اس کے ساتھ پانچ افراد اور تھے۔ جیس کا کام اصل میں مشن کو پائلٹ کرنا تھا وہ اس کام کا ماہر تھا۔ کیونکہ انہوں نے سیاروں پر لینڈنگ کسی بھی خلائی سفر کا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے اس لیے جیس ہی پائلٹ کرتا۔ اس کے علاوہ سینکڑا فیصر ریڈ اور پارکری مشین اڑا سکتے تھے لیکن انہیں جیس جیسی مہارت حاصل نہیں تھی۔

وہ سب سائز و سامان کے ساتھ تیار ہو کر مشن میں آگئے جو خلائی جہاز سے الگ ہو کر سیارے کی طرف روانہ ہوئی۔ ان کے پاس تحقیق کرنے والے سارے آلات تھے لیکن وہ سب ہتھیاروں کے استعمال کے بھی ماہر تھے اور ان کے پاس کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تمام ہتھیار موجود تھے۔ انہیں پتا نہیں تھا کہ سیارے پر انہیں کس قسم کے خطرات سے واسطہ پڑے گا۔ تین منٹ بعد وہ سیارے کی سطح کے قریب تھے جہاں اس وقت آندھی چھٹی ہو انہیں چل رہی تھیں۔ مگر یہ بہت تیز نہیں تھیں۔ جیس نے ایک ہوا دار میدان دیکھ کر اس میں مشن اتار لی۔ مشن کی پہلی کارپس کی طرح لینڈ ہو

خوشی

”جیس آخر کیوں تم روزانہ کسی نہ کسی فقیر کو کھانا کھانے کے لیے دروازے پر بٹھا لیتی ہو؟“

”میں اس بات کی خوشی محسوس کرنا چاہتی ہوں کہ دنیا میں کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو میرے پکائے ہوئے کھانے کوئی نقص نکالے بغیر خاموشی سے کھا لیتا ہے۔“

ایک افضال انصاری..... دھنگہ شہر

سکتی تھی۔ سامنے والے شیشے سے باہر گرد و آلودہ ہوا نہیں چل رہی تھیں۔ انہیں آکسیجن کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی احتیاطاً انہوں نے ماسک لگا لیے تھے۔ جیس نے مشن کا دروازہ کھولا اور اس کے پانچوں ساتھی نیچے اتر گئے تھے جیس کا رابطہ اوپر خلائی جہاز سے تھا اور باہر جانے والے ساتھیوں سے بھی تھا۔ ”یہاں ہوا نہیں بہت تیز ہیں۔“ ایک کارکن جولیو نے کہا۔ وہ باہر جانے والی ٹیم کا سربراہ تھا۔ ہواؤں کا شور اس کی آواز میں شامل تھا۔

”کیا کسی قسم کی کوئی مصنوعی تنصیب نظر آ رہی ہے؟“ جیس نے پوچھا۔

”نہیں ہر طرف قطری میدان ہے۔“ جولیو نے جواب دیا۔ ”سامنے ایک چھوٹی سی پہاڑی نظر آ رہی ہیں۔ ہم اس طرف جا رہے ہیں۔“

جیس کو وہ کیمروں میں واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔ گرد و آلودہ ہواؤں اور بادلوں کی وجہ سے ماحول نیم تاریک تھا اور حد نگاہ محدود تھی۔ جیس نے انہیں حکم دیا۔ ”کوئی ایک دوسرے سے اتنا دور نہ جائے کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے۔“

”ہم خیال رکھیں گے۔“ جولیو نے جواب دیا۔ وہ اور اس کے ساتھی پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر میں وہ مشن کے کیمروں کی حد سے نکل گئے تھے۔ البتہ ان کے لباس میں لگے کیمروں سے ان کے آس پاس کا ماحول کسی قدر دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگا رہا تھا جیسے وہ زمین پر کسی صحرائی خطے میں ہوں۔ باہر درجہ حرارت دس ڈگری سینٹی گریڈ تھا لیکن ہوا میں کمی کا تناسب تقریباً صفر تھا یعنی اس سیارے پر پانی نایاب تھا۔ شاید کمی کی وجہ سے اس کا سارا پانی بادلوں کی صورت میں جمع رہتا تھا بارش ہونے پر یہ پانی فوراً اتر کر

دوبارہ بادلوں میں کھینک جاتا ہوگا اور اسے زمین میں جذب ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا ہوگا۔ لیکن دہشتی کہ زمین کے بادلوں کے برعکس اس سیارے کے بادل بہت دبیز اور سیارے کی سطح سے پچاس کلومیٹر اوپر تک موجود تھے۔

تیس ان فوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ پہاڑی کے پاس پہنچ گئے تھے اور اب اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تیرہ ہواؤں کی وجہ سے انہیں بہت دشواری پیش آرہی تھی۔ پہاڑی زیادہ بلند نہیں تھی شاید سو فٹ اونچی ہوگی لیکن اس پر جانے کے لیے راستے نہیں تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح پتھر پکڑتے ہوئے اوپر چڑھنے میں کامیاب رہے تھے۔ تیس نے فوراً ہی جولیو کی حیرت زدہ آواز سنی۔

”میرے خدا یہ کیا ہے؟“

”جولیو کیا ہے؟“ تیس نے جولیو کا کمر اوکھا لیکن اس سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ چھوٹی سی میز پر مشتمل بہت سادہ اور بیک اینڈ ڈائنٹ کمرہ تھا۔

”یہ کوئی عجیب سی چیز ہے۔“ جولیو نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی خلائی جہاز ہے۔ لیکن اس کی حالت بے چینی ہو رہی ہے اور یہ نہ جانے کب سے یہاں پڑا ہے۔“

”جہاز نے کریش لینڈنگ کی ہے؟“

”نہیں اس کی باڈی صحیح سلامت نظر آرہی ہے۔ لیکن بھر حال یہ استعمال میں نہیں ہے۔ کیا ہم اس کی طرف جائیں؟“

”ہاں لیکن بہت احتیاط کے ساتھ اور کسی بھی خطرے کی صورت میں تم لوگوں کو واپس آنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ جولیو نے کہا اور تیس اس خلائی جہاز کی طرف بڑھنے لگا جو ان کی مشن کے مقابلے میں دس گنا بڑا تھا۔ اب تیس کو خلائی جہاز نظر آ رہا تھا۔ اس کی ساخت عجیب سی تھی اور اس کا ڈھن سے کوئی تعلق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

یقیناً یہ بھی اور فوگوں کا جہاز تھا۔ جولیو اور اس کے ساتھی اس کے قریب پہنچ گئے۔ جہاز سیاہ رنگ کی کسی دھات سے بنا ہوا تھا۔ اس میں اندر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کے گرد گھوم کر راستہ تلاش کرنے لگے۔ آخر ایک جگہ انہیں ایک سلوپ جہاز کے اندر جاتا دکھائی دیا اور انہوں نے تیس کو اس سے آگاہ کر کے اندر جانے کی اجازت چاہی۔

”ٹھیک ہے لیکن محتاط رہنا۔“ تیس نے انہیں اجازت دے دی۔

پہلے جولیو اندر گیا۔ سلوپ اندر ایک چھوٹے سے ہال میں اگلا جو خالی تھا اور اس ہال سے خلائی جہاز کے اندر جانے

کے لیے راستے نکل رہے تھے۔ وہ انداز سے بے خلائی جہاز کے اگلے حصے میں جانے لگے کیونکہ وہیں انہیں آجملہ سکے تھے۔ اندر کی ساخت بھی ایسی تھی جو جولیو اور اس کے ساتھیوں نے توجہ تک کسی انسانی خلائی جہاز میں نہیں دیکھی تھی۔ اس نے تیس سے کہا۔

”ایسا لگ رہا ہے ہم کسی اور زمین حلقوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“

”لیکن وہ زمین حلقوں کہاں ہے؟“ تیس نے سوال کیا۔

”اس جہاز کی حالت سے تو نہیں لگ رہا کہ اس کے اندر کوئی زندہ چیز ہوگی۔“

جہاز اندر سے بھی سیاہ حال تھا اور جا بجا ٹوٹی ہوئی چیزیں اور جہاز کا کلیہ پرا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اندر کسی نے جان بوجھ کر جہاز پھیلانی ہو۔ وہ جہاز کے اگلے حصے میں آئے جہاں جہاز کو کنٹرول کرنے والی مشینیں تھیں لیکن وہ ان کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہاں بھی تانہ اور برادری کے آثار نمایاں تھے۔ جولیو نے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے یہ آپس میں لڑ رہے ہیں؟“

”کون؟“ تیس نے پھر سوال کیا ”اگر کوئی مرا تھا تو اس کی لاش ہال میں کچھ آثار ہونے چاہی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ جولیو نے اس کی بات سنی۔ ”ہمیں اب تک کوئی ایسی چیز نہیں ملی ہے جسے ہم کسی مخلوق کے آثار قرار دے سکیں۔“

جولیو اور اس کے ساتھی اگلے حصے کا معائنہ کر کے جہاز کے عقبی حصے میں آئے۔ جہاز کا پچھلا حصہ کونڈرنگ نما تھا اور اندر سے ایک بہت بڑا ہال ثابت ہوا۔ جب وہ اس میں داخل ہوئے تو انہیں وہ چیز ملی جس کے وہ متلاشی تھے۔ یہاں ایک طرف تابوت نما درازیں تھیں جن کا ہر ایک والا حصہ شیشے کا تھا اور ان کے اندر انہیں ایک عجیب سی مخلوق یعنی نظر آئی۔ جولیو نے فوراً اس بارے میں تیس کو بتایا۔ تیس نے قسم کھائی۔

”اس کے قریب جاؤ لیکن کسی بھی چیز کو نہیں چھوئے۔“

یہ حکم سب کے لیے ہے۔

جولیو ایک تابوت کے قریب گیا اور اس نے ہاتھ میں پکڑی نارنج کی روشنی اس پر ڈالی۔ جہاز کے اندر روشنی کی لیکن اس ہال میں طرح طرح کی الیٹ شیشے کے تابوتوں میں ایسی سی روشنی تھی اور اصل میں یہی روشنی ہال میں تھیں رہی تھی۔ تیس نے کمرے میں دیکھا کہ تابوت میں ایک ایسی سی چیز تھی۔ اوپر کی طرف اس کا منہ تھا اور یہ منہ کسی چھلی جیسا تھا۔ اس کے لیے ہاتھ اس کے برابر میں رکھے تھے اور پاؤں

چھوٹے تھے۔ ہاتھ بیروں میں چھ چھلمی اور نوکلی انگلیاں تھیں۔ اس مخلوق کی لمبائی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھی اور جسم کہیں سے بھی چھانچ سے زیادہ موٹائیں تھا۔

”کیا یہ مردہ ہے؟“ تیس نے سوال کیا۔

”یہ ظاہر تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ جولیو نے روشنی میں اس کا قریب سے معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان میں کسی قسم کی حرکت نہیں ہے۔“

”مشتن سے چیک کرو؟“

جولیو کے پاس ایک مشین تھی جو کسی چیز میں معمولی سی حرکت بھی نوٹ کر لیتی تھی۔ اس نے مشتن استعمال کی لیکن اس پر بھی کسی قسم کی حرکت نہیں ہوئی۔ اگر یہ مخلوق بالی بریٹ پر بھی تب بھی اسے سانس لینا چاہیے تھا اور اس کا دل دھڑکنا چاہیے تھا۔ جولیو کی اس بات پر تیس نے کہا۔ ”ہم نہیں جانتے کہ یہ زندگی کی کس قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ ہماری زمین پر بھی پودوں کا دل میں دھڑکتا ہے۔“

جولیو کا ایک ساتھی فوگ ایک تابوت کے بالکل پاس تھا اور وہ دوسروں سے نظر بچا کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تابوت کے ساتھ ہی کچھ شے لگے تھے۔ اس نے ایک شے دیکھی تو ایک ہی تابوت کا وٹکن کھلنے لگا اور پھر اس کی آواز آئی جیسے

”کھیں سے کس پر پڑے غارت ہوئی ہے۔“ جولیو چلا گیا۔

”فوک؟“ تیس نے کہا۔

”فوک اب خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا ہوا تھا کیونکہ تابوت سے کوئی دھواں نکل رہی تھی اور رفتہ رفتہ ہال میں شعلیں رہی تھیں۔ تیس نے جولیو سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”فوک نے ایک تابوت کھول دیا ہے۔ اس سے کوئی گیس نکل رہی ہے۔“ تیس نے جواب دیا۔

”تم لوگ فوراً اس ہال سے نکل جاؤ۔“ تیس نے حکم دیا تو وہ سب ہال سے نکلے والے راستے کی طرف بڑے تیز تیز ان کو باہر نکلتا نہیں ہوا کیونکہ فوگ اچانک نیچے گر گیا تھا اور وہ فرش پر اڑیاں رگڑ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا سانس رگڑ رہا ہو۔ جولیو اس کی طرف بھاگا۔ اس نے فوک کو اٹھانے کی کوشش کی۔

”فوک کیا ہوا ہے؟“

لیکن فوک کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ از خود اٹھ سکے۔ اس کا جسم اڑنے جارہا تھا۔ جولیو اور وہ دوسرے اسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک اور نیچے گر گیا اور وہ بھی فوک کی طرح اڑیاں رگڑنے لگا۔ اس دوران میں فوک ساکت ہو گیا تھا اور اس کے پاس سے شعلہ اس کے اعضا

کی حالت شعلہ کرنے والا آگہ ہوا تھا کہ اس کے دل کی دھڑکن اور سانس رگڑ چکی ہیں اور اس کے دماغ میں کوئی تحریک باقی نہیں رہی۔ تیس دم بہ خود ما بٹھا تھا چند لمحوں پہلے تک زندہ فوک مر چکا تھا۔ پھر اس نے سنبھل کر جولیو سے کہا۔

”فوک کو چھوڑ دو تم لوگ باہر نکلنے کی کوشش کرو۔“

اس دوران میں فوک کا تیسہ ساتھی بھی اسی طرح نیچے گر کر اڑیاں رگڑ رہا تھا۔ صرف ایک ساتھی اپنے دوسرے ساتھی کے ہمراہ حیران پریشان انہیں دیکھ رہا تھا پھر جیسا کہ واحد ساتھی بھی گرا تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ دروازے کی طرف لپکا۔ تیس چیخ چیخ کر اسے وہاں سے نکلنے کا کہہ رہا تھا مگر وہ بھی عین دروازے پر پہنچ کر گر گیا۔ اب وہ تیس کی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ ان میں چار مر چکے تھے اور صرف جولیو زندہ تھا۔ تیس اور خلائی جہاز کو اس حادثے کی رپورٹ کرنے لگا اور جب تک وہ انہیں سمجھتا رہا جولیو بھی مر چکا تھا۔ کم سے کم ان کے وہ مکمل سانس شعلہ کرنے والا آگہی بتا رہا تھا۔ ابوری اور دوسرے بھی پریشان تھے پھر ابوری نے فوری طور پر تیس کو واپس خلائی جہاز میں آنے کا حکم دیا۔ وہ نیچے اتر کر جولیو اور اس کے ساتھیوں کو دیکھتا چلا جاتا تھا لیکن ابوری نے اسے سختی سے منع کر دیا۔

”کیا ان پانچ کا شعلہ دیکھ کر بھی تمہیں عقل نہیں آتی ہے۔ تم فوراً واپس آؤ۔“

جبوراً تیس نے شعلہ اور اٹھالی اور خلائی جہاز کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے ایک بار اس تجربہ ساز خلائی جہاز میں جا کر دیکھنا چاہیے تھا کیونکہ اس کے ساتھی اس مخلوق کے نہیں بلکہ گیس کا شکار ہوئے تھے اور انہیں مدد کی ضرورت تھی۔ وہ ایسا ہال پہنچ کر ان کی مدد کے لیے جا سکا تھا جو کسی بھی قسم کی گیس سے بچاؤ کرتا ہو۔ یہ ایسا شعلہ میں موجود تھا۔ وہ خلائی جہاز تک پہنچا تو دوسری اندامی شعلہ پرواز کے لیے تیار تھی اور اس میں اس شخص کو لباس کے ساتھ چھ دوسرے افراد تھے۔ تیس نے ابوری سے کہا۔

”میں بھی جاؤں گا میں بہتر رہنمائی کر سکتا ہوں۔“

پہچان ابوری اس کی بات مان گیا اور وہ بھی اس شعلہ کے ساتھ سیارے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس شعلہ کو باہر گرا دیا گیا اور اسے شعلہ کو اس جگہ پر لینڈ کرنے میں بہت دشواری پیش آئی تھی۔ تیس نے کوشش کی تھی کہ اس بار لینڈنگ اس پر امر خلائی جہاز کے پاس ہی ہو مگر باہر اس میں کامیاب نہیں ہوا تھا اور شعلہ نے قدر آور لینڈنگ کی۔ ہواؤں کی شدت میں تیزی آگئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ سیارے کی سطح

سبب دلت

جس نے مثل ہوت پر روٹی اور دو صاب اتر کر پیش معائنے والے حصے میں آگئے۔ یہاں جہاز کا ڈاکٹر ہوم اور اس کا نائب مین مشینوں کی مدد سے ان کا معائنہ کر سکتے تھے۔ وہ باری باری طبی معائنے کے عمل سے گزرنے لگے تھے۔ صاب سے پہلے جو یو اور اس کے ساتھیوں کو اس عمل سے گزارا گیا۔ اس کے بعد باقی افراد کی باری آئی۔ سب سے آخر میں خود کار و بوٹ پارکر کی لاش لیٹے گیا اور جب پارکر وہاں آیا تو وہ اسے زندہ پا کر حیران رہ گئے۔ جنیس نے اسے مردہ قرار دینے والے دونوں افراد کو پکڑ لیا اور وہ تمہیں کھانے لگے کہ جب انہوں نے پارکر کو دیکھا تو وہ مردہ تھا۔ اس کی ہنٹ اور سانس دونوں رکی ہوئی تھیں۔

جنیس انہیں میں پر گیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پہلے جو یو اور اس کے ساتھی مر گئے اور پھر زندہ ہو گئے اس کے بعد پارکر بھی مردہ حالت میں ملا اور اب زندہ ہو گیا۔ اس دوران میں پارکر بھی معائنے سے قاصر ہو گیا تھا۔ ہوم اور مین نے ان تمام افراد کو بالکل ٹھیک حالت میں قرار دیا تھا۔ انہیں نہ تو کوئی انفیکشن تھا اور نہ ہی ان کے جسم میں کوئی غیر معمولی کیمیائی چیز پائی گئی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے صحت مند تھے۔ ان کے ہاتھیں بھجڑ میں آنے کی اجازت دے دی گئی۔ راستے میں جنیس نے پارکر سے پوچھا۔

”جنیس مثل میں چھوڑا تھا تم اس سے سو قدم دور کیسے پیچھے اور تم بے ہوش کیسے ہوئے؟“

پارکر انہیں میں پڑ گیا۔ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے سچ سے نہیں یاد ہے میں شاید اپنی نشست پر بیٹھ بیٹھ بے ہوش ہو گیا تھا۔“

”یعنی تم نے مثل سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی تھی؟“

”میں ایسی کوشش کیوں کرتا جب کہ مجھے معلوم ہے میں مثل خالی چھوڑ کر باہر نہیں جاسکتا۔“

”پھر تم باہر کیسے پہنچے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ پارکر نے فنی میں سر ہلایا۔ ”یہ میں تم سے سن رہا ہوں۔ میں نے تو خود کو ہوش میں آنے کے بعد مثل کے محفوظ چیمبر میں پایا تھا۔“

جنیس کو لگ رہا تھا کہ میں کوئی گڑبڑ تھی۔ اس سارے کی فضا میں مسئلہ ہوتا تو صاب اس مخصوص کیفیت سے گزرتے لیکن اس مخصوص کیفیت کا شکار صرف جو یو اور اس کے ساتھی ہوئے تھے یا پھر پارکر ہوا تھا۔ جنیس کا دل کہہ رہا تھا ساری گزریاں اس مخلوق کا تابوت کھلنے سے شروع ہوئی تھی۔ ایوری نے ہنگامی میٹنگ طلب کر لی۔ جس میں خلائی جہاز کا سارا

عملہ شامل تھا۔ انہوں نے صورت حال پر غور کیا تھا لیکن کوئی نہیں سمجھ سکا کہ سارے پر ہوا کیا تھا۔ جنیس نے یہاں اپنا خیال پیش کر دیا۔ اس نے کہا۔

”میرا خیال ہے ساری گزریاں اس پر اسرار مخلوق کا تابوت کھلنے سے ہوئی ہے۔“

ایوری کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ ”اس صورت میں پارکر کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”ممکن ہے اس تک بھی تابوت کے اثرات آئے ہوں۔“

جنیس کی اس بات پر جو یو غلطی پر انداز میں ہنسا۔ ”میرا خیال ہے یہ کوئی پرانی بار مودی نہیں ہے۔“

جنیس نے اسے ناگوار سے دیکھا۔ ”میں کسی بار مودی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس تابوت سے کوئی کیمیائی یا بائیولوجیکل اثرات نکلے تھے جو تم پر مرتب ہوئے اور وہی اثرات کسی طرح پارکر تک پہنچے کیونکہ وہ بھی تمہاری طرح بہ ظاہر مردہ ہو گیا تھا۔“

”ہم مردہ نہیں ہوئے تھے۔“ جو یو کے ایک ساتھی نے احتجاج کیا۔ ”ہم صرف بے ہوش ہو گئے تھے۔“

”واٹس مل سائن نشر کرنے والے آلات کسی وجہ سے خراب بھی ہو سکتے ہیں۔“ جو یو نے اپنے ساتھی کی تائید کی۔

”تب تم پارکر کے بارے میں کیا کہو گے اسے تو تمہارے ساتھیوں نے مردہ قرار دیا تھا۔“

”وہ جلدی میں تھے اور اس ماحول میں آدمی اپنے حواس کیسے برقرار رکھ سکتا ہے۔ ان سے پارکر کی ہنٹ اور سانس چپک کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے۔“

”یعنی تم کہتا جا رہے ہو کہ جو ہوا اس کا تابوت کھلنے سے کوئی تعلق نہیں ہے؟“ جنیس نے فنی سے کہا۔

”میرا بھی خیال ہے۔ شاید وہاں کی ہوا میں کوئی ایسی تاثیر ہے۔“

”تمہارے علاوہ چھ آدمی اور بھی گئے تھے۔“ جنیس نے اسے یاد دلایا۔ ”انہیں تو کچھ نہیں ہوا۔“

وہ سب مکمل حفاظتی لباس میں تھے اور آکسیجن تنک استعمال کر رہے تھے۔ ”جو یو نے جواب دیا۔ ”کیونکہ پارکر بھی بنیادی حفاظت کے باہر نکل گیا تھا اس لیے اس پر بھی وہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔“

”اگر تم یہ کہتا جا رہے ہو کہ ہم پر کوئی انفیکشن اثر کر گیا ہے تو تم غلطی پر ہو۔“ پارکر نے جنیس کی طرف دیکھا۔ ”ہوم اور مین نے ہمیں مکمل طور پر چپک کیا ہے۔ کیا ان لوگوں نے ہمارے اندر کوئی تبدیلی پائی ہے؟“

”نہیں۔“ ہوم نے جواب دیا۔ ”تم لوگوں کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے اور تم سب مکمل طور پر فٹ ہو۔“

جنیس نے محسوس کیا کہ وہاں اس کے حامی کم تھے اور کپتان ایوری بھی جو یو سے متفق نظر آ رہا تھا۔ اس نے میٹنگ کے آخر میں کہا۔ ”خوش قسمتی سے ہم اس انفیڈ چر سے بہ حفاظت باہر آنے میں کامیاب رہے ہیں لیکن اب اس سیارے میں مکمل لباس میں جانا ہے۔“

”ہمیں اس پر اسرار مخلوق پر تحقیق کرنی چاہیے۔“ ڈاکٹر ہوم نے کہا۔

”اس کے لیے ہمیں اس مخلوق کے تابوت خلائی جہاز میں لانے ہوں گے اور اس معاملے میں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔“

میٹنگ برخاست ہو گئی۔ مسلسل سفر اور میٹنگ نے جنس کو قہقہا دیا تھا اور وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرہ انہیں بلکہ پیڈ روم، ملاؤنچ اور ایک چھوٹے سے کچن پر مشتمل مکمل یونٹ تھا۔ اگرچہ کھانے کے لیے مین تھا لیکن وہ خود کچھ پکانا چاہتا تو اس کے لیے یہاں تمام انتظامات موجود تھے۔ جنیس نے سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ لینے کا موزا اور وہ دودھ گرم کر رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

پارکر کوئی تھا اس نے بلٹن آواز سے پوچھا۔ ”باجو سے لے لی آواز آئی۔“ جنیس نے جنیس۔“

جنیس نے دروازہ کھولا تو ریڈ اندر آیا۔ جنیس نے اسے بیٹھنے کا کہتے ہوئے کافی کا پوچھا۔ اس نے سر ہلایا تو جنیس نے اسے کافی پاٹ سے کافی نکال کر دی اور خود وہ کھا گھاس لے کر اس کے سامنے آ بیٹھا۔ اس نے میٹنگ میں محسوس کیا تھا کہ ریڈ کچھ کہنے کے لیے بے چین ہے مگر وہ کہتے کہتے رک جاتا تھا۔ جنیس نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے تم اس موضوع پر کوئی خاص بات کہنے آتے ہو۔“

ریڈ نے سر ہلایا اور بولا۔ ”مجھے کپتان اور ڈاکٹر سے اختلاف ہے۔ انہیں جو یو اور پارکر وغیرہ کو اتنی جلدی شہر قرار نہیں دینا چاہیے تھا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”اس پر اسرار خلائی جہاز میں جو کچھ ہے وہ ہمارے لیے بالکل اچھی ہے اور اس معاملے میں ہمیں ہر قدم بہت احتیاط سے اٹھانا چاہیے۔“ ریڈ نے جنس سے کہا۔ ”ایوری اس بات کو اتنی اہمیت نہیں دے رہا ہے۔“

جنیس نے فور سے اسے دیکھا۔ ”کیا تم نے اس

طرز قلم

ایک دفعہ علامہ محمد اقبال مرزا پر سے گزرتے تھے کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوبصورت لڑکی کھڑکی سے باہر کا نظارہ دیکھ رہی ہے۔ آپ اسے دیکھتے گئے۔ گاڑیاں آپ کے کھڑے ہونے سے رک گئیں۔ کیونکہ راست بند ہو گیا۔

ادھر سے لڑکی نے کہا۔

جو بیچے سے ادھر صنم دیکھتا ہے وہ اپنا سر قلم دیکھتا ہے

آپ نے فرمایا:

نہ تجھ سے غرض نہ تیری صوت سے

میں تو مصور کا طرز قلم دیکھ رہا تھا

آ

ایک آدمی کے کپڑے میں آگ لگ گئی تو وہ بھاگنے لگا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی دوڑا۔ اسے میں کسی نے پہلے والے آدمی کو بلس اور صادی اور آگ بجھ گئی۔ اس کے پیچھے بھاگنے والا بھی پہنچ گیا اور کہنے لگا۔ ”آگ تو بعد میں بھی بجھائی جاسکتی تھی۔ مجھے ایک سرکیٹ تو مل گئے دے۔“

نثر

ایک شخص مرزا پر جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گنڈیری بھی چوس رہا تھا۔ دوسرا شخص اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا اور چوس رہی ہوئی گنڈیریاں جو کہ پہلا شخص پیچھا رہا تھا وہ اٹھا کر وہاں چوستا۔ اتنے میں پہلا شخص نے اسے دیکھا اور کہا۔ ”ارے کتنے خوش ہو رہی ہوئی گنڈیریاں چوس رہے ہو شرم نہیں آتی۔“

دوسرا شخص: ”شرم تو مجھے آتی چاہیے۔ ایک نظر دس بھی نہیں چھوڑتے۔“

(A.S. فیبر بختون خوا)

بارے میں ایوری سے بات کی ہے؟“
 ریڈ نے سر ہلایا۔ ”ابھی میں اسی کے پاس سے آ رہا ہوں۔ میں نے اس سے مطالبہ کیا ہے کہ جو یو، پارک اور باقی چار افراد کو فی الحال الگ کر کے آئزرویل میں رکھا جائے۔ لیکن ایوری نے میرا مطالبہ مسترد کر دیا۔ اب ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔“
 جیمس نے سوچا اور ٹکی میں سر ہلایا۔ ”ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ کمانڈر ایوری ہے۔ ہم اسے تجویز دے سکتے ہیں اس پر اپنے فیصلہ مسئلہ نہیں کر سکتے۔“
 ریڈ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”اگر ہم اس بارے میں اسے طور پر تحقیق کریں تو ممکن ہے ایوری کو قائل کرنے کے لیے ہمیں کوئی نقصان نہ جائے۔“
 ”اچھے طور پر تحقیق؟“ جیمس نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”وہ کیسے؟“
 ”اگر ہم کسی کے علم میں لائے بغیر سیارے پر موجود خلائی جہاز تک جا میں اور جانے کی کوشش کریں کہ وہاں کیا ہوا تھا؟“
 ”ہم کسی کے علم میں لائے بغیر کیسے جا سکتے ہیں؟“ جیمس نے اعتراض کیا۔
 ”جا سکتے ہیں۔“ ریڈ کا لہجہ سرگوشی آمیز ہو گیا تھا۔ ”ہم اس جہاز کے سینڈ اور تھرو آئیڈرزیں اور ہم جا میں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“
 جیمس نے سوچا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر وہ چاہے تو کسی کے علم میں لائے بغیر جہاز سے باہر جا سکتے تھے۔ وہ سیارے تک بھی جا سکتے تھے۔ وہ ریڈ کی تجویز مانتے ہوئے ہینکچار ہوا تھا کیونکہ اگر وہ پکڑے جاتے تو ان پر چارج لگتا اور ان کا ریکارڈ دائرہ وار ہو جاتا۔ ممکن ہے کپتان ان کو مصلحت کے انہیں گھروں میں نظر بند کر دیتا۔ وہ اس کا اختیار رکھتا تھا۔ بہر حال جیمس کا جذبہ اتنا تھا کہ جیمس اور ریڈ نے خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے میں کھٹے بعد جانے کا فیصلہ کیا۔ جب ان کی ڈیوٹی آف ہو جاتی۔ اس وقت تک وہ جہاز کے سسٹم میں ایسی تبدیلیاں کر سکتے تھے کہ ان کی روانگی راز دہی رہتی۔
 اس دن جیمس نے محسوس کیا کہ جو یو، اس کے ساتھی اور پارکر جیت چپ سے تھے۔ وہ کام بھی بے دلی سے کر رہے تھے اور فی بار جیمس نے انہیں آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے دیکھا تھا۔ جب کوئی ان کے پاس آتا تو وہ ایک دوسرے سے لائق بن جاتے تھے۔ لیکن جیمس ان کی اداکاری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ریڈ کو اس بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ”میں خود کچھ ایسی ہی محسوس کر رہا ہوں۔“

آخراں کے درمیان کیا کچھوڑی پک رہی ہے؟“
 ”اس کا نہیں اندازہ اس وقت ہوگا جب ہم ان حالات سے گزریں جن سے یہ گزرے ہیں۔“
 جیمس نے خلائی جہاز میں موجود سات فہرشل کا تعلق جہاز کے مواصلاتی سسٹم سے ختم کر دیا۔ اب اس کی روانگی یا آمد کی اطلاع جہاز کے مرکزی کنٹرول سسٹم کو نہیں ہو سکتی تھی۔ جب ان کی ڈیوٹی ختم ہونے کا وقت آیا تو وہ دونوں پہنچا ہر اپنے آپ فہرشل کی طرف جانے لگے لیکن درمیان میں ایک جگہ سے انہوں نے راستہ تبدیل کر لیا اور فہرشل فہرسات کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ جہاز کے سب سے بڑی جگہ میں تھی اور وہاں عام طور سے کوئی نہیں جاتا تھا۔ وہ پورے بیچ فہرشل میں داخل ہوئے اور اسے جہاز سے الگ کر کے سیارے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس مقام کو وہ پہلے فہرشل کے کمپیوٹر میں ڈال چکے تھے جہاں پراسرار خلائی جہاز موجود تھا۔
 جب وہ سیارے کی سطح تک پہنچے تو وہاں بدستور طوفان جاری تھا۔ شاید وہاں ہمہ وقت طوفان جاری رہتا تھا۔ جیمس کیونکہ خود فہرشل کو ہلک کر رہا تھا اس لیے اس نے خلائی جہاز کے بالکل پاس فہرشل کو اتار لیا۔ انہوں نے مکمل طور پر محفوظ لباس پہنے، جن میں آکسیجن کا انتظام بھی تھا۔ اس کے بعد وہ فہرشل سے اتر کر خلائی جہاز کی طرف روانہ ہوئے۔ سلوب والے راستے سے اندر داخل ہوئے جی انہوں نے اپنے ہتھیار سنہال لیے تھے اور کسی بھی غیر متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔
 بال میں تابوت ویسے ہی رکھے تھے۔ ان کی دلچسپی کا مرکز وہ تابوت تھا جس کو فوگ نے کھول دیا تھا اور اس کے بعد سے یہ سارا چکر شروع ہوا تھا۔ انہوں نے خارج کی تیز روشنی میں اس مخلوق کی لاش کا جائزہ لیا۔ وہ بالکل سادہ پڑھی تھی اور گزشتہ دو دن سے کھلی ہوا میں ہونے کی وجہ سے وہ کچھ خشک اور سبکی ہوئی تھی۔ ریڈ نے کہا۔
 ”یہ یقینی طور پر لاش ہے۔“
 جیمس نے اسے وہیں موجود ایک دھاتی اوزار سے چھیڑا۔ اس کا جسم نرم اور کسی قدر لچکا تھا۔ ریڈ نے پوچھا۔
 ”جب فوگ نے اسے کھولا تھا تو کیا اس کے اندر پہلے سے کسی تھی؟“
 ”میں نے تو یہ نہیں دی تھی، کیونکہ میں اس تابوت کو کمرے سے دیکھ رہا تھا جس کے سامنے جو یو تھا۔“
 ریڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں ایک اور تابوت کھول کر جڑ پکڑنا چاہیے۔“

جیمس ہینکچار۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا؟“
 ”بالکل آخرو فوگ نے بھی تو یہی کیا تھا اور اس نے تمہارے ختم کی صریحاً خلاف ورزی کی تھی۔“
 ”ہاں یہ تو ہے اس بات پر میں نے اس سے جواب طلب نہیں کیا تھا۔“
 ”کیونکہ انہوں نے تمہیں دوسری باتوں میں الجھا دیا تھا۔“
 جیمس ریڈ کے اصرار پر ایک اور تابوت کھولنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے کھٹے والے تابوت کے برابر والے تابوت کا بین دیا اور اس کا شیشے کا ڈھکن ہلکی آواز گئے ساتھ کھل گیا۔ فوراً ہی جیمس نے دیکھا کہ مخلوق کی لاش سے بنیادرات یا ہر کھٹے لگے ہیں۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹا اور اس نے ریڈ کو اشارہ کیا۔
 ”یہ دیکھو ویسے ہی جیس ہے۔“
 جیمس اب بال میں پھیل رہی تھی اور رفتہ رفتہ قلیل ہوتی جا رہی تھی۔ جیمس خوف زدہ تھا کہ اس کیس کے ان پر وہی اثرات نہ ہوں جو جو یو اور اس کے ساتھیوں پر ہوئے تھے۔ کیس کھٹے کے مشکل سے وہ مٹ بعد فوگ کر گیا تھا اور چار مٹ کے اندر اس کے باقی ساتھی بھی گر چکے تھے ان کا جسم مردہ ہو گیا تھا۔ لیکن کیس مٹ گزر جانے کے بعد جب کوئی رد عمل نہیں ہوا تو جیمس نے اطمینان کا حواس لیا۔ اس نے ریڈ سے کہا۔
 ”میرا خیال ہے یہ چیز سانس کے راستے جسم میں داخل ہوتی ہے اور پھر اثر کرتی ہے۔“
 ”اب ذرا اس کا تجربہ کر لیا جائے۔“ ریڈ نے کہا اور اس نے ایک چھوٹی سی لیکن طاقت ور برقی خوردبین نکالی اور دوسرے تابوت میں رکھی مخلوق کی لاش سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر الگ کیا۔ اس نے یہ ٹکڑا خوردبین کے شیشے پر رکھا اور اسکرین پر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے جیمس سے کہا۔ ”دیکھنا کچھ عجیب ہے جراثیم ہیں اس میں۔“
 جیمس نے خوردبین کی اسکرین پر دیکھا تو اسے ٹکڑے کے ساتھ سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے جراثیم نظر آئے جو حرکت کر رہے تھے۔ ریڈ نے خوردبین کی طاقت بڑھا دی تو یہ واضح نظر آنے لگا۔ یہ اصل میں سفید رنگ کی قطعی مٹی گیندیں تھیں جو بے چینی سے اوپر اوپر حرکت کر رہی تھیں۔ جیمس کا بائبلوچی سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن جہاں تک اس کی معلومات تھیں اس نے بھی اس قسم کے جراثیم کے بارے میں نہیں سنا تھا۔ کم سے کم ان جراثیم کا انسانوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ریڈ نے کہا۔
 ”میرا خیال ہے ان جراثیم کا اثر تھا جو جو یو اور اس

کے ساتھی عارضی طور پر مردہ ہو گئے تھے۔“
 ”لیکن جب ڈاکٹر ہوم نے ان کا معائنہ کیا تو اس وقت ان جراثیم کا کیوں پتہ نہیں چلا؟“ جیمس نے اعتراض کیا۔
 ”ممکن ہے وہ جراثیم قلیل ہو گئے ہوں اور جسم کے دفاعی نظام نے ان پر قابو پا لیا ہو۔“
 ریڈ کی وضاحت قائل قبول تھی لیکن جیمس نے اصرار کیا۔ ”مگر ہمیں کسی بہانے سے ان لوگوں میں سے کسی کا جسمانی معائنہ بھی کرنا ہوگا۔“
 ”وہ لوگ شاید اس کی اجازت نہیں دیں گے۔“ ریڈ نے کہا۔
 ”ہم کوشش کر سکتے ہیں۔“ جیمس نے اصرار کیا۔
 ریڈ نے خوردبین کی سلاخ متنازع کر دی تھی کہ کیس یہ جراثیم ان کے ساتھ لگ کر نہ چلے جائیں۔ یہ سفید گیند نما جراثیم اس مخلوق کے جسمانی خلیوں کے درمیان حرکت کر رہے تھے یعنی یہ اس کے جسم میں داخل ہو گئے تھے۔ انہوں نے جراثیم... کامنڈ لینے کا خطرہ مول نہیں لیا کیونکہ اگر یہ خلائی جہاز میں آزاد ہو جاتے تو ممکن ہے پورا خلائی جہاز ہی ان کا شکار ہو جاتا۔ وہ واپس آئے، فہرشل میں بیٹھے اور جس طرح خاموشی سے گئے تھے اسی طرح خاموشی سے واپس آ گئے۔ کسی کو ان پر شک نہیں ہوا تھا۔ اگلے دو دن میں جیمس نے محسوس کیا کہ جو یو اور اس کے ساتھیوں کا رویہ مزید پراسرار ہو گیا تھا اور وہ اکثر ساتھ ہوتے تھے اور۔۔۔ شہر کر کر کیوں جیسے کھانے اور تفریح کے دوران بھی الگ گروپ بنا کر رہتے تھے۔ وہ دوسروں سے اب بات چیت بھی کم کرتے تھے۔ جیمس کا شک بڑھ گیا تھا۔ اس نے ریڈ سے تنہائی میں کہا۔
 ”ہمیں ان میں سے کسی کا جسمانی معائنہ کرنا ہوگا اس سے شاید پتا چلے کہ ان کا رویہ ایسا کیوں ہے؟“
 ریڈ نے کہا۔ ”میں انہیں ہوشیار کیے بغیر اپنا کام کرنا ہوگا۔“
 ”وہ کیسے؟“
 ریڈ نے سوچ کر کہا۔ ”ان میں سے کسی کا جسمانی نمونہ حاصل کرنا ہوگا۔“
 ”جیمس سمجھ گیا۔“ ہاں اس کی کوشش کی جا سکتی ہے۔“
 اگلے روز جیمس کپتان برج سے ملنے کے وقت فوگ کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی نگر سامنے آتے ہوئے فوگ سے ہوئی اور فوگ نے ہلکی سی سسکاری بھر کر اپنا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے سر و نظروں سے جیمس کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا چیز ہے جیمس؟“

جیس نے دیکھا اس کی جیکٹ کا ایک بلیں ٹوٹ جاتے سے نوکیلا ہو گیا تھا، وہی نوک کو لگا تھا۔ دھنوک کے ہاتھ پر آیا تھا اور اس نے اسے دوسرے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ جیس نے وضاحت کی تو وہ اسے گھورتا ہوا بیٹھا گیا۔ اس کے جانے کے بعد جیس نے ہاتھ میں دبا ہوا ماسیڈ فائل جب میں رکھ لیا۔ اس میں ایک ٹیپی سے سوئی لگی تھی جس نے نوک کے ہاتھ سے اس کے جسم کا ایک معمولی سا حصہ نکال لیا تھا اور وہ سوئی سیکنڈ کے برابر دس حصے میں اس فائل میں محفوظ ہو گئی تھی۔ جیس جانے لگا تھا کہ اس کی نظر فرش پر پڑے سفید رنگ کے مائع پر پڑی۔ یہ بالکل خون کی طرح لگ رہا تھا لیکن اس کا رنگ سرخ کے بجائے سفید تھا۔ جیس نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ میس کی طرف چلا گیا وہاں ریڈ اس کا منتظر تھا اور جیس نے سر کے خفیہ سے اشارے سے اسے بتایا کہ اس نے اپنا کام کر لیا ہے۔

شام کو کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے آپارمنٹ میں آیا۔ پکٹان ایوری نے اگلے روز سارے پر جانے والی میم کے سلسلے میں رات کو بیجے مینٹک بلانی تھی۔ کیونکہ خلائی جہاز میں دن رات کا کوئی تصور نہیں تھا اس لیے انہوں نے زمین کا وقت اپنا رکھا تھا اور سارے معمولات اسی کے مطابق انجام دیتے تھے۔ ابھی جیس لاور ریڈ کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ نوک کے جسم سے حاصل کیے ہوئے نمونے کا تجزیہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ جیس کو ریڈ کا انتظار تھا اور وہ کچھ جگہ بعد آگیا۔ خوردبین اس کے پاس تھی۔ اس نے احتیاط سے فائل میں موجود نمونے کو کٹھن سے میس میں منتقل کیا اور پھر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے حیرت زدہ آواز میں کہا۔

”میرے خدا اس میں کچھ بھی وہی جراثیم موجود ہیں۔“ جیس نے جلدی سے اسکرین میں دیکھا۔ ریڈ نے منکر کو واضح کیا تو انسانی خلیات کے درمیان وہی گیند نما سفید جراثیم صاف نظر آنے لگے تھے۔ وہ دونوں دہشت زدہ ہو گئے۔ ریڈ نے ہتھ کمر کہا۔ ”اس کا مطلب ہے یہ جیہ افروڈ انٹیلیجنٹ ہو چکے ہیں۔“

جیس کچھ اور بھی سوچ رہا تھا۔ ”مگر یہ لوگ انٹیلیجنٹ ہو چکے ہیں تو انہوں نے دوسرے لوگوں کو کیوں متاثر نہیں کیا جب کہ وہ سب سے کھل رہے ہیں۔“

”اس کی کوئی تدبیر ہو سکتی۔“ ریڈ نے کہا۔ ”لیکن ہمیں پکٹان کو فوراً خبردار کرنا چاہیے۔“

جیس نے اسے دھکا۔ ”آئی جلدی نہیں۔ کسی کے خون میں جراثیم پائے جانا کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ اصل بات ان لوگوں کا بلا ہوا رہا ہے۔“

”جب تحقیق ہوگی تو ان کے رہے کی وجہ بھی سمجھ میں آجائے گی۔“

”مجھے شبہ ہے کہ پکٹان ایوری شاید ان لوگوں کو الگ تھک نہیں کرے گا۔“

”پھر بھی میں ان کے بارے میں بتانا چاہیے۔“ ریڈ بولا۔ ”اور آج مینٹک نے ان کا کہہ کر اس کا اور وہاں خوردبین ثبوت کے طور پر پیش کر دیا۔“

جیس چاہتا تھا کہ وہ اس معاملے میں مزید تحقیق کریں لیکن ریڈ کے کہنے پر وہ مان گیا کہ انہیں یہ سارا معاملہ مینٹک میں پکٹان اور دوسرے لوگوں کے سامنے رکھ دینا چاہیے۔ وہ رات کو مینٹک میں پہنچے اس میں کل دس افراد تھے ان میں انٹیلیجنٹ گروپ سے صرف پانچ افراد اور جو ریڈ تھے۔ باقی بچے درجے کے لوگ تھے جو اس قسم کی مینٹک میں شامل نہیں ہوتے تھے۔

جیسے ہی باقی بقیوں پر بیٹھے ریڈ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میں کل کی میم کے ایجنڈے سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

پکٹان ایوری اور دوسروں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”گوئی اتنی اہم بات ہے سسر ریڈ؟“

”اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ ممکنہ طور پر یہ اس جہاز اور اس میں سوار افراد کی بقا کا سوال ہے۔“

”میں اپنی بات جاری رکھوں۔“ ایوری نے کہا۔

ریڈ نے پہلے خوردبین اس کے علاوہ کتنے کے لیے پیش کی اور پھر بتایا۔ ”یہ نوک کے جسم سے حاصل شدہ نمونے اور اس میں وہی جراثیم ہیں جو سارے پر موزہ جوتلوں کے جسم میں ہیں۔ میں اور جیس خود ان کا مشاہدہ کر کے آئے ہیں۔“

”یہ کیا بکواس ہے۔“ جو ریڈ غریب۔ ”تمہیں کوئی اختیار نہیں ہے کسی کے جسم سے اس کی مرضی کے بغیر نمونے لینے کا۔“

”ہاں لیکن ہم نے جو نمونے لیے ہیں ان کے مطابق نوک انٹیلیجنٹ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ تم پانچ افراد باقی تین افراد بھی ان جراثیم کا شکار ہو چکے ہو۔“

”یہ بکواس ہے۔“ پانچ بولا۔ ”انہی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی انٹیلیجنٹ نہیں ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو اس کی بڑے آرام سے تصدیق ہو سکتی ہے۔“ ریڈ نے کہا۔ ”تم سب کا بلڈ سے کرچک کیا جائے تو حقیقت خود سامنے آجائے گی۔“

”ہم کوئی بلڈ ٹیسٹ نہیں دیں گے۔“ جو ریڈ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

پکٹان ایوری خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

جو ریڈ اور پانچ نے اپنے رویے سے خودکامیاب کر دیا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہے تھے۔ پکٹان نے جہاز کے سیکورٹی انسپران جین سے کہا۔ ”ان دونوں اور باقی چار افراد کو حراست میں لے لو اور ان سب کو الگ بند کر دو۔“

جو ریڈ چلا گیا۔ ”تم انہیں اس کر سکتے۔ ہمارا قصور کیا ہے؟“

جین نے ہتھکڑی لگا کر جو ریڈ کی طرف بڑھا لیکن اس نے جو کیا وہ کسی نے سوچا نہیں تھا۔ اس نے اپنا تک میز سے پھیر کر اٹھا لیا اور بولا۔ ”خبردار کوئی میرے پاس نہ آئے۔“

جان پناہ بدستور جو ریڈ کی طرف بڑھتا رہا تو اس نے پھر کھڑا اپنے گلے سے لگا لیا۔ ”میرے پاس آئے تو میں خودکشی کر لوں گا۔“

اس پر بھی جان نہیں دکا اور جب وہ جو ریڈ کے پاس پہنچا تو اس نے اپنا تک میز کھینچ کر اپنے گلے میں اتار لیا۔ جان ششدر رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جو ریڈ صرف دھمکی دے رہا ہے۔ ورنہ ایسی بات پر خودکشی کون کرے۔ پھر وہ اچھل کر پیچھے ہٹا کیونکہ جو ریڈ کے کہنے ہوئے گلے سے سفید رنگ کا سیال اچھل کر باہر نکل رہا تھا اور وہ دھڑا مے فرش پر گر گیا۔ اس کے کتے گلے سے سفید سیال بالکل خون کی طرح ابل رہا تھا اور فرش پر پھیل رہا تھا۔ جیس پھر ادا دی طور پر مینٹک روم کے دروازے کے کمرے پہنچا گیا جب کہ باقی سب جو ریڈ کے پاس جمع ہو رہے تھے جو آخری دھمکی پر کھڑا کسی نے اسے بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس دوران میں جان نے پانچ کو زبردستی لیا تھا لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور سکون سے کھڑا رہا تھا۔

جیسے ہی جو ریڈ کا جھٹکے لیتا جرم مسک ہوا اس سے سفید کیس تھا چیز خارج ہونے لگی۔ اس کے پاس موجود نوک خوف زدہ ہو کر گر چھپے پڑے تھے۔ جیس سب سے پیچھے تھا۔ اس نے جیسے ہی سفید کیس دیکھی وہ بھاگا اور مینٹک روم سے نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا۔ جو ریڈ کی لاش کے پاس موجود افراد بیٹھی طور پر اس کیس کا شکار ہو چکے تھے جو اصل میں کیس نہیں بلکہ سفید رنگ کے ننھے جراثیم تھے۔ یہ جراثیم بھی کیس بلکہ کوئی اعلیٰ مخلوق تھی جو انسان برقا میں ہو جاتی تھی۔ ورنہ جراثیم تو انسان کو جسمانی طور پر متاثر کرتے ہیں اس کے ذہن پر قبضہ نہیں کرتے۔ جیس نے بھی جان گیا تھا کہ ان جراثیم سے انٹیلیجنٹ افراد دوسروں کو کیوں متاثر نہیں کر رہے تھے۔ جب تک انٹیلیجنٹ فرد زندہ ہوتا تھا یہ جراثیم کی اور کو نہیں نکلتے تھے لیکن جیسے ہی وہ مر جراثیم اس کے آس پاس کے لوگوں پر حملہ آور ہو جاتے تھے۔ جیس کو عقب سے لوگوں

کے پیچھے چلانے کی آواز میں آ رہی تھیں۔

جیس اپنے آپارمنٹ کی طرف جا رہا تھا اپنا تک اسے سامنے سے جو ریڈ کے دو انٹیلیجنٹ ساتھی اپنے دو ٹھیک ساتھیوں کو پکڑے نظر آئے۔ وہ مینٹک روم کی طرف جا رہے تھے۔ جیس نے راست بدل دیا وہ اب خلائی جہاز کے ایک خفیہ چیمبر کی طرف جا رہا تھا جس میں کوئی بھی بہ وقت ضرورت پتاہ لے سکتا تھا۔ اس چیمبر میں بہت ساری ایسی چیزیں تھیں جن تک کسی عام کارکن کی رسائی نہیں تھی اور اس مقصد کے لیے چیمبر میں داخلے کا طریقہ صرف پہلے تین انسپران یعنی پکٹان ایوری، ریڈ اور جیس کو پتا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا چیمبر کے دروازے تک پہنچا اور اس نے جلدی سے نمبروں والے لاک پر مخصوص کوڈ ڈالا۔ اسی وقت اسے عقب سے بھانسنے قدموں کی آواز آئی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا وہ اندر داخل ہوا اور اسے ہند کرنے والا بلیں دیا۔ اسی لمحے راہداری میں پانچ نمودار ہوا اور بڑی تیزی سے بند ہوتے دروازے کی طرف لپکا۔ جیس نے محسوس کیا کہ وہ دروازہ بند ہونے سے پہلے اندر گھس آئے گا۔ اس لیے تیس آگے آیا اور جیسے ہی پانچ اس کے پاس آیا۔ اس نے پوری قوت سے پاؤں پانچ کے پیٹ میں مارا۔ پانچ اور تیس دونوں مختلف سمت میں جا گئے۔ اس دوران میں دروازہ بند ہو گیا۔

جیس نے جلدی سے کنٹرول روم پہنچے تو وہاں کسی اب کوئی خلائی جہاز تو اس کی مرضی کے بغیر نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس دوران میں چیمبر کے دروازے کے باہر کی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ یہ پانچ اور جو ریڈ کے ساتھی تھے۔ پانچ نے کہا۔ ”تم بیچ نہیں سکتے۔“

”فی الحال تو میں یہاں محفوظ ہوں۔“

”یہ تمہاری خوش گنجی ہے۔“ پانچ بولا۔ ”جلد ہم یہاں موجود ہر فرد کو اپنے جیسا بنائیں گے اور اس کے بعد تم اکیلے رہ جاؤ گے۔“

”کیا تم لوگ اعلیٰ ہیں؟“ جیس نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سیارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری جسامت دیکھ چکے ہو اس جسامت کے ساتھ ہم کیسا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر نہیں کر سکتے۔ پانچ بولا۔ ”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہم اس سیارے کے مالک ہیں۔“ پانچ بولا۔

”سیارے پر موجود خلائی جہاز

”ہاں ہم کسی جاندار کے اندر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ مخلوق بہت پہلے آئی تھی اور ہم نے اس پر قبضہ کر لیا مگر پھر اس کی طبیعت عریض ہو گئی اور یہ ایک ایک کر کے مر گئے۔ اپنی بھائیں لے لیے ہم نے ان کی لاشوں کو تابوتوں میں ڈال دیا اور انہیں سیل کر دیا۔ ان میں ہم محفوظ ہو گئے تھے۔ اگر کوئی ان تابوتوں کو کھولنے کی کوشش کرتا تو وہ ہمارا شکار ہو جاتا جیسے کرم لوگ ہو گئے۔“

”اگر تم لوگوں کو کوئی زندہ جسم نہ ملے تو؟“
 ”تو ہم کچھ دیر میں مر جاتے ہیں۔ لیکن ایسا ہوا نہیں ہے۔ ہمیں اپنا بھائی کے لیے کوئی زندہ جسم مل جاتا ہے۔ اصل میں ہم کسی زندہ جسم میں ہی اپنی امداد دہا سکتے ہیں۔“

”یعنی تم لوگ دائرس ہو؟“
 ”ہاں ہم ایک لحاظ سے دائرس ہیں۔“ پارکر مسکرایا۔
 ”لیکن ہم کسی جسم کو جاہ نہیں کرتے ہیں بلکہ اسے اپنے کام میں لاتے ہیں۔ اس کی معلومات اور ذہانت کا فائدہ اٹھاتے ہیں ہم اس کی ذہانت کے مرکز پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس کی سوچیں اس کی یادداشت اور اس کی شخصیت تک اپنا لیتے ہیں۔“
 ”تم لوگ عام حالات میں دوسروں کو کیوں انکیٹ نہیں کرتے؟“

”کیونکہ جب ہم کسی جسم میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت تک کے لیے اس کے قیدی بن جاتے ہیں جب تک وہ جسم زندہ ہوتا ہے اور جب وہ مر جاتا ہے تو ہم آزاد ہو جاتے ہیں ویسے کوئی مسئلہ نہیں ہے تم نے دیکھا جب ہم نے آزاد ہوتا چاہا تو جو بولنے خود کو مار دیا۔“

”نہیں یہ دیکھ رہا تھا اور اس کا ذہن امکانات پر غور کر رہا تھا۔ اگر اس خوف ناک اور غمی سے مخلوق نے تین تک رسائی حاصل کر لی تو اسے پوری زمین کے انسانوں اور دوسرے جانداروں پر قبضہ کرنے میں چند دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ پارکر اور اس کے ساتھی وہاں سے چلے گئے تھے اور کچھ دیر بعد اس نے دروازے کے کچھ سے ایوری سمیت دوسرے افراد کو آتے دیکھا ان میں ریڈ بھی تھا۔ ایوری نے اس سے کہا۔“

”دروازہ کھول دو ہم نے حالات پر قابو پا لیا ہے۔“
 ”مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ تم ان سب پر بھی قبضہ کر چکے ہو اور اب یہ سب تمہارے حکم کے غلام ہیں۔“

”ایوری درست کہہ رہا ہے۔“ ریڈ آگیا۔ ”ہم نے ان پر قابو پا لیا ہے تم دروازہ کھول دو۔“
 ”اچھا تم اپنے بازو پر چھوٹا سا کٹ دگاؤ اگر اس سے نکلنے والے خون کا رنگ لال ہو تو میں مان لوں گا کہ تم بدستور

انسان ہو۔“
 ریڈ اس کی بات سن کر ہنسنے لگا تھا۔ ”لگتا ہے تم اس طرح نہیں مانو گے۔ اگر ہم نے فیصلہ کر لیا تو اس دروازے کو کاٹنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا اس کے بعد تم خود کو بچانے کے لیے کیا کرو گے؟“

چچس خاموش رہا تھا۔ اس پر کپتان ایوری نے ویلڈنگ مشین لانے کا حکم دیا۔ چچس جانتا تھا وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ویلڈنگ مشین اس مضبوط ترین دروازے کو مشکل سے ایک گھنٹے میں کاٹ دیتی اور اس کے بعد وہ ان کے رحم و کرم پر ہوتا۔ جیسے ہی کپتان ایوری نے حکم دیا وہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے چمبر کے اندر دھکی دیا اور کنٹرول پینل کی مدد سے ایک خاص خانہ کھولا۔ جس کے اندر دوسری کس بھری ہوئی تھی وہ کچھ دیر کس خارج ہونے کا انتظار کرتا مگر

وہ اس خانے میں اتر آیا۔ اندر ایک چھوٹے سے گول کمرے کے وسط میں فرش پر ایک سلیڈز نما چیز پوسٹ تھی۔ اس نے اس کے کسی بورڈ پر کوڈز کی تسلیڈز کا اوپری حصہ کھل گیا اور اس میں موجود چیز سامنے آ گئی۔ یہ انسانوں کا تیار کردہ جہاز کن زمین پر تھا۔ یہ جہاز تو اس پورے خلائی جہاز کو بڑھ دینے کے برابر تھا۔ اس نے ہم کا سسٹم آن کیا اور اس کے خود بہ خود حرکت میں آ جانے والے نظام میں ایک گھنٹے کا ٹائم سیٹ کر کے اس کے لاک توڑ دیے۔ اب ہم کو ایک گھنٹے بعد پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ یہ کام کر کے وہ تیزی سے اس خانے سے باہر آیا۔ پہلے اس نے چاکر دیکھا۔ وہ لوگ ویلڈنگ مشین لے آئے تھے۔ یہ بہت جدید مشین تھی اور اگر

چمبر کا دروازہ کسی عام دھات کا بنا ہوتا تو وہ مشین اسے دس منٹ میں کاٹ ڈالتی لیکن اس دھات کو کاٹنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ اس چمبر کے عین نیچے ایک چھوٹا سا خلائی جہاز تھا۔ اس نے خلائی جہاز تک جانے کا راستہ کھول کر اس کے سامنے پروٹی دروازے جن سے اندر آیا جاسکتا تھا سیل کر دیے۔ ابھی تک ان لوگوں کا دھیان اس طرف نہیں آیا تھا۔ ورنہ وہ اس راستے سے اندر آ سکتے تھے۔ اس نے خلائی جہاز کا سسٹم آن کیا اور اسے فوری طور پر بڑے جہاز کے مرکزی کنٹرول سے الگ کر دیا۔ اب وہ مکمل طور پر اس کے اختیار میں تھا۔

وہ اوپر آیا تو دروازہ نصف کے قریب کٹ چکا تھا۔ اس نے کپتان ایوری سے کہا۔ ”سسٹم کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دو؟“

کپتان ایوری نے اشارے سے ویلڈنگ مشین استعمال کرنے والے کو روک دیا پھر اس نے کہا۔ ”میں نہیں

ہے کیونکہ یہ ہماری بقا کا سوال ہے۔“
 ”میں تم لوگوں کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔“
 لیکن کپتان ایوری نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے اشارہ کیا اور ویلڈنگ مشین چلانے والے نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ہم جیسے ہی ابھی نصف گھنٹا باقی تھا۔ اتنا ہی وقت دروازے کو کٹنے میں لگتا۔ وہ جانتا تھا کہ جب وہ یہاں سے نکلے تو ان لوگوں کو اس کا تعاقب کرنے کا موقع نہ ملے۔ کیونکہ اس خلائی جہاز میں ایسی مشین بھی تھی جن میں جہاز کن کس موجود تھیں جو اس کے خلائی جہاز کو دور سے تباہ کر سکتی تھیں۔ اس لیے وہ وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا اسے کاٹنے جانے کا منتظر دیکھتا رہا۔ وہ فخر و سولے لے رہا تھا۔ کیونکہ دروازے میں ڈراما سورج ہو جاتا تو جراثیم کے اندر آنے کا امکان تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ اب میں منٹ رہ گئے تھے۔ پھر چند منٹ اور پھر دس منٹ۔

دروازہ اس کے اندازے سے پہلے کٹنے والا تھا اور اس کے بعد ان لوگوں کو اندر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ خلائی جہاز کی طرف بھاگا۔ اس کے اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور اسے بڑے جہاز سے الگ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ انہیں اشارت ہوتے ہی ان لوگوں کو پتا چل جائے گا۔ مگر اب لکھنا اس کی ججوری بن گیا تھا۔ کیونکہ ہم جیسے ہی صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ اسے اپنے خلائی جہاز کو محفوظ فاصلے تک لے جانا تھا تاکہ اس جہاز کا اس پر اثر نہ پڑے۔ اس نے خلائی جہاز کو آواز کرنے والا پور دیا اور جہاز الگ ہو کر چلے جانے لگا۔

ذرا دیر بعد جس نے اس کا تھروگل کھینچا تو خلائی جہاز سرعت سے آگے بڑھا اور بہت تیزی کے ساتھ بڑے خلائی جہاز سے دور جانے لگا۔ ہم جیسے ہی ایک منٹ باقی رہ گیا تھا اور پھر یہ ایک منٹ بھی پورا ہو گیا اور ایک خیر و کن شعلے نے اس سنبھاتا کر ایک جیسے کو روک دیا۔

☆ ☆ ☆
 ”اس کے بعد کیا ہوا؟“ مل نے پوچھا۔
 ”جیسے نے جواب دیا۔“ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں سچ گیا ہوں تو میں نے خلائی جہاز کو آٹھ پانچ کر کے اس کے کمپیوٹر میں زمین کا راستہ سیٹ کر دیا اور خود ہائی بریٹ چمبر میں لیٹ کر سو گیا۔“

”یعنی تم اعتراض کر دے ہو تم نے ایک قیمتی خلائی جہاز اور اس کے انہیں افراد کو موت کے کھٹا اتار دیا؟“ مل نے کہا۔

”ہاں لیکن وہ انسان نہیں تھے بلکہ ایسے ایسے بن چکے تھے۔ جن سے پوری انسانیت کو خطرہ تھا۔ ذرا سوچیں اگر وہ زمین پر آ جاتے تو یہاں کیسے پھیلتے۔“
 ”تم درست کہہ رہے ہو۔“ شیری بولی۔ ”ہم نے تمہارے خلائی جہاز کا جو ریکارڈ چیک کیا ہے اس سے تمہاری بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ تمہاری اور دوسرے افراد کی بات چیت محفوظ ہے اور اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر صورت میں تمہیں چمبر سے باہر نکالنا چاہتے تھے جبکہ ان کی باتوں سے ان کے غیر انسانی حلقوں ہونے کا صاف پتا چل رہا تھا۔“
 ”جیسے خوش ہو گیا۔“ ”میں ابھی تم کوئی الزام نہیں ہے لیکن“
 جب تک تحقیقات مکمل نہیں ہو جاتیں تم کو ذرا بھگنا رہنا ہوگا اور فی الحال تمہارا خلائی پائلٹ کالا سسٹم ہی مکمل ہے۔“

”ہاں لیکن وہ انسان نہیں تھے بلکہ ایسے ایسے بن چکے تھے۔ جن سے پوری انسانیت کو خطرہ تھا۔ ذرا سوچیں اگر وہ زمین پر آ جاتے تو یہاں کیسے پھیلتے۔“

”تم درست کہہ رہے ہو۔“ شیری بولی۔ ”ہم نے تمہارے خلائی جہاز کا جو ریکارڈ چیک کیا ہے اس سے تمہاری بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ تمہاری اور دوسرے افراد کی بات چیت محفوظ ہے اور اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر صورت میں تمہیں چمبر سے باہر نکالنا چاہتے تھے جبکہ ان کی باتوں سے ان کے غیر انسانی حلقوں ہونے کا صاف پتا چل رہا تھا۔“
 ”جیسے خوش ہو گیا۔“ ”میں ابھی تم کوئی الزام نہیں ہے لیکن“
 جب تک تحقیقات مکمل نہیں ہو جاتیں تم کو ذرا بھگنا رہنا ہوگا اور فی الحال تمہارا خلائی پائلٹ کالا سسٹم ہی مکمل ہے۔“

”میں اس قسم کی تحقیقات کا طریقہ کار جانتا ہوں جناب اور میں آپ کو مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ میں نے جو کیا وہ انسانوں کو بچانے کے لیے میری بہترین کوشش تھی۔“
 بورڈ نے اس کا اولین انٹرویو ختم ہونے کا اشارہ دیا اور جیسے مینٹک روم سے نکل آیا۔ ان دنوں وہ ایک چھوٹی سی سرکاری عمارت میں مقیم تھا اور اسے فی الحال باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے اس کی رہائش گاہ میں تمام سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ اس کے بعد اس کے کسی نمائندہ ہونے اور پھر اس کا طبی معائنہ بھی ہوا۔ اسے ہر لحاظ سے فیکٹر قرار دے دیا گیا تھا۔

چھ مہینے کی طویل مدت کے بعد اسے اس قید سے رہائی ملی اور ساتھ ہی اس کے عہدے پر بحال بھی کر دیا گیا تھا۔
 جیسے اس دن بہت خوش تھا۔ اس نے بورڈ کو سب سچ سچ بتایا تھا سوائے ایک بات کے اور وہ یہ تھی کہ جب وہ ہائی بریٹ چمبر میں لیٹا جا رہا تھا اس کی وردی کی جب سے وہ فوٹاں نکل کر چمبر میں گری گئی جس میں اس نے نوک کے جسم سے ٹکرا لیا تھا۔ جہاز میں شاید کوئی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے وہ لوگ انسانی جسم میں مکمل طور پر جذب نہیں ہو سکے تھے اور ان کا خون سرخ رہ گیا تھا لیکن زمین پر آنے کے بعد جذب ہونے کا یہ عمل مکمل ہو گیا تھا اور جس کا جسم مکمل طور پر انسانوں جیسا تھا کوئی ٹھنی ٹھنی اس کی حقیقت نہیں جان سکتا تھا۔

فی الحال وہ اکیلا تھا اور ابھی مرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا جب اس کی موت ہوئی تو ان کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور بہت جلد وہ وقت آ جائے گا جب زمین پر ان کا راج ہوگا اور وہ انسانوں کو اپنا غلام بنائیں گے۔

☆ ☆ ☆

تقسیم کے پھر میں الجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہانہ اسے دیار غیر لے گیا جہاں وہ اناٹری تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناٹری پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا اسے پر دینے والے آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزی اس کا دل لہاتی تھیں مگر دوسری طرف دینے میں اس کی لاٹری کھیل گئی ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ اناٹری سے کھلاڑی بننے کے بعد وہ لوٹا تو ہنگامے اور ضرورتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آتسو اور لمحہ لمحہ قہقروں سے لہریز اس اناٹری کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

دور حاضر کے فتنوں اور حالات کی عکاس ایک داستان رنگ پر رنگ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

گرد و پیش کا احوال۔ منظر کشی کا کمال۔ ایک داستان لازوال، آج کے زعمہ کرداروں کی منتقل کہانی جسے احمد اقبال کی زمانہ شناس نگاہ دورِ عمر آفریں امتداد دیتے ہوئے تھمتی کیا۔
سنے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔



خوش ہوتا تھا۔ سر کا سامنے والا نصف حصہ اس نے استرا پیچھے رکھے یا پھر اوکے صاف کر رکھا تھا۔ پچھلے نصف حصے میں لمبے لمبے بال تھے جو پیچھے کی طرف اس کی گردن سے نیچے تک جاتے تھے۔ انہیں اس نے سر کے درمیان ایک سلور بینڈ سے باندھ رکھا تھا۔ وہ جو بلا پتلا اور مختصر قد کا جو کرنا سب خاص تھا اور طوطے کی چونچ جیسی ناک کے ساتھ مزید مہکمہ خیر ملتا تھا۔۔۔۔۔

اس نے دھاری دار لی شرت اور پیلے رنگ کی پتلون پہننا دیکھی تھی۔

کلا شکوف کو ہوا میں پکڑنے کا مظاہرہ پانچویں چھٹی کوشش میں ناکامی سے دو چار ہوا۔ کلا شکوف بڑی آواز کے ساتھ فرش پر گرکا اور جو کرنے اسے لپک کے یوں اٹھایا جیسے وہ اس کا شیر خوار بیٹا تھا جسے وہ ہوا میں اچھال کے کھیل رہا تھا اور اتنی ہی تسکین کے ساتھ اس کا معائنہ کرنے لگا۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے شخص نے قہقہے لگے کہا۔

”یہ تو اپنا نام بھی بھول گیا..... اے سورج بھوتی کے..... کون سے قہقہے؟“

اس وقت تک میرا مانع کام کرنے لگا تھا اور مجھے
مجبوراً یاد آگیا تھا لیکن اچانک وہ دن میں آنے والے ایک
خیال کے تحت میں سوال کرنے والے کو خالی خالی نظروں سے
وہ نکھڑ رہا۔ "نام۔ کیا ہے میرا۔ نام؟"
کلا شکوف اچھالنے والا اب مطمئن ہو گیا تھا کہ اس
کے لاڈلے ہتھیار کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا۔ تاہم اس
اپنے انہماکی بند کر دیا تھا اور دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا
تھا۔ اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "ابے تیرا نام ہے شاہ رخ
خان۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں تاہم۔ سال لے لے کثیر۔"

میرے قریب بیٹھا ہوا شخص زیادہ عمر کا بھاری مہر کم
آوی تھا۔ وہ چہرے سے بھی زیادہ سٹاک لگتا تھا۔ اس کا چہرہ
چوڑا اور ٹھیک تھا، بالکل کسی بوڑھے بل ڈاگ کی طرح۔ وہ
سائس سمیٹے ہوئے غراتا بھی تھا۔ اس کی آنکھوں میں لالی
تھی اور آنکھوں کے نیچے مہرے طے تھے۔ اس نے وسیلی
ڈھالی سیاہی شرٹ کے ساتھ جینز کی چٹلون پہن رکھی تھی۔ فی
شرٹ پر ایک نئی عورت کی تصویر تھی جو بڑے فخر کے ساتھ
اپنے جسم کے قائل ویدھوں کو نمایا کر کے پیش کر رہی
تھی۔ ظاہر ہے حسن میں اس کے لیے شرم کی کوئی بات ہی
نہیں تھی۔

بل ڈاگ نے مجھے ایک لات رسید کی..... ”تو بڑا تیسرا مارخان ہے..... آ جا متا بلے پتیری تو.....“

میں نے غصے گرا۔ اس کی لات میرے کندھے پر لگی تھی۔

یہ کسی پروفیشنل کی ٹھگ ہوتی تو میرے شانے کی ہڈی ٹوٹ جاتی لیکن بقول علامہ اقبال..... کار کا ہوتو شمشیر پر کرتا ہے بھروسہ..... ان کی ساری طاقت اس انٹینسٹیشن میں تھی جس کا رخ وہ میری طرف کر چکا تھا۔ میرے شانے میں چوٹ سے درد ضرور ہو رہا تھا لیکن وہ جتنا بے برداشت تھا کمر میں نے چپے کے تاثرات اور آہ و کھ سے یہ ظاہر کیا جیسے واقعی میرے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

مجھے گرفتار کر کے اپنی قید میں رکھنے والے مگوئے یہ معاش نہیں تھے۔ اپنے ہی ہم زبان تھے۔ پاکستانی یا انڈین۔ لہجہ کو ایسا دیتا تھا کہ وہ انڈین ہوں گے، یہ خاصی حیرانی کی بات تھی کہ فارم ہاؤس کے گیٹ پر وہ میز انتظام کر رہے تھے۔ مجھے وہاں بلائے والا اسٹیبل کا نگران سامن تھا جس نے کہا تھا کہ آف کسٹر شائر مجھے رہیں گے بھوڑوں کی منہ مالکی قیمت دینے کے لیے تیار ہیں اور ادائیگی ایک سادہ چیک سے کریں گے اور اس میں رقم میں اپنی مرضی سے بھر دوں گا۔

نظارہ ہے یہ سب کو اس حسی..... سامن خود مجھ سے سخت
ناخوش تھا لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ کسی نے سامن کی آواز نہ کر مجھے
بلیا ہو۔ میں صرف ایک ہار سامن سے ملا تھا مجھے آواز کی
شناخت میں دھوکا ہو سکتا تھا تاہم زیادہ امکان یہی تھا کہ اس
نے سامن کی یا وہ کسی سلاشی فون کے ساتھ مل گیا، بعد میں
وہ بیان ملتی بھی دے ملتا تھا کہ اس نے مجھے کوئی فون نہیں کیا
تھا، اس کے اوپر میرے درمیان ہونے والی گفتگو کسی نے بھی
نہیں سنی تھی لیکن کسی بھی فون کا لو کیپ کر لینا مشکل نہیں ہوتا۔
اگر کچھ لوگ میری نقل و حرکت اور معمولات کی نگرانی کر رہے
تھے تو انہوں نے فوراً سب کو بتا دیا ہوگا کہ موع چھا ہے.....
شکار آگیا ہے۔ کوئی مسلح محافظ ساتھ نہیں اور جہاں اسے پکڑا
جاسکتا ہے وہاں دیکھتے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔

مل ڈاگ نے آگے جھک کر میرا شانہ ہلایا۔ ”کیا بہت درد ہو رہا ہے۔“

میں نے کراہ کے کہا۔ ”ہاں..... کہیں بڑی نہ ٹوٹ گئی ہو۔“

رایتنا نے کہا۔ ”بڑی ٹھیک بڑیاں ہیں تیری..... اے ٹوٹنے والی نہیں ہیں۔“

اساتف نے کہا: ”ابھی تو کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔“
 میں نے کہا: ”آخر کیا چاہتے ہو تم لوگ..... کیوں
 لائے ہو مجھے یہاں؟“
 رابن نے ہنس کے کہا: ”اے ہم کہاں سے لائے

ہیں، تو پیدا ہی یہاں ہوا تھا۔۔۔۔۔“

استاد نے اپنے سخت بڑے سائز کے شلے جیسے ہاتھ سے میرا چہرہ دیکھ کر ایک طرف سے چادر اٹھایا اور دوسری طرف سے اس کا ٹکڑا میرے گالوں میں گڑ گیا۔ ”ہاں بول..... شاباش..... نام کیا ہے تیرا۔“

میں اسے خالی خالی خوفزدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔
میرے خالی الدہن بیوے کی اداس کاری سے وہ کچھ تسکین اور
پریشان نظروں لگے اٹھا۔ میں نے اس تھیل کو جہاز رکھنے کا
فیصلہ کیا اور یہ تھا جہاز کیا کہ میں سوچ رہا ہوں۔ "نام..... کیا نام
ہے میرا....." میں نے جیسے خود سے کہا۔

”ہاں..... سوچ، تجھے یاد آ جائے گا۔“
میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔ ”شاہ رخ
خان..... یہی نام ہے میرا..... ہاں۔“

اسیاد کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا اور منہ پر لگنے والے پچھتر نے مجھے گرا دیا۔ ”تو شواد بخ خان ہے۔“ اس نے مجھے لاکھ گالی دی۔

راہن کو بلا وجہ ہمنے کی عاوت تھی۔ ”دیکھا استاد“

اسناد کی نظر مجھ پر جمی تھی۔ "یار سب سے زیادہ ادا حق کہتا ہے۔
 پلے نہ مچا پتا۔"
 میں نے داس کیساتھ ساتھ سے پیشانی کو مڑوا کر "اگر شاہ
 رخ خان نہیں..... تو پھر وہ ہوگا، جو تم نے کہا تھا..... تیس مار
 خانہ۔"

ایسا لگتا تھا کہ میری اداکاری کا سیلاب جاری ہے۔
 رابن کی جیسی تنقید بھی اور استاد بھی کچھ تنقید نظر آئے لگے
 تھے۔ "نہیں..... یہ حیرانام نہیں ہے، دماغ پر تورو سے یاد
 چائے گا۔"

راہن نے تجویز پیش کی۔ ”استاد ایسے یہ کچھ نہیں بتائے گا، ترکیب نمبر گیارہ آکر ماکے دیکھو۔ مریچوں کی دھوئی دو اللہ انکا کرے۔“

استاد نے بے خیالی میں کہا۔ ”اس سے کیا ہوگا؟“
 ”اللہ قسم بڑے بڑے جن اس سے اتر جاتے ہیں،
 دس سال نوکری کی ہے پولیس کی..... پتھر کے بت سے
 امتحان فہرہ کرنا آتا ہے۔“

”کواس مت کر..... مجھے لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔“

راہن قریب آگیا۔ ”ایسے ڈرامے بہت دیکھے ہیں
میں نے، سارے قتل کر کے آتے تھے اور یا مکمل بن جاتے تھے،

افسوساً نہ

”اوہ میرے جیون ساتھی! تم کہاں بیٹے گئے؟
تم تو جانتے تھی ہو کہ اگر ایک مہل بھی تم میری نظروں
سے اوجھل ہو جاؤ تو میں کتنا بے چین ہو جاتا ہوں۔
اس دُور سے کہ کہیں کوئی تمہیں چرانے لے، میں سوتے
وقت تمہیں اپنے سر پرانے رکھ کر سوتا ہوں۔ تم نے دیکھا
تھا کہ میں تمہاری خاطر بینین سے لڑاؤں تھا کیونکہ اس
نے مجھ سے تمہیں آدھے گھنٹے کے لیے اوجھل کرنا تھا
تم تو ہر وقت میرے ساتھ ہوتے ہو! جو میں دیکھتا
ہوں، وہ پہلے تم ہی کہتے ہو۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے
جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ آج بھی مجھے وہ
دن یاد ہے جب تم میرے پاؤں پر گر کر زخمی ہوئے تھے
اور میں نے اپنے جیب خرچ سے پیکیٹ روپے بھا کر
تمہاری لوہار سے ویڈیو گرائی تھی۔ بس..... بس،
ایک مرتبہ تم مجھ مل جاؤ، پھر دیکھنا..... میں تمہیں اچھی
سراکتوں پر بٹھائے رکھوں گا۔ اوہ..... اب مجھے یاد
آیا! تمہیں بینین نے اٹھا لے جانے کی دھمکی دی تھی نا
اس لیے میں نے رات کو تمہیں ایک ڈیبا میں بند کر دیا
تھا کہ اس بینین تمہیں اٹھا لے جا کر تمہاری توڑ پھوڑ
نا کر سکے! اوہ میرے نظر کے چشمے!

ایک رات میں ان کی عقل واپس آجاتی تھی۔۔۔۔۔ تم مجھے ایک موقع دو۔“

استاد کچھ تذبذب کا شکار تھا کہ اپنی قتل پر بھروسہ
 کرے یا راہن کی مانے..... بالآخر اس نے راہن کو ترکیب
 برکبادہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی..... دیکھیے.....
 کریم مرگیا تو تیسرے بیوی بچوں کا قیام کرے شیخ کباب بنا
 دوں گا اور تجھے کھلا دوں گا۔"

ترکیب نمبر گیارہ نمٹل ایک اصطلاح تھی..... اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کوئی ترکیب نمبر دس بھی ہوگی، جب رائے نے میرا چارج کیا تو میرے لیے صورت حال کو الٹ دینا مشکل نہ تھا، اسناد کا ریور ایو پیلے ہی اس کی جیب میں چلا گیا تھا، ورد رائے کی کلا شکوف پر بھر دسا کر رہا تھا۔ اب وہ چھرا پانی کر رہا تھا۔ اس وقت میں ایک جستیں رائے سے اس

کی کھا شکوف چھین لین تو دس سیکنڈ میں ان دونوں کے پھر کتے
”میرے قریب رہا ہے“ میں نے غلطی نظر آتے لیکن میں نے
جوش کو ہوش پر غالب نہیں آنے دیا یہ بات یقینی تھی کہ مجھے اس
زندان میں لاکے قید میں رکھنے والے وہی افراد نہیں ہوں
گئے۔ اس دیوار کے بعد اور کئی دیواریں ہوں گی اور کتنے دشمن
ہوں گے۔ اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا، میں تو یہ بھی نہیں جانتا
تھا کہ یہ کمزار زمین کی کتنی گہرائی میں ہے یا کتنی بلندی پر۔
جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، راتین کا اصل نام
راہنہ راجہ تھا، وہ بھنگوان کی گمراہی کے بجائے قسم اللہ کی کہتا تھا
تو یہ شخص ایک عادت تھی جیسے اکثر ہندو اللہ یا خدا خیر کرے
جیسے جملہ استعمال کرتے ہیں۔ مجھے اس کمرے میں دن
رات کا اندازہ کرنا مشکل تھا کیونکہ وہاں بجلی کی مصنوعی روشنی
تھی، وقت کا تاریخ کا اب کیا پتا چلتا، قید میں رہتی اذیت
دینے کا یہ سبب طریقہ ہے۔ میرے ہاتھ پر سے گھڑی بھی
اتاری گئی تھی اور میں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ مجھے وہاں ایک دن
پہلے لایا گیا تھا یا ایک ہفتے پہلے۔ بے ہوشی اتنی طویل نہیں
ہوتی لیکن وہاں اور انجکشنوں سے کسی کو مسلسل سلائے رکھتا
کوئی مشکل نہیں ہوتا۔

ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میری یادداشت کتنی
دینے والی ٹرک کس حد تک معاون ثابت ہوئی، جانتے والے
صرف ایک انجکشن لگا کے معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ درانا ہے یا
حقیقت۔ بظاہر سو جانے والے سے کہا جاتا ہے کہ وہ انہی
گفتی کرے اور وہ سوئے میں بولنے والے کی طرح گنتی سنا
دیتا ہے۔

راتین نے دروازہ کھول کے نہ جانے کس کو پکارا، وہ
اور ایٹیا کی اندر آئے، وہ باہر گئے اور دوبارہ آئے تو ان کے
ہاتھ میں ٹانگوں کی مضبوط ڈی تھی، انہوں نے میرے دونوں
پیروں کو جوڑ کر باندھ دیا۔ دس میرے تنوں سے اوپر پٹری
میں لٹری گئی تھی۔ انہوں نے مجھے فرش پر پوں کھینا جیسے میں
بے جان چیز ہوں یا کسی جانور کی لاش۔ پچھلے فرش پر میری
کمر اور کھینا چھل کے زخمی ہو گئیں لیکن سرگوں سے تھوڑا سا
اٹھا کے ضربات سے بچائے رکھا۔ مین وسط میں قلعے کے ان
میں سے ایک نے بڑی مہارت کے ساتھ دس کو اوپر پھینکا اور
ایک عکس میں پسند اڑا لیا۔ پھر ان دونوں نے زور لگا کر
تھپتھپا تو میں یوں فضا میں بلند ہو گیا کہ میرا سر نیچے کی طرف
تھا، بگڑاؤ کرنے کے بعد قسائی اسے کھال اتارنے سے
لیے ایسی ہی مہارت سے لٹکا تے ہیں۔

استاد محترم نے رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے

ایک اور موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے میرے قریب آ کے
یہ کہا۔ ”رشتیں احمد کو جانتا ہے تو۔۔۔؟“
میں نے غلے کر لیا تھا کہ اب جو ہو سو ہو۔ ڈرانا
شرور کیا ہے تو اتنی جلدی ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ ”رشتیں
احمد۔۔۔ کون ہے۔۔۔؟“

”ایک قواب ہے سالہ۔۔۔“
کہاں کا قواب ہے۔۔۔ میں نے کراہ کے کہا۔
”سنت بدھائی کا یہ نام پہلے کی سنا ہے؟“
میں نے فریاد کی۔ ”میں نہیں کیسے یقین دلاؤں، مجھے
کچھ یاد نہیں۔“

اب بلاوجہ ہنسنے والا راتین بھی سیریس ہو رہا تھا۔
”استاد سے تو واقعی کچھ یاد نہیں، کیوں بے ہمتی کے بچے،
کیا ہوا تھا تیرے ساتھ۔۔۔“
”کیا ہوا تھا۔۔۔؟“ میں نے کہا۔

”اے تو یہاں کیسے آ گیا۔“
”خدا کے لیے، آخر تم مجھے بتاتے کیوں نہیں، کون ہو تم
لوگ۔ کیا چاہتے ہو؟ یہ ظلم کیوں کر رہے مجھ پر، بتا کیوں
نہیں دیتے کہ میں کون ہوں، یہاں کیسے آیا۔“

راتین سر ہلانے لگا۔ ”اس کی یادداشت تو بچ چلا گئی
ہے۔ جسے کہ فلموں میں ہوتا ہے۔“
”اس کے سر پر قطرہ اس۔۔۔“ میں نے بارگاہ۔ استاد
نے درمیان میں ایک گالی فگائی کر دی۔

راتین پیچھے ہٹا۔ ”میں۔۔۔ میں نے۔۔۔ مگر مجھے کیا پتا
تھا استاد اور تم نے ہی کہا تھا کہ گولی مت چلاؤ۔ اسے ناک
آؤت کر کے اٹھاتے۔“
”چوت غلط پڑی۔“ استاد فکر مند ہو گیا۔

”مہ استاد۔۔۔ ایک ڈنڈا اور بارودوں اس کے سر میں۔ کئی
فلموں میں دیکھا ہے میں نے۔۔۔ ایسے یادداشت واپس
آ جاتی ہے۔“

استاد نے اسے درجن بھر گالیوں کے ساتھ دھکے
دیے۔ ”فلموں نے داغ خراب کر دیا ہے تیرا۔ ابے ہم
جواب کیا دیں گے؟“
الٹا لٹکے لٹکے میری حالت خیر ہونے لگی تھی۔ میں ہاتھ
سے دس پکڑ کے اپنا سر اٹھانے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن

اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ میرا سارا خون چھڑک کر
میرے سر میں جمع ہو رہا تھا اور میری آنکھوں میں دباؤ اتنا بڑھ
گیا تھا کہ لگتا تھا وہ اپنے حلقے سے نکل جائیں گی۔
میں نے شور مچانا شروع کیا۔ ”خدا کے لیے رحم کرو مجھ

پر۔ میں مر جاؤں گا۔ میں نے کیا بکا ڈے ہے تمہارا۔“
استاد نے کہا۔ ”راہنہ راجہ۔۔۔ اپنا کام کر پہلے ہی
بہت نامہ ضائع ہو چکا ہے۔ ابھی کوئی آجائے گا۔“

راتین نے میرے سر کے نیچے ایک باغی لاکر رکھی۔
اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور میں اس کے اندر دیکھنے
انکار دے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے باغی مین میرے سر کے نیچے
رکھ دی اور جیب میں سے کچھ نکال کر انگوڑوں پر پھینک دیا۔
دھوئیں کے ساتھ سخت بدبو اٹھی اور مرچوں جیسی دھواں۔ میں
دھوئیں کو کب تک سانس روک کے کچھ پھپھروں میں نہ جانے
دیتا۔

سانس لینے ہی میرے دماغ کو بزدل جھکا لگا اور
مجھے حلق میں شدید جلن اور خارش کے ساتھ کھسکی آئی۔ مجھے
یوں لگا جیسے کسی نے میرے تنوں میں مرچوں کا پوسٹ بھروا
ہو۔ میری آنکھوں میں پانی ڈال دی ہوا اور میرے سینے میں
انگڑے بکھر دیے ہوں، میں برہنہ طرح تڑپا۔ یہ شاید چند
سیکنڈ کی اذیت ہوگی جو اسی طرح چھائی پائے والا بھی موت کا
تھنہ کھٹکتے ہی جھیلنا ہوگا۔ پھر جیسے مہربان موت اسے داغی
سکون عطا کرتی ہے ایسے ہی بے ہوشی نے مجھے اذیت سے
نجات دی۔

جب مجھے ہوش آیا تو وہاں کچھ بھی نہیں بولا تھا۔ میرے
اس کے کمرے، اذیت، کس باغی نیچے سے چلتی گئی تھی۔ میرا
جسم اپنی ساری توانائی اور سکت کھو چکا تھا۔ میں کسی لاش کی
طرح الٹا لٹکا ہوا تھا اور میرے ہاتھ فرش سے دو فٹ اوپر
چھوڑ رہے تھے۔

”اب کچھ یاد آیا۔۔۔“ میرے کانوں نے استاد کی
آواز سنی اور اس کا چہرہ ہل بھر کے لیے کسی اسکرین پر روشن
ہوا۔ ”نام کیا ہے تیرا؟“

میں نے کہا۔ ”دیشی احمد۔۔۔ شیرازی۔۔۔“
میں نے راتین کا قبضہ سنا۔ ”دیکھا استاد۔۔۔ گیارہ نمبر
ترکیب کا کمال۔“

استاد نے کہا۔ ”قواب صاحب۔۔۔ آپ کی دیاست
کا نام کیا ہے؟“
”سنت۔۔۔ سنت بدھائی۔“ میں نے نیم بے ہوشی
میں کہا۔
ایک دم میرے چہرے پر شندے پانی کی پوچھاڑ
آئی۔ اس سے پہلے بھی میرا بدن بھگا ہوا تھا۔ یہ میں بعد میں
سمجھا کہ وہ میرا اپنا پیشاب تھا جو زخموں کے ساتھ میرے اٹنے
لگنے ہوئے جسم پر بہا تھا۔ میرے پیٹ اور سینے پر سے گزر

انمول رشتہ

ڈاکٹر (پاکل سے)۔ ”تمہاگل کیسے ہوئے؟“
پاکل: ”میں نے ایک بیوہ سے شادی کی، اس
کی پہلے سے ایک جوان بیٹی تھی۔ میرے باپ نے اس
سے شادی کر لی۔ پون مری وہ بیٹی میری ماں بن گئی۔
ان کے گھر ایک بیٹی پیدا ہوئی مگر میں اس کی نالی کا
شوہر تھا۔ اس لیے وہ میری نواسی بھی بن گئی۔ اسی
طرح میرا بیٹا اپنی دادی کا بھائی بن گیا اور میں اپنے
بیٹے کا بھانجا اور میرا باپ میرا دادا بن گیا اور میرا بیٹا
اپنے دادا کا سالابن گیا اور۔۔۔“
ڈاکٹر: ابے چپ کر کیا مجھے بھی پاکل کر دے گا
تو مالا۔

محمد امین انجم کی شہادت۔۔۔ اور قادیان پود قصود سے

کے یہ خلافت میرے من پر چینی تھی اور کچھ بعید نہیں کہ میرے
کھلے من سے میرے حلق میں بھی اتری ہو۔

ایک بار پھر مجھے ہوش آیا تو منظر بدل چکا تھا۔ اب
میرے جسم پر پڑے بھی تھے اور میں کسی بیڈ پر سیدھا پڑا تھا
لیکن مجھ میں اتنی سکت اور توانائی نہ تھی کہ گروٹ بھی لے
سکتا۔۔۔ میرے ہاتھ پیریں تھکے اور کھلی آنکھوں سے ارد گرد کا
منظر دیکھنے کے ساتھ میرا دماغ بھی کام کرنے لگا تھا۔

چند منٹ میں مجھے وہ سب یاد آ گیا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔
پہلے والا کمرہ خالی کیا گیا تھا، اس کا کچھ سامان ادھر
ادھر کی دیواروں کے ساتھ ڈھیر تھا۔ یہ دوسرا کمرہ۔۔۔ شاید
اسی گھر کا بیڈروم تھا، صاف ستھرے بیڈ سے کچھ فاصلے پر
ڈریسنگ کھینک تھی، ایک دار دروب مخالف دیوار میں بنی ہوئی
تھی۔ چند فٹ لیے چوڑے اس بیڈروم میں کوئی غیر معمولی
گھڑی نہیں تھی، ایک کھڑکی پر معمولی پرانے پردے پڑے
ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی باہر یا دوسرے کمرے میں
جانے کے لیے دروازہ تھا۔ دوسرے کمرے کے دروازے
سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہاتھ دروم ہوگا۔

گھڑی اس کمرے میں بھی نہیں تھی اور میرے ہاتھ پر
بھی نہیں تھی چنانچہ وقت اور تاریخ کا تعین ممکن نہیں تھا۔
سر ہانے کی طرف ایک ٹیبل لیپ روشن تھا اور میز پر پانی کی
بکری کے ساتھ ایک ٹھہرا س فلائنگ ٹک اور اسٹیکس کا ایک

پکٹ دکھا تھا۔ میں نے سخت جدوجہد کے بعد اپنے درو سے سیکلے جسم کو حرکت دی اور ہاتھوں کے بل خود کو اوپر اٹھایا۔ میری بھوک اور پیاس لکھت لکھت آئی۔ میں نے جیٹ کر پانی کی بونگ اٹھائی اور کی گھونٹ لیے۔ اس سے میرا سانس پھول گیا اور مجھے تنگی محسوس ہوئی، تھوڑا سا پانی واپس نکل گیا۔ احتیاط..... احتیاط..... میرے دماغ نے مجھے ٹوکا، میں رک گیا۔ چند منٹ بعد میں نے تھراپسٹ فلکس کو تھوڑا سا نیڑھا کیا۔ اس میں سے بھاپ دھکا کافی میز پر گری۔ ایک بار پھر صبر کا دامن پا کھ سے چھوٹ گیا اور میں نے سیکٹ کے پکٹ کو بھاڑ دیا، پکھلیکٹ پیچھے کرے، کسی وحشی کی طرح میں نے چار سیکٹ چپائے بغیر نکل لیے، میرے حلق میں پھنسا سا لگا، میں نے کافی کے تھرماس ٹنگ میں الٹا اور گرم گرم کافی کا ایک گھونٹ لیا تو ہونٹوں کے ساتھ میری زبان بھی مل گئی۔ میں نے پروا نہیں کی۔

دس منٹ بعد نہ ہال سیکٹ کا کوئی ریزہ بچا تھا اور نہ تھرماس میں کافی لیکن میری حالت میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ اب میں کھڑا ہو سکتا تھا، میں چلنے کے دروازے تک گیا اور اسے ٹھونکا یا باگر وہ باہر سے بند تھا۔ میں نے اس پر زور زور سے ہاتھ مارے، پھر کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا، مجھے کچھ نفرت نہ آیا۔ باہر اندھیرا تھا یا کھڑکی کے شیشوں کے سائے سیاہ پر وہ۔

میں نے دوسرے دروازے کو دیکھا۔ وہ ہاتھ روم ہی تھا، میں پھر بند پر آ بیٹھا۔ با میرے خدا، یہ میں کہاں آگیا۔ میں کب سے یہاں ہوں اور مجھے اسیر رکھنے والے کون ہیں؟ رفت رفت مجھے سب یاد آ رہا تھا۔ میں سامنے کے بلائے پر اطمینان اور گھوڑوں کا سودا کرتے گیا تھا، اس نے کہا تھا کہ لارڈ ارنسٹ کے دوست ڈیوک آف کنٹر شائر ہیں۔ رہیں کے میدان میں ان سے کب سے بڑے حریف تھے اور وہ مجھ سے منہ مانگی قیمت پر تمام گھوڑے خریدنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے وہ مجھے بلیک چیک دے رہے تھے۔

پھر وہاں سے مجھے انکار کیا گیا۔ یہ انکار کون کرتے تھے؟ وہ مقامی اسٹین بیڈفیلڈ تھے۔ میری اپنی زبان بولنے والے انیشیائی تھے، میری جان کے دشمن تو گورے ہو گئے تھے۔ لارڈ ارنسٹ کے پرانے تنگ خوار۔ ایلینا کے بھروسے۔ اس کی فرم کے ملازم۔ عام گھر جو ایک عالی نسب لارڈ کی جگہ میرے جیسے کالے انیشیائی کو قبول کرتے کے لیے تیار نہ تھے، لیکن مجھے انکار کے قید میں رکھنے اور اذیت دینے والے تو گورے نہیں تھے۔

پھر کیا وہ کرائے کے بد معاش تھے؟ گوروں نے خود کو شک سے محفوظ رکھنے کے لیے انہیں استعمال کیا تھا، آج کل پر پتہ کرائے پر ملتی ہے۔ کرائے کے قاتل، کرائے کے گواہ..... میں جب چھوٹا تھا تو سب سے چھپ کر کرائے کی سائیکل لیتا تھا اور ہائی گراؤنڈ میں چلاتا تھا، ایک پارکسی مفرد اور مشتعل کرائے نے نگر ماری تو سائیکل سے گر کے میری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور باکو پٹا چل گیا کہ مسجد میں سپارہ پڑنے کے بہانے میں کہاں گیا تھا۔

نور کا خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے دماغ میں آیا۔ جیسے خاموش تاریک رات میں چٹائیں چلا کر گھٹا کب اٹھی اور اچانک بجلی چمکتی ہے۔ کیا اس کے ساتھ بھی، نہیں..... اس کا کوئی قصور نہ تھا..... میاں ثواب صاحب قبلہ..... اس کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ تہناری ہے، جیسے یہ جان تہناری ہے، یہ تو تنگی تہناری ہے، عذاب جسم پر آئے گا تو جان بھی جائے گی۔

میں نے اپنا سر قدام لیا، معلوم نہیں وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی..... اسے کچھ پتا ہے یا نہیں..... کب سے میں اس جہنم میں ہوں۔ ایک دن..... ایک ہفتہ..... ایک مہینہ..... کچھ معلوم نہیں..... گیا راجا کو کچھ معلوم ہوگا؟ میری اچانک کشش کی بعد کیا ہوا ہوگا..... لندن کی پولیس تو بارودات سے چپلے اس کا سراغ لگائے گی شہرت رکھتی ہے۔

ابھی تک کسی نے میرا سراغ کیوں نہیں لگایا۔ آخر اس وحشیانہ کھیل کا انجام کیا ہوگا۔ میری موت؟ تو کئی میری موت سے سادے مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔ وہ سب کچھ میرا ہی رہے گا جو از روئے قانون مجھے ملا ہے..... اور جو میرا ہے وہ میرے بعد ان کی ملکیت ہوگا جو میرے وارث ہوں گے، لیکن ابھی کون ہے میرا وارث؟ نہ میری بیوی ہے نہ بچے، نہ بھائی نہ بہن..... جو بے صرف ایک راجہ ہے جو خون کا رشتہ ہونے کی بنیاد پر جتنی وراثت رکھتی ہے اور قانون سے یہ جتنا تسلیم بھی کر سکتی ہے۔

یہ کوئی اطمینان بخش یا مثالی صورت حال نہیں تھی راجہ کے پاس ابھی اپنا کچھ بھی نہیں تھا۔ جو تھامیرا ہونے کے ہاتے اس کا بھی تھا..... کم سے کم میں ایسا ضرور بھجھتا تھا لیکن خود راجہ اس سے مطمئن نہیں تھی..... وہ کہہ رہی تھی کہ ابھی میں کیا ہوں؟ میرا کیا ہے، کچھ بھی نہیں..... جو بے تم سے ایک دشمن کی بدولت ہے۔ شاید تم ہو، میں صرف تمہاری وجہ سے شہزادی ہوں اور نہ کچھ نہیں۔

میرے خیالات کی رو ایک دھماکے سے بکھر گئی،

اچانک دروازہ کھلا اور چیف اندر آ گیا۔ ایک لمحے کے لیے میں چپک چپک ٹانگ بھول گیا۔ یہ ایسا نظارہ تھا جو میری آنکھوں کے لیے اور آنکھوں کے دھپے سے دماغ تک پہنچنے والے مکرر اطلاعات کے لیے ناقابل یقین تھا۔

بے اختیار میں نے کہا۔ "تم....."

چیف اپنی مخصوص وضع قطع، پرکھبر انداز اور پردوغت جال کے ساتھ لیوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے آگے بڑھا اور صوفے پر براجمان ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا لے کر دھواں اور پھوڑا اور بولا۔ "ہاں..... میں....."

"لیکن..... تم تو....." میں سوال کرتے کرتے رک گیا۔

"میں..... مجھے معلوم ہے کہ تمہارا سوال ادھر اور کیوں رہ گیا۔ خود تمہیں بھی اعزاز ہوا ہوگا کہ ایک شخص دو جگہ نہیں ہو سکتا، بالکل نہیں ہو سکتا ثواب رفیق احمد شیراؤنی، تم یہاں ہو تو ست بد حال میں نہیں ہو سکتے، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ تم کہاں ہو..... لندن میں یا ست بد حال میں..... ہاں میں تمہارے سامنے ہوں، دن بھر ڈی پرسنٹ..... کیونکہ چیف کسی قید خانے کے لیے نہیں بنا اور کوئی قید خانہ ابھی تک چیف کے لیے نہیں بنا۔"

"کیا تم کو نہایت پر ریا ملی گئی ہے؟"

اس نے قہقہہ ملا۔ "دیکھتے بیڑ..... تم پیدا ہوئی اگر پرینہ کسی..... لندن کے باسی اور برطانوی شہریت رکھتے ہو..... کیا تمہارے خیال میں یہاں بھی وہی جبر لو چلے جو اپنے وطن میں ناممکن کو ممکن کر دیتا تھا؟ کیا اس نظام انصاف میں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص جس پر قتل عموماً الزام ہو، واقعی شہادت اس کے خلاف ہو اور ایک نہیں تین تین چشم دید گواہ اسے بھکی کی گری پر بٹھانے کے لیے بے چین ہوں..... کوئی جیل توڑ کے نکل آئے۔"

"اسی لیے میں ابھی تک یقین کرنے سے قاصر ہوں کہ یہ تم ہو....."

"کم آن..... مجھے چھو کے سوچ کے دیکھو..... ہم تو بہت قریب رہے ہیں، آنکھوں سے نہ دیکھو، ہم پھر بھی میرے وجود کو محسوس کر سکتے ہو۔"

"اوکے..... واٹ ناؤ..... جو ناممکن تھا، تم نے ممکن کر دکھایا مسٹر سر مین۔"

"واٹ ناؤ..... تم ہی بتاؤ..... کیا کرنا چاہتے ہو۔"

"تمہیں اپنا اور میرا وقت ڈرامائی ڈائیلاگ بازی میں ضائع نہیں کرنا چاہیے، اگر تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تو میں پھر

وہی کروں گا، جو میں نے کیا تھا۔ تم کو اتنا بے وقوف سمجھنے کی غلطی میں کیسے کر سکتا ہوں۔ جہت کل کی یو پاسٹر فیلڈ کو۔"

میں نے چلا کے کہا۔

اس نے سگریٹ کے نصف حصے کو تالین پر ڈالا اور جوتے سے رگڑ کے بھجوا دیا۔ "تم نے یہ کیسے سمجھا تھا کہ چیف ایک آدمی ہے، میں واقعی تم سے تعاون کا فیصلہ کر رہا تھا اور تم ابھی تک انتقام کی آگ میں جل رہے تھے، اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی..... کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی تم نے مجھے مزائے موت دلوانے میں..... ارے ہمت تھی تو خود کھل کر تھے....."

اچانک ایک ایسی بات ہوئی جس کی بظاہر کوئی اہمیت نہ تھی لیکن اس نے پوری چویشن بدل دی..... چیف کے پیچھے وہ دروازہ تھا جس سے اس نے ڈرامائی انٹری دی تھی، اندر آنے کے بعد اس نے دروازے کو متعلق نہیں کیا تھا..... ایسی غلطی وہ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ دروازے کے باہر سٹحفاظ ہوں گے..... چیف بھی یہی دیکھ نہیں لے سکتا تھا کہ ان کے لاندے آنے کا راستہ بند کرے اور میرے رحم و کرم پر رہ جائے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے سٹح ہونے اور میرے خالی ہاتھ ہونے سے فرق نہیں پڑتا..... میں وہ موقع خود بھی حاصل کر لیتا ہوں جب اس کے ریلو اور کی تھو گولیاں بے تصرف ثابت ہوں اور میں ایک وار سے اس کی جھپٹے جیسی گردن توڑ دوں۔

دروازہ جیسے ہوا سے ہلا اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ایک ملی اندر آئی..... وہ سیاہ رنگ کی سیاہی ملی جوان اور خوبصورت تھی..... بے پاؤں چلتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ چیف کے قریب پہنچ گئی..... مجھ سے بات کرتے کرتے چیف نیچے جھکا اور اس نے بڑی نرمی سے ملی کو اٹھا کے اپنی گود میں بٹھالیا اور پیار سے اس کے سر کی بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

میرے لیے یہ نظارہ ناقابل یقین تھا..... میں جان تھا کہ چیف کو بلیوں سے لڑتی ہے..... وہ بلیوں کے خوف کی نفسیاتی پہاری میں جلا تھا..... دینا کو کچ کرنے کے خواب دیکھنے والا عظیم بلیوں نے آگے دینا کو جتاہ کر دیا تھا..... لاکھوں انسانوں کو مردا دیا تھا اور جس کے یہودیوں پر مظالم کی انسانیت موز دا مانتا میں تاریخ کا حصہ ہیں..... وہ بھی ملی سے ڈرتا تھا، شاید زندگی میں اس کی وہی کڑوایاں تھیں، ایسا براؤن کی محبت اور ملی سے ڈر کا نفسیاتی مرض..... دونوں سے وہ مرتے دم تک نجات حاصل نہ کر سکا تھا..... دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد جب اس نے ایک دکانے میں خودکشی کی

تو اس کے ساتھ مرنے والی حرف ابواب اور ان تھی۔
چٹف کی اس ذہنی اور جسمانی کمزوری کا کلم مجھے پہلے
سے تھا۔ مگر اتفاق سے بھی اس کے سامنے آ جاتی تو
چہرے پر خوف کے آثار پسینے کے قطرے بن گئے نمودار
ہو جاتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ جھجکتے لگتا تھا اور لمبی کوفرا دور
کھا جاتا تو اسے دے کا سا دور و پڑ جاتا تھا۔ خواہ مخواہ کا چٹف کی یا
کا کمر بوج سے دھست زدہ ہوتا ایک عام کتابت ہے حالانکہ
دونوں ہی بے ضرر مگر بلکہ خطرناک ہیں۔

یہ ناممکن تھا کہ چیف جی کو پیچھو بھی سکے۔ یہاں اس نے میرے سامنے جی کو گود میں بٹھا رکھا تھا اور بڑی محبت سے اس کو سہلایا تھا۔ اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں تھا کہ اس نے اپنے نفسیاتی خوف پر قابو پا لیا ہے یا اس نے ایڈ الریجی کا علاج کر لیا ہے۔ یہ دونوں کام ممکن نہیں ہوتے چنانچہ اس کا ایک اور صرف ایک مطلب نکلا جاسکتا تھا۔

وہ چیخ نکلیں تھا۔ اس جیسا تھا۔
اسا تھپے پر پہنچنے میں مجھے دیر نہیں لگی لیکن میں نے
پوری کوشش کی کہ میری صورت کے تاثرات میں تبدیلی نہ
آئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے سامنے بیٹھے چیخ
کے نقش خانی کو زیادہ غور سے دیکھنا شروع کیا اور چند منٹ
میں ایسی بہت سی علامات تلاش کرنے میں کامیاب رہا جو
میرے بیٹن کی تائید کرتی تھیں۔

چیف ہے چند بار ملنے والا یا اسے سرسری نظر سے دیکھنے والا اصلی نقلی کے فرق کو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی صورت کے نقوش وہی تھے۔ بالوں کا اندازہ اور آنکھوں کا رنگ بدلایا جاسکتا تھا۔ قد کا ٹھہر اور وزن کے فرق میں انہیں اس کے فرق کو نوٹ کر با مشکل تھا۔ کپڑے اس نے بالکل چیف جیسے پہنے تھے لیکن اصل کمال اس کی آواز کا اور اس کے انداز و عوار کا تھا۔ یہ کمال اس نے یقیناً نقش اور مہارت سے حاصل کیا ہوگا۔ اس کا Mannerism کی نقل کرنا قابل تعریف تھا۔ وہ اسی طرح سے ہاتھ ہلاتا، ویسے تھا آنکھیں گھماتا تھا۔ جونٹ سکیز کرتا تھا۔ وہی الفاظ عمار سے یہاں تک کہ گالیاں بھی وہی استعمال کرتا جو چیف کرتا تھا اور آواز کا لہجہ بھی اس نے نقل مطابق اصل کر لیا تھا۔

ایسا ڈپلی کیٹ رکھنا بہت سے مشہور لوگوں کے لیے
سیکوریٹی کی ضرورت بن جاتا ہے۔ حقیقت کوئی نہیں جانتا
کیونکہ یہ بات ہمیشہ مپ سکریٹ رکھی جاتی ہے۔ مشہور ہے
کہ جنرل ورمیل کا ایک ڈپلی کیٹ تھا۔ بعض اوقات وہ ہمارے
سے خطرہ جتنی حکمت عملی برائے اگرات کرنے میں مصروف ہوتا

تھا اور اس کا دل چاہی کیست فوجوں کی کمان کرتا رہتا تھا۔ اپنے ملک میں مرحوم امیر محمد خان ثواب آف کالا بانگ کے بارے میں بھی ایسی ہی کہا جاتا ہے کہ انہیں وہ خود نہیں جانا چاہتے تھے تو اپنے دل چاہی کیست کو بیچ دیتے تھے۔ واللہ اعلم بالعواد۔ اس کی افادیت یقیناً کچھ نہیں آتی ہے۔ آج جب ہمارے حاکم ورجوں جتنی بھی گاڑیوں اور سیکڑوں میں انھوں کی معیت میں کسی مردگ سے گزرتے ہیں تو ایک جیسی بہت سی گاڑیوں میں سے کسی ایک میں ہوتے ہیں۔ دیکھنے والے کو کچھ بتائیں جلداً کہ وہ کس میں تھے..... خدا نخواستہ کوئی انہیں مارنا بھی چاہے تو کسے مارے..... یہ تو بہت ہی آسان ہے کہ اپنے دل چاہی کیست کو سرکاری گاڑی میں روانہ نہ کریں اور خود نکل جائیں۔ کسی میں یا موٹر سائیکل پر تو ان کی طرف کسی کا گمان بھی نہیں جاسکتا۔

چیف نے ایک زمانے میں بڑی دہشت گردی سے بھرا ہوا
تھی اور اس کی جان کے دشمن بہت تھے۔ ظاہر ہے بارے
جائے کہ خوف اسی کو ہوگا جس کا کوئی جانی دشمن ہوگا۔ جس کو
یہ ڈر ہو، وہ حفاظتی انتظامات کے بارے میں سوچے گا بھی
نہیں۔ اس زمانے میں چیف نے بڑی تلاش کے بعد اپنا ایک
ہم عمل رکھ لیا۔

یہاں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر بھی ہے۔ کل نہ ہوگا۔
 غلوں میں ڈپٹی کمرٹ عام ہوتے ہیں۔ نامی گرامی تیسرو جو
 مشکل اور جان بوجھوں کا کام نہ کر یا میں نے ڈپٹی کمرٹ کرنے
 ہیں کیونکہ ان کی جان اتنی قیمتی نہیں ہوتی۔ فلم "شہساز" کی
 شوقین کے دوران فلم انڈسٹریاں کم حادثاتی موت ہوئی تھی
 یا تو آدھی فلم اس کے ڈپٹی کمرٹ کے ساتھ پوری کی گئی اور
 دیکھنے والوں کو کہیں بھی فرق کا پتا نہیں چلا۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نقل چیت میں
باریک بینی سے چند فرق تلاش کیے۔ اخبار رسالوں میں اکثر
دو ایک جیسی تصویریں شائع ہوتی ہیں کہ فرق بتائیں۔ یہ بھی
ایسا ہی کیس تھا۔ ایک تو مجھے اس شخص کی گردن کے نیچے حصے
میں دائیں جانب تل نظر نہیں آیا۔ تل اس کے اوپر والے
ہونٹ پر تھا جو چیف کے ہونٹ پر نہیں تھا۔ نقلی چیف کے
بانٹیں ہاتھ کی انگلی میں مٹکی کی انگوٹھی تھی۔ اصل چیف کے
دائیں ہاتھ میں تھی اور برسوں بعد یہ انگوٹھی ایسے پھنس چکی تھی
کہ اسے اتارنا ہی ناممکن تھا۔ مزید یہ کہ اصل چیف کی انگوٹھی
میں گھینے پر انگریزی حرف ایس کندہ تھا۔ ہو سکتا ہے اس کی کسی
مشقیر کا نام ایس سے شروع ہوتا ہو۔ مٹکی دو کرتا رہتا تھا اور
شاہی اس نے فرزند نام کی ایک ماول سے کی تھی جو صرف

چھ ماہ اس کے ساتھ رہی اور پھر غائب ہو گئی۔ چیف نے کہا کہ وہ علاقے کے راجہ کا بیٹا ہے جس کی عمر اس کی تصدیق بھی نہ ہو سکتی تھی۔ چیف کی انگوٹھی پر کوئی نگینہ نہیں تھا۔

جب مجھے سارے ثبوت مل گئے تو پورا یقین ہو گیا کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا بہرہ ویا ہے اصل چیف تو اس وقت بھی پولیس کی تحویل میں اور کسی فیصل میں بند ہوگا۔ یہ ایک اچھی چال تھی، جو ناکام ہوگئی۔ یہ تحریک ہے کہ میری قوت مشاہدہ نے بعد میں بڑا کام کیا لیکن چیف کے چلان کا بیڑا غرق کرنے والی تو درحقیقت وہی مصمم سی کالی بنی ہوئی جو کھی چلان کے بغیر گھومتی پھرتی تھاں آئی۔ چنانچہ میں نے اسے تائید از دی سے موسوم کیا اور ایک دم مستعد ہو گیا۔ اب یہ ضروری تھا کہ اپنی پہنچاؤی طابرتہ کروں۔ یہ تاثر دینا رہوں کہ میں چیف کو اصل میں سمجھ رہا ہوں۔

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد چیف حکمران آیا۔
 "یار اچھے! کیا تم بھی نہیں بن سکتے۔"
 میں نے مخاطب ہو کے پوچھا۔ "میں نے کبھی کوشش بھی
 نہیں کی۔"

اس نے لی کو مجھ پر سمجھا دیا۔ مانی نے دہشت زدہ آواز میں لکھنیاں اور چیخے کرتے ہی فراہم ہو گئی۔ ”کوشش پوری کی تم نے... یادداشت کے ضائع ہونے کا ڈراما کیا تھا۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”مجھے ترکیب نمبر چھ گیارہ کا علم نہیں تھا۔ اور میری حکم دے تو جان بچانے کے لیے کیا کرتے؟“

”یہ سوال کر رہے ہو تم مجھ سے؟“

۳۲ "ہاں..... اور کس سے کروں۔"

اس نے قہقہہ مارا۔ ”مرنے سے اتنا ڈرتے ہو؟ کیا ہوگا اگر تم مرنا چاہو؟“ کچھ نہیں..... یہ دیکھا ایسے ہی جیسی ہے گی۔ رست بدھائی کی ریاست بھی..... اور یہ شیرازی اینڈ جیسی بھی

”اس کے باوجود میں جینا چاہتا ہوں۔ جیسے تم جینا چاہتے ہو۔“

”یہ کی باتم نے پہلی کام کی بات۔ اسے کہتے ہیں
بقائے باہمی کا سمجھوتا، جیواور جینے دو۔“

”مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا۔
 ”ویری کپل..... تم میرے خلاف اپنے شو فر چارلی

میں نے کہا۔ ”یار فدا کی طبیعت موت نہیں تھی۔“

کیفیت

یہیں عرصہ ان حضرات پر آتا ہے جو بے سوچے سمجھے یہاں کے موسم پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اس کی وضاحت نہیں فرماتے کہ انہیں کونسا موسم ناپسند ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ کراچی میں موسم پر لحاظ رونی کے بھاؤ کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک ہی عمارت کے کراہیدہ دار ایک منزل سے دوسری منزل پر تہہ پلٹی آب و ہوا کی غرض سے جاتے ہیں۔ یہاں آپ دبیر میں ملل کا کرتہ باجون میں گرم پتلون پہن کر نکل جائیں تو کسی کو ترس نہیں آئے گا۔ اہل کراچی اس والدہ اعظم بالاعواب قسم کے موسم کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اگر یہ وقتیں کھٹے تبدیل نہ ہوتو وحشت ہونے لگتی ہے اور بڑی بوڑھیاں اس کو قرب قیامت کی نشانی سمجھتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اچھے خاصے لحاف اوڑھ کر سوئے اور صبح چنگھا جھٹتے جوئے اٹھیں۔ یا محکمہ موسمیات کی پیش گوئی کو طوطا رکھتے ہوئے صبح برساتی لے کر گھر سے نکلے اور دو پہر تک لوٹنے کے سبب بالائے بالا اسپتال میں داخل کرادیے گئے۔ کہاں تو رات کو ایسی شفاف چاندنی چٹکی ہوئی تھی کہ چار پانی کی بوتلوں کے کھٹل گن لٹکیے اور کہاں صبح دس بجے کہرے کا یہ عالم کہ ہر بس ہیلڈ لائٹ جلائے اور اوس سے جیسٹ سڑک پر غروبوے کی پھاٹک کی طرح پھسل رہی ہے۔ بعض اوقات تو یہ کبریاں اٹھا گھرا ہوتا ہے کہ بو داروں کو کراچی کا اصل موسم نظر نہیں آتا۔ موسم کی کنون کی یہ کیفیت ہے کہ دن بھر کے تھکے ہارے پیھیری والے شام کو گھر لوٹتے ہیں تو بغیر استخارہ کے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ صبح اٹھ کر کھجول کی بھیجی گرامر مونج پھلی پیچیں یا آس کریم۔

ڈھیر کے پیچھے دبا دیا گیا تھا۔ مکینیکل شاول چلا کے۔ یہ پولیس رپورٹ میں بھی ہے اور دونوں وعدہ و وعاف کیا ہوں نے بھی کہا ہے۔ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بہت واضح ہے۔

”پھر وہ کیسے ہوسکتا ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ صرف میرے کہنے سے کیس ختم کیس ہو سکتا ہے۔“

”میرے خلاف کیس ختم ہو سکتا ہے۔ الزام تم اپنے سر لے لو۔“

”واہ۔۔۔ کیا آپ یہ یا ہے۔ تمہاری جگہ میں بجلی کی کرسی پر چاہیں تو ابھی میں نے تم سے کہا کہ میں مرنا نہیں چاہتا، اب تم کہہ رہے ہو کہ میری جگہ مر جاؤ۔“

”دیکھو۔۔۔ ہمیں سزا ہوگی لیکن موت کی نہیں۔ یہ میری گارنٹی ہے۔“

”تم کیا اور تمہاری گارنٹی کیا؟ اس کے علاوہ میں کیا کروں؟ عدالت میں حاضر ہو کے کہوں کہ سوری مافی لاؤ۔“

”حاصل یہ نہیں میں ہوں۔۔۔ جب میں نے اس پر الزام لگایا تھا اس وقت میں نے یہ بھی سمجھا تھا کہ یہ بات ہے؟ چلو پھر تم کو پکڑ لیتے ہیں۔ چیف صاحب سوری۔۔۔ آپ جاسکتے ہیں؟“

شاہ ضرورت سے زیادہ چالاک ہونے کا ثبوت دینا میری غلطی تھی، مجھے چیف کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیے۔ خود اسی سے پوچھنا چاہیے کہ آخر یہ سب کیسے ہوگا، کوئی پلان اس کے پاس بھی ضرور ہوگا۔

نئی چیف صاحب نے غصے میں وہ گلاس دیوار پر دے مارا جس سے دو بیڑا ہوا تھا، شراب کی یہ بوتلی ایک الماری سے اس نے خود ہی نکالی تھی۔

”بند کرو اپنی بکواس۔۔۔ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہم ہیں، صاف بتائیے کہ تمہاری مل کی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ میں روپوش ہو جاؤں گا اور پھر کسی خفیہ راستے سے نکل بھی جاؤں گا، پھر جانے سے پہلے تم کو زندہ گاڑ جاؤں گا قیقے پتر۔۔۔ اس نے بوتل سے منہ لگا کر ایک گھونٹ لیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اوکے، تم بتاؤ یہ سب کیسے ہوگا۔“

”دیکھو۔۔۔ تم عدالت میں حاضر ہو کے اپنے وکیل کی مدد سے دوسرا بیان داخل کرو گے، تم کو جس میں نے ذاتی دشمنی کی بنا پر ایک بے گناہ شخص کو اس قتل کے الزام میں ملوث کر دیا تھا۔ اب میرے طبی غلطی نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں عدالت کے سامنے آ کے جج پولوں۔ ذاتی دشمنی کی وجہ تم کو بچا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ چیف نے موقع پا کے ایک دن

زبردستی قور کے ساتھ زیادتی کی تھی۔“

ایک دم سارا خون چھج کے میرے سر میں آ گیا۔ ”نور کے ساتھ۔۔۔ تمہارا دماغ خراب ہے، تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔“

”سنو۔۔۔ سارا مسئلہ سوچنے ہی سے حل ہوگا۔ ظاہر ہے قور کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا تھا، یہ جھوٹ ہوگا لیکن قور تردید نہ کرے تو کیا اس سے قور بھی پاک دامن غفت ماب حسینہ کے دامن پاکیزگی پر داغ آجائے گا؟“

نور کے بارے میں اس کے الفاظ میرے منہ پر تھم بن کے لگ رہے تھے مگر میں برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

”جھوٹ تو جھوٹ ہی رہے گا۔“ چیف نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”نور وہی رہے گی جو ہے لیکن تم کہہ سکتے ہو کہ تمہارے دل میں چیف سے بدلا لینے کی ایک پرائی خواہش تھی، اب موقع ملنے ہی تم نے اسے پھنسا دیا۔“

میں نے کہا۔ ”پھر یہ کہوں کہ چارلی قتل میں نے کیا تھا۔“

”بالکل نہیں۔۔۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ تم قتل کا الزام اپنے سر لے لو۔“

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”چارلی قتل تو ہوا تھا، میں کہوں کہ چیف نے نہیں کیا تھا، پھر کس نے کیا تھا؟“

”پولیس معلوم کرے۔“

”تم عدالت کو اور پولیس کی تفتیش کو قیاتی سمجھتے ہو شاید۔ یہ میں نے ہی بتا تھا کہ چارلی کو قتل کیا۔ قتل کے بعد فون کیا گیا ہے وہ چشم دید گواہ ہیں۔“

”وہ دونوں کہیں کے کہیں مسٹر رفین نے اس گواہی کے لیے تیار کیا گیا تھا، پس دیا تھا۔“

”کیوں میرا دماغ خراب کر رہے ہو، مجھے کیا فرشتوں نے آ کے بتایا تھا کہ چارلی کو مار کے فلاں جگہ گاڑا گیا ہے۔“

”سنو۔۔۔ پہلا مرحلہ ہے عدالت کو یہ بتانے کا کہ میں نے کچھ نہیں کیا، میں صرف تمہارے انتقامی جذبات کا نشانہ بنا ہوں، تمہارا بیان بھی جھوٹا تھا اور وہ چشم دید گواہ بھی جھوٹے تھے۔ یہاں تک بات تمہاری سمجھ میں آئی ہو تو میں آگے چلوں۔“

”بولو۔۔۔ میں سن رہا ہوں۔“

”اب تم ہر الزام یہ ہوگا کہ تم نے عدالت میں جھوٹ بولا اور دو جھوٹے گواہ خریدے۔“

”میںیں الگ سزا ہوگی اور ان گواہوں کو الگ لیکن قتل کا الزام مجھ پر نہیں ہوگا اور تم پر بھی نہیں، تم صرف یہ کہو گے کہ چارلی کے بارے میں کسی نے

تمہیں ملوث توں کر کے اطلاع دی تھی کہ ہم نے اسے قتل کر کے فلاں جگہ گاڑ دیا ہے۔ تم خود چارلی کو پابند کرتے تھے کیونکہ وہ تم سے خوش نہیں تھا، لاڈلہ ارٹسٹ کے ساتھ ملازمین نے تمہاری خدمت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت تمہیں ایک تیرے دوست کا خیال آیا، تم نے سوچا کہ کیوں نہ چیف کی گردن اس قتل کے جرم میں پھنسا دی جائے اور تم نے یہی کیا۔ تم نے چیف کو گاڑی دے کر وہاں بھیجا جہاں کے بارے میں اطلاع کی تھی کہ چارلی کو وہاں مار کے ٹکڑیوں کے ایک ڈسٹر میں دبا دیا گیا ہے اور چیف وہاں پہنچا تو ایک پلان کے مطابق تم نے اسے جرم بنا دیا، تم اصرار کئے ہی نہیں تھے۔ اس دن ایلینا کے ساتھ تھے۔“

یہ ساری کہانی انتہائی بے سرو پا تھی اور پوری دنیا کی کوئی عدالت اس پر یقین نہ کرتی اور پھر لندن کی پولیس اڈہ مجھ سے یہ بھی معلوم کر لیتے کہ آخر میں اب جھوٹ کیوں بول رہا ہوں۔ مجھے کیا مجبور ہے۔۔۔ میں۔۔۔ مجبوری۔۔۔ یہ خیال اب تک میرے ذہن میں آیا۔ مجھے کیا ضرورت ہے جوش کرنے کی، مجھے تو یہاں سے نکلنا ہے، مجھے وقت چاہیے اور کچھ کرنے کی مہلت۔

نقل چیف نے اچانک کہا۔ ”ایک اور صورت ہے جس میں تمہاری جان صاف بچ سکتی ہے۔“

میں چونکا۔ ”وہ کیا؟“

”تم اپنی جگہ وحید کو پیش کر دو۔ وہ جو تمہارا ہم شکل ہے۔“

میں نے کہا۔ ”وہ تو پاکستان چلا گیا۔“

”کیا تم اسے واپس نہیں بلا سکتے کسی بھی بہانے۔ کوئی ایسا جگہ چلاؤ کہ خود بخود جاؤ مست بد حالی، وہ پکڑا جائے۔ یہ یقین نہیں۔“

جو وہ کہہ رہا تھا صاب نامک ممکن تھا۔ معلوم نہیں کیسے اس نے فرض کر لیا تھا کہ میں ہر بات مان سکتا ہوں۔ ساری دنیا پاگل ہے کہ میں یہاڑ سے بڑا جھوٹ بولوں اور جج مان لیا جائے لیکن اب تاثر مجھے یہ دینا تھا کہ میں ان کے چکر میں آ گیا ہوں۔ وہ مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد وہ کیا کرتے ہیں۔ یہ اندازہ بعد میں ہوا۔

میں نے کہا۔ ”چیف۔۔۔ یہ تمہارا ٹیم ہے، اگر تم نے کچھ لیا ہے تو میں ٹھیلنے کے لیے تیار ہوں، تم بتاؤ مجھے عدالت کے سامنے کیا بیان دینا ہوگا، میں دوں گا مقصد نہیں بتانا ہے۔ اگر تم جج جاؤ گے تو میں پھنس جاؤں گا، مجھے معلوم ہے

میں نے کہا۔ ”چیف۔۔۔ یہ تمہارا ٹیم ہے، اگر تم نے کچھ لیا ہے تو میں ٹھیلنے کے لیے تیار ہوں، تم بتاؤ مجھے عدالت کے سامنے کیا بیان دینا ہوگا، میں دوں گا مقصد نہیں بتانا ہے۔ اگر تم جج جاؤ گے تو میں پھنس جاؤں گا، مجھے معلوم ہے

میں نے کہا۔ ”چیف۔۔۔ یہ تمہارا ٹیم ہے، اگر تم نے کچھ لیا ہے تو میں ٹھیلنے کے لیے تیار ہوں، تم بتاؤ مجھے عدالت کے سامنے کیا بیان دینا ہوگا، میں دوں گا مقصد نہیں بتانا ہے۔ اگر تم جج جاؤ گے تو میں پھنس جاؤں گا، مجھے معلوم ہے

میں نے کہا۔ ”چیف۔۔۔ یہ تمہارا ٹیم ہے، اگر تم نے کچھ لیا ہے تو میں ٹھیلنے کے لیے تیار ہوں، تم بتاؤ مجھے عدالت کے سامنے کیا بیان دینا ہوگا، میں دوں گا مقصد نہیں بتانا ہے۔ اگر تم جج جاؤ گے تو میں پھنس جاؤں گا، مجھے معلوم ہے

میں نے کہا۔ ”چیف۔۔۔ یہ تمہارا ٹیم ہے، اگر تم نے کچھ لیا ہے تو میں ٹھیلنے کے لیے تیار ہوں، تم بتاؤ مجھے عدالت کے سامنے کیا بیان دینا ہوگا، میں دوں گا مقصد نہیں بتانا ہے۔ اگر تم جج جاؤ گے تو میں پھنس جاؤں گا، مجھے معلوم ہے

پابندی وقت

ایک دوست دوسرے دوست سے۔ ”کیوں میاں شادی سے خوش تو ہوتا؟“

پہلا دوست۔ ”ہاں بھی بہت خوش ہوں، بڑا آرام ہو گیا ہے، ہر چیز کا۔ وقت پر صبح اٹھ جاتا ہوں، وقت پر ناشتا کرتا ہوں۔ وقت پر دفتر پہنچ جاتا ہوں۔ گھر صاف ستھرا رہتا ہے۔ کھانا وقت پر پکا ہے اور صحت بھی اب ٹھیک رہتی ہے۔“

دوسرا دوست نے پوچھا۔ ”تو کیا یہ سارے کام اب تمہاری ہی خود کرتی ہے؟“

پہلا دوست۔ ”نہیں کرتا تو اب بھی میں ہی ہوں۔ بس اس نے تو ہر کام کا وقت مقرر کر دیا ہے اور بڑی سختی سے عمل کرواتی ہے۔“

ایم انفال انصاری، ڈھنگہ شہر

تھی اور سب کچھ واپس مانگ رہی تھی۔

”یہ ایسا کسے مانا گئی ہے۔“

”اس نے تسلیم کیا ہے کہ فون پر اس نے رفیق سے بات کی تھی تو اس بات پر انھیں کا اظہار کیا تھا کہ وہ لارڈ ارلٹ کے خاندانی محل کو بھیج رہا ہے اور ان کے انتہائی شوق سے پالے ہوئے گھوڑوں کو بھی۔ مزید یہ کہ وہ فرم کا نام بدل گئے اپنے نام پر رکھ رہا ہے، لیکن وہ صرف درخواست کر سکتی تھی کہ رفیق ایسا نہ کرے۔ اسے روک نہیں سکتی تھی۔“

”مالک وہ ہے۔ اس نے کہا کہ ایک فن کے لیے بھوت بولنا گناہ عظیم ہوگا۔ اس لیے میں جج کہوں گی۔ مجھے رفیق پر سخت غصہ تھا اور میں انتہائی رنجیدہ تھی، لیکن اس سے میں نے اس کوئی بات نہیں کی کہ میں اپنا حق ملکیت واپس کا جاتی ہوں۔“

”تمہاری مرضی کا بیان دینے کے لیے میرا عدالت میں حاضر ہونا ضروری ہے۔ اگر یہاں سے تم میرا حلف نامہ دستخط کروا کے لے جاؤ تو وہ قبول نہیں ہوگا۔“

”یہ مجھے بھی معلوم ہے لیکن پھر۔۔۔۔۔“

”الو کے چٹھے۔۔۔۔۔ تمہیں کس نے حق دیا ہے کہ مجھے اس نام سے پکارو۔۔۔۔۔ راجا کے علاوہ کوئی مجھے یہ نہیں کہہ سکتا۔“

اس نے اصل چیف کے انداز میں بے دیر تہذیب لگایا۔

”یہ چار کا نام ہے۔ برا کیوں مانتے ہو نواب صاحب۔ عدالت میں آپ خود ہی پیش ہو گئے اپنے وکیل ملک ارشد کے ساتھ۔“

”اس میں تمہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔“

وہ کچھ دیر مختصر سے کمرے میں ادھر ادھر بٹھتا رہا۔ ”تم نوکر کو کتنا چاہتے ہو، اتنا ہی جتنا فریال کو چاہتے تھے یا اس سے پہلے۔۔۔۔۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس فضول سوال کا مقصد یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“

وہ ایک دم پلٹا۔ ”چو کس تمہاری ہوگی تو اب رفیق۔ اور یہی ایک خطرے کی بات ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنے انتہائی جذبات پر اپنی محبت کو قربان کر دو، تمہارا ماضی کا ریکارڈ کوئی بہت قابل رشک نہیں ہے۔“

”کسا مطلب۔۔۔۔۔“

”مطلب یہ کہ عدالت میں جا کر تم نوٹرن لے لو۔۔۔۔۔ اپنی بات سے بچ کر جاؤ اور عدالت کو وہ سب بتا دو جو تمہارے ساتھ ہوا، تمہارا کچھ بھی نہیں چاہئے گا۔ میری فروریج میں انھیں اور میں بے جا میں رہنے کے جرم بھی شامل ہو جائیں گے تو

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جہاں سیر دیاں سوا سیر۔۔۔۔۔ لیکن تو تمہاری محبت میں اپنی جان سے جائے گی۔“

میں چونکا۔ ”تم اسے قتل کرنے کی دھمکی دے رہے ہو۔“

”یہ دھمکی نہیں۔۔۔۔۔ ہم اسے واقعی قتل کر دیں گے۔ فوراً۔۔۔۔۔ اور تمہیں اس کی لاش مل جائے گی، سالم نہیں۔۔۔۔۔ گزروں کی صورت میں۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ پہلے سے ہمارے قبضے میں ہو گئی۔“

”کیا تم نے اسے بھی اٹھالیا ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ اس کے قریب کوئی نہیں چٹک سکتا۔ اس کی اپنی سیکورٹی سخت ہے، پھر لندن پولیس اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ اس نے وودن میں کمراسم چھپا دیا ہے۔“

”پھر تم اسے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہو کہ۔۔۔۔۔“

”رفیق صاحب۔۔۔۔۔ اگر سودا منظور ہے تو سنو۔۔۔۔۔ ابھی میں تم کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا لیکن جانے سے پہلے تم نوکر فون کر کے بلاؤ گے۔ راز داری اور اعتماد کے ساتھ، تم اس سے کہو گے کہ وہ تمہاری رہائی کے لیے اپنے ساتھ چچاس ہزار پاؤنڈ لائے۔“

”چچاس ہزار پاؤنڈ۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اب تک اسے مختلف لوگ چٹک کال آفس سے کال کر چکے ہیں، لیکن کال پر سون رات ڈھائی بجے کی گئی تھی اور اس سے یہی کہا گیا تھا کہ وہ رفیق کو زندہ سلامت واپس کا جاتی ہے تو کسی کو کبھی اس کال کے بارے میں نہ بتائے۔ خصوصاً پولیس کو۔۔۔۔۔ اور چچاس ہزار پاؤنڈ تیار رکھے۔ انھیں براہ تادان کرنے والوں کے اسٹاک میں اس سے کہا گیا کہ نوٹ پرانے ہوں اور چھوٹے ہوں۔۔۔۔۔ ان کو سرخ رنگ کے برف کیس میں ڈالا جائے۔ اس پر دونوں جانب تین اچھے قطر کا سفید دائرہ ہو۔“

”اس کا مقصد۔۔۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ بس کثیف ڈون پھیلا نا۔ پولیس نے یہ کال فریج کر لی مگر کال کرنے والا دو منٹ بعد جا چکا تھا۔ دوسری کال ہوئی کس دوپہر اور تیسری گزشتہ رات پھر ڈھائی بجے۔۔۔۔۔ وہ تیار رہے۔“

”اب میں اسے کہاں بلاؤں؟“

”گودیز سروس کے ذریعے ابھی کچھ دیر پہلے اسے ایک موبائل فون ملا ہوگا۔ اس میں یہ بھی تحریر ہوگا کہ اس نے نمبر پر موصول ہونے والی کال کا ذکر اس نے کسی سے کیا تو شام تک رفیق کی لاش اسے پہنچا دی جائے گی۔ ابھی ہم

تمہیں ایک نیا نمبر دیں گے۔ اس سے تم پاکستان میں راجا کو کال کرو گے۔۔۔۔۔ راجا سے کہو گے کہ وہ ایک نیا فون اور نئی سم لے کر نوکر کو کال کرے۔ جو تم راجا سے کہو گے، وہ فوراً کو بتائے گا۔ یہ تمہیں کے اعتماد کا ٹھیکل ہے جس میں راز پر صرف نوکر کی جان ہوگی یا تمہاری۔۔۔۔۔ نوکر کو تم قاتل کر دو گے کہ وہ چچاس ہزار پاؤنڈ نے کر تمہاری پٹائی ہوئی جگہ پر اکیلا آئے اور کسی کو بتائے بغیر۔ وہ کس حد تک تمہاری ہدایات مانجی ہے۔ یہ ہم دیکھ لیں گے۔“

میں کچھ گیا کہ وہ میرے انھیں کو عام انھیں براہ تادان کا رنگ دے کر پولیس کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے ٹھیکل میں شامل ہونا ایک خطرناک کام تھا لیکن میرے پاس اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ یہ نوکر سب کو غیر والی نوٹیشن تھی۔ وہ کہاں غلطی کرتے ہیں، کہاں نقد پر انھیں دھوکا دیتی ہے۔ نوکر کیا کرتی ہے اور کیا نہیں کرتی۔ جھوٹ کیا ہے سچ کیا، ایسے ان گنت سوالوں کا جواب پانے کے لیے مجھے وقت درکار تھا اور یہاں سے نکلے بغیر وقت کا بھی کوئی مصرف نہ تھا۔

میں نے ان کی بات مان لی۔ جو ہو ہو۔۔۔۔۔ یہ ایک مجرمات منصوبہ تھا جس کو کبھی نہ تھا۔ آدمی کی قتل سازشوں کے بہت اچھے ہوئے حال تھے اور اس کا تانا بانہ بننے والے کو اپنے دماغ پر بڑا تازہ اور اعتماد ہوتا ہے کہ اس کی فکر سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ وہ دیکھ سکتا ہے کہ آئے والے وقت میں کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ تمہارے تقدیر اپنا پارٹ بچے کرتی ہے، نتیجہ کے بعد۔

اس کی چیف نے مجھے ایک نیا فون لا کے دیا۔ ظاہر ہے اس کی رجسٹریشن کو نہیں کرنا پولیس کے لیے بھی کاہر ہوا ہوگا۔ وہ انھیں اور پتہ چلا جائے گا۔ مجرموں کے اور ان کے چکرنے والوں کے درمیان ذہانت سے ایک دوسرے کو دھوکا دینے کی آگے بڑھتی ہر جگہ ہر وقت جاری رہتی ہے۔ میں ابھی اپنی عقل کر کے یہ سوچنے لگا کہ اسے کوئی نہیں تھا جو مجھے ایک پیاری سی کالی بی کے طفل حاصل ہوا تھا۔ جسے عام طور پر ہمارے ملک میں ننھوں سمجھا جاتا ہے۔

میں نے راجا کا نمبر ملایا۔ اس وقت کمرے میں دو ننھوں صورت بد محاش اور آگئے تھے اور کسی چیز کے بغیر مجھے رہا اور دکھا کے ڈرانا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں نظر انداز کر دیا۔

دوسری طرف سے راجا نے کسی سے کہا۔ ”یار یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور پھر مجھے سے مخاطب ہوا۔“

”یہ۔۔۔۔۔“

میں نے کہا۔ ”راجا۔۔۔۔۔“



رژن کہ ہنسوں

ایک جنازہ جا رہا تھا بہت سے لوگ ہمارے ساتھ، راستے میں ایک پٹھان بھی ساتھ ہو گیا۔ کسی نے کہا کلمہ شہادت، پٹھان بولا، زندہ ہوا، تھوڑی دیر کے بعد پھر کہا گیا کلمہ شہادت پٹھان پھر بولا۔ زندہ ہوا، کسی نے کہا۔ ”بھئی خان صاحب جنازہ جا رہا ہے۔“ پٹھان بولا۔ ”اچھا میں تو سمجھا کہ جلوس جا رہا ہے۔“

یہ ہوتی ہے دوستی

ایک لڑکا پوری رات گھرت آیا، اگلے دن قادر سے کہا۔ ”میں رات کو دوست کے گھر سو گیا تھا۔“ قادر نے بیٹے کے 10 فریڈز کو فون کر کے پوچھا۔ سب نے کہا میرے پاس تھا۔

اورنگی ناؤن کرچی سے رضوان تنولی کریڈیٹی کی سوغات

میں دیکھ نہیں سکتا تھا اور پھر بھی تصور میں راجا کا ردعمل میرے سامنے تھا، جب وہ چلا یا نہیں۔ اس نے مجھے گالیاں نہیں دیں اور مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ نہیں کی تو میں سمجھ گیا کہ وہ تمام صورت حال سے پوری طرح باخبر ہے اور فوراً اسے میرے انھیں کے جانے کی رپورٹ پہنچا دی ہے۔

”کیا حال ہے حیرانیکے پتر۔۔۔۔۔ کہاں سے بول رہا ہے تو؟“

میں نے فیس کے کہا۔ ”اپنے منہ سے راجا اور کہاں سے۔۔۔۔۔“

راجا کی متانت پر قرار رہی۔ ”تو ٹھیک ہے نا۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔“

”اور نے سب بتا دیا ہے، تو فکر تمہارے ان سے سودا چکا کر لے۔۔۔۔۔ اور دماغ ٹھنڈا رکھ۔ تو بے کہاں۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔ اب تو میری بات دھیان سے سن۔ نوکر فون کر۔۔۔۔۔ نمبر میں بتاتا ہوں۔“

”یہ نیا نمبر ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اس سے کہہ کہ چچاس ہزار پاؤنڈ نہ ہدایات کے مطابق آئے، میں دوسری کال نہیں کروں گا۔ اسے دہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اگر وہ اس گھنٹہ کا ایک لفظ بھی

مسی اور تک پہنچا تو پھر کچھ نہیں ہوگا، یہ لوگ دوسرا چانس دینے والے نہیں ہیں۔

”ٹھیک ہے..... میں اسے سمجھا دوں گا۔ تو مجھے بتا۔“

میں نے ملکی چیف صاحب کی ہدایت کے مطابق راستہ سمجھنا شروع کیا۔ ”اس کو کیلے آنا ہوگا، اپنی سیکورٹی کو وہ منع کر سکتی ہے لیکن اسے کیا معلوم کہ باہر سے سادہ کپڑوں میں کون اس کے پیچھے لگ گیا۔ پولیس کی اس پر نظر ہوگی، وہ عینی راستے سے نکلے، پیدل اور پھر کسی چکر لے، جو نیا فون اس کے پاس ہے اس پر میں نور کو ہدایات دوں گا کہ اسے کہاں آنا ہے۔“

چیف نے ایک کاغذ کا پرزہ میرے حوالے کیا، میں نے اس پر کبھی ہوئی عبارت ایسے پرچی جیسے یہ بات میں خود راجا سے کہہ رہا ہوں۔ ”نور کو تم پہنچا کے ہدایات کے مطابق واپس جانا ہوگا۔ اس کے پیچھے سے پہلے ہی میں گھر پہنچ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے..... میں اسے سمجھا دوں گا۔“

فون میرے ہاتھ سے لے لیا گیا۔ اب ایک تباہیل شروع ہوا۔ میرے ہاتھ کمر کے پیچھے بانٹھ دیے گئے۔ ایک ربر بینڈ میری آنکھوں پر لپکا گیا۔ مجھے باہر لے جا کر ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ دو محافظ میرے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ شاید وہ شخص جو چیف کا کردار ادا کر رہا تھا آگے تھا۔ ان کا چوتھا ساتھی گاڑی چلا رہا ہوگا۔ گاڑی کے شیشے بند تھے۔ باہر کی آوازیں میرے کانوں میں بہت کم آ رہی تھیں۔ ان سے یہ اندازہ کرنا ناممکن تھا کہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں۔

گجڑی آرام دہ اور نرم تھی۔ ہم ایک گھنٹا خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ پھر مجھے فون دیا گیا۔ ”راجا کے ذریعے نور سے کہو کہ وہ اکی جگہ آجائے جہاں چار لی کو فون کیا گیا تھا۔“

میں نے فون کی۔ ”ادھا گھنٹا اور گزر گیا۔ اس کے بعد میں نے راجا کے ذریعے نئی ہدایات ارسال کر دیں۔ اب نور کوئی سٹ میں سڑک نہ تھا۔ اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ نور ایلی آئی ہے اور اس کا قاتل کوئی نہیں کر رہا ہے۔ اس ملکی چیف کو بت جانے کوں مسلسل یہ اطلاع دے رہا تھا کہ سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اسے کامیابی سمجھ کر فخر سے مسکراتا تھا اور پھر میری طرف دیکھ کے کہتا تھا۔ ”ٹھوکی سیاتی ہے۔“

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں اس جوئے میں ہار گیا ہوں۔ میں نے اس امید

میں چیف کی ہر بات مانی تھی جب تک مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع ملے گا تو میں فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں لندن پولیس سے بھی توقع لگائے بیٹھا تھا کہ وہ اپنی شہرت کے مطابق کوئی کارنامہ سرانجام دیں گے اور مجرم عین اس وقت پکڑ لیے جائیں گے جب وہ پچاس ہزار پاؤنڈ خزانے کے ساتھ نور کو بھی لے جائیں گے۔ ضمانت کے طور پر..... اگر میں ان کی مرضی کے مطابق عدالت میں اپنا بیان بدل کے چیف کو بے گناہ قرار دلوانے میں کامیاب رہتا ہوں تو وہ نور کو چھوڑ دیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا، پھر..... ان کی مرضی کا بیان دینے کے باوجود ثبوت اور شہادتوں کی بنیاد پر عدالت نے میرے بیان کو تسلیم نہ کیا۔ پولیس نے ثابت کر دیا کہ میں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں نور کی جان بچانے کے لیے ایسا کہنے پر مجبور ہوں، یہ تو انہیں معلوم ہو ہی جائے گا کہ مجھے رہائی مل گئی ہے تو نور عتاب سے..... میں یہ ثبوت بھی نہیں بول سکتا کہ نور وہاں پاکستان چلی گئی ہے۔

ان بے تحاشہ کر دار کی قید میں نور پر کیا ہونے لگا؟ وہ مجھے کیا سمجھی؟ اپنی رہائی کے لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ بے شک پولیس اور سرانجام میری بھرپور مدد کر رہے لیکن وہ نور کے بخیر عافیت واپس آنے کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ یہ ملکی چیف تو عتاب ہو جائے گا ملکی چیف جو ابھی تک قید میں ہے اور اسے جرم کی سزا دلانے جانے کا انتظار کر رہا ہے اسے سو فیصد پر قائل رہے گا کہ کئی میں سے نہیں کیا تھا، مجھے پھنسا یا گیا ہے۔

گاڑی اچانک رکی تو میرے پریشان خیالات کی رو بکھر گئی۔ میرے لیے ملے کرنا تھا ملکہ میں نے فکرمندی کی تھی یا بے وقوفی۔ ان جرائم پیشہ لوگوں کے سامنے میری کیا چلتی۔ میں نے نور مارا رہے جانے پر کچھ وقت حاصل کرنے کو ترجیح دی تھی کہ شاید یہ مہلت فائدہ مند ثابت ہو۔ کچھ ایسا ہو جائے کہ مجھری بات بن جائے۔ غیب سے کچھ ٹھہر میں آئے یا تقدیر مجھے کوئی موقع فراہم کر دے۔ دس منٹ تک ہم پیدل چلتے رہے۔ پھر مجھے ایک زبردستی اترنے کو کہا گیا۔ میری آنکھوں پر پٹی لگی تھی۔ میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں، ہر طرف کی خاموشی یہ احساس دلاتی تھی کہ مجھے شہر سے باہر لایا گیا ہے۔ یہ فیل کی دیر میں ہو رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ”کیا تو آئی۔“

”ہاں..... اور وہ ریفیکس بھی لے آئی ہے۔“

میں نے عاجزی سے کہا۔ ”میری آنکھوں پر سے یہ پٹی ہٹا دو، تصویر دیر کے لیے۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”پلیز، میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ اس کے اور ہمارے درمیان ایک خست عمارت حاصل ہے۔ اس کے بعد مجھے کی طرف ایک سڑک ہے، یہی سڑک آگے سے گھوم کے آئی ہے۔ تو اس پر گھڑی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تو نے کی کیا بات ہے اس میں۔“

ایک زبردست تھپڑ میرے منہ پر پڑا جو اتنا غیر متوقع تھا کہ میں گر پڑا۔ میں نے چلا کے کہا۔ ”نور..... تم کہاں ہو۔“

نور کا کوئی جواب نہیں آیا۔ بے درپے پڑنے والی ٹھوکروں نے مجھے بے حال کر دیا۔ ”تم کچھ نہیں کر سکتے تو اب زادے۔ ہم نور کو لے جا رہے ہیں اور وہ تم کو اسی وقت ملے گی جب تم اور تمہارا بیکل چارلی کے کل کے الزام سے چیف کو رہائی دلوا دو گے۔“

میں نے فریاد کی۔ ”دیکھو یہ پاکستان نہیں ہے۔ وہاں سب کچھ ہو سکتا تھا۔ زور زبردستی سے یا رشوت سے، لیکن یہاں۔“

”کوئی پہاڑ نہیں کھودا ہے تم کو..... صرف یہ کہنا ہے کہ تمہارا الزام لگنا غلط تھا۔ چیف نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ تم نے اپنا پرانا حساب برابر کرنے کے لیے اسے پھنسا یا۔ چاہو تو الزام اپنے سر لے لو، اسی اور کو مجرم بنا دو..... یا وہی ہو جو ہمیں سمجھا گیا ہے، جب تک چیف واپس نہیں آئے گا تو رہی واپس نہیں آئے گی، آگے تمہاری مرضی..... تمہیں یہ کام کیسے کرنا ہے۔“

”اور..... تم..... نور سے میرا رابطہ کر دو گے۔“

”یہ ہو سکتا ہے۔ یہ تمہاری نیت پر منحصر ہے۔ تم پلان کے مطابق چلو گے تو اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ورنہ۔“

”اور نہ کیا۔“

”وہ ہمارے پس میں ہوگی، اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ کسی نے میری جیب میں سے تھاموگس فون بھی نکال لیا جس پر میں راجا کے ذریعے نور تک اپنی بات پہنچا رہا تھا۔ آس پاس بدستور سنا جاتا تھا۔ کہیں کسی قسم کی آواز نہ تھی۔ نہ سڑک پر سے کوئی گاڑی گزرنے کی..... نہ انسانوں کے بات کرنے کی..... زندگی میں اتنا بے بس میں نے خود کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

میں اپنے برحشت خیالوں میں اتنا سرگرواں تھا کہ میرے لیے وقت کا احساس بے معنی ہو گیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے چاروں طرف خاموشی محسوس ہوئی، ایسی خاموشی جس میں میرے ساتھ صرف میری تنہائی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”چیف۔“

”کسی نے بھی جواب میں کچھ نہیں کہا۔ میں نے کہا۔ ”چیف..... تم کہاں ہو..... چیف.....! میں چلا جا لیکن میرے کانوں میں صرف اپنی آواز آئی یا اپنی بے چارگی اور بے بسی کی خاموشی تھی۔ وہ لوگ جا چکے تھے۔ وہ نور کو بھی اسے ساتھ لے گئے تھے اور مجھے نہ جانے کہاں چھوڑ گئے تھے۔

میں نے اپنے ہاتھ آزاد کرانے کی اور اپنی آنکھوں پر چڑھی ہوئی پٹی اتارنے کی روانہ دار لا حاصل کوشش کی۔ ایک عجیب طرح کے خوف نے مجھے گھیر لیا۔ شاید وہ مجھے کسی ذریعہ ان گھر میں بند کر سکے ہوں گے جہاں کوئی میری آواز پر نہیں آئے گا۔ میں چلا تے چلا تے اسی دہانے بے نشان میں سر جاؤں گا۔ بے وقوف..... حق..... بے عقل تو اب رہیں احمد شیرازی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ چیف نہیں، تم نے اس سے تعاون کیا؟ نور کو اس کے حوالے کر دیا؟ انہیں پچاس ہزار پاؤنڈ بخیر عافیت دلوا دیے۔ تمہاری یہی سزا تھی جو تمہارے دشمنوں نے تم کو دی۔ اب شہرت بدعالتی کی ریاست ہو گئی۔ شیرازی اینڈ پٹنی، مذہد محل زندہ وہ اسٹیل..... نور پھر خوار ہوگی۔

میں نے اپنا سر جھکا۔ یہ میرے دماغ میں کس قسم کے فضول خیالات کی لپٹا رہا ہے، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر میں یہاں سے نکل گیا تو سب ٹھیک کر لوں گا۔ یہاں سے نکلتا کیا مشکل ہے، جب وہ مجھے لائے تھے تو میں چند ہیے اتر کے بیٹھے آیا تھا، نہ اس وقت کسی نے کوئی دروازہ کھولا تھا اور نہ بعد میں اس کے بند ہونے کی آواز آئی تھی، وہ ذریعہ کب تک قریب ہی ہوگا، میں اسے تلاش کر سکتا ہوں۔

کئی بار گرنے اور دیوار سے ٹکراتے کے بعد بالآخر میرے قدموں نے زبردست تلاش کر لیا۔ ایک دم میرا حوصلہ دو چند ہو گیا، آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے میں اوپر کی جانب بڑھتا گیا۔ پھر میرا گام قدم ہوا رستہ پر پرانہ ذریعہ ختم ہو گیا تھا، میں نے چلا کے کہا۔ ”ہیلو..... کوئی ہے؟“

مجھے یہاں چھوڑ کے جانے والوں نے کہا تھا کہ سڑک اسی کھنڈر کے نیچے سے گزرتی ہے، کھنڈر سے شاید میں باہر آ گیا تھا۔ اب کیا مجھے نیچے کود جانا چاہیے؟ معلوم نہیں سڑک

میں نے اسے روکا۔ ”اٹ اڑ آں رات۔۔۔ مجھے تھوڑا سا پانی منگوادو، یہ ابھی ہوش میں آجائے گی۔“

اس نے مجھے ہائی منگوادیا۔ ”مجھے سخت جرت ہے کہ اس کا ایک اسے کیا ہوا، ابھی تھرا ہے آنے سے پہلے نور باگل نازل طریقے پر مجھ سے بات کر رہی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کسی کی نظر اندر اٹھنے والے جذبات کے طوفانوں کی شدت کا کیسے اندازہ کر سکتی ہے۔“

وہ میری بات کچھ سمجھا مگر کچھ نہیں لیکن اس نے خدا کا شکر ادا کیا جب پانی کے چند چھینٹے پڑنے کے بعد نور نے آنکھیں کھول دیں اور کچھ دیر میں سخت زدہ ایٹھ بیٹھی۔ راجر کے علاوہ بھی کچھ لوگ اس کے ہسٹریائی روئل کا مشاہدہ کر کے جا چکے تھے۔

میں نے کہا۔ ”تم واقعی پاگل ہو۔۔۔ خود کو تماشا بنالیا سب کے سامنے۔“

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ”جو کچھ ہوا اس پر میرا اختیار نہیں تھا۔ میں کوئی ایکٹنگ نہیں کر رہی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”آئی ایم سوری، میرا یہ مطلب نہیں تھا جان لیکن موقع مل گیا تو دیکھنا چاہیے۔ کچھ کنٹرول رکھنا چاہیے اسے جذبات پر۔ خیر۔۔۔ یہ بتاؤ، اب طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم کیسے ہو، مجھے بہت کمزور لگ رہے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔ وہ کوئی صحت افزا مقام نہیں تھا۔ تم بتاؤ کہ یہاں کیسے آئیں۔ تمہیں تو وہ بد معاش لے گئے تھے؟“

کیپٹن راجر ہماری گفتگو کیا سمجھتا۔ ہم دونوں ہی ایک بگڑائی کیفیت سے گزر رہے آئے تھے۔ وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ دیکھو تمہاری باتوں میں میرا وقت ضائع ہو رہا ہے اور فوراً قانونی کارروائی شروع کر دیتا۔ یہاں کی پولیس کا خالص انسانی وصف ہے، وہ غیر انسانی رویہ بھی اختیار نہیں کرتے خصوصاً عام شریف لوگوں کے ساتھ۔

کیپٹن راجر نے گھڑی دیکھی۔ ”میرا خیال ہے کہ قانونی کارروائی کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دینا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”اٹ اڑ آں رات لیٹن۔۔۔ ہم اپنا بیان دینے کے لیے تیار ہیں۔“

”دراصل مجھے ایک کام سے جانا تھا اور وہاں میرا وقت پر پکڑنا از حد ضروری ہے، باقی کارروائی ہم کل تک پر رکھ

لیتے ہیں۔“

باقی کیا۔۔۔ کارروائی ابھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے زبانی طور سے چند سوالات پوچھے تھے کہ میں کتنے گھنٹے گیا اور کارروائی رک گئی۔ میں نے اس کی پیشکش کو قبول کر لیا۔ ہماری گاڑی باہر موجود تھی۔ وہ یہ گاڑی تھی جو پولیس کو میرے اتوار کے بعد قادم ہاؤس کے باہر لاوارث گھڑی لٹی تھی۔ اب اس میں ایک ڈرائیور موجود تھا جس کی صورت میرے لیے اچھی تھی۔ دوسرا اس کے ساتھ سرسٹ پر رکھے سو رہا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی اشارت کی تو اس کا ساتھی بھی مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دونوں حفاظتی عملے کا حصہ ہوں گے اور ہر جگہ آتے جاتے ہمارے ساتھ رہیں گے۔ تمام راست نور میرے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کیے خاموش بیٹھی رہی۔ میں واپس ارٹسٹ ہاؤس پہنچا تو مجھے سب کچھ بہت بدلا ہوا لگا۔ جس سیکورٹی کوشش نے غیر ضروری سمجھتے ہوئے ختم کر دیا تھا وہ پہلے سے زیادہ نظر آ رہی تھی۔ سوئی نے اور پولیس نے حفاظتی انتظامات کو ناگزیر قرار دیتے ہوئے ایک فول پروف سسٹم نافذ کر دیا تھا جس میں ہاؤس کا فزڈ کے علاوہ کبھی بہت کچھ تھا۔ کلون سرکٹ کمرے، خود کار الارم، شخصوں فریکوئنسی پر مکمل دے والے آلات۔

اپنے کمرے کی خلوت میں بیٹھنے ہی لوگوں کو پھر جذباتی کمزوری نے مغلوب کیا اور اس نے روتے روتے مجھ سے مطالبہ کیا کہ بس اب یہ سب چھوڑو اور چلو واپس۔ لندن پر ارٹسٹ بیٹیشن برادر شیرازی اینڈ کمپنی پر۔۔۔ میں صرف سنتا رہا اور اسے سنی دیتے ہوئے اچھا اچھا کہتا رہا۔ بالآخر وہ پرسکون ہو گئی۔ میں خود دلچسپ ٹیشن میں تھا لیکن نور کو منع کیا کہ اسے داری بھی میری کسی چٹانچہ میں نہ لے کر اسے صحت سے اسے سمجھاتا بھی رہا اور اپنی ہلکی ہلکی باتوں سے اس کو ہنسائے کی کوشش بھی کرتا رہا۔

کچھ دیر میں وہ ہاتھ دھو کر اور لباس بدل کے آگئی تو میں بھی غسل کرنے چلا گیا۔ پھر تم نے ٹیرس پر بیٹھ کے رات کا کھانا کھایا۔ اب نور سے پوچھا جاسکتا تھا کہ اس پر کیا بیٹھی اور میں بھی بتا سکتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے جب نور نے بات کرنی چاہی، میں نے اسے روک دیا تھا کہ ابھی نہیں۔۔۔ کریں گے بات وچلدی کیا ہے۔

چھ سوالات میں نے کیا۔ ”میرے ساتھ جو ڈراما ہوا وہ ہوا، کیا وہ تمہیں انوار کر کے نہیں لے گئے تھے۔؟ پچاس

ہزار پاؤنڈز کے ساتھ۔“

”لے گئے تھے۔۔۔ ان کے پیچھے پیچھے پولیس پہنچ گئی۔ وہ سب جڑے گئے۔۔۔ نور نے کہا۔ ”پوچھو کیسے؟“

میں نے کہا۔ ”لندن کی پولیس ایسے کارنامے سر انجام دینے کے لیے مشہور ہے۔ کیسے کا جواب میں کیسے دوں؟“

وہ بولی۔ ”پولیس کوشش نے بلایا تھا، اپنے پیچھے۔“

”تم نے بلایا تھا؟“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”تمہارے اصلیل جانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد وہاں سے سامن نے فون کیا تھا۔ بے چارہ سامن۔۔۔ پولیس نے میرے بیان پر اس تفتیش کے لیے پکڑ لیا تھا۔ وہ کیا بتاتا۔۔۔“

”اس نے کہاں فون کیا تھا؟“

”اس نے آفس میں فون کیا تھا، تم سے بات کرنے کے لیے۔ مگر اسے بتایا گیا تھا کہ نواب بریلی ایک گھنٹہ پہلے گاڑی لے کر کہیں گئے ہیں۔ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تم آفس میں ہو یا نہیں، وہاں اس کی بات مجھ سے ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں یہاں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس نے بتایا کہ میں نے انہیں ایک گھنٹہ سے ملوانے کے لیے بلایا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”یعنی فون کال نہیں تھی۔“

”سامن نے کہا کہ لاڈل ریفریق کے آنے کے بعد میں ڈیوک آف کسٹرشائز کو اطلاع دیتا۔ لیکن وہ ابھی تک پہنچے نہیں حالانکہ انہوں نے کہا تھا کہ میں آ رہا ہوں۔ پہلے تو میں نے کہہ دیا کہ ہوسکتا ہے کوئی اور ضروری کام نکل آیا ہو، پھر میں نے تم سے بات کرنے کی کوشش کی تو آدھے گھنٹے تک تمہارا فون بند ملا۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے پھر سامن سے پوچھا تو اس نے کہا کہ لاڈل ریفریق ابھی تک نہیں آئے۔“

”یہ نواب سے میں لاڈل کب بنا۔“

”صرف سامن ہی نہیں۔۔۔ یہاں اور لوگ بھی جنہیں لاڈل ریفریق کہنے لگے ہیں۔۔۔ عادت کے مطابق نواب ان کی زبان پر نہیں چڑھتا۔ پہلے لاڈل ارٹسٹ کہتے تھے، ان کی جگہ تم آئے ہو تو لاڈل ریفریق ہو گئے۔ خیر۔۔۔ سامن کی بات پر مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ میں نے سوچی سے کہا کہ آخر ریفریق کیا کہاں اور اس سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا ہے، اس نے کہا کہ تھوڑی دیر اور دیکھ لیجئے ہیں، کیا باتوں خراب ہو گیا ہو۔“

”سامن نے گیت پر میری گاڑی نہیں دیکھی تھی؟“

”وہ باہر گیا بھی نہیں۔ ڈھائی گھنٹے بعد اس نے پھر یہی کہا کہ میں لاڈل ریفریق کا انتظار کر رہا ہوں اور مجھے تشویش

ہو رہی ہے۔ پھر میں نے پولیس سے اپنے انڈیشوں کا احوال پوچھا۔ پولیس پہلے میرے انڈیشوں کو سرکس میں لے رہی تھی لیکن جب میں نے گزشتہ رات کے پرداتوں والے قے کا ذکر کیا جس میں اسل پرست مصعب گمروے اسٹن ہیڈز نے سوئی کے کمرے واپس آتے ہوئے ہمارے حملہ کیا تھا اور سوئی نے بھی تاہی کی تو پولیس نے ریج یعنی انڈیشوں میں سامن کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ اصلیل سے ارٹسٹ میٹن کے راستے پر دیکھے۔ وہ گیت سے نکلا ہی تھا کہ اسے تمہاری لاوارث گھڑی ہوئی گاڑی نظر آگئی۔ اس نے فوراً پولیس کو بتا دیا اور دس منٹ میں ایک پولیس کار وہاں پہنچ گئی۔ پھر سرخسوں اور جاسوس آگئے۔ انہوں نے مجھے مطلع کیا اور میں سوئی کے ساتھ ایک پولیس کار میں گئی۔ پولیس نے وہاں معمول کے مطابق اپنی کارروائی کی۔ انہوں نے فکٹر پرنس کے لیے اور نو نو گراف۔۔۔ وہاں دوسری گاڑی کی موجودگی ثابت ہوئی تھی جس میں ہمیں انوار کر کے لے جایا گیا تھا۔ انہوں نے ٹائروں کے پرنس دیکھے۔ جھاڑیاں دیکھیں جہاں انوار کا چھپ کر بیٹھے تھے۔ بعد میں سرخس فکاٹے والے کتے طلب کیے گئے اور واردات کی خبر پولیس کے ٹیٹ ورک پر پھیلا دی گئی۔

پولیس نے مجھ سے بہت کچھ پوچھا۔ میں نے سامن کے روئے کا ذکر کیا جو مجھے بھی مخالف لگتا تھا اور ہمیں بھی۔۔۔ وہ ہمیں اپنا نیا بالک کچھ کے ناخوش تھا۔ وجہ وہی۔۔۔ ہم نو دو لیتے اور گھبرا لوگ تھے۔ غیر خاندانی، سونے پر سہا کہ یہ کہ انہیں۔۔۔ کالے لوگ، میں نے اسی پر شک ظاہر کیا۔ اس سے پہلے چارلی اپنی خباثت دکھا چکا تھا اور نکل کے سارے ملازمین احتجاجاً مستعفی ہو گئے تھے۔ انہیں یہ ملکیت کی تہہ کی نالیہند اور نا منظور تھی۔ میرے بیان پر۔۔۔ میرا خیال ہے کہ میں غم دھیس میں اس حد تک آگے چلی گئی کہ میں نے سامن کو ہی مجرم بتا دیا تھا کہ اس نے دھوکے سے فون کر کے ہمیں بلایا ہوگا، خیر بعد میں خود ڈیوک آف کسٹرشائز نے تصدیق کر دی کہ وہ گھوڑے خریدنا چاہتے تھے۔ سامن نے ان سے بات کی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ لاڈل ریفریق کو فٹ مائی قیمت دینے کے لیے تیار ہیں یہاں تک کہ بلیک چیک بھی دے دیں گے۔ دراصل گھوڑوں کی محبت سے قیادہ ان کو اپنے حریف دوست لاڈل ارٹسٹ کی موت کا مددہ تھا اور ان کی تمکلی سے جذباتی ہمدردی تھی۔ ان کے بیان سے سامن کی جان بخشی ضرور ہو گئی۔ لیکن اس پر شک برقرار رہا۔

میری جو حالت ہوئی سو ہوئی۔ سوئی کا مددہ سے ہر

حال تھا۔ اس نے پولیس پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک پریس
 انٹیمٹ جاری کر دیا۔ پولیس کا سارا تھک ایک دم جیسے
 سارے کام چھوڑ کے اس کیس میں لگ گیا۔ بروقت سح شام
 نے احکامات ملتے تھے، نئے انتظامات کیے جاتے تھے۔
 انہوں نے ہر طرف خفیہ پولیس کے لوگ سادے کپڑوں میں
 متعین کر دیے تھے اور امکانات کے ہر پہلو کو سامنے رکھا تھا۔
 بہت سے لوگ گرفتار ہوئے اور تفتیش کے بعد چھوڑ دیے
 گئے۔ دو بار مجھے شناخت کے لیے بلایا گیا۔ کچل کے پرانے
 خادم طلب ہوئے جن میں میری لوجی بھی شامل تھی۔ وہ سخت
 براخود سختی اور اٹلا پولیس کو دھمکی دیتی رہی کہ وہ ان کے
 خلاف ہتک عزت کے ہر جانے کا کیس کرے گی۔ میں نے
 کسی پرائیویٹ مکیک رٹی انجمنی کی خدمات حاصل کرنے کی
 خواہش ظاہر کی تو پولیس نے مجھے تین نام دے کہ یہ قابل
 اعتبار ہیں۔ ایک سے میں نے سٹریٹ بھی کر لیا لیکن ایک
 بہت بڑا کام پولیس نے کیا۔ بتاؤ کیا ہے؟
 میں نے فور کی ایک پٹری بزم کا نشان دیکھا۔ اس پر
 میڈیکل ٹیپ سے کراس بنا ہوا تھا اور دروگر کی جگہ پر گہری
 برقی تھی۔ ایک خفیہ سائنٹسٹان خون کا بھی تھا۔ میں نے اسے
 انگلی سے چھو کر کہا۔ ”کوئی چوٹ لگی ہے؟“
 اس نے مسکراتے میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔“
 میں نے کہا۔ ”کوئی چیز بھی ہوگی۔ درد ہوتا ہے۔“
 وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔ ”تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ
 اسی زخم کی وجہ سے اس وقت میں تمہارے سامنے بیٹھی
 ہوں۔“
 میں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“
 اس نے کہا۔ ”اس بیڈ روم کے پیچھے ایک الیکٹرونک
 چپ ہے۔ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے جان لیون یہاں کی
 پولیس سرانصرہانی کے لیے سائنسی آلات اور ایجادات سے
 کیا کچھ کرتی ہے، ایک رات میرے پاس کیپٹن راجر آیا میں
 بھی معمول کی تفتیش کے لیے آیا ہوا تھا۔ ہاں۔ یہ پہلی رات
 گئی بات ہے، اس کے ساتھ ایک دیلا ہلا بے وقوف نظر آنے
 والا ڈراہور تھا۔ اس نے اندر آ کر مجھے خردا کر کیا کہ لاڈ
 رہتی کا سراغ تو ہم کٹائیں گے لیکن میڈیم۔ آپ خود بہت
 خطرے میں ہیں، وہی لوگ آپ کو بھی لے جاسکتے ہیں جن کی
 تحویل میں آپ کا دوست ہے، وہ آپ کو بلانے کے لیے انہی
 کو استعمال کر سکتے ہیں اور وہ مجبور ہوں گے۔ کچا نہ کی وہ
 سے انکار نہیں کر پائیں گے۔“
 میں دم بخود بیٹھا تھا۔ ”مکتا صبح اندازہ تھا ان کا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اس نے کہا کہ ہم آپ کو ایک چھوٹی سی
 تکلیف دیں گے، اس سے آپ کا تحفظ سہولیت پتی ہو جائے
 گا۔ یہ ہمارے پولیس سرجن ہیں، یہ آپ کے جسم میں ایک
 ٹرانسمیٹر لگائیں گے۔ ٹرانسمیٹر کے نام پر میں ڈر گئی کہ شاید
 پیٹ میں کوئی آلہ ڈالیں گے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ڈرنے
 کی کوئی بات نہیں، یہ آپ کے زخموں کے برابر ایک چپ ہوگی
 جو سگنل نشر کرتی ہے، اس نے مجھے پیش جو گراہک والوں کی
 ایک ڈیو ہول دکھائی جس میں سائنسدانوں نے کچھ برآمدوں
 کے ٹکڑے میں تعویذ لگا کر لاک ڈالے تھے اور اس سے ان کی شکل
 و حرکت پر نظر رکھی جاتی تھی۔ یہ لاکٹ جو سگنل دیتے تھے اس
 سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ پرنڈہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔
 بعض لاکٹ کسمرے والے بھی تھے، جانوروں کو تحفظ فراہم
 کرنے والے ادارے اور دیر سرج کرنے والے یہ تکنیک ہر
 جگہ استعمال کر رہے ہیں۔ پھر اس نے مجھے وہ چپ دکھائی۔
 وہ زخموں کے برابر تو غیر نہیں تھی، ایک انچ سے کچھ لمبائی اور
 چوڑائی تھی اور تقریباً تین کی میگز موٹی۔ کیپٹن راجر نے کہا
 کہ یہ میری جلد کے نیچے ٹرانس پلانٹ ہوگی۔ اس میں ایک
 بیٹری ہے جو میرے جسم کی حرارت سے چارج ہوتی رہے گی
 اور اس کا ٹرانسمیٹر ایک مخصوص فریکوئنسی پر مسلسل سگنل نشر
 کرے گا۔ پولیس کے ریسورسز پر اسے مانیٹر کیا جائے گا۔
 اوپر سے دیکھتے ہیں کہ کسی زخم کی حیثیت نظر آئے گا۔ ہم اس
 کے آس پاس کی جگہ کو ایسا ہی بنا دیں گے۔ آپ کو چھپنے ہوئے
 احساس تک نہیں ہوگا لیکن دن رات آپ جہاں جائیں گی
 ہمیں سگنل ملے گا اور پتا چلا رہے گا کہ آپ کہاں ہیں۔ میں
 حیران تو شمری، پھر بھی میں نے پوچھا کہ یہ جلد کے نیچے ہی
 کیوں ضروری ہے۔ اس نے کہا کہ میڈیم۔ خدا نہ کرے کہ
 آپ انخوا ہوں لیکن انخوا کرنے والے جسم پر کچھ چھوڑتے
 نہیں، نہ پکڑے نہ زبرد۔ وہ آپ کے بالوں میں بھی دیکھیں
 گے اور آپس بھی اتروائیں گے۔ گھڑی یا موبائل فون کا تو
 سوال ہی نہیں۔ ہر صورت میں یہ زخم اپنی جگہ رہے گا۔ وہ بی کو
 نہیں اتاریں گے۔ جی بھی کہاں یہ میڈیکل ٹیپ کا معمولی
 کر اس ہے۔ اس کے آس پاس جو سرجی قمر نے دیکھی یا جو خون
 کا معمولی سا دماغ نہیں نظر آیا۔ وہ کچھ بھی نہیں۔ سیک اپ
 کا رنگ ہے لیکن اس سے چوٹ کا پتا چلا ہے کہ زخم کے آس
 پاس کی جگہ بھی متاثر ہوئی ہے۔“
 ”یہ تو واقعی کمال کیا پولیس نے۔۔۔۔۔“
 ”جب مجھے بلایا گیا تو مجھے کیپٹن راجر کی بات یاد
 آئی۔ ابھی تک انخوا کرنے والوں کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کون

ہیں۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ تمہیں تاوان کے لیے انخوا کیا گیا
 ہے۔ راجر نے کہا تھا کہ جب لاڈر تفتیش آپ کو بلائیں گے تو
 ان کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا۔ وہ کسی بھی وجہ سے
 مجبور ہوں گے۔ بالکل ٹھیک کہا تھا اس نے۔۔۔۔۔ اب پولیس کو
 کچھ بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے وہی کیا جو
 مجھ سے کہا گیا۔ میں ڈرا بھی خوف زدہ نہیں تھی کہ میرے
 ساتھ کیا ہوگا۔ الٹا مجھے امید ہو گئی تھی کہ اب مجرم جج نہیں
 سکتے۔ میں بیچاس ہزار پاؤنڈ بڑے کر خفیہ طریقے سے فلی لیکن
 میری شکل و حرکت خفیہ کہاں تھی۔ پولیس کو فوراً معلوم ہو گیا کہ
 میں کہاں جا رہی ہوں۔ وہ سامنے کی طرح میرے پیچھے آئے
 مگر شہر سے باہر آ کے قلاب ہو گئے۔ مجھے اپنی گاڑی میں لے
 جانے والے اپنی طرف سے انتہائی محتاط تھے اور ان کی گاڑی
 سے ایک گھو میز پیچھے دوسری گاڑی صرف یہ دیکھنے کے لیے
 چلی رہی تھی کہ پولیس یا کوئی اور ان کے تعاقب میں تو نہیں
 ہے لیکن پولیس نے مخالف سمت سے بلکہ شمالی طرف سے سگنل
 دیکھ لیا۔ ظاہر ہے سگنل تو ایک دائرے میں نشر ہو رہا تھا اور
 اس کی رینج بھی تھی۔ پولیس نے اپنے طور پر نتیجہ اخذ کر لیا تھا
 کہ میرے ساتھ وہی ہو رہا ہے جس کا انٹینسٹیٹ تھا۔ میں تم
 نے مجھے بلایا ہے اور میں رازدار ہی سے پولیس کو یا کسی اور کو
 بتاے بغیر جا رہی ہوں۔ انہوں نے تین گاڑیوں کو روانہ کیا جو
 ایک ایک سٹاپ سے آئیں لیکن ان کے پیچھے کوئی نہیں گا۔
 پولیس کا خیال تھا کہ یہ لوگ سب بھگتوں تو پولیس کا بھی مقابلہ
 کر سکتے ہیں۔ ان کے فرشتوں کو خبر نہیں ہوئی اور پولیس سر پر
 آ کھڑی ہوئی۔“
 ”تمہارے ساتھ انہوں نے کوئی بدسلوکی تو نہیں کی
 تھی؟“ میں نے پوچھا۔
 ”سوال یہ ہے کہ تم بدتمیزی کسے سمجھتے ہو۔ اگر تمہاری
 مراد دست درازائی سے تو جواب ہے نہیں۔ لیکن یہ موقع
 ملا تو وہ کرتے۔۔۔۔۔ ایک مرد کے مقابلے میں عورت کو صرف
 جسمانی تشدد کا خطرہ ہی نہیں ہوتا۔ بے آبروئی کا ڈر زیادہ ہوتا
 ہے، تمہارے بات کرنے والا ان میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ
 سب انتہائی کھلی اور بازاری زبان استعمال کر رہے تھے اور یہ
 ثبوت فراہم کر رہے تھے کہ وہ کتنے کھلی مجرم ہیں۔“
 ”یعنی اعلیٰ مجرم بھی ہوتے ہیں۔“
 ”کیا تم نے دیکھے نہیں؟۔۔۔۔۔ اس بکر خان کے ساتھ میں
 ایسے لوگوں سے ملی ہوں جو ذہن تھے، باقی کو کنٹرول کرتے
 تھے لیکن کیا مہذب اور شائستہ۔ خوش لباس، خوش ذوق،
 آداب مجلس کے واقف۔۔۔۔۔ دیکھ کے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا

مونالیزا

مونالیزا کا ساتھ اور اسی کی تلاش تھی۔ صاحبزادہ
 پروین گھٹا بڑی چیز ہے۔ ہم نے بہت چھوٹی عمر میں
 دس بارہ سال کے سن میں جی یا مونالیزا کا ذکر پڑھا
 تھا اور اس کی تصویر نیرنگ خیال کے سالانے میں
 دیکھی تھی۔ جو کچھ تھا نقادان کرام نے مونالیزا کی
 مسکراہٹ کے باب میں لکھا تھا اسے پڑھ کر تو ہم
 متاثر ہوئے لیکن تصویر دیکھ کر نہیں۔ پھر سیکڑوں بار یہ
 تصویر دیکھی اور آخر خیال کیا کہ یہ آخر قطعی ہیں۔
 اصل میں ضرور کوئی بات ہوگی۔ پس ہم لودر میں
 اسٹریٹ روم میں بیچنے تو دم بخود تھے۔ ایک تصویر کے
 سامنے لوگوں کا جھوم تھا۔ صرف اس ایک تصویر کے
 گرد و سرخ باتات کا فریم تھا اور پڑیش تھا۔ ہم نے
 اسے دور سے دیکھا، پاس سے دیکھا۔ بہت جی کو کڑا
 کیا۔ لیکن صاحبزادہ آپ لوگوں نے بھی یہ تصویر دیکھی
 ہے۔ اس میں کون سی خاص بات ہے۔ ایک عورت
 ہے جس کے جسم میں کسی طرح کی موزونیت نہیں۔
 ایک چہرہ ہے جس پر کسی طرح کے جذبہ بات نہیں۔ کسی
 طرح کی شوشی۔۔۔۔۔ غم کی کیفیت نہیں اور ایک
 مسکراہٹ یا غم مسکراہٹ ہے جو آپ کسی بھی غصے
 کے چہرے پر دیکھ سکتے ہیں۔ لیونارڈو ڈی ونچی کے
 ہم بہت قائل ہیں اور اس کے شاہکار ہم نے دیکھے
 ہیں لیکن یہ تصویر؟ ہے ادب شرط مزہ نہ کھلو اس۔
 ایک بار کسی نے اسے چڑھا دیا۔ باقی لوگ تھپڑا مٹھی
 پر تھپی مارتے گئے۔ اگر کسی کی رائے ایسی ہوتی جیسی
 ہماری ہے تو عورت کے مارے یا نقادوں کے ڈر سے
 چپ ہو گیا کہ بدذوق کی تہمت نہ اٹھائے۔ مونالیزا
 کے دلدادگان ہم پر قفرین بھیجے سے چیلر اڑا رہے
 انصاف اس تصویر کو ایک نظر دیکھ لیں اور ایک بے
 ذول غبی چہرے پر اس احمقانہ تاثر کو ملاحظہ فرمائیں جو
 مسکراہٹ بنتے بنتے رہ گیا ہے۔ پھر جو جی چاہے
 ہمارے بارے میں لکھیں۔
 ابن انشا کے سفر نامے ”دنیا گول ہے“ سے اقتباس

کہ وہ جرائم پیشہ گروہ کے سربراہ ہیں۔

وہمبول جھوٹا۔^{۱۷}

ہوتا ہے کہ تم نے یہاں بھی اپنی ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

”اسی لیے میں نے بتا دیا کہ تمہارے ساتھیہ میں سب میں تو تم پر انحصار کر رہا تھا۔“

تھے لیکن میرے سامنے بیٹھی ہوئی ماہ نور اس زندگی سے بھاگ کے آئی تھی اور اس نے میری محبت کے سناہن میں چاہا ہے لی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے گرد ایک جذباتی جوار کا تم کر لیا تھا جس میں وہ خود کو صرف میرے ساتھ محفوظ دیکھتی تھی۔ یہ بھی تھی کہ باہر کی دنیا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

اور میں تھا کہ اسے پھر اسی کاروباری دنیا میں کھینچ لایا تھا۔ اس کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ جذبات کو ایک طرف رکھے۔ اسے عملی ہونے کا ثبوت دے، دنیا وار بنے۔ میرے ساتھ مل کے بڑھ چلا اور حریف دولت کمانے کی جدوجہد میں میرا ساتھ دے۔ یہ سب کچھ بھی وہ اکبر خان کے لیے بھی کر رہی تھی۔ صرف یہاں تک کہ اس کا مقصد حیات ہوتا تو وہ اکبر خان کو چھوڑ دیتی کیوں اور اس کے قتل کا الزام اپنے سر کیوں لیتی، یہ صرف محبت تھی جو اسے میری طرف کھینچ لاتی تھی، یہ ایسی محبت تھی جس میں وہ مجھ سے کچھ طلب کرنے کی روادار نہ تھی۔ یہ بالکل غیر شرط محبت تھی بالکل یکطرفہ۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ میں فریال سے شادی کروں تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس سے شادی نہ کروں تب بھی اس کی محبت وہی رہے گی، بس میں اسے خود سے دور نہ کروں۔

وہ جو کچھ کر رہی تھی محبت میں میرے لیے کر رہی تھی بہت دنیا پر کچھ بات کرنے کے لیے اور نہ مجھے اب اس کرنے کے لیے۔ وہ میری خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اور اگر فریال بھی تھی لیکن اب شاید یہ تیریں بڑیک ڈاؤن کا نتیجہ تھا کہ اس کے دل کی بات زبان پر آگئی اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ کیا چاہتی ہے اور میں نے اس کے دل کی بات سمجھ لی۔

لندن کے پیچیدہ اخبارات میں جرائم کی خبروں کو نمایاں جگہ نہیں دی جاتی لیکن وہاں بھی ایسے اخبارات کی کمی نہیں جیسے ہمارے ملک میں عام طور پر شام کو شائع ہونے والے کہلاتے ہیں لیکن دو پہر سے بھی پہلے مارکیٹ میں آجاتے ہیں۔ خود ہماری پاکستانی برادری اردو زبان میں ایسے اخبارات شائع کرتی ہے جن کے پڑھنے والوں کی تعداد ہزاروں کو لگتا سیکڑوں میں ہی رہتی ہے اور یہ اخبارات بھی مفت تقسیم کیے جاتے ہیں اور اشالوں پر ایسے ہی دوسرے اخبارات کے ساتھ بڑے نظر آتے ہیں۔

انہی اخبارات نے میرے کس میں بڑی دلچسپی لی اور انہو پرانے تاوان کی واردات کو خوب بڑھا چڑھا کے پیش کیا۔ کچھ پور پور کرنا اور میرا انٹرویو بھی کرنا چاہتے تھے۔ انہیں میں نے قریب نہیں جھٹکے دیا۔ پھر بھی کچھ میسر ہوئے سچے ارشٹ سینٹن کے باہر منتلا لائے رہے اور میرے

تقاب میں بھی آئے۔ انہوں نے ہماری تصویریں بھی اتار لیں اور ہمیں پتا نہیں چلا۔ اٹالوی زبان میں ایسے جان کاروں کا رقبہ بن کر تقاب کرنے والے صحافیوں کو پاپارازمی کہا جاتا ہے۔

ان اخبارات نے ہمیں بہت کچھ بتا دیا۔ میں پاکستان کی ایک بہت بڑی ریاست کا بادشاہ قرار پایا۔ ایک نے مجھے حکمران لکھا۔ فورملک ہوئی اور اس کا مقابلہ ملکہ نور جہاں سے کیا گیا تو مجھے جہانگیر کہنا پڑا۔ اس کے بعد انگریزوں کے لئے لیے گئے کہ وہ یہاں بھی اپنی نسلی برتری اور کیت کے خستاس میں مبتلا ہیں۔

افسوس کی بات یہ تھی کہ کچھ اخبارات نے ایلیا کے ساتھ میرے معاشرے کی بنیاد پر وہ کیا نیاں شائع کر دیں جو غلط تو خیر نہیں تھیں مگر مکمل درست بھی نہیں تھیں۔ ان میں ہمارے عشق کو ساری خرابی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ مجھے بے وقار اور چال باز کہا گیا کہ ایک اور لڑکی کے ساتھ کھینچے اور باہوں اور دل شکستہ ہیر و من دنیا چھوڑ کے سنائیس لے چکی ہے کسی دن خود کو بھی کرے گی۔ جتنے جتنے تھے اتنی باتیں۔

ایسے صحافیوں سے محفوظ رہنے کا ایک طریقہ تو قانونی تھا کہ میں ہرے بنیاد پر یا غلط یا درست پر ہر اخبار کو نوٹس جاری کر دوں۔ ظاہر ہے یہ ناممکن تھا۔ فوراً خبریں کو بہت اٹھائے کر لی تھی لیکن مجھے ایک کاروباری ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی گفٹوں کی فکر تھی۔ میرے قانونی مشیر ملک ارشد نے مجھے مشورہ دیا کہ میں دو چار دن کے لیے غائب ہو جاؤں۔ بہتر ہو گا کہ کسی کو بتائے بغیر جیس چلا جاؤں۔ اس سے معاملات خود ہی ختم ہو جائیں گے۔

یہ جویز مجھے پسند آئی۔ میں خود بھی تبدیلی کے لیے ایک بڑیک جاتا تھا۔ میرے ڈاکٹر نے اس کی تائید کی۔ لندن کے اعصاب شکن معاملات نور کو اور مجھے ڈپریشن میں مبتلا کر رہے تھے اور اس کا سب سے مؤثر علاج یہی تھا کہ ہم کچھ دن کے لیے سب کچھ بھول کے صرف تفریق کریں۔

مجھے اس تجویز پر بھی آئی کیونکہ بالکل ایسا ہی مشورہ مجھے ست بدعہائی میں دیا گیا تھا۔ راجا سیت میرے تمام خیر خواہ اس حق میں تھے کہ کچھ دن کے لیے میں لندن چلا جاؤں کیونکہ ست بدعہائی کے حالات میری ذہنی اور اعصابی صحت کو متاثر کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نور کے ساتھ لندن آ گیا تھا۔ اب لندن کا ڈاکٹر بھی یہی تجویز کر رہا تھا کہ چند دن کے لیے سارے مسائل کو بھول کر لندن سے دور چلے جاؤ۔ بے اختیار مجھے مرزا غالب یاد آئے۔ اب تو میرا کسے بھی کہتے ہیں

مر جا نہیں گئے۔ مر کے بھی جین نہ پایا تو کدھر جا نہیں گئے۔ ست بدعہائی سے لندن۔ لندن سے پیرس۔ اور آگے اپنی مرضی سے کم اور نور کے اصرار سے زیادہ مجبور ہو کے میں نے سپر ڈال دی اور ہم جیس جھٹکے گئے۔ یہ میڈیکل ایڈوائس تھی چنانچہ پوئیس نے اپنی ساری کارروائی مؤخر کر دی۔

اس قسم کی تبدیلی کے اثرات ہمیشہ خوش گوار ہوتے ہیں اور پیرس تو شہر ہی ایسا ہے کہ کرشمہ داسن دل کا کشید کر جا میں جا ست۔ ہر طرف حسن۔ خوب صورتی۔ فیشن اور خوشبو۔ چھوٹوں کے رنگ اور نور نے مصوری اور سنگتراشی کے کچھ۔ دنیا میں سب سے زیادہ سیاحوں کے پیرس آنے کی جگہ ہے۔

میں اور نور بھی لوٹ کر آئے تو بہت تازہ دم اور خوش تھے۔ ہمارے واپس آتے ہی مصروفیات کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ چیف کا معاملہ زیادہ سنگین ہو گیا تھا۔ اس کے الحق ماتحتوں نے ایک احمقانہ منصوبے کے ذریعے اسے پھرانے کی جو کوشش کی تھی اس سے جرم کی سنگینی اور بڑھ گئی تھی۔

انہو پرانے تاوان میں استعمال ہونے والی ساری رقم ہمیں لوٹا دی گئی تھی۔ ایک سچ مجھے اور نور کو شامت پر یہ قسم کی کارروائی کے لیے کاؤتھی مل لے چاہی گیا۔ وہاں ایک ایک کر کے تمام مٹران کو ہمارے سامنے پیش کیا گیا۔ کئی چیف کو دیکھ کر میں حیران بھی ہوا اور مجھے فسی بھی آئی۔ وہ اصل چیف سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی صورت کے لٹوٹش میں تھوڑی بہت مماثلت ضرور تھی لیکن اس کا میز اسٹائل وگ کا مرہون مت تھا۔ وہ گنجائش اور وگ کے بغیر ڈرامائی چیل نہیں لگتا تھا۔

میں نے اس شخص سے کہا۔ "مجھے تمہاری بے وقوفی پر افسوس ہوتا ہے۔ آخر کیا ضرورت تھی تمہیں اس شخص کی خاطر یہ سوانح بھرنے کی جو تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا؟"

"تم کو کیا۔ وہ خود بھی بھل جائے گا اور پھر مجھے بھی نکال لے گا۔" اس نے بہت دھڑکیا یہ بے شرمی سے کہا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "مجھے تو وہ وقت بہت دور نظر نہیں آتا جب وہ اور تم ایک ساتھ بھٹی کی کرسی پر بٹھائے جاؤ گے۔ یہ پاکستان نہیں لندن ہے۔ یہاں انہو پرانے تاوان کی میز ابھی موت ہے۔ اور یہاں رشوت یا سٹارڈش کام نہیں آتی۔"

اس کا رنگ درود پڑ گیا۔ "مرتا تو ایک دن سب کو ہے۔"

سائیکل

جب سائیکل بی بی امجاد ہوئی تو ایک آدمی نے اپنے بیٹے کو سائیکل لے کر دی۔ اس کا بیٹا سائیکل لے کر باہر نکلا، تو لوگوں نے دیکھا کہ لڑکے کو کوئی چیز اٹھا کر لے جا رہی ہے اور لڑکا لاتیں چلا رہا ہے لیکن وہ چیز لڑکے کی جان چھوڑ نہیں رہی، لوگوں نے ڈنڈے مار مار کے سائیکل کو توڑ دیا لڑکے باپ کو پتا چلا تو غصے سے بھرا ہوا آیا اور لوگوں سے کہا۔ "تم بھتو تم نے میرے بیٹے کی سائیکل کو توڑ دیا۔"

لوگوں نے جواب دیا۔ "چودھری بی بی اللہ کا شکر ادا کریں کہ آپ کے بیٹے کی جان بچ گئی، یہ عجیب چیز آپ کے بیٹے کو اٹھا کر لے جا رہی تھی، ہم لوگ نہ ہوتے تو یہ پتا نہیں اسے کہاں لے جاتی۔"

پاکستانی

جنم میں عذاب کے کوڑوں پر ایک ایک فرشتے کی بیوی تھی جب کوئی جنمیں کنویں سے باہر نکلا تو فرشتہ اسے دوبارہ دیکھل دیتا، ایک کنواں فرشتے کی ڈیوٹی کے بغیر تھا، ایک فرشتے نے پوچھا۔ "ہر کنویں پر تو فرشتہ مقرر ہے پھر وہ کنواں فرشتے کے بغیر کیوں ہے۔" جواب ملا۔ "اس کنویں میں پاکستانی ہیں، جب بھی کوئی لنگے کی کوشش کرتا ہے دوسرے اس کی ٹانگ پکڑ کے پھر اندر کھینچ لیتے ہیں۔"

ترکیب

کھلونوں کی دکان پر ایک جیسے دو ہرن رکھے تھے ان ہرنوں پر ان کی بیٹیاں درج تھیں ایک ہرن کی قیمت باجی سو جبکہ دوسرے ہرن کی قیمت دو سو درج تھی۔ ایک گاہک نے دونوں کو اچھی طرح دیکھا اور کم قیمت والا ہرن خرید لیا۔ جب گاہک دکان سے چلا گیا۔ سلا مین نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "دیکھا تمہاری سامان بیچنے کی یہ ترکیب، کبھی ناکام نہیں ہوتی۔"

مرسلہ رضوان عیوبی کریم دی۔

"اور جس کا روبرو میں تم جیف کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس میں بہن ہونا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ ایسا بہت دیر سے ہوا۔ جتنے لوگوں کی جان تم نے لی۔ جتنی زمرہ گوں کو تم نے برباد کیا اس کے بعد یہ سزا کوئی سزا نہیں۔"

"تم بھی تو جیف کے ساتھیوں میں تھے۔"

"غلط۔ میں اس کا شکار تھا۔ لیکن میں بچ گیا تھا۔ شاید خدا نے مجھے اسی لیے بچایا۔ زندہ رکھا اور پھر یہاں پہنچایا۔ کہ یہ نیک کام میرے ہاتھوں سرانجام پائے۔ ہر فرعونے داسوئے۔ افسوس پھر بھی ہوتا ہے کہ شہارے یہودی بیچے تا عمر تھارے اعمال کی سزا چھین گئے۔"

اس نے کہا۔ "ان کے پاس پیرا بہت ہے۔"

"ویری گڈ۔ آج پتا چلا کہ پیرا شوہر کا اور باپ کا تبادلہ ہو سکتا ہے۔ چلو پھر جاؤ تم بھی۔"

تقریباً آٹھ ماہ بعد جیف کی سزائے موت پر عمل درآمد ہوا۔ اس کے ساتھی کو بھونچو طور پر ساٹھ سال قید کی سزا ملی۔ باقی افراد کو میعادوں سے چالیس سال بھی۔ ان کا ذکر آگے نہیں آئے گا۔

سب بدحالی میں میرا سب سے ہی رابطہ تھا۔ راجا اصل حقائق سے پوری طرح باخبر تھا اور اس نے ہزاروں میل دور سے بھی ہر معاملے میں مجھے صاحب مشورہ دیا اور اپنی حاضر دماغی، ذہانت اور معاملہ جی سے مجھے احساس نہیں ہونے دیا کہ میں کیا ہوں۔ بے شک نور وہاں میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے موجود تھی لیکن اس کا سہارا محض جذباتی تھا۔ میں نے اس سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی تھیں اور اسے بہت سی ایسی ذلت داریوں میں شریک کر لیا تھا جن کا بوجھ اٹھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی لیکن میری خوشی کے لیے اس نے انکار نہیں کیا حالانکہ وہ ایک عام گورت تھی جسے جسمانی طور پر مصنف نازک شمار کیا جاتا ہے۔ اعصابی اور جسمانی طور پر بھی وہ ملوثا سرو کے مقابلے میں کمزور ثابت ہوئی ہیں۔ بالآخر ایک ایسی نوبت آگئی تھی جب نور نے صاف انکار کر دیا تھا کہ میرے بغیر وہ یہاں نہیں رہے گی۔

پیرس میں قیام کے دوران میں ہم نے کوئی کاروباری یا قانونی مسائل کی بات نہیں کی۔ یہ ہم نے روانگی سے پہلے ہی طے کر لیا تھا اس کے باوجود ہم میں سے کوئی ایسی بات پچھیر دیتا تھا تو دوسرا فوراً اسے روک دیتا تھا۔ یہ ایک مصنوعی اور شعوری کوشش تھی حقائق سے رد گردانی تھی فراہمی کوشش تھی۔ شرمناک کی طرح خطرے کے ڈر سے مریت میں من چھپانے والی بات تھی لیکن اس کا فائدہ ہوا۔

اس تمام عرصے میں موٹی نے جس خلوص اور مہارت سے کمپنی کے معاملات چلائے اس کی تعریف الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔ اس کی مدد کے بغیر میں نے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے میری خواہش کے مطابق مجھے میں تہہ ملی کی تھی۔ نئے اسٹاف میں زیادہ تر پاکستانی تھے۔ یہ وہ ہونہار نوجوان تھے جن کی اپنے وطن میں قدر نہ ہوئی یا جنہیں لان کی صلاحیت کے مطابق نہ کام ملا اور نہ معاوضہ وہ بدلہ ہو کے باہر نکال گئے۔ ایسی مثالیں کیڑوں نہیں ہزاروں ہیں۔

یہاں کے سارے معاملات راجہ کے سپرد کر دینے کا آئیڈیال رفتہ رفتہ مجھے قائل کر رہا تھا کہ میرے مسائل کا سب سے بہتر حل ہے اور خود راجہ کو مطمئن کرنے کا بھی۔ میں نے بتانا شروع کر دیا تھا اس مجموعہ کی افادیت کا قائل ہونا چاہا گیا۔ لیکن میں نے کوئی فوری فیصلہ نہیں کیا۔ میں اس معاملے میں واپس ست بدحالی پہنچ کے راجا سے اور دوسرے لوگوں کے علاوہ راجہ سے بھی مشورہ کر رہا تھا۔

اب میں واپسی کے متعلق سوچنے لگا تھا کہ ایک رات سیکورٹی کا رٹھ ڈھکے کی ہر برت اپنہر کے آنے کی اطلاع دی۔ اگر یہ پیشگی اطلاع دے بغیر اور وقت ملاقات لیے بغیر اپنے گھر پہنچ جائی تو بھی نہیں جاتے۔

میں نے کہا۔ "میں کسی ہر برت اپنہر کو نہیں جانتا۔"

"اس نے کہا ہے کہ مقررہ ملاقات وہ صرف آپ کو بتائے گا؟"

میں نے کہا۔ "اچھا فون اسے دو۔"

فون پر آواز آئی۔ "لاؤر تھیں۔ مجھے موٹی نے آپ سے ملنے کو کہا تھا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن سوچی نے یہ بات مجھے نہیں بتائی۔"

وہ پرمانہ بغیر بولا۔ "کیا اس میں میرا قصور ہے؟"

"میرا ہر برت اپنہر۔ آپ ایک منٹ انتظار کریں میں سوچی سے کفرم کر لوں۔"

میں نے سوچی سے پوچھا۔ "یہ ہر برت اپنہر کون ہے؟"

کہتا ہے اسے تم نے بھیجا ہے؟"

"اوہ ریٹی۔ آئی ایم سوری۔ میں مصروفیت میں تھیں بتانا بھول گئی۔ یہ دبی بردگر ہے جو محلات قدیم کوٹھیوں نوادرات اور جواہرات وغیرہ کے سودے کرتا ہے۔"

میں نے ہر برت اپنہر کو اندر بلا لیا۔ خلاصہ توقع وہ

ایک عمر رسیدہ شخص تھا جس کے سر کے بال بہت گھٹے اور لمبے ہونے کے ساتھ بالکل سفید تھے۔ جیسا کہ اس نے اپنے میں بتایا کہ اس کی عمر سال ایک سو ستر دن اور چودہ گھنٹے تھی۔ لیکن اس کی صحت بہت سے جوانوں سے اچھی تھی اور وہ حد درجہ خوش مزاج اور خوش لباس شخص تھا۔

"آئی ایم سوری مسٹر اپنہر۔ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔"

وہ مسکرا کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ "معذرت سوچی کو کرنی چاہیے۔ لیکن میں انتظار کا عادی ہوں۔ پیدا ہونے کے لیے مجھے نو مہینے ماں کے پیٹ میں انتظار کرنا پڑا۔ جوان ہونے کے لیے اٹھارہ سال انتظار کرنا پڑا کہ میں کسی خوب صورت لڑکی پر ڈرے ڈال سکوں۔ انتظار میں اب بھی کر رہا ہوں۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "کس بات کا؟"

"میرے کا اور کس کا۔ اور میں اپنے وارثوں کو مسلسل مایوس کر رہا ہوں۔ ہر سال کہتا ہوں کہ بس یہ آخری سالگرہ ہے۔ میری آنکھیں پوری سب سے زیادہ دھبی ہے کیونکہ اس کی عمر ایک ایک سال کر کے بڑھتی جا رہی ہے اس نے آٹھ سال قبل مجھ سے شادی کی تھی تو وہ تیس سال کی تھی۔"

میں نے حیرانی سے کہا۔ "یعنی تم سے آٹھ سال پہلے؟"

"مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ تیس کی ہوئی تھی۔"

دراصل ایک بچی نے اسے متعلق کیا تھا کہ دو سال میں تم مالدار ہو جاؤ گی۔ اس وقت ہم منگنی کر چکے تھے۔ جو تین سال رہی۔ پھر وہ شادی کے لیے بعد ہو گئی۔"

میں نے کہا۔ "دوست مند بننے کے اور بھی طریقے تھے۔"

"ہاں۔ مگر اس نے یہی طریقہ پسند کیا تو اس کی مرضی۔ دراصل اسے یقین ہوگا کہ میں اپنا وعدہ نبھائوں گا اور آٹھ میری سالگرہ نہیں بری ہوگی۔ اب وہ مجھے چھوڑ گئی نہیں سکتی۔ کیا پتا میں اسی سال روانہ ہو جاؤں۔ اور کچھ پانچیس پچھری مار دوں۔ تیس سال بعد وہ جو جائے گی اڑسٹھ کی۔ اور مجھے یقین ہے چلتے کرتے پہلے ہی مر جائے گی۔ ورنہ خود کشی کر لے گی۔"

میں نے کہا۔ "کیا اب ہم پرنس کی بات کریں؟"

"شیور۔ دراصل میں تم سے ملنے آ گیا ورنہ یہ بات فون پر دو منٹ میں ختم ہو جاتی۔ میں پوچھتا کہ بے دخل ہونے کا کیا لو گئے۔ تم ایک رقم بتاتے۔ میں کہتا

اوکے۔ اور بس۔"

"یعنی میں کچھ بھی مانگ لیتا؟"

"اب مانگ کے دیکھو۔ کیا چاہیے تمہیں اس عمل کا؟"

میں نے کہا۔ "اگر میں سو لیٹن کیوں۔ پھر؟"

"میرا جواب وہی ہوگا۔ انتظار تمہیں زیادہ کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔ "کتنا زیادہ؟"

"میرے خیال میں پچاس سال سے کافی کم۔ وہ سوچ کے بولا۔"

میں نے پوچھا۔ "کتنا کم؟"

"چھ سات بیس کم۔ اس نے کہا اور پھر اپنے مذاق پر خود ہی ہنسا۔ "اتنا ہی لوگ؟"

میں نے کہا۔ "مسٹر اپنہر۔ مجھے یہاں کی جانداؤں کی مالیت کا کچھ پتا نہیں۔ تم میری رہائشی کرو۔"

نور کا کافی لے آئی اور وہاں بیٹھ گئی۔ ہر برت اپنہر نے اسے غور سے دیکھا۔ "تمہاری سیکرٹری۔ گرل فرینڈ۔ یا وائف؟"

"سب کچھ۔ میں نے کہا۔ "تھری ان ون۔"

اس نے کہا۔ "میں اپنی زندگی کے تجربات کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ تم خوش قسمت ہو۔ ایسی حسین لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ دیکھی ہوئی تو تمہاری طرح قاعدت کر کے بیٹھ جاتا۔ یوں نہ بٹھکتا پھرتا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں۔"

نور کا چہرہ سرخ ہو کے خوشی سے دھنکے لگا۔

اپنہر نے کہا۔ "یہ کل کوئی ڈھائی سو سال پہلے تعمیر ہوا تھا لاؤر اڈسٹ کے دادا کے دادا نے اسے کوئن انریٹھ کے زمانے میں خریدا تھا۔"

"لیکن یہ اتنا پرانا تو نہیں لگتا؟"

"مورت۔ مگر اور شیفری کی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے کسی تکنیکی طرح ارشاد فرمایا۔ "ان کو خطاب بھی ملکہ انریٹھ اول نے دیا تھا۔ اس وقت بھی یہ اتنا ہی بڑا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس کے بارے اور نقشے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ بعد میں آنے والے یعنی لاؤر اڈسٹ کے باپ نے اور سب سے زیادہ لاؤر اڈسٹ نے اس کی مرمت اور رنگ و روغن اور اندرونی آرائش پر سب سے زیادہ وقت اور پیسہ خرچ کیا۔ اب یہ ایک تاریخی ورثہ ہے۔"

اس کی ظاہری شکل و صورت بدلی نہیں جاسکتی۔ اسے گما کے کوئی تجارتی عبارت کھڑی کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔ چنانچہ اب اس کے خریدار بہت کم ہیں۔ اور ایسے لوگ جو نوادرات کی قدر کریں کم ہوتے جا رہے ہیں۔ انہیں دوستوں اور مشیروں نے کیا قیمت لگانے کو کہا۔ اور خود تم کیا توقع رکھتے ہو؟ اب تو میں نے گلی لپٹی رکھے بغیر نہیں اس کی بارہنہ بیٹھتی تھی۔

میں نے کہا۔ ”جو قیمت میں نے پہلے بتائی تھی۔ اگر میں اسے نصف کروں؟“

وہ عیاری سے سگرایا۔ ”تو وقت بھی نصف ہو جائے گا۔“

”اس حساب سے تو دس ملین کے لیے مجھے دس سال چاہئیں؟“

”تو سر۔۔۔ صرف دس منٹ۔ شاید اس سے بھی کم۔ ایک چمک لکھنے میں جتنا وقت لگتا ہے۔“

”مسٹر اسپنسر میری کم آگاہی کا مذاق نہ اڑاؤ۔ میں نے کہا تھا کہ میری راہنمائی کرو۔“ میں نے نگلی سے کہا۔

”لارڈ ریش۔۔۔ میں نہ کسی کی کم طلی سے فائدہ اٹھاتا ہوں اور نہ کسی سے غلط بیانی کرتا ہوں۔ آپ کا دوست بن کر میں دوسرے شخص کو ٹوٹوں گا نہیں۔ لیکن ہے وہ آپ سے بھی زیادہ سادہ لوح ہو۔ شوق میں دینی تھی قیمت دے جائے۔ بعد میں پیچھتاے اور مجھے کو سے۔ میں اس کی بھی راہنمائی کروں گا۔ مجھے ہر حال میں دونوں سے حق و منت وصول ہوگی۔ کیونکہ اس کے لیے ذرا کھٹا لفظ ہے۔ اس کی قیمت آپ ہیں اور بچیس کے درمیان وصول کر سکتے ہیں۔ میں ملین پاؤنڈز آپ کو فوراً بھی مل سکتے ہیں۔ ایک لکھتے میں۔ بچیس کے لیے شاید بچیس لکھتے میں مل جائے۔ یہ آپ کی قسمت ہے کہ گھگ بیلے آ جائے۔“

”میں بچیس بیلے انتظار کر سکتا ہوں۔ گو باچہ بیٹے۔“

”ویری گڈ۔“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملائے۔ ”مجھے وہ نو جوان پسند ہیں جو تہذیب میں اپنا اور دوسروں کا دماغ خراب نہ کریں۔“

”یہ ہو سکتا ہے کہ میں واپس پاکستان چلا جاؤں۔ اور پھر آ جاؤں۔ اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑے گا؟“

اس نے فنی میں سر ہلایا۔ ”آپ کون سا مکمل اپنے ساتھ لے جائے۔“

”خریدا رہے دیکھنا چاہیں گے؟“

وہ ہنس۔ ”خریدارا نہیں میں سے کوئی ہوگا جو اسے پارا

و کچھ بچے ہوں گے اور حسرت رکھتے ہوئے گئے کہ اس میں رہائش اختیار کریں۔ اس حسرت کے بغیر اتنی بڑی رقم کون نکال سکتا ہے۔ اس سے کہیں کم میں جدید صنعت کی اس سے کوئی بڑی عبارت کہیں بھی لی جاسکتی ہے۔ ساری بات ہے جذبے کی قدر شناسی کی۔ اب یہ سوچنا تو ہو گیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملائے۔

”اگر ہو گیا تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“

”اگر مگر کیسی۔۔۔ آپ نے بچیس ملین پاؤنڈز میں رضامندی ظاہر کی ہے اور میں نے چھ ماہ کی مہلت لی ہے۔ ہم دونوں شریف اور اپنی اپنی بات پر قائم رہتے والے لوگ ہیں۔ اب ہم آتے ہیں ایک اور اہم سوال کی طرف۔ کیا آپ خریدار کا انتخاب بھی کریں گے؟“

میں نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں۔“

”آپ نے انجمنی لارڈ کے کھڑوں والے اصطبل کا سوواڈ یوک آف کنٹرول سے کیا ہے۔ یہ ایک چمکین ڈیل تھی۔ میرے خیال میں اس سے بہتر قدر شناسی کا ایک اور کوئی نہیں تھا۔ کیا ایسا ہی آپ محل کے بارے میں کریں گے؟“

”دیکھئے۔۔۔ مجھے کیا پتا کون کا کب آئے گا۔۔۔ اصطبل کا تو ایک ہی خریدار تھا اور اس نے مجھے ہینک چمک دینے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ پھر میں دوسرے سے بات کیوں کروں؟“

”فرض کریں آپ گے پاس تین چمک ہوں۔۔۔ ایک آپ کو پانچ ملین زیادہ دینے پر راضی ہوئیں وہ کسی انڈر ورلڈ مافیا کا سربراہ ہو۔“

”پھر انکار کی بہت ہی کہاں ہوگی مجھ میں۔“

”ایسی بات نہیں۔۔۔ وہ آپ کے سامنے پرفیکٹ جنٹلمین کا نمونہ بن کے آئے گا اور آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ کون ہے۔ دوسرا خریدار لارڈ کا کوئی پرانا حامد اور دشمن ہو۔ وہ بھی پانچ ملین زیادہ دے۔ اور تیسرا ایک حقیقی قدردان۔ نہ دوست نہ دشمن۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کو یقیناً مایوسی ہوگی مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ میں آج کے زمانے کا کاروباری ذہن رکھنے والا عام آدمی ہوں۔ خاصا بزدل بھی ہوں۔ میں اس باغیا کے ڈان کے سامنے سر جھکا دوں گا۔“

”مجھے اسی جواب کی امید تھی۔ اب دیکھا جائے تو آپ کی توقع بچیس سے بڑھ کر تیس کی ہوگی لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ حالانکہ میں ملین میں میرا ایمین بھی بڑھ جاتا

ہے۔ لیکن لارڈ نہیں میں پرانے وقتوں کا ایک احمق بوڑھا ہوں جو پرانی قدروں کو آج بھی اہم سمجھتا ہے۔ نہ میں لارڈ کے دشمن سے رابطہ کروں گا اور نہ اس ڈان سے۔ میری بات صرف حق لوگوں سے ہوگی۔ حق کا لفظ شاید آپ کو عجیب لگے۔ دنیا کے بازار میں ہر وہ شخص سچتی ہے جو قوت خرید رکھتا ہے مگر میرے لیے ایسا نہیں ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ اس بوڑھے شخص کی بات نے مجھے شرمندہ گرد پایا۔ اگر بڑا ایک وعتدار اور روایت پسند قوم ہے اور پرانے لوگ حدود پر قدامت پرست۔ میرا صاف پانچ ملین کا نقصان ہو رہا تھا مگر اسے پروا ہی نہیں تھی اور میں مجبور تھا۔ اس کی مدد کے بغیر میں بنگل اور جائیداد پرانے فروخت کا اشتہار لگانے کے نہیں بچ سکتا تھا۔ پھر یہ نوادرات اور آثار قدیمہ نہ رہتی۔ عام پرانی ہو جاتی جس کو خواص من نہ لگتے۔ عام آدمی صرف زمین کی قیمت لگاتا یا اینٹ پتھروں کی۔ یہ شاید نصف بھی نہ ہوتی۔

تو اب تک خاموشی تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوچل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے یا اس کے بغیر؟“

وہ کچھ دیر سوچ رہا تھا۔ ”تمہاری ناقابل یقین غریب صورتی کی وجہ سے میں اس احتمالہ سوال کو معاف کرتا ہوں۔“

تو نے نگلی سے کہا۔ ”آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔“

”نہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ خدا ایک وقت میں دو چیزیں نہیں دیتا۔ کہ سارے زمانے کا حسن بھی تمہارے حوالے کر دے اور فزانت بھی۔ ڈیزیز گرل بے پوری خوبی ایک تاریخی ورثہ ہے۔ کئی میوزیم کی طرح۔ اور جب میوزیم کا سودا ہوتا ہے تو صرف تیسر کا نہیں ہوتا۔“

”آپ کا مطلب ہے۔۔۔ سارا سامان قیمت میں شامل ہے؟“

”آف کورس۔ اب آپ اس کی اہم ہیں۔ آپ کا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ اس کی ایک ایک چیز کی اسی طرح حفاظت کریں جیسے کسی میوزیم کا ڈائریکٹر کرتا ہے۔ ہاں یہ بعد میں خریدار کی مرضی اور فاضلی پر منحصر ہے کہ اس میں سے بہت کچھ وہ آپ کو لے جائے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اور تو نے اسے ملے ملے جذبات کے ساتھ الوداع کہا۔ ایک طرف وہ میں ارستیشن کی خصوصی قیمت دلوار ہاتھ کیونکہ اس کے مراسم خصوصی لوگوں سے تھے دوسری طرف وہ انجمنی خاصی قیمت کے نوادرات بھی ساتھ ہی خرید رہا تھا جن کی قیمت کا ہمیں کوئی اندازہ نہ تھا۔ پھر بھی میرا خیال تھا کہ وہ اہلیت میں محل کے برابر کسی صورت نہیں ہو سکتے۔

یہ اگلے روز شام کی بات ہے جب مجھے ایلینا کا فون موصول ہوا۔ ”ریش میں سے ملنا چاہتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”کس سلسلے میں۔۔۔؟“

”سلسلہ تو بہت پرانا ہے اور لوگ ایسے بھی ملتے رہتے ہیں۔“

میں نے صاف کہا۔ ”آئی ایم سوری، پرانے وقت کی اب کوئی بات نہیں رہی اور یہ بھی میں بہت مصروف ہوں اپنے کام میں۔“

”مجھے سب معلوم ہے تمہاری مصروفیت کا۔ اس نے تلخ ہو کے کہا۔ ”تم میری سیر و تفریح کو تم کام کہتے ہو؟“

”سیر تفریح کو اگر میں کام سمجھتا ہوں تو تمہیں کیا۔۔۔ تفریح تم پر حرام ہے، مجھ پر نہیں۔“

”اس سے پہلے دو دن اچھی تفریح کر چکے تھے پرانے دوست۔“

مجھے سخت طیش آیا۔ ”واہ۔۔۔ خوب تر کہ دنیا ہے کہ جہج میں ہی باہر سے ملٹ منٹ کی جہز رہی ہے۔ کیوں کر رہی ہو یہ ڈراما تم؟“

وہ روہائی ہو گئی۔ ”ہائیز ریش، اسے بے مروت نہ بنو۔“

”یہ بے مروتی نہیں۔ تمہاری بھلائی کے لیے ہے، کیونکہ سے عبادت میں مصروف ہو جاؤ گی تو تمہارے دل کو وہ سکون ملے گا جو اجنبی حاصل نہیں کیونکہ تم دو دنیاؤں کے بیچ میں چنڈ و لم کی طرح ادھر سے ادھر ہو رہی ہو۔ میری پریشانی کو چھوڑو۔ اپنے لیے پریشانی کم کرو۔“

اچانک مجھے احساس ہوا کہ دوسری طرف سے ایلینا نے فون بند کر دیا ہے اور میں اکیلا خود سے باتیں کر رہا ہوں۔ تو نے سب سنا تھا لیکن غلغل نہیں دیا تھا۔ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”غصہ کیوں کرتے ہو وہ ناہل نہیں ہے، رحم کے قابل ہے۔“

”ایسا نہ ہو کہ میں ناہل نہ رہوں۔ رحم کے قابل

ہو جاؤں۔ یہی جانتی ہے وہ۔۔۔۔۔

”چلو چلو، تم نے مجھ دیا ہے، وہ مجھ جائے گی۔ آؤ آج ہم ڈاکٹر شائستہ سے مل آئیں، بہت دن ہو گئے، اس سے فریال کی بھی کچھ خبر ملے گی۔“ اس نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

نہ جانتے ہوئے بھی میں نور کے ساتھ ڈاکٹر شائستہ کی طرف چلا گیا۔ مجھے ایک ڈر سا لگا رہتا تھا کہ وہ درجہ ذالی سوچ رکھنے والی عورت تھیں نور کے سامنے کوئی غلط بات نہ کر دے۔ اسے بھی میں اپنا بل سوچ ہی کہوں گا کہ وہ مرد عورت کے رشتے کو شخص حیوانی تعلق سمجھتی تھی جس میں اخلاقیات کا کوئی دخل نہیں۔ جس ایک جہانی ضرورت ہے جو کہیں سے بھی پوری کی جاسکتی ہے جیسے پیٹ کی بھوک کہیں سے بھی کچھ کھانے کی ملانی جاسکتی ہے۔ مغرب میں یہ طرز فکر تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے اور ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو خودی رشتوں کی حرمت کا قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کتنے، ملنی بکری اور بکری یا دیگر جانور کون سے خودی رشتے کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ گائے کا کون سا بھائی ہوتا ہے، وہ صرف تیل ہوتا ہے۔

شائستہ کی اس سوچ کے پیچھے بھی ایک حادثہ تھا مگر مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ وہ فریال کی سب سے عزیز بہیلی تھی جس نے لندن کے قیام کے دوران میں سے اور مجھے مانے رکھا تھا۔ میں تو ایک ایک دن اس کے چکل میں پھنس گیا تھا۔ جب مجھے اس کے کپٹیکس کا علم ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ میرے ساتھ اتنی رکھائی اور بے رخی سے پیش آتی تھی۔ خصوصاً فریال کے سامنے اس نے اسے ڈاکٹر غیر شائستہ کا خطاب دے رکھا تھا۔

ڈاکٹر شائستہ نے بڑے تاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اب میرے ساتھ اس کا رویہ بالکل بدل چکا تھا۔ وہ نور کے ساتھ بھی بہت فریڈی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے فریال کے ساتھ تھی۔ یہاں آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ نور کو اپنے ساتھ لائے میں نے غلطی کی ہے۔ شاید خود مجھے بھی اس تعلق کو بحال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں اندر والے کمرے میں نہ جانے کیا کس پر پھنس رہیں۔ میں نے باہر بیٹھ کے کافی ختم کر لی، پھر احتجاج کیا کہ آخر مجھے کیا لایا کیوں بڑھا دیا گیا ہے تو وہ باہر آئیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ نور کا رنگ کچھ اڑا ہوا ہے۔

نور فوراً رخصت چاہتی تھی لیکن شائستہ نے کہا کہ باہر کہیں کھانے پر چلتے ہیں۔ ”میں تو بالکل اکیلی ہی رہتی ہوں۔“

جہاں جاتی ہوں بچے ساتھ ہوتے ہیں، تم لوگوں کے آنے سے کچھ روک ہو گا۔

اس کے اسرار کے آگے ہماری ایک نہ چلی۔ وہ ہمیں لندن کے ایک عربی ریسٹورنٹ میں لے گئی جہاں کھانا واقعی اچھا اور نیا تھا۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو نور نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔ ”یہ شائستہ کیا چیز ہے آخر، مجھے تو آج ہی پتا چلا۔“

”کیا پتا چلا۔۔۔۔۔؟“ میں نے اپنی نظر سڑک پر رکھی۔

”وہ تو بالکل ہے۔“

میں نے ہنس کے کہا۔ ”یہ بالکل کی نظر میں دوسرا شخص بالکل ہے، وہ کیا کہتی ہے تمہارے بارے میں؟“

مجھے جانے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر مجھے پتا ہوتا تو میں ہرگز نہیں وہاں نہ لے جاتی۔

”مطلب یہ کیا کہانی جاتی۔“

”آج جو باتیں اس نے مجھ سے کی ہیں، میں کیا بتاؤں تمہیں۔“

میں نے کہا۔ ”مت بتاؤ، مجھے معلوم ہے سب۔“

”تمہیں معلوم ہے؟۔۔۔۔۔ فریال نے بتایا ہو گا۔“

میں نے سر ہلا دیا۔ ”نہا پر ہے لیکن دیکھو، ہر شے شدہ شخصیت کی حادثے کا نتیجہ ہوتی ہے، جیسے گاڑی، خیرادہ تو ٹھیک ہوتی ہیں لیکن اس کے ٹیٹ ہو جائے تو۔۔۔۔۔“

”چلو اب اپنا یہ فلسفہ مت بکھاؤ، میں آئندہ اس عورت سے نہیں ملوں گی اور تم بھی نہیں۔“

”میں بھی نہیں؟۔۔۔۔۔؟“ میں نے شرارت سے غصہ کی سانس لی۔

”اگر تمہیں ایک بات معلوم تھی تو مجھے کیوں نہیں بتاتی تھی؟“

”وہ کوئی اچھی بات تھی کہ تمہیں ضرور بتانا۔۔۔۔۔؟“

میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ فریال کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہوا۔“

”اس کے بارے میں خبر اچھی نہیں ہے، وہ کسی فن خیر جھوٹے حاجی مستانہ کے ساتھ رہتی ہے، کسی فلم کا آئٹم سنگ کمر رہی تھی۔“

”وہ آئٹم گل ہو گئی ہے۔“

”اس کے پرفیشن میں سب کام میں اور متعدد صرف ایک ہے، نامہودی اور بیٹا۔۔۔۔۔ وہاں امارات کا کوئی شاہزادہ بھی موجود تھا، اس نے بعد میں فریال کو ساتھ چلنے کی پیشکش کی، فریال نے انکار کر دیا۔ شاہزادے کی خشت بے عزتی ہوئی۔“

کسی کی مجال نہیں کہ اسے انکار کر سکے۔ اس وقت وہ تو لال پیلا ہوتا چلا گیا کیونکہ حاجی مستانہ کی گتھا اور اس نے کہا کہ ابھی تو یہ میری بیوی ہے لیکن آپ کو پسند ہے تو میں غلطی دے کر آپ کے پاس پہنچا دوں گا، اس کے بعد سے وہ غائب ہے۔

”غائب ہے؟“

”دہلی میں نہیں ہے۔۔۔۔۔ شاہزادہ کچھ رہا ہے کہ اسے حاجی مستانہ نے فرار کر دیا، حاجی مستانہ کا خیال ہے کہ شاہزادے نے انکار کر لیا۔ ان کے کاروباری تعلقات ختم ہو گئے اور ایک طرح کی دہشت ہو گئی ہے۔ وہ تو حاجی مستانہ بھی کوئی معمولی چیز نہیں، اس کے مراسم شاہزادے کے والد ماجد شخ سے ہیں، فریال کا پتا نہیں کہاں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ چھوڑو۔۔۔۔۔ کوئی اور بات کرو۔“

”فرض کرو، ابھی ہم گھر جا میں اور وہ پہلے سے وہاں موجود ہو۔“

میں نے بڑی سے کہا۔ ”یار کیوں میرا دماغ قریب کر رہی ہو۔۔۔۔۔ کرنا ہے تو ابھی بات کرو ورنہ خاموش رہو۔“

نور نے سخت برا مانا اور کمر بوجھنے کے بعد بھی اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں خود بہت دیر چاکا رہا اور اس وقت کے بارے میں سوچتا رہا جو فریال کے ساتھ گزارا تھا۔

زندگی نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ بھر فریال نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا، آخر میرا تصور کیا تھا؟

اچانک اشتر کام کا بزر بولا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے سوا بارہ بجے تھے، سیکورٹی گاڑی کو اس وقت مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی، اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ وقت سونے کا ہے۔ شاید اسے کوئی ایمر ملتی ہو، یہ سوچ کے میں نے ریسیدر اٹھا لیا۔

”سر۔۔۔۔۔ آپ سے کوئی ملے آیا ہے، ایک خاتون ہیں برقعے میں۔“

میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ ایک دم میرا ذہن نور کی بات کی طرف چلا گیا تھا۔ فرض کرو ابھی ہم گھر چلیں اور وہ وہاں پہلے سے موجود ہو۔ کیا فریال بچ چکی تھی۔ برقعہ کاٹنے کے یہاں آئے والا اور کون ہو سکتا تھا۔ میں کچھ دیر تذبذب میں ریسیدر لیے بیٹھا رہا۔ سیکورٹی گاڑی دوسری طرف میرے جواب کے انتظار میں تھا۔

نور کو رہنمائی دروازے میں دیکھ کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے میری صورت دیکھ کے پوچھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“

میں نے ریسیدر اسے تھا دیا۔ ”تمہاری بات سچ ہو گئی تھی۔ وہ پہنچ گئی یہاں۔۔۔۔۔ مصیبت۔“

اس نے ریسیدر کے کہنا۔ ”کون فریال۔۔۔۔۔؟“ اور پھر گارڈ سے بات کرنے لگی۔ ”فریال نہیں ہے تو پھر کون ہے؟“

نام کیوں نہیں بتاتی، اچھا اسے آنے دو۔

میں نے پریشانی سے کہا۔ ”کون ہے آخر؟“

”میں دیکھتی ہوں باہر جا کے۔“

”میں بھی چتا ہوں تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔ کوئی پکارت ہو۔“ میں نے اپنا ریوا اور ساتھ لے لیا۔

وہ عبور گیت سے اندر آ چکی تھی اور میں نے ایک نظر میں پہچان لیا کہ اسے برقعہ پہننے کی عادت نہیں ہے۔ روشنی میں آگے اس نے غائب الٹا تو میرے دماغ کو ڈر بہت جھٹکا لگا، نور کے قدم بھی رک گئے۔

میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”ایلیشا۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

وہ مسکھی اندر چلی گئی۔ ”مجھے اس طرح آنا پڑا۔“

میں اور نور اس کے پیچھے اندر گئے۔ اس وقت تک وہ برقعہ ایک طرف ڈال کے سونے پر بیٹھ چکی تھی۔ ”اگر میں صبح کے ذرا آتی تو اور کیا کرتی، تم نے ملنے سے انکار جو کر دیا تھا۔“

”ایلیشا۔۔۔۔۔ تم چرچ سے کسے نکل آئیں؟“

”بس نکل آئی۔ میرا تم سے ملنا ہے حد ضروری تھا۔“

میں تم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا یہ سچ ہے؟۔۔۔۔۔ تم ارنسٹ میٹشنگ کے ساتھ ہمارا تمام ساز و سامان بھی لے کر رہے ہو؟“

میں نے رکھائی سے کہا۔ ”تم بھول رہی ہو کہ اب وہ میرا ہے۔“

اس نے غصے سے پھر پٹا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اسے کہنے اور لیل ہو، تمہیں ذرا احساس نہیں کہ اس محل کے علاوہ اس کے اسباب کی میرے نزدیک کیا جذباتی قیمت ہے۔ وہ سب نوادرات ہیں، ان کے ساتھ میری زندگی کی کہانی بڑی ہوتی ہے، میرا بچپن۔۔۔۔۔ میری جوانی۔۔۔۔۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے روئے گی اور میرا سچا کچھ بچپان لپٹے گی۔“

نور نے مجھے اشارہ کیا کہ فی الحال میں خاموش ہو جاؤں اور اسے پانی کا گلاس پیش کیا۔ ”ٹیک اسٹ ایڈی ایلیشا۔۔۔۔۔“

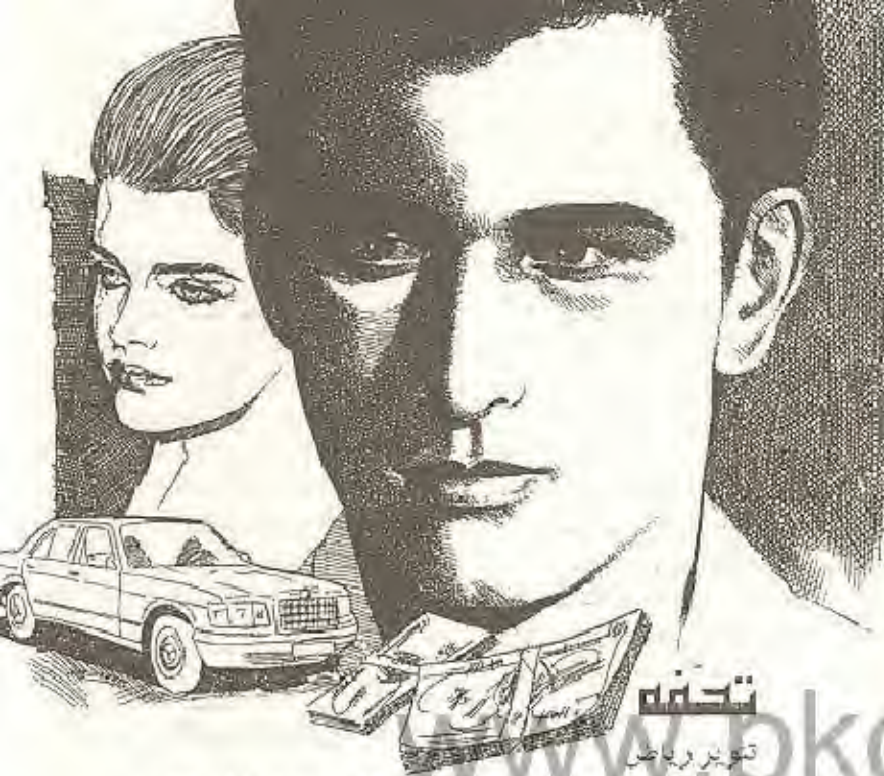
اس نے ایک ہاتھ مار کے گلاس گرا دیا۔ ”یہ کیا پارہی ہو مجھے، اس سے بہتر چیز کوئی نہیں رہی اس محل میں۔۔۔۔۔ دیا

کی بہترین شراب کا قابلِ فخر ذخیرہ تھا یہاں۔
میں نے یہ بھی سے کہا۔ ”وہ سب ہم نے ٹافٹ میں بھا
دیا اور اب تم چرچ میں کیا جیتی ہو، میں نے اپنے کے بعد؟“
”اُس وقت تو میں اسے گھر میں ہوں۔“

وزاریاں..... میرے بچپن کی یادگار گزریاں اور کھلنے لگیں۔
 میں نے کہا۔ ”سب ہو گا۔ بالکل اسی طرح جیسے تم
 چھوڑ کے گئی تھیں، اب اگر کل تم مجھے سے کہیں تو میں تمہیں اجازت
 دیتا کہ جو چاہے لے جاؤ۔“ کیونکہ اس وقت سب میرا تھا۔
 مالک میں تھا لیکن اب میں زبان دے چکا ہوں کہ کل میں جو
 کچھ ہے، وہ خرید لو گئے گا۔“
 ”اے کیا معلوم۔۔۔۔۔“
 ”مگر مجھے تو معلوم ہے۔۔۔۔۔ اور سسر ایلیش۔۔۔۔۔ خدا

نور نے برہنہ اور بچ کارروائی کی۔۔۔ ایشیا کی لوجہ
ہے گی تھی۔ اس کی آنکھیں میرے دکھائے ہوئے خواب میں
گم گئیں جب نور نے ایک دم سے اسے دھکا دیا۔ یہی نہیں،
جب وہ گری تو نور نے اس کے ہاتھ پر اپنے پاؤں کی ٹھوکر
مار لی اور اس کے ہاتھ سے روبرو رکھ کے پھینک دیا۔ ہوا سونے
کے نیچے چلا گیا۔ پھر میں نے بڑی آسانی سے اسے قابو کر لیا
چالانکہ وہ چل رہی تھی اور چلا چلا کر نور کو گم کیاں دے رہی
تھی۔

میں نے کہا: ”اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں یہی کرتا لیکن اب اس کا فے دار چرچ ہے جہاں سے یہ نکل کر بھاگی ہے۔“



تحفہ

تصویر دریا میں

دوستی اذہبے اعتماد کا دوسرا نام ہے مگر..... جہاں کوئی اعتماد کرتا ہے وہاں ایک ذرا ٹھہرس لگنے سے بہت سسوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، وہ بھی زندگی کا ایک ایسا ہی مقام تھا جہاں محبت اور دوستی کے درمیان جنگ و جدل جاری تھی..... ایسے میں ان کے دامن میں اسی زخمی دوست کی جانب سے وہ تحفہ آن کرنا کہ جس کی خاطر وہ دوستی کا ہی خون کر بیٹھتے تھے۔

بچپن سے ہی آپ میں بٹھنے والے ایک جوروں کا دلچسپ واقعہ

”میرا خیال ہے کہ یہ تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ کرس نے اپنے دیرینہ دوست کی بات پر سر ہلایا اور اس سے اس کی بالکل نئی لی ایم ڈیوٹی نوٹ بک کی چابیاں لیتے ہوئے بولا۔

”میری کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟“

”وہ میرے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی۔“

”صرف آٹھ ماہ کی تو بات ہے۔“ ڈیوٹی نوٹ بک پر انداز

میں بولا۔ ”نیوزی لینڈ سے واپس آنے کے بعد میں اپنی

امانت واپس لے جائوں گا۔“ بگیا بات تو یہ ہے کہ میں جتنا پس

”تم بالکل ٹھیک مت کرو۔“ کرس نے اسے یقین دلایا۔

”تمہاری گاڑی یہاں بالکل محفوظ رہے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“ جین بچھے

ایئر پورٹ تک چھوڑ دے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے باہر کھڑی

واکس وین میں بیٹھی ہوئی سنبھلے بالوں والی لڑکی کی طرف

باتھ بلایا اور بولا۔ ”لگتا ہے کہ میں اسے بھی تھوڑا بہت یاد

ایلیشا..... جو تم سوچ رہی ہو وہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ اپنے ساتھ مجھے بالکل مت کرو، اب تمہاری واحد پناہ گاہ وہی ہے بالکل خانہ۔“

”میں مرنے والی نہیں لیکن واپس نہیں جاؤں گی رقی! میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی تھی، یہ گھر میرا ہے، میں اس میں تمہارے ساتھ رہوں گی..... یہاں سے کوئی مجھے نہیں نکال سکتا۔“ وہ پھر چلائے گی۔

میں نے کہا۔ ”نور..... پولیس کو بلا لو۔“ نور ابھی انکی بی بی کی کہ ایلیشا صوفے کے نیچے گھس گئی، بے وقوفی سراسر میری تھی، ابھی تک میں نے نیچے سے ریوالتور نکال کر اسے قبضے میں نہیں لیا تھا، میں اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا کہ وہ ایلیشا کی دسترس میں نہیں رہا۔

کچھ دیر پہلے نور نے اسی اندیشے کا اظہار کیا تھا۔ اگر میں تمہارے ساتھ نہ رہی تو تم ایک بیوی کے ساتھ یہاں رہو گے دوسری کے ساتھ وہاں..... اور ایلیشا اس کے اندیشوں کو حقیقت کا روپ دینے کی جلدی آگئی تھی..... لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اب ایلیشا کو پولیس کے حوالے ہی کرنا بہتر ہوگا۔ پولیس اسے واپس چرچ لے جائے یا نہیں اور.....! اس نے گھٹنوں کے بل ہو کے نیچے گھماؤ کیا۔ ”ایلیشا باہر آ جاؤ۔“

”نہیں..... اب میری لاش ہی باہر آئے گی۔“

”نور مجھے ہم بات کر سکتے ہیں۔“

”نہیں نہیں نہیں.....“ وہ دہرائی میں چلائی۔ ”تم

انکار کر چکے ہو..... تم نے پولیس کو غلبہ کر لیا ہے۔“

مجھے نور کی کمزوری ہوئی آواز سنائی دی۔

”پولیس..... پلیز فوراً آرڈر مینشن آ جا میں، ایمر جیسی

ہے..... کسی کی جان جا سکتی ہے۔“

میں صوفے کے نیچے گھس گیا۔ ”ایلیشا.....“

مجھے اندھیرے میں اس کا وجود سانس کی طرح دکھائی

دیا۔ وہ سیدھی گئی ہوئی گئی اور اس کے دامن میں

ریوالتور تھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”یہ مجھے دے دو.....

پلیز۔“

وہ ہنسی۔ پھر ایک دھماکا ہوا..... میری نظروں کے

سامنے گہری تاریکی پھیل گئی۔ میرے کانوں میں پولیس کے

سائرن کی آواز کوئی..... نور چیخ رہی تھی، میرا نام زہرا رہی

تھی..... رقی..... رقی..... رقی.....

یہ پوینچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے

”تم سب کچھ کر سکتے ہو، تم مجھے بالکل خانے میں مرنے سے بچا سکتے ہو، میں تمہاری ہوں نہیں..... میں مرنے جاؤں گی۔“

”وہاں تمہارا علاج ہوگا تو تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

”اسے منگول اور بے رحم نہ بنو..... تم چاہو تو سب کچھ کر سکتے ہو، یہ تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں، تم میری ذمہ داری لے لو۔“

میں نے گھبرا کر کہا۔ ”ایلیشا میں خود کو اس قابل نہیں

سمجھتا، میں یہ ذمہ داری کیسے لے سکتا ہوں۔“

”بہت آسان ہے۔ تم مجھ سے شادی کرو تو سب ٹھیک

ہو جائے گا۔“

”میں تم سے شادی کروں.....؟“

”ہاں..... دیکھو نا..... ڈیڈ نیل چاہتے تھے اور تم کو

وارث بنانے کا مقصد کیا تھا۔ تمہارے لیے تو یہ کوئی مشکل کام

نہیں، تم مجھ سے بھی شادی کر سکتے ہو اور نور سے بھی۔

تمہارے مذہب میں تو چار کی اجازت ہے، ایک جیسا

منصفانہ سلوک کرنے کی شرط ہے، وہ تم پوری کر سکتے ہو۔ اس

طرح سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ یہاں میں اور تم ہوں

گے۔ مجھے میرا حق بھی مل جائے گا اور تمہیں اپنے حق سے

دستبردار بھی نہیں ہونا پڑے گا۔“

”ایلیشا..... یہ ناممکن ہے۔“ میں نے بڑی مشکل سے

کہا۔

”کیوں ناممکن ہے..... کیا نور کو اعتراض ہوگا؟.....

نہیں ہوگا، مجھے معلوم ہے..... وہ تو تمہارے ساتھ شادی کے

بغیر بھی رہے رہتا رہا ہے۔ پہلے تم فریال سے شادی کرنا چاہتے

تھے تو اسے اعتراض نہیں تھا، اب مجھ سے کرلو گے ایک نیک

مقصد کی خاطر..... تو وہ تمہیں کیوں روکے گی، کیوں نور.....

کیا میں نے غلط کہا.....؟“

نور ساکت و صامت بیٹھی تھی اور پکیس جھکائے بغیر

اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی جو دیوانہ کار خوشیوں کا شکار تھی جتنی جتنی

مثال تھی وہ بالکل غلط لیکن اپنا برا بھلا سمجھتی تھی..... اپنے مفاد

کو نہیں بھولتی تھی۔

”تم نے دیکھا رقی..... نور نے میری تائید کر دی و

کیونکہ یہ بہت آسان..... بہت پریشانی ہے یہاں میں اور

تم..... ست بدھائی میں تم اور نور..... تم یہاں بھی مالک وہاں

بھی..... اس میں سب کی بھلائی ہی ہے اور پھر اعتراض کرنے

والا کون ہے تم روکنا میں ٹھیک ہو جاؤں گی، مجھے معلوم ہے

میرے سچا کام ہی ہو سکتے ہو۔“

ایک دم مجھے ہوش آگیا۔ ”اسٹاپ دس نان سنس

گلتا ہے۔ البتہ اس ملاقات کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ بڑی مہما نے میری گواہی کیلی سچھ کر جوانی کے سارے راز اگل دیے جنہوں نے میری گواہی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ کرسی آرام سے صوفے پر چٹائیں پھیلائے ٹیبل و ڈین دیکھ رہا تھا کہ میری اس کے پاس آئی اور کرسی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے لگی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بی ایم ڈبلیو کی چابی تھی۔ وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں صرف ایک بار اس میں بیٹھنا چاہتی ہوں۔“

کرسی نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”تم ڈبلیو کی کار میں بیٹھو گی لیکن تمہیں تو اس سے نفرت ہے۔“ میری نے دروازہ کھول کر ایک تصویر نکالی اور کرسی کی طرف بڑھا دی۔ اس میں ایک نوجوان جو اُن کار کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا لائٹ ڈرائیو سے لطف اندوز ہو رہا تھا لڑکی کے ہال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ مسکراتے ہوئے نوٹو گرافری جانب دیکھ رہی تھی جبکہ مرد جوانی اور محبت کے نشے میں سرشار لگاڑی چلا رہا تھا۔

”جانتے ہو یہ عورت کون ہے؟“ میری نے پوچھا۔ کرسی کے پاس اس سوال کا جواب موجود تھا۔ ”خریدہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے والدین ہیں۔“

”یہ تصویر مجھے ان کے سامان سے ملی ہے۔ کل جب ان سے ملنے گئی تو وہ مجھے اپنی پرانی کیلی سچھ کر ماضی کے قصے سناتے لگے۔ مجھے یہ سب یاد نہیں سنا چاہے تھا لیکن جب میں نے اپنے آپ کو ان کی جگہ رکھ کر سوچا تو خاموش ہو گئی۔ چالیس سال بعد شاید میں بھی اسی طرح کسی ریٹ ہو م میں کبھی اپنے بچوں کو جوانی کے قصے سنارہی ہوں گی لیکن میری زندگی میں کوئی ایڈ وگر نہیں اور نہ ہی کسی تیز رفتار کار میں تمہارے ساتھ لائٹ ڈرائیو پر مچی ہوں۔ اب سوچ ملا ہے تو کیوں نہ ہم اپنی زندگی میں کچھ خوشگوار یادوں کا اضافہ کر لیں۔“

کرسی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی پیاری بیوی کی اس معصوم سی خواہش کو رد کر دے۔ اس نے میری کا ہاتھ تھاما اور بی ایم ڈبلیو کی جانب بڑھ گیا پھر جب وہ کار میں بیٹھے تو کرسی کا ضبط جواب دے گیا۔ اس نے گاڑی اشارت کی اور اسے بڑی احتیاط سے گیس راج سے باہر لے آیا۔ باہر کا موسم بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھوٹے میری کے بالوں سے اگھیلیاں کر رہے تھے اور کرسی سرشاری کے عالم میں گاڑی

چلا رہا تھا۔ پھر وہ تیسے سے باہر نکل آئے۔ ان کی گاڑی مضافاتی علاقے میں دوڑ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی انہوں نے گاڑی ایک ہب کے سامنے روک دی اور ڈرگس کے لیے اتر آئے۔

آتش دان کے نزدیک ایک ٹیبل پر وہ دونوں اپنے اپنے ڈرگس لیے ایک دوسرے کو حمار آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے کرسی نے اپنے لیے سوٹ ڈرگس کا انتخاب کیا تھا لیکن میری کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھی۔ اسے وائٹ وائن میڈ سے ہی پسند تھی پھر وہ اپنی زندگی کے ان خوبصورت ترین لمحات میں اس سے کیوں نہ لطف اندوز ہوتی۔ تین چار پیگ کے بعد ہی اس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اس کی زبان لڑکھوانے لگی۔ کرسی نے اس کی حالت دیکھ کر اٹھنے کا ارادہ کیا کہ چاکلے ہی ایک آدی اس کے سامنے آ گیا۔

”دوست! یہ گاڑی تمہاری ہے؟“ اس نے بی ایم ڈبلیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کرسی نے نظر اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ”ہاں۔“

”اچھی ہے، انجینی نے قعر بلی انداز میں کہا۔“ اگر تم براہ مناؤ تو میں یہاں بیٹھ جاؤں۔“

یہ کہہ کر وہ جواب کا اقتدار کے بغیر ہی وہاں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا نام جیک بتایا اور ساتھ ہی بی ایم ڈبلیو کے بارے میں اپنی معلومات بیان کرتے لگا۔ کرسی کو محسوس ہوا کہ اس نے ملٹی سے کسی کار ریجنٹ کو اپنے ساتھ بٹھا لیا ہے۔ کچھ دیر بولنے کے بعد اس کی تان اس جملے پر آن کر پڑی۔

”اگر تم اس گاڑی کو فروخت کرنا چاہو تو میں اسے خریدنے کے لیے تیار ہوں۔“

”یہ براے فروخت نہیں ہے۔“ کرسی نے بے زاری سے کہا لیکن تین اسی وقت میری بول پڑی۔

”کیا دوسرے؟“

”جیسی ہزار پاؤنڈ نقد۔“ جیک نے کہا اور میری کی طرف دیکھنے لگا۔

”پچیس ہزار۔“ میری نے اپنی ڈیڑھا نقد بتائی۔ کرسی نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بولا۔ ”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ گاڑی براے فروخت نہیں ہے اور نہ ہی اس وقت میرے پاس اس گاڑی کے کاغذات ہیں۔“

”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ جیک بولا۔ ”تم گاڑی کی حالی دو میں کھیں نقد رقم دیتا ہوں۔ تم پولیس میں اس کی کشتی کی رپورٹ درج کروا دیتا۔ جب تک پولیس اور انسورنس والے اپنی کارروائی شروع کریں گے۔ میں اس کا

MEDICAM SHAMPOO

9 مختلف قسم کے شیمپو



میں کی کیم شیمپو کے پانچ سو سال سے بالوں کی جگہ لطف کے ساتھ ساتھ بالوں کے

اپنے بھرتیو آرہی قیمت میں

رنگ زلفین

پھولوں جیسی شگفتگی ہزاروں جیسی لٹری۔



رنگ اور سر پلٹ تبدیل کر چکا ہوں گا اور یہ گاڑی اپنے لئے گا کہ تک پہنچ جاتی ہوگی۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے شوہر کی جانب کے بارے میں بتا دوں۔“ میری نے کہا۔ ”وہ خفیہ پولیس آفیسر ہے اور کارفرما کے کیسوں کی تحقیقات کرتا ہے۔“

جیک نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں کیسے مان لوں۔ اتنی معمولی تخریب کا کام کرنے والا شخص اس کا رکوہ تو نہیں کر سکتا۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کی آواز آدنی بھی ہو۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں بالکل صحیح شخص سے بات کر رہا ہوں۔“ جیک نے کہا اور کرس سے بولا۔ ”میری پیشکش پر غور رہے۔ تم جب چاہو یہاں آ کر مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔“

واپسی میں کرس کا موڈ بہت آف تھا۔ اس نے غصے میں آ کر ڈیوٹیک بند کر دیا جس پر میری سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ جھلاتے ہوئے بولی۔ ”اوہ خدایا! تم اسے تو بگڑ کر کیوں ہو۔ صرف اس لیے کہ اپنے آپ کو سوپر طاہر کر سکو۔“

”نہیں، بلکہ تم نے کچھ زیادہ ہی پی لی ہے اور تمہارا دماغ ابھی تک ٹھکانے نہیں آیا۔“

”شاید تمہیں اچھا نہیں لگا کہ جیک مجھے مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔“

”میری! اس نے ہماری شام برباد کر دی۔ کیا تم یہاں اس لیے آئے تھے کہ ایک تیسرے درجے کے کاربڈر کے ساتھ اس گاڑی کا سودا کریں جو ہماری نہیں ہے۔“

میری نے کوئی جواب نہیں دیا اور منہ پھلکاے قبضہ رہی۔

”سٹو میری گاڑی میں گھومنا اور نہیں چنہ کر ڈرنک لینا ایک علیحدہ بات ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ اگلے مینیجے کے گرام وچ میں میری اسٹوری شائع ہو۔“

اس واقعہ کے چاروں بعد وہ گھر کے کسی کام میں مصروف تھا کہ اسے میری کی چیخ نما آواز سنانی دی۔ وہ فی دی لاؤنچ سے اسے پارک رہی تھی۔ وہ جیسے ہی اس کے پاس پہنچا تو وہ فی دی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”دیکھو، کیا آ رہا ہے؟“

اس وقت شام کی مقامی خبریں چل رہی تھیں۔ ایک رپورٹر کسی خاتون کا انٹرویو کر رہا تھا جو اپنے دونوں ہاتھوں میں براؤن کمر کے جیک چڑے ہوئے تھی جن پر سفید دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ عورت ناراض تھی۔

”میں اپنی دکان کے عقب میں کام کر رہی تھی اور وہ تمام ہاکس دیکھ رہی تھی جو ہفتہ کی شام لوگ وہاں چھوڑ گئے

تھے کہ میری نظر ان نوادرات پر پڑی۔ میں نے اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکی سے کہا کہ وہ اپنے انٹرنیٹ پر ان کے بارے میں معلوم کرے جب ہمیں ان کی اصل قیمت کا اندازہ ہوا، جو کسی طرح بھی پانچ سے لے کر دس ہزار پاؤنڈ سے کم نہیں۔ دراصل اس طرح کی اشیاء صدا نایاب ہیں۔“

”اب آپ ان کا کیا کریں گی؟“ رپورٹر نے پوچھا۔

”ظاہر ہے کہ ہم انہیں شاپ میں فروخت نہیں کر سکتے۔ لہذا ہم نے جمعہ کے روز انہیں نلام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس طرح ہمیں ان نوادرات کی اچھی قیمت مل جائے گی۔“

”کیا آپ اس ڈونر کے لیے کچھ کہنا چاہیں گی۔ ممکن ہے کہ وہ یہ پروگرام دیکھ رہا ہو۔“

وہ عورت کمرے کی طرف مڑی اور اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ”آپ جو کوئی بھی ہیں۔ چیری کے لیے اتنا قیمتی عطیہ دینے پر میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔“

میری نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور زور زور سے سسکیا لینے لگی۔

وہ دونوں کافی دیر تک ٹوٹتی گم ممتھے رہے۔ ان کے دماغ میں آنکھیاں چل رہی تھیں۔ ان کی سوچ ایک ہی نکتہ پر آکر ٹھہر گئی تھی کہ کسی طرح وہ دیاب جگ واپس مل جائیں۔ بظاہر اس کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ انہیں نیلا کی کے ذریعے حاصل کیا جائے لیکن اس کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ جس کا انتظام کرنا ان کے لیے جوتھک ممکن نہ تھا۔ اس دوران میں انہوں نے فی وی اسٹیشن فون کر کے اس خاتون وکر سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن کا سیاب نہ ہو سکے۔ انہیں بتایا گیا کہ اور بھی لوگ یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ وہی ان نوادرات کے حقیقی مالک ہیں اور انہوں نے غلطی سے چیری شاپ کو عطیہ کر دیا تھا لہذا اس سلسلے میں مزید کوئی کال وصول نہیں کی جائے گی۔

میری کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا پھر اچانک ہی اسے خیال آیا کہ اس معاملے پر جیک ہی ان کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ پرجوش انداز میں بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں جیک کی پیشکش قبول کر لینی چاہیے۔ اس رقم سے ہم نلام میں حصہ لے کر وہ قیمتی جگ دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قیمت بھی بڑھتی جائے گی۔ اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو ساری عمر پچھتاہٹا رہے گا۔“

”یہ غیر قانونی ہے اور میں اس جرم میں شریک نہیں

ہو سکتا۔ ہمیں کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیے۔“

”ساری عمر سوچتے رہو گے۔ تب بھی اتنی بڑی رقم کا انتظام نہ ہو سکے گا۔“ میری نے اس کے ہاتھ پر پی ایچ ڈی بلیو کی چاپیاں رکھیں اور بولی۔ ”تم تو راجیک کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ کہ ہم یہ کار بیچنا چاہتے ہیں۔“

”میری! وہ ایک جرائم پیشہ شخص ہے۔“ کرس نے سگزدور سا احتجاج کیا۔

”لیکن اس وقت وہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔“ میری نے اسے یاد دلایا۔

جیک نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ کرس کسی ضرورت کے تحت مجبور ہو کر اس کے پاس آیا ہے۔ اس کا دوبارہ میں رہ کر اسے لوگوں کے چہرے پہنچانے کی عادت ہو چکی تھی اور وہ جانتا تھا کہ کرس کا ہیک سے کسی طرح بات کرنی ہے۔ کرس کا چہرہ بڑھتے ہی وہ جان گیا کہ اب اس سے معاملہ طے کرنا آسان رہے گا۔ وہ اسے ہب کے ہیک کونے میں لے گیا اور کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر ایک ایڈریس لکھ کر بولا۔

”گردہ جمعہ کے روز صبح نو بجے وہاں پہنچ جائے۔ اس دوران وہ رقم کا ہندو بست کر لے گا۔“

جمعہ کے روز کرس اور میری مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ کرس کی ایچ ڈی بلیو تھا جبکہ اس کی بیوی اپنی کار میں اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ پہلا نظر میں وہ جگہ کرس کو پہنچا دیا وہ پسند نہیں آئی۔ وہاں ڈھنگ آلود مشینری، ویلڈنگ مشین اور گاڑیوں کی ٹیسٹ لائیں جا رہا تھیں۔ وہ فی وی اسٹیشن کو ایک میز تک لے گیا جہاں وہ مال میں پلٹا ہوا نوٹوں کا ہنڈل رکھا ہوا تھا۔ میری اسے اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”کتنے ہیں؟“

”دن ہزار۔“ جیک ان کے چہروں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”لیکن تم نے تو میں ہزار کی بات کی تھی۔“

جیک نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”میں اپنی بات پر قائم ہوں لیکن پوری رقم کا ہندو بست نہیں ہو سکا۔ فی الحال یہ رقم لوہا باقی اگلے مینیجے مل جائے گی۔ بتاؤ یہ سود منظور ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ کرس نے جواب دیا۔ ”مجھے پوری رقم چاہیے۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ جیک نے کہا اور نوٹوں کا ہنڈل اپنی جانب منتقل کیا۔

”ایک منٹ! میری بولی۔“ وہیں منظور ہے۔“

”میری! کرس نے مجھ سے کہا۔“ کیا تمہیں یقین ہے کہ ہمیں بقیہ رقم مل جائے گی۔“

جیک نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں ایک

مصروف آدمی ہوں اور میرے پاس تم دونوں کی بحث کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اگر منظور ہے تو یہ دس ہزار پاؤنڈ اٹھاؤ اور چالی میرے حوالے کر دو ورنہ بات ختم۔“

دو منٹ بعد وہ دونوں اپنی کار میں واپس جا رہے تھے۔ اب ان کا رخ نلام گھر کی جانب تھا۔ میری کار چلا رہی تھی جبکہ کرس خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار واضح تھے۔ نلام گھر لوگوں سے کھچا کھرا ہوا تھا۔ وہاں نوادرات کے شائقین اور تاجروں کے علاوہ بہت بڑی تعداد تماشا دیکھنے والوں کی بھی تھی۔

کرس اور میری کو سب سے آخری قطار میں جگہ مل سکی۔ بال کی دیواروں کے ساتھ درجنوں لوگ کھڑے تھے جو ٹیلی فون پر غیر حاضر خریداروں سے رابطے میں تھے۔ نیلا شروع ہوئی اور مختلف اشیاء فروخت کے لیے پیش ہوئی رہیں لیکن خریداروں کی ساری دیکھی ان میں قیمت اور نایاب جگہوں میں بھی جن کے حصول کے لیے وہ یہاں آئے تھے۔ نیلا کی آواز پانچ ہزار پاؤنڈ سے ہوا جو بڑھتے بڑھتے آٹھ ہزار تک سوایڈنگ تک پہنچ گئی۔ اس دوران کرس نے کئی بار بولی لگانے کی کوشش کی لیکن ہر مرتبہ میری نے اسے روک دیا۔ وہ جانتا چاہ رہی تھی کہ سب سے اوپر بولی کیاں تک جاتی ہے پھر بیک ایک ہی کرس کا ہاتھ بلند ہوا۔ ”آٹھ ہزار پاؤنڈ سو۔۔۔ ایک۔“ نیلا کی کرنے والے نے جگ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آٹھ ہزار پاؤنڈ سو۔۔۔ دو۔“

”آٹھ ہزار پاؤنڈ سو۔۔۔ تین۔“

اس سے پہلے کہ اخباری رپورٹر اور فی وی کے کیمرا میں ان کا گھیراؤ کرتے۔ نلام گھر کی انتظامیہ نے انہیں پھیلے دروازے سے نکال دیا اور نو ہزار آٹھ سو پچھتر پاؤنڈ کی ادائیگی کے بعد وہ قیمتی جگ واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں نلام کی قیمت کے ساتھ دس فیصد کمیشن بھی دیا جاتا تھا لیکن میری خوش تھی کہ وہ اپنی ماں کا قیمتی اثاثہ واپس لے آئی۔ اس نے فخریہ انداز میں وہ جگ ہاتھ میں لیے اور بولی۔

”اب میں بھی اپنے بچوں کو فخریہ طود پر یہ کہانی سناسکوں کی جب وہ مجھ سے ملنے کے لیے ریٹ روم آیا کریں گے۔“

”ہاں تم شاید ایسا کر سکو۔“ کرس نے جمل کر کہا۔

”لیکن میں تو شرم سے زمین میں گڑا جا رہا ہوں۔“

”آج تمہیں پریشانی کس بات کی ہے؟“ میری نے پوچھا۔
 ”اتنی انجان نہ بنو۔ ابھی ہمیں پولیس کو اس کا ریکی
 چوری کی اطلاع بھی دینی ہے اور تم جانتی ہو کہ پولیس مجھ سے
 کیسے کیسے سوالات کرے گی۔“

”اگر تم نے کوئی مخالفت نہ کی اور راجعہ و انداز میں ان
 کے سوالوں کے جواب دیتے رہے تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔“
 ”اس سے بھی زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ میں
 اپنے دوست کو کیا بتاؤں گا۔ یہی کہ میں اس کی بی بی اور بیٹی کا ر
 کی حفاظت نہ کر سکا۔ او خدا! ایک تو میں نے اس کے ساتھ
 بے ایمانی کی اور اب مجھ سے بھی بولنا ہوگا۔“

میری نے سر ہلایا اور آہستہ سے بولی۔ ”جان! مجھے
 بہت افسوس ہے لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ
 بھی تو نہ تھا۔“

”تمہارے لیے یہ کہنا بہت آسان ہے کیونکہ وہ تمہارا
 دوست نہیں ہے اور نہ ہی وہ تمہارے دوست کی کار بھی۔“
 ”تم نے بھی دو۔“ میری جھلٹاتے ہوئے بولی۔ ”وہ
 ہمیشہ تمہیں استعمال کرتا ہے اگر ایک بار تم نے اسے استعمال
 کر لیا تو کیا ہوا؟“

”اگر تم وہ جگہ چیر بنی شاپ میں چھوڑ کر نہ آتیں تو یہ
 سب کچھ نہ ہوتا۔“ کرس نے جمل کر کہا۔

”میں اپنی غلطی مانتی ہوں۔“ میری نے جواب
 دیا۔ ”لیکن مجھے ایسا کرنے پر کس نے مجبور کیا۔ تمہارے
 دوست نے جو اتنی گاڑی میں اس جگہ کھڑی کر لیا جہاں ماما کا
 سامان رکھا ہوا تھا۔ اگر وہ اپنی کار یہاں لے کر نہ آتا تو یہ
 سب کچھ نہ ہوتا جو کچھ ہوا۔ اس کی سامری دسے داری تمہارے
 دوست پر قائم ہوتی ہے۔“

”تمہاری کوئی بھی جگہ تو کرس نے جھلا کر ریسورٹ لیا اور
 بولا۔ ”بس!“

دوسری طرف سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی
 دی۔ ”گتا ہے کہ میں نے غلط وقت پر فون کیا ہے۔ تم کچھ
 پریشان لگ رہے ہو؟“

”وہ ڈیوی تھا۔ کرس نے ایک نظر میری کو دیکھا اور
 بولا۔ ”جیس۔“ اسی کوئی بات نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔“

”میرا تم سے اس کار کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“
 کرس کا سانس رکنے لگا اور وہ جھٹی ہوئی آواز میں
 بولا۔ ”ڈیوی۔“ میں بھی نہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“

”میں پہلے میری بات سن لو۔ مجھے تمہاری مدد کی
 ضرورت ہے۔“

”دو۔ کسی مدد؟ میں کچھ سمجھا نہیں ڈیوی۔“ کرس نے
 الجھتے ہوئے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم وہ کار بیچ دو۔“
 ”کیا؟“ کرس نے چوتھے ہوئے کہا۔

”تم نے سنا نہیں۔ اسے بیچ دو۔ میں اب اس پر نہیں
 میں ہوں کہ اس سے تین گنا قیمتی کار خرید سکتا ہوں میں گاڑی
 کے کاغذات سمیت دوں گا لیکن تیس ہزار پاؤنڈز سے ایک بی بی بھی
 کم نہیں لینا۔ تم سن رہے ہو نا۔“

کرس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی حالت ایک بارے ہوئے
 چوری کی بی بی ہو رہی تھی اس نے جھٹکے جھٹکے میں کہا۔

”ہاں سن رہا ہوں لیکن تم بھی میری ایک بات سن لو۔“
 میں تمہیں اسی کار کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“

”ایک مینڈ۔“ ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی ہے۔ میں
 تمہارے بارے میں اکثر سوچتا رہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم
 دونوں میاں بیوی کو زندگی گزارنے کے لیے بہت جدوجہد
 کرنی پڑ رہی ہے۔ میں بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا لیکن
 اب میرے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ اس لیے چاہتا
 ہوں کہ درست ہونے کے ناتے اپنا فرض نبھادوں۔“

ایک آن تھا اور میری ان دونوں کی باتیں سن رہی
 تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ڈیوی کا اگلا جمل کیا ہوگا۔ اس خیال کے
 آتے ہی وہ بے چین ہوئی اور اس کے ہاتھ دھڑکنے لگے۔
 کا پٹے لگے۔ اس نے مضبوطی سے جگ بجز لیے۔

ڈیوی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم
 یہ رقم اپنے پاس ہی رکھو۔ یہ تیس ہزار پاؤنڈز تمہارے ہیں۔
 میری جتنی ہے کہ میں ہمیشہ تمہیں استعمال کرتا رہا ہوں۔ سمجھ لو
 کہ یہ اسی کا معاوضہ ہے یا پھر اسے ایک پیسے دوست کی طرف
 سے تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔“

کرس حیرت سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اس کی نظر
 میری رہ گئی۔ اس نے لڑتے ہاتھوں سے وہ دونوں جگ میز
 پر رکھنے کی کوشش کی لیکن رشتے پر قابو نہ رکھ کر پھر اچانک ہی
 وہ جگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بیگن کے فرش پر گر کر پھٹکا
 چلا ہو گئے۔

ڈیوی کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ ”آج کل یوں لگ
 جیسے وہ دنیا کے دوسرے کونے سے بول رہا ہو۔“

”کرس! تم میری بات سمجھ گئے نا۔ اس کار کو بیچ کر
 پیسے اپنے پاس رکھ لو۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں تمہیں کوئی
 مسئلہ نہیں ہوگا۔“



حضرت ادریسؑ

رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ گواہ ہے کہ ابلیس نے ہر دور میں اپنا قول نبھاتے ہوئے اولادِ آدم
 کو صراطِ مستقیم سے اتنا دور کر دیا کہ وہ گمراہ کن تاریکی میں
 قویہ کر رہ گئے۔ مگر ایسے میں نور کا اجالا کہیں نہ کہیں سے
 اندھیرے کا پردہ چاک کرتے ہوئے نمودار ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ بھی
 بہت پرستی میں مبتلا ہو کر اصل معبود کی جستجو کھو بیٹھے تھے۔
 ایسے میں حضرت ادریسؑ تشریف لائے اور اپنے رب کا پیغام ان تک
 پہنچایا لیکن منافقین اور مشرکین نے آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔
 آپ نے اپنی قوم کو یہ شمار علوم سے آشنا کیا۔ حضرت ادریسؑ
 پہلی پستی ہیں جنہوں نے علم و حکمت اور علم نجوم کی ابتدا کی
 اللہ تعالیٰ نے آپ کو اقلان کی ترکیب اور کواکب کے رموز و اسرار
 سے آگاہی دی۔ آپ نے لوگوں کو مدنی سیاست کے اصول و قواعد
 سکھائے۔ ایسے میں ابلیس ملعون کے منصوبہ دھڑکے دھڑکے گئے۔

ایک نبی کے عہد کی جو صورت باوریں اور نہانی کا اجمال

فرزِ نیر آدم علیہ السلام جنابِ شریف علیہ السلام اپنے ماننے والوں میں نہایت مقبول اور کامیاب تھے۔ یہاں تک کہ لوگ
 آپ کے انتقال کے بعد بھی آپ ہی کے تائے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔ نو سو سال سے اوپر کی عمر کو پہنچ کر جب آپ کا

انتقال ہوا تو ان کے بیٹے اور بیٹیاں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور سب بت پرستی سے دور، صراطِ مستقیم پر گامزن تھے۔ نصیحتوں کے اثر سے پیٹ بھر رہے تھے اور غاریوں، میدانوں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہ رہے تھے۔ دنیا بس وہیں تک تھی جہاں تک ان چند ہزار نفوس کے قدموں کی رسائی تھی۔

جب سلسلہ اولہ چھٹے بڑھتے بڑھتے کسی پشت میں ایک صاحبِ جمال بزرگ محلّ ایل تک پہنچا اور ان کی وفات ہوئی تو لوگ آٹے کے دین سے بھر گئے۔ کہتے ہیں محلّ ایل حسن و جمال میں لا جانی تھے۔ ان کی قوم ان سے بے حد پیار کرتی تھی۔ یہ ماہ تاب آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ لوگوں کی آنکھیں تاریک ہو گئیں۔ دل رونے لگے۔ ہر طرف محلّ ایل کو ڈھونڈتے مگر نہیں پاتے تھے۔ ماتم سا چھا ہوا تھا۔ ایسے میں شیطان کا داؤ چل گیا۔

رات کا وقت تھا۔ چند لوگ الاؤ روشن کیے اس کے گرد بیٹھے تھے کراہت بزرگ صورت آدمی ان کے درمیان آکر بیٹھ گیا۔ وہ صورت ان لوگوں کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ ہر آنکھ نے اس کا بغور جائزہ لیا پھر ان میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے اسے مخاطب کیا۔

”کیا تم ہماری زبان سربانی سمجھ سکتے ہو؟“

”ہاں کیوں نہیں۔ میں بھی میں سے ہوں۔“

”اگر تم ہم میں سے ہو تو ہم نے آج سے پہلے تمہیں دیکھا کیوں نہیں؟“

”دیکھنے کہاں سے۔ عرصہ ہوا میں یہاں سے چلا گیا تھا۔ اب لوٹ کر آیا ہوں۔“

”تم چلے کیوں گئے تھے؟“

”اتھکے تھکے اور کسی بڑے دریا کی تلاش میں۔“

”تمہیں وہ کھیت مل گئی؟“

”یہاں سے بہت اچھی جگہ ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ وہاں اور بہت سے لوگ بھی ہیں۔ تم لوگ چاہو تو تم بھی وہاں رہ سکتے ہو۔“

”ہم یہاں سے کیوں جائیں۔ ہمارے باپ دادا نے ہمیں یہیں وقت گزارا ہے۔“

”تو جلد گھر میں دیکھ باہوں تم لوگ یہاں خوش نہیں ہو۔ تمہاری عورتیں ہیں گریہ ہیں تمہارے چہرے آؤں ہیں۔“

”کیا تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ ہمارا بادشاہ محلّ ایل ہمارے درمیان سے اٹھ گیا ہے؟“

”یہ تو مجھے معلوم ہے۔“

”ہاں لیکن ہمارا دکھ ہے۔ اسے دیکھتے بغیر نہیں کہیں گے آئے۔“

”میں اسے نہ تو دیکھ سکتا لیکن اس کی صورت تمہیں ضرور دکھا سکتا ہوں۔“ شیطان نے کہا۔

”صورت ہی دکھا دو۔ ہم کچھ دیر کے لیے تو خوش ہو جائیں گے۔“

”کچھ دیر کے لیے نہیں۔ وہ صورت مستقل تمہارے پاس رہے گی۔“

”تو پھر دیر کیوں کرتے ہو۔ جلد ہی دکھا دو یہ صورت۔“

”ابھی نہیں۔ کل تم لوگ مجھے یہیں ملنا۔ میں وہ صورت تمہیں دکھا دوں گا لیکن خبردار ابھی یہ بات ان لوگوں کو مت بتانا جو یہاں نہیں ہیں۔“

شیطان یہ کہہ کر ان کے درمیان سے اٹھ گیا اور کسی طرف چلتا ہوا ایک نظروں سے غائب ہو گیا۔ الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ دیر تک اس کی باتیں کرتے رہے اور پھر کسی انجانی سرت سے سرشار دانیے ایسے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے۔ رات کے پندرہ گئے ہوئے انگارے کچھ دیر اندھیرے میں جگنو بنے رہے پھر ہر طرف گھپ اندھیرا چھل گیا۔

اگلی رات آئی تو یہ لوگ بھڑائی جگنو بنے ہوئے اور اس انجانی کا انتقاد کرنے لگے۔ اس شخص نے زیادہ انتقاد نہیں کرنے دیا۔ سب لوگوں نے ایک ساتھ دیکھا کہ کوئی ان کی طرف آ رہا ہے۔ اس کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ وہ قریب آیا تو جی تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جو دوسرے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ آگ کی روشنی نے دکھا تو نظر آیا۔ یہ نیکڑی کا بٹا ہوا ایک بٹ تھا۔ اس نے نیکڑی کے اس ٹکڑے کو سب کے سامنے رکھ دیا۔ یہ اتنی صفائی سے بنایا گیا تھا کہ جیسے محلّ ایل خود چل کر ان کے پاس آ گیا ہے۔ اس

بت پر نظر پڑی تو سب آپس میں جھگڑنے لگے۔ ہر ایک اس کی ملکیت کا دعویدار بن چاہتا تھا۔ سب کام شیطان کی منشا کے مطابق ہو رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور یہاں فساد شروع ہو گیا تھا۔ جو لوگ کسی بات پر نہیں اترتے تھے ایک بت کے لیے لڑ رہے تھے۔ شیطان نے جس انداز کی

”میں تمہیں ایک ایسی بات نہ بتا دوں کہ یہ بت تم سب کی ملکیت بن جائے۔“

”ہاں بتاؤ۔ تم بہت عقل مند ہو کوئی نہ کوئی ترکیب نکال لو گے۔“

”تم لوگ اس بت کو کسی مرکز کی مقام پر رکھ دو۔ کسی پر کوئی پابندی نہ ہو۔ جس کا جی چاہے اسے جا کر دیکھ لے۔“

سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور ایک چار دیواری کھینچ کر اس بت کو وہاں نصب کر دیا۔ یہ پہلا بت خانہ تھا جو تعمیر ہو گیا۔

وقت گزر رہا تھا۔ ایسے ایسے کئی بت خانے تعمیر ہوتے گئے۔ پھر ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو اس بت کی طرح دوسرے بت تیار کرنے پر قادر تھے۔ انہوں نے محلّ ایل کے بت بھی بنائے اور کچھ خیالی شخصیات بھی کھڑکیں۔ ان کے مختلف نام بھی رکھ لیے۔ رفتہ رفتہ یہ بت صرف بتاوت تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کی پرستش بھی ہونے لگی اور لوگ حضرت شیث علیہ السلام کی تعلیمات سے دور ہوتے چلے گئے۔ تمام اولاد آدم میں بت پرستی سرایت کر گئی۔

وقت کی گردش نے ان اندھروں کو مزید گہرا کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت دہریہ کے مطابق بت پرستوں کی اصلاح کے لیے انہی میں سے ایک پیغمبر پیدا کیا جسے قرآن عزیز نے حضرت ادریس علیہ السلام کے نام سے یاد کیا ہے۔

”اور ادریس اور ادریس اور ذوالکفل ان میں سے ہر ایک تمہا پر کرنے والا۔“ (سورہ ابراہیم)

”اور یاد کرو قرآن میں ادریس کو۔ بلاشبہ وہ تھے سچے نبی اور بلند کیا ہم نے ان کے مقام کو۔“ (سورہ مریم)

بائبل کے مطابق جب حضرت شیث علیہ السلام ایک سو پانچ برس کے تھے تو ان سے انوش پیدا ہوئے۔ انوش کی پیدائش کے بعد حضرت شیث علیہ السلام آٹھ سو برس جیتے رہے اور ان سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ انوش نوے برس کے تھے جب ان سے قینان پیدا ہوئے۔ قینان کی پیدائش کے بعد انوش آٹھ سو چھترہ برس جیتے رہے اور ان سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ قینان ستر برس کے تھے جب محلّ ایل پیدا ہوئے۔ محلّ ایل کی پیدائش کے بعد قینان آٹھ سو چالیس برس زندہ رہے اور ان سے عزیز بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ محلّ ایل بیسٹھ برس کے تھے جب یاد پیدا ہوئے اور یاد کی پیدائش کے بعد محلّ ایل آٹھ سو تیس برس زندہ رہے اور ان سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور یاد ایک سو اٹھ برس کے تھے جب ان سے حنوک پیدا ہوئے۔

تو ریت کے یہی حنوک، حضرت ادریس علیہ السلام تھے۔

ان کے نام اور وطن کے بارے میں خاصے اختلافات ہیں۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ ان کا نام ہرمس البرامہ ہے اور مصر کے قریب مصف میں پیدا ہوئے۔ یونانی ہرمس کو ارمیس کہتے ہیں اور ارمیس کے معنی عطا دے ہیں۔

دوسری جماعت کا خیال ہے کہ ان کا نام یونانی میں طرمیس، عبرانی میں خنوخ اور عربی میں اخنوخ ہے اور قرآن عزیز میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ادریس کہا ہے۔ یہ جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ ہرمس نے مصر سے نکل کر اقطارِ عالم کی سیر کی اور تمام دنیا کو چھان ڈالا اور جب مصر واپس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی جانب اٹھالیا۔

ایک تیسری جماعت یہ کہتی ہے کہ حضرت ادریس بائبل میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اسی خیال پر اکثر کا اتفاق ہے کہ ان کا تعلق وجہ اور فرات کے دریاؤں سے تھا۔ موجودہ کوئٹہ ان کا وطن تھا۔

نسب بیان کرنے والوں نے ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔ ”خنوخ یا اخنوخ (ادریس) بن یارد بن محلّ ایل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام۔“

مورخین کے مطابق آیت 3284 ق م میں پیدا ہوئے۔ بعض مفسرین نے آپ کا زمانہ ولادت 3880 اور بعض نے 4500 ق م لکھا ہے لیکن اکثر انکشافات کے مطابق آپ کا زمانہ ولادت 3500 ق م ہے۔

رسول کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق آپ سریانی پیغمبر تھے اور آپ پر تمسکین مینے ڈال دی ہے۔ یہ صحیفہ عبرانی زبان میں تھے۔ ان صحیفوں میں اسرار ادریس نامی عجیب سا رنگ زبان میں لکھا ہوا ملا ہے۔ اس کے علاوہ صحیفہ ادریس بھی انھیں پناہ میں موجود ہے۔

انہی جان کے مطابق آپ نے سب سے پہلے قلم کا استعمال کیا۔ پھر اینٹینا بچا دیا۔ ٹاپ ٹول کا قلم اور اسلحہ سازی کا فن بھی آپ کی ایجاد ہے۔ علم ربی بھی آپ سے منسوب ہے۔
 حضور اکرم ﷺ سے دل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "بے شک ایک پیغمبر تھے جنہوں نے یہ کھلا لہذا جس شخص کا خط ان کے موافق نہ رہا ہے تو اس کے حق میں اچھا ہوتا ہے۔"
 علامہ تفسیر میں سے اکثر کہا جاتا ہے کہ پہلے شخص جنہوں نے دین کے بارے میں وعظ و خطاب کا سلسلہ ڈالا وہ یہی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔

☆☆☆

حضرت آدم علیہ السلام کی نسل کو پہلے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن ہر اس علاقے میں ان کی اولاد میں موجود تھیں جہاں کھیتی باڑی کی سہولیات پائی جاتی تھیں لیکن شیطان اپنا کام دکھانا چکا تھا۔ ہر طرف گمراہی اور بت پرستی کا بازار گرم تھا۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس علیہ السلام کو عہد نبوت پر سفر فرمایا اور حکم دیا کہ وہ اولا د آدم کی رہنمائی فرمائیں۔
 بائبل کے بار باروں میں اس روز عجیب کی سر اسکی پیش کی ہوئی تھی۔ ہر شخص ایک شخص کا تذکرہ کر رہا تھا۔ اس کا رنگ گندمی ہے۔ دراز قد ہے۔ ٹھنی ڈاڑھی ہے، چمک دار آنکھیں ہیں۔ ہم میں سے ہے لیکن ہم سب سے زیادہ خوب رو ہے۔ چند دنوں سے دجلہ کے کنارے دکھائی دے رہا ہے اور اس کی باتیں کرتا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہ سنی ہوں گی۔ وہاں چلنا چاہیے۔ دیکھیں تو کہتا کیا ہے۔
 دجلہ کے کنارے لوگ جمع تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام چند پتھر اوپر پیچے رکھ کر اس کے اوپر کھڑے ہو گئے تھے اور لوگوں سے خطاب فرما رہے تھے۔

"اے لوگو! میں تم میں سے ہی ہوں لیکن تم سے مختلف ہوں۔ اس لیے کہ تم اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر بت پرستی میں مبتلا ہو گئے ہو جبکہ میں اپنے رب سے اس فعل بد کی بنا و مانگتا ہوں اور تمہیں تلقین کرتا ہوں کہ جن کی پرستش سے باز آ جاؤ۔ پرستش کے لیے صرف وہی ایک ذات ہے جس نے تم پر اپنا پانی بنا کر بھیجا ہے۔ تم سے میں وہی کہتا ہوں جو اس نے مجھے بتایا ہے۔ گو اللہ کی توحید پر ایمان لے آؤ۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور تم نے اس کے شریک بن چکے ہو۔" وہ لوگوں کو ایک دن تم سے تمہارا احساں لیا جائے گا۔ آخرت کے عذاب سے تمہیں صرف ایک چیز بچائے گی اور وہ ہیں تمہارے اچھے اعمال۔ عدل و انصاف کو پیش نظر رکھو۔ میں تمہیں عدل و انصاف کے اور عبادت الہی کے طریقے بتاؤں گا۔ تم اس پر عمل کرو، دیکھا میں بھی خوش حال رہو گے اور آخرت کے عذاب سے بھی نجات پاؤ گے۔"

ابھی آپ کا خطاب جاری تھا کہ دو مسند دار شریک لوگ جو بازار میں ان کی شہرت سن کر یہاں پہنچ گئے تھے، شور و غوغا بلند کرنے لگے۔

"تم کون ہوتے ہو جو ہمارے معاملات میں دخل اندازی کرنے والے۔ یہ ہمارے بت ہی تو ہیں جو ہمارے روزگار میں برکت دیتے ہیں۔ ہمارے لیے بارش برساتے ہیں۔ ایسی اچھی زمین کسے میسر ہوگی جو ہماری دسترس میں ہے۔ تم چاہتے ہو ہم سے یہ سب کچھ چھین جائے اور ہم تمہارے رحم و کرم پر رہ جائیں۔"

ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس پتھر پر بیٹھ کر جھانپا جس پر حضرت ادریس علیہ السلام موجود تھے اور خطاب کر رہے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام بہ حال و کچھ کر وہاں سے اتر گئے۔

آپ گھر پہنچے تو آپ کی زوجہ محترمہ جن کا نام بدائہ بنت اہل بن مخول تھا آپ کی پریشانی دیکھ کر گھبرا گئیں۔ آپ جب بھی گھر تشریف لاتے تھے خوش و خرم ہوتے تھے لیکن اس روز آپ کے چہرے پر ریشائش نہیں تھی بلکہ غصہ غم پرورد ہوا تھا۔
 "خیر تو گدڑی آج آپ پریشان دکھائی دے رہی ہے۔"

"میری قوم گمراہی میں ہے۔ میں اسے اس اندھیرے سے نکالنا چاہتا ہوں لیکن یہ نادان میری بات سننے کو تیار ہی نہیں ہوتے بلکہ اب تو زبردستی پر اتر آتے ہیں۔"

"خبر رکھیے اور منتظر نہ رہتے رہیے۔ آخر جب تک ان کے کان بند ہیں گے۔"
 "نہدا کہیں اس کا اجر دے۔" حضرت ادریس علیہ السلام نے اپنی زوجہ سے فرمایا۔ "عام طور پر جو عمر میں ایسے جھگڑوں سے گھبرا جاتی ہیں لیکن تمہاری انتہا صمت نے مجھے حوصلہ دیا ہے۔ اب میں اور باد و مہدی سے خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچانا چاہوں گا۔" آپ نے فرمایا اور اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے عبادت میں مشغول ہو گئے۔

دوسرے دن آپ باہر نکلنے کے لیے تیار ہوئے۔ اپنی انگوٹھی انگلی میں ڈالی جس پر تحریر تھا: "اللہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ مہربان مہندی کا پاستا ہے۔"
 کمر سے پٹکا باندھا جس پر لکھا تھا۔

"جنتی عیدیں اللہ کے فرشتوں میں بخشدہ ہیں اور دین کمال شریعت سے وابستہ ہے اور عورت میں کمال دین کی تکمیل ہے۔"
 اس دن آپ کے کمر سے نکلنے والی کچھ لوگ آپ کے ساتھ ہو لیے۔ آپ خوش ہوئے کہ یہ لوگ میری باتیں سننے کے مشتاق ہیں۔ یہ حقوق اسی طرح برقرار رہا تو یہ باتیں ایک دن ان پر اثر انداز بھی ہوئے لگیں گی۔ راستے میں اور لوگ بھی شامل ہوتے گئے یہاں تک کہ آپ اس مقام تک پہنچ گئے جہاں آپ قوم سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔ دیکھا کہ ایک شخص پہلے ہی سے آپ کی جگہ کھڑا ہے اور لوگوں سے خطاب کر رہا ہے۔ جو لوگ اس کے سامنے کھڑے ہیں اس کی باتوں کو بڑی توجہ سے سن رہے ہیں۔ سچ میں خوشی سے چہچہاتے بھی جا رہے ہیں۔ یہ شخص آپ کی مخالفت میں تقریر کر رہا تھا۔ سننے والوں کو آپ کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔
 "ادریس کہیں جا چکا کہ ہم ترقی کریں۔ یہ ہمارا خیر خواہ نہیں ہے۔ یہ ہمیں ہمارے بتوں سے برگشتہ کرتا چاہتا ہے۔ اس کی باتوں میں ہرگز ذرا آہ۔ اگر ہمارے بت ہم سے ناراض ہو گئے تو ہم سے ہماری خوش حالی چھین جائے گی۔"
 جب یہ شخص تقریر کر کے چل دیا تو وہ لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے جو اس کی باتیں سن رہے تھے۔ صرف وہ لوگ وہاں رہ گئے۔ جو حضرت ادریس علیہ السلام کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔ آپ اس پتھر پر کھڑے ہو گئے اور وسط و تلقین کرنے لگے۔

"یہ جو ابھی یہاں سے اٹھ کر چلے گئے ہیں اللہ کی رحمت سے دور ہونے والے ہیں۔ تم بھی سن لو اور ان لوگوں کو بھی بتا دینا کہ اگر تم نے اپنی روش نہیں بدلی تو اللہ کی طرف سے ایک عذاب بہت جلد آنے والا ہے۔ یہ آفت، زمین کو آگ اور پانی سے ڈھانپ دے گی۔"

یہ لوگ کچھ دیر تک آپ کی باتیں سننے رہے پھر انہاں کو اندر اصر ہو گئے۔ محض دو چار لوگ علی تھے جو آپ کے قریب کھڑے رہ گئے۔ آپ نے اپنا خطاب مکمل کیا۔ ان لوگوں کے حق میں وہاں سے خبر کی اور پتھر سے اتر آئے۔

کئی سال گزر گئے۔ آپ نے یہی طریقہ اپنایا ہوا تھا۔ وقت مقرر ہو جلد کے کنارے پہنچ جاتے اور خطاب شروع کر دیتے۔ ان کا مخالف تھا عدی بن یاسر نے ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ سارے کی طرح آپ کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ آپ کی مخالفت میں تقریریں کرتا رہتا تھا۔ اس کی تقریروں میں زور دین تھا لیکن چونکہ وہ بتوں کے حق کی تقریریں کر رہا تھا اور پوری قوم بتوں کی پرستش میں مبتلا تھی اس لیے اس کی باتیں لوگوں کے دلوں میں اتر رہی تھیں۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے ساتھ محض دو چار ہی لوگ تھے جن کا شمار ان کے ماننے والوں میں کیا جاسکتا تھا۔

حضرت ادریس علیہ السلام نہایت ثابت قدمی سے کایہ نبوت انجام دے رہے تھے۔ اب انہوں نے اپنی تبلیغ کا دائرہ ابھی بڑھا دیا تھا۔ وجہ کے کنارے تک محدود نہیں رہے تھے بلکہ شام ہوتے ہی بازار میں نکل آتے اور لوگوں کو تلقین کرتے کہ وہ خدا کی ہستی اور اس کی توحید پر ایمان لے آئیں۔ ہر ماہ قمری تاریخ کی چودہ، پندرہ اور سولہ کے روزے رکھیں، دلو کو ادا کرتے رہیں۔ دکانداروں کو نصیحت کرتے کہ کتاب ٹول میں ایمان داری سے کام لیں۔

ابھی تک ان کی تبلیغ کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ اس لیے قوم کے سربراہ اور دو لوگوں کو ان کی طرف سے کوئی خاص فکرا لاحق نہیں ہوئی تھی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ماننے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے تو ان کے کان کھڑے ہوئے۔

کچھ دنوں نے حضرت ادریس علیہ السلام کا گھر تبلیغ و ہدایت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جو لوگ آپ پر ایمان لے آتے تھے، یہاں ان کی تربیت ہو رہی تھی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کو معلوم نہ ہوئے۔ اس احتیاط کی عبادت کا اندیشہ ان کی تکمیل دے سکتا تھا۔ رات ہوتے ہی دروازے پر دستک ہوتی، آپ آنے والے کا نام پوچھتے۔ دروازہ دکھتا اور پتھر بند ہو جاتا۔
 "کسی نے دیکھا تو نہیں؟" مرغوشی ابھرتی۔
 "نہیں۔" باہر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

ایک ایک کر کے جب سب متفق ہو جاتے تو آپ اپنے ماننے والوں کو اپنی شریعت سے آگاہ فرماتے۔ قربانی اور نماز کے طریقہ بتاتے۔ آشنا کرتے۔ عبادت الہی کے طریقے سمجھاتے۔ یہ سب وہ چیزیں تھیں جو بدر لیدہ کی آپ تک پہنچ رہی تھیں۔ اجتماعی عبادت بھی سب مل کر آپ کے گھر پر ہی ادا کرتے۔

اندھیرے کی چادر نے بہت دن تک یہ راز چھپائے رکھا لیکن پھر ایک روز اس چادر میں ایک ساتھ مٹی سوراخ ہو گئے۔ کسی مخالف کی نظر پڑ گئی۔ مٹی دن تک اس کی تصدیق کی جاتی رہی کہ جو کچھ دیکھا ہے اس میں کتنی صداقت ہے۔ جب آنکھوں کی روشنی نے یقین کے کاغذ پر دستخط کر دیے تو مقدمہ قوم کے سرداران کے حضور لے جایا گیا۔

”اور میں (علیہ السلام) کا گھر سازشوں کا مرکز بن گیا ہے۔“

”کیسی سازشیں؟“ سرداروں نے پوچھا۔

”معاذ اللہ! اس کے عزائم یہ ہیں کہ وہ عام لوگوں کو بھڑکائے اور پھر انہیں سرداروں کے خلاف لاکھڑا کرے۔“

”تم کیسی سمجھتے ہو، جو غلطیوں سے بچنے کے لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ سرداروں کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں؟“

”وہ نہیں کوئی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر اس سے باز رہیں نہیں کی گئی تو وہ بہت بڑا خطرہ بن سکتا ہے۔“

”اسے ہماری سرداری سے کیا واسطہ؟ وہ تو مذہبی قسم کی نظر میں کرتا پھر رہا ہے۔“

”یہی باتوں کی جالاکہ ہے۔ وہ باتوں کی مخالفت کر کے ایک نیا نظام لانا چاہتا ہے جس کا مالک وہ بادشاہ وہ خود ہوگا۔ آپ

لوگ جس نظام کے سردار ہیں وہ اسے بدل دینا چاہتا ہے۔ ابھی تو بہت تھوڑے سے لوگ اس کے ساتھ ہیں لیکن اگر اس کے

ماننے والوں کی تعداد بڑھ گئی تو پھر اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔“

سرداروں کو اپنی سرداری خطرے میں پڑتی نظر آئی تو انہوں نے حضرت ادریس علیہ السلام کو بلا بھیجا تاکہ انہیں فرادھمکا

کر تبلیغ و ہدایت سے باز رکھا جائے۔

آپ کے ماننے والوں میں سے کئی نے آپ کے ساتھ چلنے کی خدمت کی لیکن آپ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ آپ اکیلے

جائیں۔ سرداروں کو بھی تو قیاس کی حد آپ کے ساتھ بہت سے لوگ ہوں گے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت ادریس علیہ

السلام اکیلے آئے ہیں تو ان کی بے غوثی بردہ کر دی گئی۔

ان سرداروں میں سے ایک نے پہل کی اور آپ کے عزائم کے بارے میں پوچھا۔ ”یہ خبریں ہم تک پہنچ رہی ہیں کہ آپ

بھائی کو بھائی سے لڑانے کے درپے ہیں۔ آخر آپ کا چاہے کیا ہیں؟“

”آپ لوگوں سے یہ کہیں کہ میں لوگوں کو لڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں تو انہیں اس مرکز پر لانے کی کوشش

کر رہا ہوں جس سے وہ دور ہو گئے ہیں۔“

”کیا اس میں تمہارا یہ مقصد پوشیدہ نہیں کہ تم سب کو ایک جگہ جمع کر لو اور پھر ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہو۔“

”ہرگز نہیں۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ جنوں کی پریشانی چھوڑ دو اور اس کی پریشانی کرو جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے۔“

”یہ صرف اتنی ہی بات نہیں۔“ ان سرداروں نے کہا۔ ”تم چاہے ہو تم ان طریقوں سے دور ہٹ جائیں جو ہمارے باپ

دادا سے چلے آ رہے ہیں۔ پھر اسوچو، ان باتوں میں تمہارے دلدادہ اہل اہل کا بھی ہمت ہے۔ کیا تم اسے بھی ہٹا دو گے؟“

”اکمل اہل لے یہ بھی نہیں کہا ہوگا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی پرستش کرنا۔ یہ سب شیطان کی کارستانی ہیں جن

میں تم لوگ گرفتار رہو۔“

”اچھا یہ بتاؤ تم یہ سب کس کے اکسانے پر کر رہے ہو۔“

”میں کسی انسان کے کہنے پر نہیں راہ حق کی تلقین نہیں کر رہا ہوں اور نہ یہ باتیں اپنے دل سے گھڑ کر بیان کر رہا ہوں بلکہ

خداوند تعالیٰ نے مجھے اپنا نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اس کا ایک فرشتہ ہے جو یہ سب باتیں مجھے بتاتا ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ، یہ نبی کیا ہوتا ہے۔ یہ دعویٰ تو بھی تمہارے باپ نے بھی نہیں کیا تھا جو تم کر رہے ہو۔“

”تم کیسی سمجھتے ہو، خدا نے جو راز بتائے وہ اسے پوچھو بے سہارا چھوڑ دے گا۔ نبی اس کا قائل نہ ہوتا ہے جو یہ بتاتا ہے

کہ تمہارا خدا تم سے کیا چاہتا ہے۔“

”یہ بات تو خدا ہم سے خود آ کر کہہ سکتا تھا۔ تمہیں خواہ مخواہ رحمت دی۔ اب تم بتاؤ ہم تمہاری بات پر کیسے یقین کر لیں۔

کیسے مان لیں کہ تم وہ ہو جو کہہ رہے ہو یعنی اللہ کا نمائندہ۔ یہ کام تو وہ ہم سے بھی لے سکتا تھا۔ تمہارا انتخاب کیوں کیا؟“

”خدا کسی کا انتخاب نہیں۔ وہ تو وہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اس نے مجھے ہی بتایا تم میں سے کسی کو نہیں۔“

”مجھ کی باتیں کر رہے ہو جو کہ تمہارے حکم ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”کیا تم اپنی ہی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ان باتوں کو اپنے کندھے ہاتھوں سے نہاتے ہو اور پھر ان کی پرستش بھی کرتے

ہو۔ چاہو تو انہیں توڑ بھی سکتے ہو۔ جسے کوئی انسان اپنے ہاتھوں سے توڑ دے گیاد وہ خدا ہو سکتا ہے۔“

”ہم ان باتوں کو خدا نہیں کہتے۔ یہ تو خدا کے نمائندے ہیں اور اب تم ایک نمائندہ بن کر آگے تاکہ ہم تمہاری بھی پرستش

کریں، کیوں یہی چاہتے ہو؟“

”میں تمہاری طرح تاوان نہیں ہوں۔“

”پھر تم کیا چاہتے ہو۔ تمہیں کتنا سوتا اور کتنی چاندنی چاہیے ہے؟“

”میرا صلوات اللہ کے پاس ہے، ایک انسان دوسرے کو کیا دے سکتا ہے۔“

”یہ دیوانگی چھوڑ دو ورنہ ہمارا غضب نازل ہوگا۔“

”میں اللہ کے غضب کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔“

”تم تو خیر بڑے گھر کے ہو ان لوگوں پر رحم کھاؤ جو تمہاری باتوں میں آگے ہیں اور تمہارے ساتھ لگے بھرتے رہتے ہیں،

لوگ انہیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔“

”خدا کی نظروں میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں، تم اگر تکلیف پہنچانا چاہتے ہو تو مجھے بھی تکلیف پہنچا کر دیکھو، میں وہی کہتا ہوں گا

جو خدا مجھ سے کہلاتا رہے گا۔“

”پھر آج سے تمہارا خدا تمہیں بچائے گا اور ہمارے بت ہماری مدد کریں گے۔“ ان سرداروں نے کہا اور مجلس پر خاست

ہوئی۔ حضرت ادریس علیہ السلام وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔

ان بڑے لوگوں نے آپ کی طرف سے مایوس ہو کر آپ کے خلاف سازشوں کے جال میں شروع کر دیے۔ ان سب

لوگوں کو بلایا جو حضرت ادریس علیہ السلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور انہیں یہ ہدایت کی کہ جو لوگ حضرت ادریس علیہ السلام

کی حمایت کر رہے ہیں ان کی زندگی اجیرن کر دو۔ ان سے مل کر دین بند کر دو اور شتے دریاں موتوں کر لو۔ جب یہ لوگ جنگ

آ کر حضرت ادریس علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو وہ لامحالہ اکیلے رہ جائیں گے۔ اگر وہ پھر بھی باز نہیں آئے تو ان کے متعلق

بعد میں سوچا جائے گا۔ فرادھمکا کر انہیں بھی خاموش کر دیں گے۔

دوسرے دن کی صبح طلوع ہوئی تو مشہد بن ادریس اتر چکے گئے۔ راستوں میں بیٹھے ہوئے یہ مفیدان پتروں کی طرح تھے

جو کسی طرف اٹھتے ہیں تو اسے ذرا کیے بغیر زمین چھوڑ دیتے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے ماننے والوں میں سے جو نظر آتا اس پر

ظہن و حضن کی بادشہ شروع کر دیتے۔ مقصد یہ تھا کہ انہیں فرادھمکا کر اور راست سے ہٹا دیا جائے لیکن یہ نقشہ شش اتنا اچھا نہیں تھا

کہ ان دھمکیوں سے اتر جاتا۔

یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا لیکن ان دھمکیوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ان شریروں نے اب باقاعدہ ہار پیٹ شروع کر دی۔

اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ ایک آدھ باتو ایسا ہوا کہ مارنے والا خود پٹ گیا۔

اب منافقین نے حضرت ادریس علیہ السلام اور ان کی جماعت کو مٹانے کے لیے یہ رامت نکالا کہ ان سے قطع تعلق کر لیا۔

رشتہ داروں نے منہ پھیر لیا، لیکن دین بند کر دیا۔ کوئی اگر کسی کے کھیتوں پر کام کرتا تھا تو اسے نکال باہر کیا۔ بات چیت بند کر دی۔

کوئی اپنے قریب نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔

حضرت ادریس علیہ السلام کے ماننے والے سخت پریشان تھے لیکن آپ انہیں مسلسل تسلیاں دے رہے تھے۔ یہ تسلیاں ان

غریبوں کے آتمو تو پوچھنے کی تھیں لیکن ان کے لیے سہولت کا سامان فراہم نہیں ہو سکتا تھا۔

جب اس جماعت کے گھروں کا منہ قاقوں نے دیکھ لیا تو سب کے سب بچ ہو کر حضرت ادریس علیہ السلام کی خدمت میں

حاضر ہوئے اور فریاد کرنے لگے۔ آپ کے ہاتھوں پر تسلی کے وہی الفاظ تھے۔

”جس طرح یہ دنیا عارضی ہے اسی طرح اس کی تکلیفیں عارضی ہیں۔ آخرت کا آرام تمہارے ہاتھ رہے گا۔ یہ بد بخت

ڈنکیل بنا رہے ہیں گے۔“

آپ نے خطاب میں ایسی تاثیر بھی کر دکھائی کہ شکایتوں کے دھم توڑا بھر گئے۔ یہ لوگ نئے ہوصلے کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو

رہا نہ ہو گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد آپ بڑی دیر تک ان کی حالت پر غور کرتے رہے اور کوئی ایسا عمل ڈھونڈنے کی کوشش

کرتے رہے جس سے ان غریبوں کی تکلیفیں ہٹ سکیں۔ آپ کوئی کام دینی الہی کے بغیر نہیں کر سکتے تھے اور ابھی زبان وحی خاموش تھی۔

آپ اور آپ کی جماعت اسیجوت بن کر رہ گئی تھی۔ دکان دار انہیں سودا سلف دینے سے انکار کر رہے تھے، رشتہ داروں

نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ آپ راتوں کو گریہ و زاری کرتے تھے۔

”اے اللہ! یہ تھوڑے سے بندے جو تجھ پر ایمان لے آئے تھے۔ ان کی مخالفت فرما۔ اگر یہ بدول ہو کر واپس لوٹ گئے تو تیرا نام لیا کوئی نہیں رہے گا، مگر اہل کفر و کدایت دے۔ ان کے دلوں کو ہماری طرف سے نرم کر دے۔“

دن بدن گزرتے جارہے تھے لیکن یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ شاید امتحان کے کچھ دن اور باقی تھے۔ حضرت اور یس علیہ السلام کو ماننے والے اب اسنے جا بڑا گئے تھے کہ لگتا تھا کسی بھی وقت آپ کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

وہ رات ستاروں سے جاری اندھیری اور خاموش تھی۔ وہ تمام لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے، حضرت اور یس علیہ السلام کے گھر میں جمع تھے۔ آپ کو بڑا ریوچی پیغام مل گیا تھا اور اب وہ اس پیغام کو اپنے ماننے والوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔

جب سب لوگ جمع ہو چکے تو آپ نے انہیں مخاطب کیا۔

”اے لوگو! تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ مجھے تمہاری حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں رب العزت کی بارگاہ میں تمہارے لیے دعا گو تھا۔ میں خطر تھا کہ مجھے کوئی حکم دیا جائے اور میں جیل حکم کروں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنے ماننے والوں کو ساتھ لے کر بائیں سے نکل جاؤں پھر جہاں اللہ کا حکم ہو وہاں قیام کروں۔ اب بتاؤ تمہیں میرا ساتھ دینا منظور ہے یا نہیں؟“

سکوت اور گہرا ہوا گیا۔ کسی کی دیکھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیا جائے۔ یہ کیا فیصلہ ہے۔ جہاں ہمارے باب دادار ہے طے آئے ہیں وہاں سے ہجرت کیسے کر جائیں۔ مشکلیں بھی ہم نے اٹھائیں اور وطن بھی ہمیں چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ جو لوگ حضرت اور یس علیہ السلام کی مخالفت کرتے رہے وہ تو مزے میں رہے۔ غمو کریں ہمیں کھائی پڑیں گی۔ حضرت اور یس علیہ السلام نے انہیں خاموش دیکھا تو ایک مرتبہ پھر اصرار کیا۔

”تم لوگ خاموش کیوں ہو۔ بولنے کیوں نہیں۔ کیا تمہیں اس فیصلے سے اختلاف ہے؟“

”یہ کیا فیصلہ ہوا۔ ہم کیا غلطی کر رہے ہیں جو ہمیں وطن چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ ہمیں ستانے والے تو یہاں رہیں اور ہم صحراؤں میں بیٹھتے پھر رہیں۔“

”وہ نہیں وطن عزیز ہے یا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی؟“

”آپ ہم سے ایسا سوال کیوں پوچھتے ہیں جس کا جواب آپ کو معلوم ہے۔ اگر ہمیں خدا کی خوشنودی حاصل نہ ہوتی تو اس کی راہ میں اتنی تکلیفیں کیوں اٹھاتے۔ ہم نے تو آپ کا ساتھ دینے کے لیے اپنے دوستوں اور عزیزوں تک کو چھوڑ دیا۔“

”تم نے انہیں نہیں چھوڑا بلکہ انہوں نے تمہیں چھوڑا ہے۔ اس لیے کہ تم حق پر تھے۔ باطل کو یہ کیسے پسند آ سکتا ہے کہ حق اس کے ساتھ رہے۔ اب تمہیں یہ سوچنا ہوگا کہ باطل کے ساتھ رہنا ہے یا باطل سے الگ ہو جانا ہے۔“

”ہم خود باطل کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ یہ ہمارا وطن ہے۔ اسے کیسے چھوڑ دیں۔“

”وطن کے لوگوں کا سلوک دیکھ رہے ہو۔ ایسے ہوتے ہیں اور باب وٹن؟“

اس کا کوئی جواب ان لوگوں کے پاس نہیں تھا لیکن ان کا دل بائیں میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ حضرت اور یس علیہ السلام نے انہیں متذبذب میں دیکھا تو سب کو جانے دیا کہ اپنے گھروں کو جا کر خوب اچھی طرح غور کریں اور کل پھر اسی جگہ جمع ہوں۔

بائیں کی دھوپ دوسرے دن بھی اسی طرح چمکی تھی۔ لوگوں کا رویہ اسی طرح نازبا تھا۔ حیران اور یس علیہ السلام خاص طور پر گھروں سے نکلے کہ شاید اہل وطن کے رویوں میں کوئی تبدیلی نظر آجائے لیکن وہ جدھر سے گزرتے طنز کے تیروں کی بوچھاڑ لگتی رہتی تھی۔ جس سے بات کرنے کی کوشش کی وہ مزید پھیر کر دوسری طرف چل دیا۔

رات کے وقت جب یہ جماعت حضرت اور یس علیہ السلام کے مکان پر جمع ہوئی تو ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے تجربات بیان کیے۔ امید کی کوئی صورت نہیں تھی۔ پتھروں سے کوئی پشیمند نہیں اٹھا تھا لیکن سب کے دلوں میں یہ کھٹکنا بھی تھا کہ حضرت اور یس علیہ السلام نہ جاتے کہاں لے جائیں۔ بائیں جیسا سرسبز و شاداب علاقہ پھر ملے یا نہ ملے۔ اس کا اظہار بعض لوگوں کی زبان پر بھی گیا۔

”ہمیں بائیں جیسا علاقہ کہیں اور نصیب نہیں ہوگا۔ وجہ وہ فرائ سے اچھی نہیں کہاں ہوں گی۔“

”کیا تمہیں یقین نہیں کہ ہجرت کا جو فیصلہ میں نے کیا ہے وہ میرا نہیں خدا کا فیصلہ ہے۔“

”ہمیں معلوم ہے۔ اسی لیے تو ہم آپ سے کہہ رہے ہیں کہ اپنے اللہ سے کیسے وہ فیصلہ بدل دے۔ کوئی تدبیر ایسا کر

دے کہ ہم اپنے وطن ہی میں رہیں۔“

”اللہ کے فیصلے اصل ہوتے ہیں لیکن یہ تو بتاؤ تمہیں یہ فیصلہ تسلیم کرنے میں اتنی قیادت کیوں ہے؟“

”ہم پہلے کہتے ہیں کہ یہ شادی نہیں کریں اور نہیں ملے گی۔“

”یہ شادی جس پر تم استقامت کر رہے ہو، کیا تمہاری پیدائش ہوئی ہے؟“

”نہیں۔ اس کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے۔“

”میں تو پھر تمہارا ایمان یہ ہوتا چاہیے کہ اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی کمی نہیں۔ جتنا حسن اس نے بائیں کو دیا ہے اس سے کہیں زیادہ اس خطہ زمین کو بھی دے سکتا ہے جہاں وہ چاہیں لے جاتا جاتا ہے۔ جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں وہ انہیں بھی مایوس نہیں کرتا۔ تم اس پر بھروسہ کرو، وہ تمہیں ضرور اس کا حکم اہل دل دے گا۔ اس کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔“

اس کے قصہ کے آگے سر تسلیم خم کر دو پھر دیکھو وہ تمہارے لیے کیسی کبھی نصیحتیں عطا کرتا ہے۔ وہ ایسی نصیحتیں ہوں گی کہ تم بائیں کو بھول جاؤ گے اگر اس کی حکم عدولی کر کے تم نے وطن نہ چھوڑا تو وہ جو ہر کام پر قادر ہے، شہرہاں کی نہروں کو خشک بھی کر سکتا ہے۔ پھر تم ہو گے اور یہ عالم اور باب وٹن۔ اس کے بعد اگر تم نے ملک چھوڑا تو کیا چھوڑا۔ اس کے باقرمان بننے سے کہیں بہتر ہے کہ اس کے فرماں بردار بن جاؤ۔ وہ جو ہر شے پر قادر ہے تم سے خوش ہوا تو تمہیں مالامال کر دے گا۔ ایک دن آنے لگا کہ بائیں اور باب وٹن حضرت سے کہیں گے کاش! ہم بھی تمہارے ساتھ ہجرت کر گئے ہوتے۔“

آپ نے کی تقریر ایسی موثر تھی کہ سب کے سب ہجرت پر آمادہ ہو گئے اور یہ عہد باعہدا کہ وہ اپنے پیغمبر کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ آپ نے ان سب کو حکم دیا کہ چلے گی تیاری کریں۔

کچھ دن سے خاموشی تھی۔ حضرت اور یس علیہ السلام کی تیاری میں لگے ہوئے تھے جیسے وہ کہیں جانے کے لیے کمر کمر رہے ہوں۔ بہت سی لوگ اس تیاری کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ بڑی جتو کے بعد یہ معلوم ہوئی گیا کہ حضرت اور یس علیہ السلام اور ان کے ساتھی بائیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا بلکہ یہ تو انہیں بھی معلوم نہیں تھا جو ہجرت کر رہے تھے۔

تقدیق ہوتے ہی کھرام بج گیا۔ وہی لوگ جنہوں نے زندگی اخیر ان کر رہی تھی، اب افسردہ تھے۔ آپس میں رش و داریاں

تھیں اور اب چارے شوت رہے تھے۔ ان لوگوں کو اس لیے تکلیف لگتا تھا کہ خبرا کر حضرت اور یس علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ یہ فیصلہ خود ہی تھا کہ بائیں سے چلے جائیں۔ کسی کا بائیں چھوڑنے جا رہا تھا۔ کسی کا بیٹا جا رہا تھا تو آپ نہیں رہ گیا تھا۔ پادری کی زنجیریں غور کر رہی تھیں۔ جانے والوں کے لیے یہ ایک اور امتحان تھا اور یہ ایسا جھڈائی امتحان تھا کہ پڑے پڑوں کے قدم ڈگمگائیں۔

ہر گھر میں طرح طرح کے موالات کیے جا رہے تھے۔ جواب مل رہے تھے مگر کسی کی تشفی نہیں ہو رہی تھی۔ بس ایک ہی جواب سامنے تھا کہ ان کے پیارے ان سے جدا ہوں گے۔

”تم لوگ کہاں جانے کی تیاریاں کر رہے ہو؟“

”یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ بائیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“

”سوال تو یہی ہے کہ تم لوگ کیوں جا رہے ہو، یہاں تم لوگوں کو کس چیز کی کمی ہے؟“

”یہ سوال آپ کو ان لوگوں سے کرنا چاہیے جنہوں نے ہم پر عمر بھر کیات تک کر دیا تھا۔ پھر ہم یہاں رہ کر کیا کرتے؟“

”دیکھو تم ہمارے اپنے ہو۔ ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم نے ہمارے بٹوں کو برا کہا مگر تو کیا جس کے نتیجے میں تازہ کھڑا ہوا۔ تم اگر آج حضرت اور یس علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دو تو ہم تمہیں گلے لگاتے کو تیار ہیں۔“

”یہ سودا نہیں منظور نہیں بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آپ سب بھی حضرت اور یس علیہ السلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں۔“

”تم ہمیں ایسے خدا کی پرستش کے لیے کہہ رہے ہو جیسے ہم نے دیکھا تک نہیں۔ اور میں اپنے طریقے ایجاد کرنا چاہتے ہیں جو ہمیں ہرگز قابل قبول نہیں۔“

”ہم نے تو یہ تک کہا کہ بڑی برائی نہیں ہے۔ تم اپنے بٹوں کی پرستش کرتے رہو، ہمیں خدا کی عبادت کرنے دو لیکن یہاں کے لوگوں نے تو ہم سے لین دین ہی بند کر دیا۔ ہمیں بالکل ہی تنہا کر دیا پھر ہم یہاں رہ کر کیا کریں۔“

”تم تم سے پھر کہتے ہیں۔ آج کی دشمنیاں ختم کر دو۔ اور میں سے کہو وہ جہاں جانا چاہتا ہے چلا جائے۔ تم لوگ ہمیں رہ جاؤ۔“

”یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہی ہدایت کی ہے کہ وہ اس کیلئے نہیں ہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔“

”وہ نہیں لے وقت بھارے ہیں۔“

”وہ اللہ کے نبی ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔“

”یہ کی کیا ہوتا ہے؟“

”جس طرح ہمارے اور تمہارے باپ آدم نبی تھے۔“

”تم بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ کہاں صحراؤں میں بھٹکتے پھرو گے۔ جانے کا ارادہ اب بھی ترک کر دو۔“

”ہم اپنے نبی سے وعدہ کر چکے ہیں۔ ہمارا عہد ٹوٹنے کے لیے نہیں تھا۔“

ان کی طرف سے پاپس چوٹے کے بعد ان لوگوں نے حضرت ادریس علیہ السلام کو اپنے پاس بلایا۔ ”یہ آپ کسی نادانی کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو کہاں لے کر جا رہے ہیں؟“

”میرے رب نے مجھے صرف یہ حکم دیا ہے کہ میں اپنی جماعت کے ساتھ بابل سے ہجرت کر جاؤں۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ میں انہیں کہاں لے جا رہا ہوں۔“

”اچھے رہو ہر گز منزل کا پتا نہیں اور جا رہے ہو۔“

”میری رجنائی کے لیے میرا خدا ہے۔ میں پھرتا ہوں گا، جہاں اس کا حکم ہو گا کہ جاؤں گا۔“

”کیا تم نہیں ارکس کے لیے نہیں کہہ سکتے؟“

”میرے خدا نے جو مجھے ہجرت کا حکم دیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیدھا راستہ تمہاری قسمت میں نہیں ہے۔ اسی لیے ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہم نہیں چھوڑ جائیں۔ ہمیں اگر تو یہی تو فیصلہ ملی ہوئی تو ہم یہاں سے جاتے ہی کیوں۔“

”یہ بات نہیں۔“ ان سرداروں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہمارے بتوں کو یہ منظور نہیں کہ ان کا مذاق اڑانے والے یہاں رہیں۔ اسی لیے انہوں نے تمہارے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور وہ لوگ بھی جو تمہارے ساتھ ہیں۔ کچھ ہی دن میں یہ عیش تم سے چھین جائے گا اور تم صحراؤں میں بھٹکتے پھرو گے۔ یہی تمہاری سزا ہے۔“

ان بڑے لوگوں نے ان لوگوں میں بھی مشہور کر دیا کہ ادریس اور ان کے ساتھیوں کو بتوں کی توجہ کرنے کی سزا ملی ہے۔ ہمارے بتوں نے ان لوگوں کو ناراض ہو کر بابل سے نکال دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت ادریس علیہ السلام بابل سے نکلے تو بابل کے لوگوں نے بڑی جھوم دھام سے جشن منایا اور کئی دن تک بتوں کو خوش کرنے کے لیے چڑھاوے اور نذرانے چڑھائے جاتے رہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا یہ چھوٹا سا قافلہ برق و برق صحرا میں کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ منزل کا تعین ہو تو سفر آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کا حال تو یہ تھا جیسے راستہ ٹھیک گئے ہوں۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے موصاف ہی پریشان تھے۔ سختیاں جیسے جیسے بڑھتی جاتی تھیں وطن کی یاد ستاتی جا رہی تھی۔ وہ دبے لفظوں میں کہتے گئے تھے کہ ہم نے بابل سے نکل کر غلطی کی۔ بابل ہمیں سرزمینِ آبِ ہمیں میر نہیں آسکتی۔ اب تک ریت اور پہاڑیوں کے سوا ہمیں کچھ نہیں ملا ہے۔ حضرت ادریس علیہ السلام انہیں برابر موصلا دیے جا رہے تھے اور وہ غافل رہے تھے۔ ”اے اللہ! میرے ساتھیوں کے ایمانوں میں ضعف پیدا نہ کر۔ انہیں ثابت قدم رکھ اور انہیں بابل کا حکم الہی عطا کر۔“

کئی دن کے سفر کے بعد ان لوگوں کے پاس پانی کم ہو گیا۔ قطرہ قطرہ کر کے پیاس بھرا رہے تھے۔ اب ان میں سے بہت سوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ایسی ہی ٹھیک صحرا میں سر جائیں گے۔ نوچر دور تک کوئی پرندہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ کتنی قریب ابھی پانی ہے۔

ریت کا ایک بیڑا ایلا سامنے تھا اور کچھ نہیں معلوم تھا کہ یہ بیڑا عبور کرنے کے بعد کیا منظر سامنے آتا ہے۔ ان لوگوں نے بے دلی سے اس ٹیلے پر چڑھنا شروع کر دیا۔ جب سب اوپر پہنچ گئے اور اس بلندی سے دیکھا تو کوئی چیز آنکھ کی طرح چمکتی ہوئی نظر آئی۔ سب اس طرف دوڑ پڑے۔ وہ جتنا چلتے جاتے تھے اتنے ہی بے چارہ دور ہوتی جاتی تھیں۔ ابھی وہ اسے نہ دیکھ سکا تھا کہ

کچھ رہے تھے کہ ان کی آنکھوں نے ایک بڑے دریا کو نظر میں لایا۔ وہ بے دیکھا۔ وہ سمجھا تھا وہ نے گئے۔ ہر طرف بزمہ ہی بزمہ تھا۔ یہ دریا وہی تھا جسے آج دریائے نیل کہا جاتا ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ عالم بچان میں تاج رہے تھے، شور مچا رہے تھے، ایک دوسرے پر پانی اچھال رہے تھے۔

حضرت ادریس علیہ السلام نے دریا کی روانی اور زمین کی شادابی دیکھی تو آپ نے بے ساختہ فرمایا۔ ”بابلیون“

(تمہارے بابل کی طرح شاداب مقام) حضرت ادریس کے اس لفظ ”بابلیون“ نے ایسی شہرت پائی کہ اس جگہ کا نام ہی بابلیون پڑ گیا۔ قدیم قوام اس مقام کو اسی نام سے پکارتی رہیں۔ طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد جب دنیا دوبارہ آباد ہوئی تو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حام نے اپنے بیٹے مصر کو دریائے نیل کے کنارے آباد ہونے کا حکم دیا اور یہ مقام مصر بنی حام کی وجہ سے مصر کہلایا۔

بہر حال موجودہ مصر اور قدیم بابلیون میں ایک بہترین جگہ منتخب کر کے دریائے نیل کے کنارے یہ لوگ آباد ہو گئے۔ ان کی عورتیں اور بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان لوگوں نے بابل کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے اور اب انہیں اسی ”بابلیون“ میں رہنا تھا جو خدا نے انہیں بابل کے حکم الہی کے طور پر عطا کیا تھا۔

خدا نے اپنا وعدہ بچ کر رکھا تھا۔ بابل سے اچھی زمین عطا کی تھی۔ ان کے پیچھے رہنے والے تھے وہ پوری ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے ایمان مزید بخت ہو گئے اور ہر وقت اپنے نبی کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے لیے کوشاں ہو گئے۔

یہ ایسی شاداب سرزمین تھی کہ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت سے قبائل آباد تھے جو سب کے سب گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یہ اندھیرے کی آجالی کی تلاش میں تھے اور اچالا بہت قریب آ گیا تھا۔ حضرت ادریس علیہ السلام کسی ایک شخص کو قوم کے نبی نہیں تھے بلکہ انہیں خلافتِ ارضی عطا ہوئی تھی۔ روئے زمین پر جو بھی آباد ہے، اس تک اپنی تعلیمات پہنچانا آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ آپ نے اپنے چند بااعتماد ساتھیوں کے ہمراہ ان قبائل کا رخ کیا اور پیغامِ الہی پہنچانا شروع کر دیا۔

کہتے ہیں اس وقت مصر میں بہتر زبانیں بولی جاتی تھیں۔ آپ کے پیروکار یہ دیکھ کر حیران تھے کہ کون تمام زبانوں پر عبور حاصل ہے جو جماعت آتی ہے آپ اس سے ہمیں کئی زبانیں باتیں کرتے ہیں۔ خدا نے تعالیٰ کی عطا بخشش سے آپ اس وقت کی تمام زبانوں کے وہاں دان تھے۔

آپ کے ماننے والوں کے لیے کچھ دنوں سے ایک اور بات دیکھی اور تجسس کا باعث بنی ہوئی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ حضرت ادریس علیہ السلام ایک ایک دو دو دن کے لیے غائب ہو جاتے ہیں اور پھر لوٹ کر آ جاتے ہیں اور جب وہاں آتے ہیں شریعت کا ایک نیا نکتہ بیان فرماتے ہیں۔ لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ایک فرشتہ ہے جو آپ کا دوست ہے۔ وہ جب بھی آتا ہے حضرت ادریس علیہ السلام اسے لے کر جنگل میں چلے جاتے ہیں۔ وہ آپ کو کئی نیا باتیں بتاتا ہے۔ ان سب زبانوں کا علم بھی اسی نے دیا ہوگا۔ اس کا یقین اس طرح بھی آتا تھا کہ آپ ابھی بھی کوشری میں بند ہو جاتے تھے۔ اندر کوئی نہیں ہوتا تھا لیکن یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ بعض لوگ تو یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ ایک ایک شخص ہے جس کو کفر آپ کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ یہی وہ فرشتہ ہے۔ لوگوں نے اس بارے میں آپ سے کئی مرتبہ سوالات کیے اور اس فرشتے کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن آپ نے کسی کو کھل کر کچھ نہیں بتایا۔

ایک دن پھر آپ کے قریب رہنے والوں نے دیکھا کہ آپ تنہائی میں کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ یقیناً وہ فرشتہ پھر آیا تھا۔ اس سے آپ کو کچھ باتیں سنیں اور پھر کو بتائی تھیں۔

پوری قوم انتظار میں تھی یا آخر دونوں کے انتظار کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام نے قوم سے خطاب کیا۔

”لوگو! مجھے تاکید کی گئی ہے کہ میں تمہیں بتاؤں اور تم اس پر عمل کرو۔ خدا کی قسم! یہی اور اسی کی توحید پر ایمان لاؤ۔ صرف خالقِ ہستی کی پرستش کرو۔ آخرت کے عذاب سے رستگاری کے لیے اعمالِ صالح کو حوالہ بناتے رہو۔ ایسے اعمال کرو جو تمہیں آخرت کے عذاب سے بچائیں۔ مقررہ طریقے پر عبادت کرتے رہو اور کسی کے ساتھ نا انصافی مت کرو۔ پاک ساتھی رہا کرو۔“

نصرا اور چرواہوں کے قریب بھی مست جاؤ۔ کئے اور سور سے خاص طور پر اجتناب کرو۔“

آپ کے ماننے والے آپ کی ہر بات کو ایمان کا درجہ دیتے تھے۔ مختلف قبائل کے جو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، آپ اور آپ کی جماعت کے لوگ انہیں ان تعلیمات سے آگاہ کرتے رہے۔ آپ کی یہ تعلیمات دور دور تک پہنچتی رہیں اور ان پر عمل بھی ہوتا رہا۔

اخلاقی تعلیمات کا ورثہ تھا جو رواں تھا۔ انسانیت کے ابتدائی دور میں آپ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ انسانیت کے مراعات بن جاتے تھے۔

معلم نے پھر باب وائش واکیا۔ آپ پھر لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ ”جب سورج کسی برج میں داخل ہونے لگا ہو اور بعض جگہ سیارے اپنے بیوت و برج شرف میں داخل ہوں اور بعض سیارے بعض سیاروں کے مقابل آجائیں اس وقت عید منائی جائے اور ایام بیض میں روزے رکھا کرو۔“

”ایام بیض سے کیا مراد ہے؟“ لوگوں نے پوچھا۔

”ہر ماہ قمری کی چودہ پندرہ اور سولہ تاریخ بیض کے ایام ہوتے ہیں۔“

”بہنیں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ سورج کب برج میں داخل ہوگا اور سیارے کب برج شرف میں داخل ہوں گے؟“

”جب تک میں ہوں مجھ سے پوچھتے رہنا۔ پھر میں تم میں سے ایسے لوگ تیار کروں گا جو اس علم کے ماہر ہوں گے۔“

حضرت اور اہل اسلام پہلی ہستی ہیں جنہوں نے علم تحت و نجوم کی ابتدائی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو افلاک اور ان کی ترکیب، کواکب اور ان کے اجتماع و افتراق کے نقاط اور ان کے باہم کشش کے رموز و اسرار کی تعلیم دی اور انہیں علم عدد و حساب کا عالم بنایا۔ اگر اس تکبیر خدا کے ذریعے ان علوم کا اکتشاف نہ ہوتا تو انسانی طبائع کی وہاں تک رسائی مشکل تھی۔

آپ نے قوم کو نذر اور قربانی کے طریقے بھی بتائے، خوشبو کی دعویٰ، جانوروں کی قربانی اور ان کے علاوہ میوؤں، پھلوں اور پھولوں میں سے موسم کی پہلی چیز کی نذر ضروری تھی۔ میوؤں میں سے سیب کو، اناج میں سے گیسوں کو اور پھولوں میں سے گلاب کو ترجیح حاصل تھی۔

آپ ایک سرحد تک دنیا کی سیاست کرتے رہے۔ اس وقت چرباں جہاں انسان آباد تھے۔ آپ وہاں تشریف لے گئے کیونکہ آپ کو خدا کی زمین کا مالک بنایا گیا تھا۔ آپ کا کام صرف اخلاقی تعلیم تک محدود نہیں تھا بلکہ آپ کو ایسے علوم سے بھی سرفراز کیا گیا تھا جنہیں کام میں لے کر سیاست مدن، شہری زندگی اور بود و ماند کے متعدد طریقوں کی بھی تعلیم دینی تھی کیونکہ آپ دیکھ رہے تھے اور آپ کو بتایا بھی جا رہا تھا کہ دنیا جب پہلے لگے گی تو اس میں امن قائم رکھنے اور اسے محفوظ بنانے کے لیے نئے طریقوں کی ضرورت پیش آئے گی چنانچہ آپ نے علم عمل کے اعتبار سے اللہ کی مخلوق کو تین طبقات میں تقسیم کیا کہ

آئندہ اسی طریقے پر عمل کیا جائے۔

یہ تین طبقات کا بن، بادشاہ اور رعیت تھے۔ حسب ترتیب ان کے مراتب بھی مقرر فرمائے۔ کائنات نے سب سے پہلا اور بلند درجہ قرار پایا ہے لیے کہ وہ خدا کے تعالیٰ کے سامنے اپنے نفس کے علاوہ بادشاہ اور رعیت کے معاملات میں بھی جوابدہ ہے اور بادشاہ کا دوسرا درجہ قرار پایا۔ اس لیے کہ وہ اپنے نفس اور امور مملکت کے متعلق جوابدہ ہے اور رعیت صرف اپنے نفس ہی کے لیے جوابدہ ہے۔ اس لیے وہ تیسرے طبقے میں شامل ہے لیکن یہ طبقات فرائض کے اعتبار سے تھے نہ کہ لسانی و خاندان کے اعتبارات کے لحاظ سے۔ آپ کے چار مشہور شاگرد تھے۔ آپ نے دنیا کو چار حصوں میں تقسیم کر کے چاروں شاگردوں کو ایک ایک حصے کا بادشاہ مقرر کیا۔ ان بادشاہوں کے نام ایلاؤس، ڈوس، اٹھلیوس اور ڈولامون تھے۔

آپ اس دور اندیشی سے کام کر رہے تھے جسے گمراہ ہونے والے دن اور آنے والے شب و روز آپ پر ظاہر کر دیے گئے ہوں۔ آپ نے ہر فرقے، ہر جماعت سے طلبہ جمع کیے اور ان کو مدنی سیاست اور اس کے اصول و اقوال سکھائے۔ جب یہ طلبہ کامل و ماہر بن کر اپنے قبائل کی طرف لوٹے تو انہوں نے شہر اور بستیوں آباد کیں جن کو مدنی اصولوں پر بنایا۔ ان شہروں کی تعداد کم و بیش دو سو کے قریب تھی جن میں سب سے چھوٹا شہر ”زبا“ تھا (یہ شہر صحیفہ عالم سے مت گیا مگر اس کے کھنڈرات باقی ہیں)

ان طلبہ کو حضرت اور اہل اسلام نے دوسرے علوم کی بھی تعلیم دی جس میں علم و حکمت اور علم نجوم جیسے علوم بھی شامل ہیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے زمین ہی نہیں ستارے، سیارے اور سورج کو بھی آپ کے تابع کر دیا ہو، یہ جان کر اور بھی حیرت ہوتی تھی کہ ایک شخص جو اتنے علوم کا ماہر ہے اس نے یہ تعلیم کسی سے حاصل نہیں کی اور حالت یہ کہ کلمہ سے لے کر مونی سے پہنچ تک ہر چیز کا علم آپ کو ہے۔ دراصل یہ علم مدنی تھا یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ علوم آپ کو ودیعت کیے تھے۔

جلدی ہے

ماخذات: قصص القرآن - قصص الانبیاء - تفسیر القرآن

ڈیرک نے چاقو دیکھا۔ اس کا سامنا زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن وہ بہت آزمودہ اور ڈیرک کا پسندیدہ اوتار تھا جس سے وہ اس سے بے شمار بار کام لے چکا تھا۔ اس نے محبت سے چاقو کو دیکھا اور اسے اپنے چرمی بیگ میں رکھ لیا۔ یہ کسی قدر عجیب و غریب ماحول کا چرمی بیگ تھا جو نیچے سے پھیلا ہوا اور بلاشبہ بہت اعلیٰ دور ہے کا تھا۔ اس کی بک بند کر کے ڈیرک نے آئینے میں اپنا معائنہ کیا۔ اسے کوئی چار سو میل دور ایک دوسرے شہر جانا تھا۔ جہاں اسے اپنے چاقو سے ایک اہم کام لینا تھا اور اس کے اگلے دن اسے واپس آ جانا تھا۔

ڈیرک تقریباً پچیس برس کا ایک سخت اور کھردرے لیتے گزری تھیں۔

سنی نیکیات پر مشتمل پچسپ واقعات

دور حاضر میں مسیحا بھی راہزنوں کے روپ میں دکھائی دینے لگے ہیں۔ نہیں معلوم کب، کون، کس جگہ، کیا روپ دھار لے وہ بھی ایک طوفانی رات کا منظر تھا جب طالب و مطلوب ایک دوسرے کی جان کے درمیان تھے۔ پھر طوفان کی گرج جھلک نے بہت سی چیزیں کو واضح کر دیا۔ جان لیوے والے اچانک ہی دل پار بینہ، سگر کیسے۔ یہی تو ایک واز ہے



ڈیرک تیار ہو کر باہر نکل آیا۔ کار میں روانہ ہونے کے ساتھ ہی اس نے ریڈیو آن کر لیا اور مقامی خبروں کے لیے کوئی موزوں چینل تلاش کرنے لگا۔ ایک چینل سے خبریں نشر ہو رہی تھیں اس نے یہی چینل لگا دیا۔ کچھ دیر بعد اس کے مطلب کی خبر آگئی۔ یہ موسم کا احوال تھا اور یہ سن کر وہ کسی قدر تشویش زدہ ہو گیا کہ اس کے روتے میں شدید طوفانی بارش کا امکان تھا۔ موسم کے تیز تو ابھی سے شراب تھے۔ وہ ہائی وے پر آیا تو موبلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ جس میں سامنے کا منظر دھندلا رہا تھا اور اسے کار کی ہیڈ لائٹس تیز کرنے کے باوجود دس چالیس گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ رفتار کم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ شام کے چھ بج رہے تھے اور جب ایک گھنٹے بعد اندھیرا اچھا جاتا تو صورت حال اور بھی خراب ہو جاتی۔ اس وقت بھی وہ چالیس سے زیادہ کی رفتار سے ڈرائیو نہیں کر رہا تھا۔

ڈیرک جھنجھلائے لگا تھا۔ اس کا صبح تک منزل پر پہنچنا لازمی تھا۔ اگر وہ وقت پر نہیں پہنچ پاتا تو اس کا سفر بے کار جاتا۔ اس کا ارادہ تھا کہ رات کے نصف پہر کے بعد وہ کسی موبل میں رک جائے گا۔ جب اس کی منزل سوسل سے کم فاصلے پر رہ جائے گی اور اگلی صبح وہ تازہ دم ہو کر وہاں پہنچ جائے گا۔ مگر بارش کو دیکھتے ہوئے اس کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ رات آرام کرنے کے لیے کہیں رک سکے گا۔ اس رفتار سے سفر کرتے ہوئے اسے وہاں پہنچنے میں کم سے کم بارہ سے پندرہ گھنٹے لگ جاتے۔ آرام کے بغیر وہ تھک جاتا تو اپنا کام کس طرح کرتا۔ کم سے کم صبح طرح سے انجام نہیں دے سکتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ یہ موقع پھر سے نہیں ملے گا۔ جو اس نے بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا اور وہ اسے کھو نہ چاہتا تھا۔

بارش کی وجہ سے ہائی وے پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے ڈیرک نے تیز ڈرائیو کا خطرہ مول لے لیا۔ پھر بھی اس کی رفتار پچاس میل فی گھنٹے سے اوپر نہیں جا رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد مکمل طور پر تاریکی چھا چکی تھی اور اس میں ڈرائیو کرنا اور بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اوپر سے بارش کی تیزی بڑھ رہی تھی۔ وہ ڈائمنڈ پر پانی جیسے دھار کی طرح گر رہا تھا اور کار کے وہاں ہر شے چلنے کے باوجود اسے صاف کرنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ جب ڈائمنڈ بچے جاتے تو ایک لمحے کو اسکرین یا ٹکڑ دھندلی ہو جاتی تھی اور ڈیرک کو سامنے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے محسوس

کیا کہ اس وقت سامنے سے کوئی دوسری گاڑی آگئی تو حادثے کا بہت زیادہ امکان ہو گا۔ لہذا اس نے بے بسی سے رفتار کم کر دی۔

کار مشکل سے تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہی تھی اور اسی رفتار سے وہ کسی صورت کل صبح دس بجے تک منزل پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ موقع اس کے ہاتھ سے نکلنا جا رہا تھا۔ ڈیرک کو اس شخص کا خیال آیا جس پر اسے اپنا جانے والا تھا۔ شاید اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اس نے حسرت سے اپنے بیک کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے سامنے سے ایک گاڑی نمودار ہوئی اور زن سے اس کے پاس سے گزری۔ وہ تصادم سے بال بال بچا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب اپنی ساری توجہ ڈرائیو پر رکھے گا۔

رات گیارہ بجے وہ کوئی دس سو میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ بارش کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ پانچ گھنٹے کی مسلسل اور اعصاب شکن ڈرائیو نے اسے تھکا دیا تھا اور اب اس نے کچھ دیر آرام کا فیصلہ کیا۔ اسے راستے میں آتے والے کسی ریسٹوران یا کینے کی تلاش تھی جہاں رک کر وہ ایک کپ کافی لینا اور کچھ دیر سنا لیتا۔ لیکن ریسٹوران اسے ملے بارہ بجے ملا۔ یہ ایک چھوٹا سا ریسٹوران تھا جس کے ساتھ گیس مشین اور ایک چھوٹا سا شوروم بھی تھا۔ اس نے کار پارکنگ میں روکی اور اپنے اوپر کوٹ کا کارڈ کر کے ہونے کار سے نکل کر تیزی سے اندر گیس گیا لیکن کوشش کے باوجود وہ اچھا خاصا جھجک گیا تھا۔ اندر آ کر اس نے پانی چھاڑا اور کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ ریسٹوران میں مالک کے علاوہ صرف دو افراد اور تھے۔ ایک کرسی پر بیٹھا خزانے لے رہا تھا اور دوسرا ایئر کی بوتل سامنے رکھے اؤٹ لکھ رہا تھا۔ مالک اسے دیکھ کر متعجب ہو گیا۔

”میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”ایک کپ کافی گرم اور سیاہ۔“ وہ استول پر بیٹھ گیا۔ مالک نے گرمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”کہتر ہوگا تم وہاں کہیں بیٹھ جاؤ۔۔۔ تم تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔“

ڈیرک نے اس کی بات مان لی اور دو واٹر سے اس ایک میز تک پہنچا۔ کچھ دیر بعد ریسٹوران کے مالک نے اس کے سامنے کافی لا کر رکھی۔ ”آج بہت طوفانی بارش ہو رہی ہے۔“

ڈیرک نے سر ہلایا اور کافی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن ریسٹوران کے مالک نے اس کی خاموشی کا کوئی اثر قبول نہیں

کیا وہ بات کرنے کے موڈ میں تھا۔ ”بہت سال بعد میں اس قسم کی بارش دیکھ رہا ہوں۔“

”ہوں۔“ ڈیرک نے ہنکارا بھرا۔

”تم اس موسم میں کہاں جا رہے ہو؟“

اس بار ڈیرک نے سخت نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”کیا ضروری ہے میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں۔“

”کچھ سے زیادہ ڈیرک کی نظروں نے ریسٹوران کے مالک کو سہا دیا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔“ نہیں... میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید تم بات کرنے کے موڈ میں ہو۔“

”میرا ایسا کوئی موڈ نہیں ہے۔“ ڈیرک نے رکھائی سے کہا اور شیشے کے باہر دیکھنے لگا۔ مالک کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ ہائی وے کی طرف تارکی کا راج تھا۔ اچانک ہی اس تارکی سے ایک روشنی نمودار ہوئی اور ایک کار آ کر تیزی سے ڈیرک کی کار کے پاس رکی۔ رکھتے رکھتے بھی اس نے عقب سے ڈیرک کی کار کو گھر مار دی تھی۔ شیشہ ٹھکرنے کی آواز اندر تک آئی تھی۔ ڈیرک بے ساختہ بولا۔ ”لعنت ہو۔“

وہ باہر کی طرف بھاگا۔ تارکی والی کار عقب سے اس کی کار سے ٹکرائی تھی جس نے ایک طرف کی بریک لائن توڑ دی تھی۔ ٹکرائے والی کار سے ایک عورت اتر کر اندر کی طرف لپٹی۔ ڈیرک اسے سمجھ سے دیکھ نہیں سکا تھا۔ اپنے نقصان کا معائنہ کر کے وہ بیٹھا ہوا اندر آیا تو عورت کا دفتر پر ریسٹوران کے مالک سے کھد رہی تھی۔

”پلیز کسی طرح رابطے کی صورت نکالو۔۔۔۔۔ یہ ایئر چنسی ہے۔“

ریسٹوران کے مالک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”فون خراب ہے اور اس موسم میں موبائل کام کہاں کرتا ہے۔“

ڈیرک شیشے میں عورت کے پاس پہنچا اور اسے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھلیا۔ ”تم نے میری کار کا کیا شٹر کیا ہے۔“

عورت تقریباً تیس برس کی تھی۔ دلکش نقوش اور موزوں چہرے کے ساتھ وہ کسی مرد کو متاثر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی لیکن پریشانی نے اس کی بالکشی کو ماند کر دیا تھا۔ پھر ڈیرک کے انداز نے اسے غصہ دلایا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو پھرایا۔ ”دوہرہ بوجھ ہے۔“

”میری کار۔۔۔“ ڈیرک نے کہا چاہا۔

”جہنم میں گئی تمہاری کار۔۔۔ عورت کبہر وہاں سے

آخری پینتیرا

ایک قدیم چینی کہادت ہے کہ لڑائی کے 370 پینتیرے داناؤں نے کتنا ہی ہیں ان میں جو پینتیرا سب سے کارآمد بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بھاگ لو اس کی تصدیق ہندو دیوالا سے بھی ہوئی ہے۔ راون کے دس سرداروں میں ہاتھ سے پھر بھی مارا گیا۔ اس کی ہوجہ جاری سمجھ میں تو نہیں آتی ہے کہ بھاگنے کے لیے صرف دو ٹانگیں تھیں۔

مطابق احمد علی کی ”آب گم“ سے اقتباس محمد تمکین انجمن کھوزہ پبلیکیشنز، سندھ

جائے تھی۔

”تم اس طرح نہیں جاسکتی ہو۔“ ڈیرک اس کے راستے میں آگیا۔

”تم بھی جہنم میں جاؤ۔“ عورت نے کہا اور اچانک اس کے پیٹ میں ٹھٹھا مارا۔ وہ خاصی طاقت ور تھی کیونکہ ضرب کی شدت نے ایک لمحے کے لیے ڈیرک کو مفلوج کر دیا تھا اور وہ اس کا فائدہ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ جب تک ڈیرک خود پر قابو نہ پا تا وہ کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے جا چکی تھی۔ ریسٹوران کا مالک اس کے پاس آیا۔

”مستمر تھیک ہوتا؟“

ڈیرک نے سیدھا ہوتے ہوئے گہری سانس لی اور بولا۔ ”میں تھیک ہوں۔۔۔ اس عورت نے میری کار کو عقب سے ٹکرایا ہے۔ اس کی بریک لائن توڑ دی ہے۔“

”تم پولیس کو رپورٹ کرو۔“ ریسٹوران کے مالک نے مشورہ دیا۔ ”ورنہ آگے سفر میں تم کو بہت مشکل ہو سکتی ہے۔“

لیکن وہ پولیس کو رپورٹ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے وہ رہ کر عورت پر غصہ کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا راستے میں جہاں بھی ٹریفک پولیس نے اس کی کار دیکھی وہ اسے روک کر پوچھ گچھ ضرور کریں گے۔ اگر کوئی اور مسئلہ نہ بھی ہوتا یعنی وہ تاخیر کا شکار نہ ہو جاتا۔ جب کہ بارش نے پہلے ہی اس کے سفر کو مشکل کر دیا تھا۔ اس نے ریسٹوران کے مالک کو بل دیا۔

”میں دیکھوں گا شاید کہیں ورکشاپ مل جائے اور میں لائن تھیک کرالوں۔“

اس نے کافی کی قیمت میز پر رکھی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اسے خوف تھا کہ اس تصادم نے کار کے نظام کو نقصان نہ کیا ہو کہیں وہ اشارت ہونے سے انکار کر دے لیکن کار

پاکیزہ

ماہنامہ

ستمبر 2010ء عیدِ بُہار کی ایک تھک

انجم انصاری اور عالیہ بخاری کے سلسلے وارٹیل

مادی دنیا کی ضرورتوں سے قطع نظر ایک آواز ہماری صداقت و حقیقت کو ہمارے سامنے منظرِ حیات پر ہے۔ کچھ اسی تناظر میں قیصرہ حیات کا ناول

ماضی کے آئینے میں جھلکاتے عکسِ کوہِ کثرت کی دیرِ نہیں بھی منعکس ہونے سے نہیں روک سکتیں..... زندگی کے نشیب و فراز میں اپنی منزل کو بخوشی لڑکی کی کہانی ذکیہ بلگرامی کا دلچسپ ناول

زندگی اک ہیرے کے مانند ہے جسے خورِ اشتیاق ہوتا ہے۔ اقبال بانو کے کچھ ایسے ہی کرداروں کی تلاش و جستجو

محبت انسان کی زندگی میں لمحہ بہ لمحہ تبدیلیاں لاتا ہے۔ انہی تبدیلیوں کے ساتھ غزالہ فرح کا دلچسپ ناول

عید کی خوشیاں اور نگاہِ شائستہ (زین کا پائلٹ سرف)

شیریں حیدر، صائمہ اکرم، عائشہ خان، فزات جیس ضیا، ناہدہ فاطمہ حسنین، آصفہ شفیق، عقبیلہ حق، سائرہ رضا

اور عالیہ حرا کی یادگار تحریروں

آپ کی آواز و گزارشات کے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہِ پاکِ نوبہار میں انکسار نہیں کیا ہے؟

رہی تھیں۔

”کبھی... کوئی نہیں... ہائے“ نوجوان ہلہلایا تھا۔ ڈیرک نے اس کا پیٹ سوچتے والی جگہ سے دبایا تھا۔ ”پلیز میری مدد کرو... روتے میں مر جاؤں گا۔“ ڈیرک نوجوان کی بات سے متعلق تھا۔ وہ موت کے قریب تھا۔ ڈیرک سیدھا ہو گیا۔ اس نے نوجوان سے کہا۔ ”انظرِ کمرو میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ اوپر آیا اور اس نے راہداری میں ایک طرف لنگی برساتی پہن لی۔ اسے باہر جانا تھا۔ برساتی کا پڑا چھوٹا سر پر کر کے اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا باہر سے تند ہوا کے ساتھ پانی کی بو چھاڑی آئی تھی۔ وہ ہوا سے لڑتا ہوا اپنی کار تک آیا۔ اس کا چریک بیک فرنٹ سیٹ پر رکھا تھا۔ اسے نکال کر ڈیرک وہاں آنے لگا۔ دوسری گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے کبھی چکی تو اسے گاڑی کا دائیں بونٹ کسی حادثے کے نتیجے میں پچکا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ دیکھ گیا پھر اس نے ٹارچ نکال کر اس کی روشنی میں بونٹ کا معائنہ کیا اور اس کا ٹک بلیک میں بدل گیا تھا۔ یہ وہی گاڑی تھی جس نے اس کی کار کو چھپے سے ٹکرایا تھا۔ یہ اسی لڑکی کا گھر تھا۔ وہ چری بیک لے کر باہر آیا۔ اتنی دیر میں ہواؤں نے راہداری میں بجلی چھادی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور خانے کی سیڑھیاں اتر کر چلے آیا۔ جہاں نوجوان ٹھہری کی کیفیت میں تھا۔

اس نے فور سے نوجوان کو دیکھا اور اب اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ ڈیرک نے لگ رہا تھا۔ وہ بلیک میں اسے عورت کا بھائی تھا۔ کیونکہ اس کے خدو خال میں اس سے مشابہت آ رہی تھی۔ عورت نے ایک تو اس کی کار کو ٹکرایا تھا اور پھر اس کو بھی ضرب لگا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کی ضرب کا سوچ کر ڈیرک کو پھر غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے بیک پیچہ رکھا اور اسے کھول کر اس میں سے اپنا آزمودہ چاقو نکال لیا۔ نوجوان کی آنکھوں میں چاقو دیکھ کر خوف آ رہا تھا اور جب وہ اس کی طرف بڑھا تو وہ بے ساختہ چیخ اٹھا تھا۔

☆☆☆☆

وہ دوپہر تھی میں دیکھ ہوئی خوف سے کاتب رہی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ خوف ناک شخص اس کا بچپن کرتا ہوا یہاں تک آجائے گا۔ آج کا دن اس کے لیے بہت برا ثابت ہوا تھا۔ لارل کی طبیعت دوپہر سے خراب تھی لیکن اس نے اس پر اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا شہر تھا کہ وہ کیسٹرک

سردی نہیں لگ رہی تھی۔ کافی بڑی کہ وہ راہداری میں آیا۔ میٹر جھپوں کے نیچے سے خانے کے دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اندر سے کوئی آواز آئی تو وہ ٹھٹک گیا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو آواز آئی تھی وہ چیخ کوئی آواز تھی یا اس کا وہم تھا۔ وہ کچھ دیر تک دروازے کے پاس کان لگائے کھڑا رہا تھا اور جب آواز نہیں آئی تو وہاں سے جانے لگا کہ اسی لمحے آواز دوبارہ آئی۔ اس بار اس نے واضح طور پر سنا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی انسان شدید درد سے کمرہ رہا ہو۔ ڈیرک نے دروازہ کھولا۔

”اندھ کون ہے؟“

جواب میں پھر کراہ سنائی دی تھی۔ وہ جو بھی تھا یقیناً کسی بڑی تکلیف میں تھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا بلکہ یہ چابی سے لاک ہونے والا دروازہ تھا۔ ڈیرک نے دو تین بار آواز دی۔ پھر اس نے لیور سے کام لیا۔ وہ خانے کا دروازہ کھولا اور ساتھ ساتھ چاروں طرف دیکھ کر آیا۔ ڈیرک کا اندازہ درست نکلا۔ دروازہ لاک تھا اس میں صرف میٹر تھا اندر باہر کوئی کنڈی نہیں تھی۔ دروازہ کھل جانے کے بعد وہ سیڑھیاں اتر کر چلے آیا۔ ذرا پیچھے آنے پر اسے وہاں بلیک سی روٹی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے ٹارچ بند کر دی۔

”کوئی ہے؟“ اس نے آہستہ سے آواز دی۔

”پلیز میری مدد کرو۔“ ایک مردانہ آواز سے کہا۔ ڈیرک سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا خانہ تھا جہاں ایک طرف صوفے پر ایک نوجوان بٹھا ہوا تھا۔ صوفے کے آس پاس کا پورا فرش الٹوں سے بھرا ہوا تھا اور نوجوان سردیوں میں بھی پیٹے میں شراہو تھا۔ وہاں دیوار پر ایک امیر جمی لائٹ لگی تھی۔ ڈیرک الٹیوں سے جوتا بچاتا نوجوان کے پاس آیا۔ اس نے نوجوان کو دیکھا تو اسے عجیب سا احساس ہوا جیسے اس نے نوجوان کو پہلے ہی دیکھا ہو لیکن کہاں... یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ مشکل سے چپچپ کر رہا تھا۔

”کون ہو تم کیا ہو اسے تمہیں؟“

”میرے... پیٹ میں... درد ہے۔“ نوجوان نے رک رک کر کہا۔ ڈیرک نے اس کی شرٹ اوپر کی اور اس نے فوراً ہی نوجوان کا پیچھے سے پھولا پیٹ دیکھ لیا تھا۔ ”یہاں اندر کون ہے اوپر کی دونوں منزلیں خالی ہی ہیں؟“ اس نے نوجوان سے پوچھا اس دوران میں اس کی انگلیاں نوجوان کا پیٹ نکل

گیا تھا۔ جب دونوں منزلوں میں کوئی نہیں تھا تو پھر اس گھر کے افراد کہاں گئے تھے۔ کیا وہ جرائم پیشہ تھے اور اس کی اس طرح آمد سے پریشان ہو کر کہیں چھپ گئے تھے اور شاید ان کے عزائم بھی اس کے بارے میں اچھے نہیں تھے۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ اس جگہ سے نکل جائے مگر جب اسے طوفان اور بارش یاد آئی تو اس نے خیال جھٹک دیا۔ اس موسم میں باہر جانا مناسب نہیں تھا۔ اب ایک جگہ باقی تھی جہاں کوئی ہوسکتا تھا اور وہی دوپہر تھی۔

چلائی کے دوران میں اس نے جہاں تک مکان اور اس کی چیزیں دیکھی تھیں۔ اسے یہ کام سا گھر لگا تھا۔ یہاں نہ تو اسلحہ تھا اور نہ ہی کوئی اور ایسی چیزیں جو دیکھا جہاں اسلحہ ہوسکتا تھا لیکن وہاں بھی کچھ ایسی چیزیں تھیں۔ آخر اس نے دوپہر سے بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک ہاتھ میں لیور اور دوسرے میں ٹارچ تھا کہ سر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیاں زیادہ مشکل نہیں تھیں اور وہ بنا کسی آہٹ کے دوپہر سے فرش کھلنے والے دروازے تک پہنچ گیا۔

اس نے آہستہ سے ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا تو تختہ اندر سے بند نکلا۔ اندر کوئی تھا اور اس نے تختے کی کنڈی لگا رکھی تھی۔ گویا اس گھر میں جو بھی تھا وہ اسی دوپہر میں تھا۔ ڈیرک کی آنکھ میں آ کر اس کی آمد پر اس طرح دوپہر میں جا چھپے کا کیا جواز ہوسکتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اوپر کتنے لوگ تھے اور وہ صبح تھے یا نہیں تھے۔ وہ ان کو پھینکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے اس نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا اور دوپہر کے تختے کے نیچے کی کنڈی کو بند کر دیا۔ گویا اب اوپر سے کوئی نیچے نہیں آسکتا تھا۔ وہ اسی طرح دبے قدموں نیچے اترتا اور پھر چلی منزل پر آ گیا۔ اسے پاس لگ رہی تھی۔ علاقے کی لائٹ بند تھی لیکن کچھ دیر کے فاصلے میں موجود پانی کی بونٹ سرد تھی۔ پانی کی کراس نے ٹارچ کی روشنی میں جگہ کا معائنہ کیا۔ وہاں کھائے پینے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن اس کا کچھ کھانے کا مواد نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یہاں میں اتنی دیر رہنا چاہتا تھا کہ بارش ٹپکی ہو جائے۔

باہر بارش کا شور ویسے ہی جاری تھا۔ پانی پانی کراس نے اپنا کوٹ اتار دیا۔ اس کے کپڑے کسی قدر خشک ہو چکے تھے۔ اس نے چھلے پر پانی کے لیے پانی رکھ دیا اور پھر کافی تلاش کی۔ وہ اسے سامنے ایک کینٹ میں مل گئی، ساتھ میں شکر اور کریم بھی تھی۔ مگر اس نے صرف کافی لی۔ گرم کافی نے اسے گرم کر دیا تھا اور اب اسے ہلکے کپڑوں کے باوجود اتنی

خاصی دیر بعد وہ چنگی اور اس کی چھٹی س نے بتایا کہ وہ شخص اب یہاں نہیں ہے۔ شاید وہ نیچے جا چکا تھا۔ لیکن وہ اسے چھوڑ کر نیچے کیوں گیا تھا۔ رہنا نہ بہت آہستگی سے تختے کی کنڈی کھدائی اور بہت ہی آہستہ سے تختہ اٹھانے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا کہ اس شخص نے تختے کی باہر والی کنڈی لگا دی تھی۔ اس لیے اسے لاریل کا خیال آیا اور وہ ٹپ اٹھی۔ کڑخت صورت والا اسے یہاں بند کر کے پہلے لاریل سے منسلک کیا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ آرام سے اس کے ساتھ جو جائے کر سکتا تھا۔ اس دیران جگہ پر ان کی فریاد سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ان کا قریب ترین پڑوسی بھی کوئی نصف میل کے فاصلے پر رہتا تھا۔

رہنا نے بارج جلائی اور دو چھتی میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگی جس سے تختے کے باہر کی کنڈی کھولی یا توڑی جاسکے۔ لیکن دو چھتی کے کھانڈ خانے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ دھات کی چند چیزیں بھی تھیں لیکن وہ ہلکی اور ساخت میں ایسی تھیں کہ ان سے تختے پر ضرب نہیں لگائی جاسکتی تھی۔

اجانک اسے خیال آیا کہ تختہ اور نیچے کی کنڈی معمولی سی تھی اور وہ اس پر چڑھ کر اٹھتی تو اس کا امکان تھا کہ تختہ یا کنڈی ٹوٹ جائے۔ اس نے تختے پر چڑھ کر اس کا تجربہ کیا۔ اس کے وزن سے تختہ دبے اور چرچا لگے۔ وہ اچھلی تو تختہ اس طرح دبا کہ وہ ڈر کر اٹھی۔ اگر تختہ ٹوٹ جاتا تو وہ نیچے جا گرتی۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو کر تختے پر پاؤں مارنے لگی مگر اس طرح تختہ ہلا بھی نہیں تھا۔ اسے توڑنے کے لیے بوجھ لازمی تھا۔ مجبوراً وہ تختے پر کھڑے ہو کر اچھلنے لگی۔ یہ کوشش جلد رنگ لائی اور تختہ کنڈی سے ڈھیرا ہو کر جھوٹے لگا۔ جب وہ ٹوٹنے کے قریب ہو گیا تو رینا ایک طرف ہو کر اسے پاؤں سے مار کر کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک بار اس نے زیادہ ہی زور سے پاؤں مارا تو تختہ یک دم ٹپک گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور اگر اس نے لکڑی کی ٹکی کا سہارا نہ لے رکھا ہوتا تو وہ نیچے جا گرتی۔

سنبھل کر وہ نیچے آئی۔ اس نے بارج اٹھا لی لیکن اسے روشن نہیں کیا تھا۔ یہ اس کا گھر تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کوئی چیز کہاں ہے۔ وہ تاریکی میں نیچے آئی۔ کچھ دیر سن گئی تھی۔ نیچے آنے کے بعد اس کا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ شخص یہیں نہیں چھپا ہے اور ابھی تاریکی سے نکل اسے دیوچ لے گا۔ لیکن کچھ دیر تک اوپر والی منزل پر پھرنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ وہ

یہاں نہیں ہے۔

رینا وہ قدموں نیچے آئی۔ یہاں بھی سنا تھا۔ پھر بجلی چمکی تو اس نے نہ خانے کا کھلا دروازہ دیکھ لیا۔ اس کا دل ایک لمحے کو رک گیا۔ اس شخص نے اس کے بھائی کو تلاش کر لیا تھا اور نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا۔ رہنا نے کچن میں جا کر پہلے ہتھیار کے طور پر ایک تیز چاقو اٹھا لیکن جب اس نے سوچا کہ کیا وہ یہ چاقو کسی انسان کے جسم میں اتار سکے گی تو یہ سوچ کر اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس نے چاقو رکھ دیا اور اسٹیل کا ایک وزنی کلکیر اٹھا لیا۔

وہ نہ خانے تک آئی تو اسے پیچھے روشنی کا احساس ہوا۔ اسے یاد آیا کہ نیچے ایک ایمر چھٹی لائٹ تھی اور یہ اسی کی روشنی تھی۔ وہ پیچھٹوں سے سنبھل کر اترنے لگی۔ اس کا دل کبر ہوا تھا کہ وہ شخص نہ خانے میں موجود ہے اور وہ کوئی آہٹ پیدا کر کے اسے چوڑا کر نہیں جاسکتی تھی۔ وہ بہت آہستہ سے نیچے آئی۔ کلکیر اس نے حملے کے انداز میں اٹھا رکھی تھی۔ جب نہ خانہ اس کی نظروں میں آیا تو اس نے لاریل کو کھونٹے پر آنکھیں بند کیے ساکت پڑے دیکھا اور اس کے پیٹ والے حصے پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ اس کی شرٹ اور پتلون پر بھی خون لگ گیا تھا اور صوفی بھی کسی قدر خون آلودہ ہو رہا تھا۔ رہنا نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ کی گئی۔

پھر اس نے کڑخت صورت والے کو دیکھا جو ایک طرف ایک چھوٹا سا چاقو صاف کر رہا تھا اور اس پر خون لگے ہوا تھا۔ بات صاف تھی اس درندے نے اس کے بھائی کو چاقو سے قتل کر دیا تھا۔ حالانکہ لاریل نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ رہنا پاگل ہو گئی۔ اس دنیا میں اس کا ایک ہی تو دشمن دار تھا اور اس ظالم نے اسے بھی چھین لیا تھا۔ جوش انتقام میں وہ کڑخت صورت والے کی طرف چمکی اور اس سے پیسے کہ وہ ہوشیار ہوتا رہنا۔ کلکیر گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس ضرب میں اس نے ساری قوت سودی گئی۔ اس لیے ڈیرک سر پر ضرب لگنے ہی بے ہوش ہو کر پڑ گیا۔ رہنا نے اسے جھک کر دیکھا اور بے ہوش پا کر نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

”ڈیکل شخص۔“

اس دار نے رہنا کے دل کی آگ بدم تو کر دی تھی لیکن بھائی نہیں تھی۔ اس شخص نے اس کے بھائی کو مارا تھا۔ اس لیے انصاف کا تقاضا تھا کہ وہ بھی اسے مار دے۔ اس نے کلکیر بلند کی اور اس بار وہ کھڑا ہوا وار کرنے جا رہی تھی

لیکن اس سے پہلے کہ وہ وار کرتی اسے لاریل کی ٹھٹھ سی آواز آئی۔

”رینا رنگ جا۔ تم نے یہ کیا کیا؟“

☆☆☆

سر پر لگنے والی ضرب نے ڈیرک کے چاروں طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے یہ جانتے کا سوچ بھی نہیں ملا کہ یہ بلائے ناگہانی اس پر کہاں سے نازل ہوئی تھی۔ وہ شاید تین چار گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ کیونکہ جب اس کی آنکھ کھلی تو بارش کا شور بدستور جاری تھا اور ابھی رات ہو رہی تھی۔ البتہ یہ تھا کہ وہ ایک صاف ستھرے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔ سر میں درد بھی کم تھا۔ وہ گراہ کر اٹھا۔ اس کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور شاید اسے یہاں بند کر دیا گیا تھا لیکن جب اس نے دروازہ چپک کیا تو اسے کھلا پایا۔ وہ قید نہیں تھا۔

وہ باہر جانے کا سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور رہنا اندر آ گئی۔ اسے دروازے کے سامنے دیکھ کر وہ کی قدر ہو کھلا گئی تھی۔ اس کے خیال میں وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ رہنا نے بڑی بے رحمی سے اس کے سر پر وار کیا تھا اور اگر لاریل اسے نہ روکتا تو وہ اسے مار ہی دیتی۔ اب وہ شرمندہ تھی۔ اس نے عداوت سے کہا۔

”سواری میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا۔“

”اوہ تو یہ تم گھبرا۔“ ڈیرک نے گہری سانس لی۔ ”میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ آفت جا چکا کہاں سے نازل ہوئی۔“ رہنا اسے نشست گاہ میں لے آئی اور پھر اس کے لیے کافی بنا کر لائی۔ ”اب تمہارا سر کا درد کیسا ہے؟“ میں نے زیادہ ہی زور سے وار کر دیا تھا۔

”ہاں وار تو سخت تھا لیکن درد اتنا نہیں ہے۔“

کافی نے رہی کسی تکلیف بھی کم کر دی تھی اور اب وہ محسوس بھی نہیں کر رہا تھا۔ جب تک وہ کافی لیٹا رہا، رہنا نے اسے بتایا کہ اسے کیا غلط ہوئی تھی۔ وہ جہاں۔ ”تم سمجھ رہی تھیں کہ میں نے تمہارے بھائی کو قتل کر دیا ہے؟“

رہنا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس وقت میں یہی سمجھتی تھی کہ تم نے لاریل کو میرے انتقام میں قتل کر دیا ہے۔“

”حالانکہ میں نے تو اس کی جان بچائی تھی۔ یقین کرو اگر میں ایک دو منٹ اور اس کا آپریشن نہ کرتا تو اس کا اچھٹا کس پھٹ جاتا اور اب تک وہ مر چکا ہوتا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ رہنا نے سر ہلایا۔ ”جب لاریل نے مجھے روکا جب اس نے بتایا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ کیا

کیا ہے۔“

”تمہارے بھائی کی خوش قسمتی ہے کہ میں سرجن ہوں اور اتفاق سے یہاں آ گیا۔“

رہنا نے اسے تعجب سے دیکھا۔ ”تو تم میرا تعاقب کرتے ہوئے نہیں آتے تھے؟“

”نہیں مجھے تمہارا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت تھی اور میں تو طوفان سے بچاؤ لینے کے لیے یہاں آیا تھا۔“

رہنا پھر شرمندہ ہو گئی۔ ”میں بھی کہ تم مجھ سے انتقام لینے کے لیے یہاں آئے ہو اور اسی وجہ سے میں نے لاریل کے نہ خانے میں چھپا دیا اور خود وہ چھتی میں چھپ گئی تھی۔“

”ایسا نہ کیے کی وجہ؟“

رہنا نے پچھلے جواب دیا۔ ”وہ تم قتل سے بالکل بھی کوئی ڈاکٹر سرجن نظر نہیں آتے ہو۔“

ڈیرک نے گہری سانس لی۔ ”میں اپنی اس صورت کا کیا کروں اس کی وجہ سے مجھے لوگ ہمیشہ ہی غلط سمجھتے ہیں۔“

خبر چھوڑ داس بات کو لاریل کیسا ہے؟

”ٹھیک ہے۔ میں نے تمہارے بیک سے نیند کا انجکشن نکال کر اسے لگا دیا تھا۔“

”وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن کل اسے اسپتال لے جا کر اس کے زخم کی صفائی ضرور کرانی ہے۔“

”تو کیا تم طے جاؤ گے؟“

”ہاں صبح مجھے ایک اہم آپریشن میں حصہ لینا ہے۔“ ڈیرک نے اسے بتایا۔ ”یہاں سے کوئی دوسو میل دور ایک شہر میں۔“

”اس موسم میں تم اتنی جلدی وہاں نہیں جاسکتے ہو۔“ رہنا پوئی۔ ”تو یہ بھی صبح ہونے والی ہے۔“

پہنچ رہے تھے اور آپریشن کا آغاز دس بجے ہونا تھا۔ وہ واقعی اتنی جلدی نہیں جاسکتا تھا۔ رہنا سے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ”پلیز رک جاؤ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

ڈیرک نے سوچا کہ واقعی ان لوگوں کو اس کی مدد کی زیادہ ضرورت ہے آپریشن تو اس کے بغیر بھی ہو سکتا تھا۔ پھر یہاں رہنا بھی حسین عورت بھی تھی اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور سر اثبات میں ہلادیا۔

”او کے میں رک رہا ہوں۔“

اس کی بات سن کر رہنا کے چہرے پر جو روشنی آئی تھی اس نے ڈیرک کی سونی زندگی میں وہی اجالا کر دیا تھا۔

☆



www.gest.com

روشنی

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ درقہ شخصیت کا حامل انسان..... بعض اوقات خود کو بھی سمجھ نہیں پاتا کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے..... اور پھر حیوان ناطق ہونے کے باعث مٹی کا یہ پتلا زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر بس اچانک ہی حیوانیت کا مظاہرہ بھی کر ڈالتا ہے۔ جس کے بعد تمام عمر اپنے اس روپ پر پردے ڈالنے کی کوشش میں یہ شمار خوبصورت لمحات کو..... اندیشوں کی آگ میں جلا دیتا ہے..... وہ بھی بڑے ستھرے انداز میں زندگی کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھا مگر پھر اچانک ایک طوفانی لہر نے اس کی زندگی کو تہ و بالا کر ڈالا اور اب وہ زندگی کے اس مقام پر تھا کہڑا تھا جہاں کئی تاریک لمحات بیتے دنوں کے نوحے سنا رہے تھے..... جہاں محبت وحشتوں کے درمیان لہو لہان ہانپ رہی تھی اور..... ایسا تو ایک دن ہونا ہی تھا کہ قدرت نے کب اپنے باغیوں کو معاف کیا ہے۔

تیرگی کی جانب محسوس روشنی کی چوڑی کا دیے والی حیرانگیر واد

وہ اگر اس اسٹیشن پر غور نہ کرتی ہوتی تو اسے یقین ہی نہ آتا کہ شہرین یہاں رک بھی سکتی ہے اور انہیں اتار کر آگے جا بھی سکتی ہے۔ چاروں طرف پہاڑ کھڑے تھے۔ پلیٹ فارم پر کڑی کی دو پٹیاں بڑی تھیں۔ دور ایک بوڑھا آدمی جانی ہوئی ٹرین کو پھری جھنڈی دکھا رہا تھا اور ٹرین اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک پہاڑی سرگ میں غائب ہو گئی تھی۔

”تم تو کہہ رہے تھے وہ بڑا پر فضا مقام ہے جہاں تم مجھے لے جا رہے ہو۔“ اس عورت نے اپنے شوہر سے کہا۔
”ابھی تو تم اسٹیشن پر اتری ہو۔“ جیسے میں جا کر دیکھو گی تو خود کہو گی، کیا پر فضا جگہ ہے۔“

”یہاں انسان بستے ہیں یا ہم پہلے ہیں جو یہاں آئے ہیں؟“

”ایسی باتیں کرتی ہو، لاکھ بڑھلا لاکھ آبادی کا شہر ہے۔“
”میں تو یہ سوچ رہی ہوں، اتنی بڑی ٹرین کیا صرف ہمیں اتارنے یہاں تک آئی تھی اور اگر بھی جانا پڑا تو لینے بھی آئے گی یا نہیں۔“

”مذاق چھوڑو، تم سامان کے پاس بیٹھو، میں کسی آدمی کو دیکھتا ہوں جو ہمیں ہستی تک پہنچا دے یا کوئی سواری مل جائے۔“ فرائز کا خیال رکھنا۔ یہ ادھر ادھر نہ ہو جائے۔

”ماں یہاں بہت بھیر ہے، ہر جگہ ہر جگہ ہر جگہ۔“
”پڑی پر بیکل رہا ہے، آپ ہی آجائے گا۔ آپ جا سکیں اور کسی سواری کا بندوبست کریں، مجھے تو یہاں ہول اٹھ رہے ہیں۔“
”اسے ریل کی پٹری سے بلاؤ، کوئی ٹرین آئی تو؟“

”ہی تو ہے۔“
”بلاؤ لوں گی ایازہ، تم تو جاؤ، کس مصیبت میں پھنس گئی۔“

ایازہ کی عمر تیس تیس سال ہو گئی، وہ یہاں سے پینتالیس سال پہلے ایک شہر کیلاش پور میں اسکول ماسٹر تھا، مگر ہندوئی آمدنی تھی اور اسے آمدنی بڑھانے کی فکر ہر وقت تھی رہتی تھی۔ شہر میں قابل استادوں کی کمی تھی لہذا اسے ٹیوشن بھی زیادہ نہیں ملتی تھی۔ انہی دنوں اسے معلوم ہوا کہ ”قصبہ پہاڑی“ میں حکومت نے ایک شاندار ہائی اسکول قائم کیا ہے۔ پرنسپل تنخواہیں دے کر اساتذہ کو اس اسکول میں بڑھانے پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔ رہائش مفت ہے۔ وہ خوش ہو گیا۔ اس نے سوچا، مکان کا کرایہ دینے سے بھی بچ جائے گا جو اس چھوٹی سی تنخواہ میں اسے دینا پڑ رہا تھا۔ تنخواہ بھی تقریباً دوگنی ہو جائے گی۔ چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں اخراجات بھی کم ہوں گے۔ پوری تنخواہ صاف بچ جائے گی۔ اس نے پہلی فرصت

میں مجھے کو در خواست دے دی کہ وہ قصبہ پہاڑی جانے کے لیے خود کو پیش کرنے کا خواہش مند ہے۔ ایک ہفتہ بھی نہیں گزر تھا کہ اس کی درخواست قبول ہو گئی۔

اس کی بیوی عمرانہ کو اب تک کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایازہ ہر کی باتیں گھر میں بتانے کا قائل بھی نہیں تھا لیکن اب تو بتانا لازمی تھا۔ اس نے نہ صرف یہ خبر سنا لی بلکہ فخر سے سنا لی۔

اس نے بیوی کا مطالبہ پورا کر دیا تھا۔ وہ ہوش بختی رہتی تھی کہ یہاں پڑے رہو گے تو بھی ترقی نہیں کرو گے۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ یہاں سے نکلو، ہاتھ پاؤں مارو۔ مکان تک تو اپنا ہے نہیں۔ کم از کم مکان ہی اپنا کرو۔ عمرانہ نے بھی اس خبر کو بڑے اشتیاق سے سنا لیکن فوراً ہی اداس بھی ہو گئی۔ ایک تو

اس لیے کہ اس کا شوہر اسے جہاں لے جا رہا تھا، وہ کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ ”قصبہ پہاڑی“ کا وہ نام ہی پہلی مرتبہ سن رہی تھی اور دوسرے اس لیے کہ اس کے بچے کے جو دو چار گھر تھے وہ چھوٹے رہے تھے۔ ماں باپ تو دنیا میں تھے ہی نہیں جو دو چار۔

رشتہ دار تھے۔ ان سے بھی دور جانا پڑ رہا تھا۔ اس کی اداسی اپنی جگہ لیکن اس کا شوہر اسے جہاں لے جا رہا تھا اسے جانتا تو تھا۔ ایازہ نے اسے راضی کرنے کے لیے اس قصبے کی تصویر کشی اس طرح کی کہ اس کی اداسی خوشی میں بدل گئی۔

”چھوٹی سی جگہ ہے لیکن انہی تین جیسے جنت کا ٹکڑا زمین پر اتار آیا ہو۔ شام کے وقت صاف ستری سڑکیں ہر گولگ تفریح کے لیے اس طرح نکلتے ہیں جیسے پھولوں نے اپنا کچھ چٹنا شروع کر دیا ہو۔ محل کھائی سڑکیں اپنے سفر نوں کو پہاڑوں پر لے کر جاتی ہیں اور پھر چکر کاٹ کر نیچے اتر آتی ہیں۔ سڑکوں کی دونوں جانب سرد کے درخت ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے رہتے ہیں۔ رات آتی ہے تو پورے قصبے پر کھنکھار کر دیتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے آسمان آتش بازی کے ٹار پھوٹ رہا ہو۔

وہاں بسے پھول ہیں کہ کتنی خوشبو ہر وقت پھیلی رہتی ہے۔ تم نے کبھی پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کی ہے؟“

”میں نے تو پہاڑ بس فلموں میں دیکھے ہیں۔ چڑھتی کہاں سے۔“
”وہاں میں تمہیں پہاڑ کے اوپر لے کر جاؤں گا۔ اوپر سے دیکھنا پوری دنیا نظر آئے گی اور ہمارا بیٹا پہاڑی لڑکپوں کے ساتھ کھیلے گا۔“

”آپ نے تو ایسا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ جی چاہتا ہے کل ہی چلی جاؤں۔“
”کل ہی سمجھو چار دن بعد تو پلے ہی جاؤ۔ میں تمے مالک مکان سے کہہ دیا ہے۔ بھاری سامان سب بچ رہا

ہوں وہاں جا کر نیا خرید لیں گے۔ بس تم کپڑے اور تھوڑے سے برتن وغیرہ سمیٹ لو۔ میری کمائیاں ہیں وہ بھی ساتھ جا سکیں گی۔“

”فرائز بھی ریل میں نہیں بیٹھا۔ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔“ عمرانہ نے کہا۔

عمرانہ ایسے ہی کئی دھنوں کے خواب لے کر یہاں آئی تھی اور اب سناٹا پلیٹ فارم پر اس طرح سامان کے پاس بیٹھتی تھی جیسے مالک مکان نے سامان یا ہر چھیک کر دروازہ بند کر لیا ہو۔ اس کا بیٹا فرائز ابھی تک ٹرین کی پٹری پر کھڑا پتھر اچھال رہا تھا۔

عمرانہ نے دیکھا کہ وہی بوڑھا آدمی جو کچھ دیر پہلے ٹرین کو پھری جھنڈی دکھا رہا تھا، اس کی طرف آ رہا ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ آدمی ریل کے ملازم ہے اور پھر بوڑھا بھی ہے۔ اس کے باپ کی جگہ ہے لیکن پھر بھی وہ خوف زدہ ہو گئی اور گھبرا کر فرائز کو آواز دینے لگی۔

”بیٹی، کیا بات ہے۔ اکیلی آئی ہو، تمہارے ساتھ کوئی مر نہیں ہے؟“

”ہے۔ ہے کیوں نہیں۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ سواری کا بندوبست کرتے گئے ہیں۔“

”اور بچہ؟“
”میرا بیٹا ہے۔ وہاں خرابی ہے، اس وقت بھی دیکھیے پتھر اچھال رہا ہے۔“ اس نے کہا اور فرائز کو ایک مرتبہ پھر آواز دیں گے۔

”اسے واپس بلا لیجئے اور اپنے پاس بٹھائیے۔ میں اسی کو دیکھ کر آیا ہوں۔“ ابھی ٹرین آنے والی ہے۔
”کوئی اور مر نہیں بھی آئی ہے یہاں؟“

”چوبیس گھنٹوں میں دو مرتبہ آئی ہیں۔ ایک وہ جو آپ کو چھوڑ کر گئی ہے دوسری وہ جو یہاں کے مسافروں کو لے کر جائے گی۔“
”یہاں تو کوئی مسافر ہے ہی نہیں۔“

”مسافر ہونہ ہوڑیں کو تو آتا ہے۔ ایک منٹ گئے لیے ٹھہرے گی پھر آگے بڑھ جائے گی کیلاش پور جانے کے لیے۔ آپ نے اپنے بچے کو نہیں چاہا یا مر نہیں آئے والی ہے۔“
”وہ میرے کہنے سے نہیں آئے گا۔ زرا آپ اسے ڈانٹ کر میرے پاس بھیج دیں۔“ عمرانہ نے کہا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی، اسے ایازہ یاد کھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جو یقیناً سامان اٹھانے اس کے ساتھ آیا تھا۔ فرائز نے بھی باپ کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا لہذا وہ بھی دوڑتا

ہوا آگیا۔

مزور نے سامان اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔ ایازہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ عمرانہ اور فرائز چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ یہ بہت چھوٹا پلیٹ فارم تھا۔ چند قدم چل کر ہی اسٹیشن سے باہر نکلے گا دروازہ آگیا تھا جہاں ایک آدمی دروازے سے باہر جانے والوں سے ٹکٹ طلب کر رہا تھا۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی تاکہ تیار کھڑا

تھا۔ مزور نے سامان تانگے پر رکھ دیا۔ اس سامان کے درمیان جگہ بنا کر عمرانہ کو بٹھا دیا گیا۔ ایازہ اور فرائز آگے تانگے والے کے پاس بیٹھ گئے۔ تاکہ کچھ دیر کھلی سڑک پر چلتا رہا پھر دو پہاڑوں کے درمیان ایک دروازہ سامنا ہوا تھا، تاکہ اس دروازے میں داخل ہوا۔ یہ گویا شہر میں داخل ہونے کا

دروازہ تھا کیونکہ اب تاکہ ایک بازار سے گزر رہا تھا۔ یہ دیا بازار میں تھا جیسا وہ کیلاش پور میں دیکھ چکی تھی۔ کچھ کمین نما دکھائی دے رہے تھے، بہت سے ٹیبلے والے کھڑے تھے جن پر تازہ سبزیاں، پھل اور مختلف قسم کا سامان فروخت ہو رہا تھا۔ چلتے بھرتے گا کوں کے پاس اس اور منہ قطع اس سے گفتگو بھی جو وہ

کیلاش پور میں دیکھتی رہی تھی۔ اسے سب اچھا تو لگ رہا تھا کیونکہ ایک نئی دنیا کا احساس ہو رہا تھا لیکن موج رہی تھی کہ ایازہ نے جانش کھینچا تھا۔ شہر دیکھا تو نہیں ہے۔ چاروں طرف پہاڑ تو نظر آ رہے ہیں لیکن کوئی سڑک پہاڑوں کی طرف جاتی تو نظر نہیں آ رہی ہے۔ پھولوں کی منہ بھی نہیں ہے۔ پھر اس نے سوچا لیکن ہے یہ سب شام کے وقت ہوتا ہو، رات آئے گی تو میں بکنوں کی بیخار بھی دیکھوں گی۔ آسمان کس طرح آتش بازی کے انار چھوڑتا ہے۔

تاکہ ایک بڑی سی عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گیا تھا۔ عمرانہ نے اس جگہ کی غارت کو دیکھا اور خوش ہو گئی۔ اللہ نے آخر میری سہیلی۔ ایازہ کو کتنا بڑا گھر ملا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ تانگے سے اتر بھی چکی ہوتی لیکن اس وقت تو وہ سامان میں چھٹی بیٹھی تھی۔ سامان اترتا تو وہ اترتی، اتنی دیر میں ایازہ آگے سے کوڑ کچھ آچکا تھا۔

”سامان تو اتار دو، میں اتروں کیسے؟“
”ابھی تمہیں نہیں اترنا ہے، بیٹھی رہو، میں اندر سے ہو کر آتا ہوں۔“ فرائز کے بیٹھے خیال رکھنا۔

عمرانہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ یہ کون سا طریقہ ہے۔ نئے گھر میں سب سے پہلے مجھے لے کر جانا چاہیے تھا۔ اماں ابھی جس عورت کے قدموں میں برکت ہوتی ہے۔ وہ ایک تکلف وہ انتظار کر رہی تھی اور تصویر ہی تصور

میں اتنی بڑی عمارت کے کمرے گن رہی تھی۔ ہم اچھے کمرے کا کیا کریں گے۔ سامان بھی بہت چاہیے ہوگا۔ میں فکر کیوں کروں ایاز خود انتظام کریں گے۔ میرا کام تو بس یہ ہوگا کہ اسے بڑے گراؤڈ میں یہ جو چیز پودے لگے ہوئے ہیں ان کی دیکھ بھال کرتی رہوں۔ نہ بابا اتنے بڑے باغیچے کی دیکھ بھال مجھ سے نہیں ہوگی۔ میں تو ایاز سے کہوں گی، اس کے لیے کوئی مالی رکھ لے جیسے کیلاش پور میں بڑی کوئی دلی نے مالی رکھا ہوا تھا۔ جب ادھر سے گزرو وہ چچی سے پودے تراش رہا تھا۔ اب میں بھی کوئی دلی ہوں۔ ایک چھوڑ دو دلی رکھوں گی۔ فراز کو سائیکل دلا دوں گی کیلاش پور میں تو اس لیے نہیں ولائی تھی کہ سڑک پر لے کر نکل جائے گا۔ یہاں تو جب تک ہی جگہ ہے۔ بڑا چھانک بند کروں پھر کوئی اندر جا سکتا ہے تو کوئی باہر آ سکتا ہے۔

اس کی نظریں مستقل اس عمارت پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے دور سے ایاز آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جو سائیکل لیے پیدل چل رہا تھا۔ ایاز کو ملازمت کی طرف سے تو کبھی تو لا ہوگا۔ یہ شاید وہی ہے مگر یہ سائیکل پر کیوں ہے۔ ادھر مجھے کیا۔ جب آنے کا تو خود ہی پتا چل جائے گا۔

ایاز آیا اس نے تانگے والے سے کچھ کہا اور ہاتھ کاٹھیل پر۔ عمران کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ سائیکل والا آدمی اپنی سائیکل پر آگے کے پیلر رہا تھا۔ عمران کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہوا کیا اور اب ایاز اسے کہاں لے جا رہا ہے۔ ایاز تو بس ایسے ہی ہیں۔ کہہ دیا ہوگا کہ اتنا بڑا گھر لے کر ہم کیا کریں گے۔ تین ہی تو آدمی ہیں۔ شاید اب دوسرا گھر دیکھنے جا رہے ہیں۔ پتا نہیں دوسرا گھر اتنا بڑا ہو کہ نہ ہو۔ چلو میں دو نہیں تو ایک مالی رکھ لوں گی۔

تا نگا اب اسی بازار سے گزر رہا تھا جہاں سے وہ ہو کر آئی تھی۔ پھر اس نے دیکھا بازار ختم ہو گیا ہے اور گھروں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ گھر اسے بڑے اچھے لگے۔ چھوٹے تھے لیکن سب دو منزلہ تھے۔ ہر گھر کے آگے چھوٹا سا گارڈن بھی تھا۔

ان کا ٹاٹا ایک ایسے ہی مکان کے سامنے جا کر روک گیا۔ اس نے دیکھا وہ آدمی جو سائیکل پر تانگے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، آدھے قدم سے جھکا ہوا اسے میں جانی لگا رہا ہے۔ تو یہ ہے وہ مکان جہاں نہیں رہتا ہوگا۔ وہ مکان اچھا خاصا تھا ایاز نے بے کار چھوڑ دیا۔ پوچھوں گی تو ضرور۔

”میں نہ ماضی کا ہے مجھے بتا دیا تھا کہ آپ آنے

والے چن لیا میں نے کل ہی صفائی وغیرہ کرادی تھی۔ آپ کو کچھ کرتا نہیں پڑے گا۔“ سائیکل والے آدمی نے کہا جو یقیناً اسکول کا چچا ہی تھا۔

”عبدالرحمن مجھے دو چار دن تمہاری ضرورت پڑے گی۔ کیونکہ میں اس قصبے میں بالکل نیا ہوں۔“ ایاز نے ایک نوٹ اس کی منجھی میں رکھتے ہوئے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی صاحب۔ میں کل صبح آ جاؤں گا۔ پورا قصبہ گھملاؤں گا۔“

”ہاں کل آ جاؤ۔ کل میری چمنی ہے، مجھے تو اسکول پر سوں سے جواکن کرنا ہے۔“

تانگے والے نے سامان اٹھا کر اندر پہنچا دیا۔ عمران اور فراز پہلے ہی اندر چلے گئے تھے۔ عمران گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا گراؤڈ تھا جس میں دو کمرے بیچھے تھے اور ایک کمرہ اوپر کی منزل پر بنا ہوا تھا۔ عمران کا دل بھگ گیا۔ یہ مکان تقریباً آٹھ بیڑا تھا۔ چھتہ دیکھا اس پور میں چھوڑ کر آئی تھی البتہ یہ دیکھ کر اس کا دل خوش ہو گیا کہ مکان بالکل نیا ہے اور کمرے میں ضروری فرنیچر بھی موجود ہے۔

ایاز تانگے والے کو ٹھانڈے کرنے کے بعد گھر میں آیا تو عمران اس کے کمرے میں کھڑی ہوئی۔ ”اتنا بڑا مکان چھوڑ کر یہ چھوٹا سا مکان لے لیا۔ کبھی تم نے کوئی عقل مندی کی بات کی ہے۔“

”کون سا بڑا مکان؟ کس مکان کی بات کر رہی ہو۔“

”وہی جہاں پہلے گا گھر تھا۔“

”وہ مکان نہیں تھا۔ وہ تو اسکول تھا جہاں مجھے پڑھانا ہے۔“ ایاز نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہی تو میں سوچ رہی تھی۔ تم معمولی سے اسکول منچر ہو جنہیں اتنا بڑا مکان کس لیے لیا۔“

”اللہ کا شکر ادا کرو۔ مکان چھوٹا ہے لیکن یہ دیکھو ہے کتنا شاندار۔ اوپر کا کمرہ انہی اچھے لکھنے پڑھنے کے لیے بنا لوں گا۔ ہماری ضرورت کے لیے کافی ہے۔“ اس نے بوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے فراز سے پوچھا۔

”ہاں بیٹا، تمہیں یہ گھر کیسا لگا؟“

”ابو بہت اچھا لگا ہے۔ کیلاش پور میں تو اوپر کمرہ بھی نہیں بنا ہوا تھا۔ اس میں کمرہ بھی ہے۔ چھت سے نیچے بھانڈوں برابر والوں کا گھر بھی نظر آتا ہے۔ وہاں ایک بڑی بیاری سی بچی ہے۔ انہی گھیت کہہ کر کہا جاتا ہے۔ جب ہمیں یہاں رہنے ہوئے بہت دن ہو جائیں گے اور ان لوگوں سے ہماری دوستی ہو جائے گی تو میں اس کے ساتھ گھسٹا کروں گا۔“

”بڑی بات، چھت سے کسی کے گھر میں نہیں جھانکتے۔“ ایاز نے کہا۔ ”دیکھ رہی ہوں اپنے صاحب زادے کو۔ ابھی یہ مشکل آٹھ سال کے ہوئے ہیں اور پڑوس میں تا جھانکنا شروع کر دی۔“

”بیٹا کس کا ہے۔“

”تمہارا ہے اور کس کا ہے۔“

”میں سمجھا اس کا ہے جو پڑوس میں تاک جھانک کرتا ہے۔“

”تم نے یہ گھر لیا ہی اس لیے ہے کہ اس کی چھت سے پڑوس نظر آتا ہے۔“

”تمہاری قسم، مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا۔“

”اسی لیے کہہ رہے تھے کہ اوپر کا کمرہ میں پڑوس لکھنے کے لیے بنا لوں گا۔“

”ارے ارے، تم تو ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئیں، جس کی بیوی خود اتنی خوبصورت ہو وہ کیوں پڑوس میں جھانکے گا۔“

”باہر کی تو دل بھی سرخی مٹی ہے۔“

”ارے ہاں، دال پر یاد آیا۔ ہم کھانا کیا کھا میں گئے۔ ابھی تو کمرے میں کچھ ہو گا بھی نہیں۔ کل عبدالرحمن آنے کا تو اس کے ساتھ جا کر ہوا اسٹل لے آؤں گا۔ ابھی با بازار سے کچھ پکایا لے آتا ہوں۔“

ایاز نے بیٹے کو ساتھ لیا اور بازار چلا گیا۔ عمران یہ دیکھنے اوپر چلی گی کہ ہماری چھت سے برابر والوں کا گھر کتنا نظر آتا ہے۔ اس نے دیکھا گھر تو نظر نہیں آتا اب چھت کی ہوئی ہے، کوئی چھت پر آئے تو دوسری چھت سے نظر آ سکتا ہے۔ فراز کو وہ بچی چھت پر نظر آئی ہوگی۔ اس نے چھت پر سے ہونے کمرے کو ایک نظر دیکھا اور مطمئن ہو کر نیچے چلی آئی۔ کئی دن جاؤں گی۔ دیکھوں تو کسی برابر میں کیسے لوگ رہتے ہیں۔ اگر انہی عورت ہوئی تو بات چیت میں دل لگا رہا کرے گا ورنہ تو اس انہی میں میں بوریٹ ہی بوریٹ ہے۔

ایاز کھانے کے لیے کئی ہوئی پھل لے کر آ گیا تھا۔

”یہاں کی پھل بڑی مزے دار ہوئی ہے وہی لے آیا ہوں۔“

”شام کو غلے پھل کھیں گے تو دابھی میں جو کوئی وہ خرید لیں گے۔“

”شام ہوئی تو عمران خوش ہوئی۔ اب ہم باہر نکلیں گے اور پھلوں کو چھتے ہوئے دیکھیں گے۔ ایاز نے یہی کہا تھا کہ وہاں لوگ اس طرح تفریح کے لیے نکلتے ہیں جیسے پھلوں سے اچانک چٹنا شروع کر دیا ہو۔ اس نے وہ پیر کو شام کے لیے کپڑے نکال کر رکھ لیے تھے۔ خوب اچھی طرح تیار ہوئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیر تک خود سے باتیں

کیں اور فراز کی انگلی تمام گریباں لٹکی آئی۔ باہر وہی منظر تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جب وہ آئی تھی تو ہر طرف دھوپ لگی ہوئی تھی اور اب دھوپ نے ہل سیڑ لیا تھا۔ وہی اونچی بچی تانہوار میں تھی وہی سائیکلوں پر جاتے ہوئے مسطوک الحال لوگ تھے۔ اس نے سوچا وہ کوئی خاص سڑک ہوگی جو بقول ایاز تانچلی مل کھاتی اپنے مسافروں کو چوٹی پر لے کر جاتی ہے اور پھر کٹ کر نیچے لے آتی ہے۔ اس نے فراز سے بھی کہہ دیا تھا کہ ہم تفریح کے لیے ایک ایسی سڑک پر جا رہے ہیں۔ وہ بار بار بوجھ رہا تھا کہ وہ سڑک کب آئے گی۔

وہ ٹھیکوں سے باہر نکل آئی تھی۔ ایک ٹھیکوں کی اس کے سامنے تھی جس پر بھی کسی کوئی ٹانگا گزرتا تھا یا کوئی سائیکل سوار۔ جو لوگ چل پھر رہے تھے ان کے لباس پہنے تھے اور غربت کا غماز چروں پر تھا۔ ہمیں سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ پھول اچانک چھلنے لگے ہیں۔ کسی طرف سے بھی ہنسنے نہیں جھپک نہیں رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سرو کے درخت ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نہیں کھڑے تھے۔ اس کے برعکس چند غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت مقبوض سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے میں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران نے ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بھل گیا۔

”اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے گا۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہول میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور سائین خرید کر واپس آئے۔

کیں اور فراز کی انگلی تمام گریباں لٹکی آئی۔ باہر وہی منظر تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جب وہ آئی تھی تو ہر طرف دھوپ لگی ہوئی تھی اور اب دھوپ نے ہل سیڑ لیا تھا۔ وہی اونچی بچی تانہوار میں تھی وہی سائیکلوں پر جاتے ہوئے مسطوک الحال لوگ تھے۔ اس نے سوچا وہ کوئی خاص سڑک ہوگی جو بقول ایاز تانچلی مل کھاتی اپنے مسافروں کو چوٹی پر لے کر جاتی ہے اور پھر کٹ کر نیچے لے آتی ہے۔ اس نے فراز سے بھی کہہ دیا تھا کہ ہم تفریح کے لیے ایک ایسی سڑک پر جا رہے ہیں۔ وہ بار بار بوجھ رہا تھا کہ وہ سڑک کب آئے گی۔

وہ ٹھیکوں سے باہر نکل آئی تھی۔ ایک ٹھیکوں کی اس کے سامنے تھی جس پر بھی کسی کوئی ٹانگا گزرتا تھا یا کوئی سائیکل سوار۔ جو لوگ چل پھر رہے تھے ان کے لباس پہنے تھے اور غربت کا غماز چروں پر تھا۔ ہمیں سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ پھول اچانک چھلنے لگے ہیں۔ کسی طرف سے بھی ہنسنے نہیں جھپک نہیں رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سرو کے درخت ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نہیں کھڑے تھے۔ اس کے برعکس چند غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت مقبوض سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے میں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران نے ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بھل گیا۔

”اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے گا۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہول میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور سائین خرید کر واپس آئے۔

کے لیے غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت مقبوض سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے میں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران نے ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بھل گیا۔

”اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے گا۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہول میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور سائین خرید کر واپس آئے۔

کے لیے غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت مقبوض سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے میں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران نے ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بھل گیا۔

”اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے گا۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہول میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور سائین خرید کر واپس آئے۔

کے لیے غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت مقبوض سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے میں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران نے ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بھل گیا۔

”اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے گا۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہول میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور سائین خرید کر واپس آئے۔

کے لیے غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت مقبوض سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے میں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران نے ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بھل گیا۔

”اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے گا۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہول میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور سائین خرید کر واپس آئے۔

کے لیے غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت مقبوض سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے میں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران نے ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بھل گیا۔

”اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے گا۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہول میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور سائین خرید کر واپس آئے۔

کے لیے غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت مقبوض سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے میں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران نے ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بھل گیا۔

”اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے گا۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہول میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور سائین خرید کر واپس آئے۔

کے لیے غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت مقبوض سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے میں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران نے ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بھل گیا۔

”اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے گا۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہول میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور سائین خرید کر واپس آئے۔

کے لیے غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت مقبوض سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے میں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران نے ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بھل گیا۔

”اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے گا۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہول میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور سائین خرید کر واپس آئے۔

کے لیے غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت مقبوض سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے میں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران نے ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بھل گیا۔

”اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے گا۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہول میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور سائین خرید کر واپس آئے۔

کے لیے غراخے والے تھے جو کہیں نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اسے غصے میں بھی کر دہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ چل جاتا۔ وہ بار بار وہیں جانے کی ضرورت رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلائے کی کوشش کی کہ دابھی میں کہیں بیٹھ کر کھ

”کیا سائن بناتے ہیں یہ لوگ، کھاؤ گی تو انگلیاں جاتی رہ جاؤ گی۔ دوپہر میں دیکھا کسی شاندار مجلس تھی۔“ اس نے کہا اور داد طلب نظروں سے عمرانہ کی طرف دیکھا۔ ”تم کچھ بولی کیوں نہیں؟“

”کیوں بولوں۔ اب کسی ایسے رستے پر چلیے جو گھر کی طرف جاتا ہو۔“

”اوہ، تھک گئی ہوگی، چلو کوئی بات نہیں آدھا قصبہ کل گھوم لیں گے۔“

گھر تک پہنچتے پہنچتے رات آگئی تھی۔ اس نے سوچا کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا جتنو پلکار ضرور کریں گے۔ آسمان سے آتش بازی کے آثار ضرور پھوٹیں گے لیکن اس کی یہ آرزو بھی پوری نہیں ہوئی بلکہ یہ ہوا کہ گھر کے قریب پہنچ کر راستے کو اندھیرے نے نکل لیا۔ یہاں روشنی بالکل نہیں تھی، یہاں بجلی کے پل ہی نہیں تھے تو روشنی کہاں سے ہوئی۔ بڑی مشکل سے تالے میں چابی لٹائی اور وہ اندر آگئے۔

وہ سونے کے لیے بیٹی تو ایاز سے ناراض تھی۔ ایاز سمجھ رہا تھا کہ وہ کیوں خاموش ہے لیکن پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ دونوں طرف خاموشی تھی۔ باہر بجلی جان لیوا سناٹا تھا۔ کمرے میں گلی گھڑی کی ٹک ٹک ٹک ٹک بجا رہی تھی۔ بڑا قافہ مقرر ہو گیا تھا۔

”عمرانہ!“

”ہوں۔“

”کوئی بات کرو، آج اس گھر میں ہماری پہلی رات ہے۔“

”ایک ہفتی سے قصبہ پیڑی۔ چھوٹی سی جگہ مگر ایسی حسین جیسے جنت کا ٹکڑا زمین پر اتر آیا ہو، شام کے وقت صاف تھری سڑکوں پر لوگ تفریح کے لیے اس طرح نکلتے ہیں جیسے اچانک پھولوں نے چلنا شروع کر دیا ہو۔“ اس نے وہ تمام الفاظ دہرا دیے جو یہاں آنے سے پہلے ایاز کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔

ایاز پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ عمرانہ کس بات پر ناراض ہے۔ اسے خود احساس تھا کہ اس نے جو غلط بیانی کی تھی عمرانہ کا دل اسی غلط بیانی پر خون کے آنسو وہ رہا ہے۔ وہ تو بوس چپ تھا کہ اگر وہ بھی چپ رہی تو دن گزرتے جائیں گے لیکن عمرانہ نے اپنا کرب لفظوں کے حوالے کیا تو وہ تڑپ اٹھا۔

”عمرانہ تجھے معاف کر دو کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا۔ تم نے جو قہات باندھ لی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ تم نے مجھے لانا چاہتا تھا۔ اسے جنت کا ٹکڑا کہتا تھا تو اس جہنم میں تم آئیں کیسے۔“

”میں تو تمہاری داسی ہوں ایاز۔ یہاں کہو گے گلی چلی جاؤں گی مگر مجھ سے یہ جھوٹ تو نہ بولا ہوتا۔ اگر جھوٹ بولنے کی عادت پڑ گئی تو ہر معاملے میں بولو گے۔“

”بس ایک جھوٹ اور ہے وہ بھی سن لو تاکہ اسٹاک ختم ہو جائے۔ پھر کوئی جھوٹ نہ ہوگا نہ بولوں گا۔“

”وہ بھی بول دو۔ اب تو میں بھی عادی ہوتی جا رہی ہوں جھوٹ سننے کی۔“

”ایک ٹوکی سے عمرانہ۔ وہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔“

”یہ تو خبر جھوٹ نہیں ہے۔“ عمرانہ نے اس کی طرف کروت بدلی اور بے اختیار ہنسنے لگی۔

☆☆☆

”امی دیکھیں کون آیا ہے۔“ فرزانے اس بچی کی طرف توجہ دلائی جو اس کے ساتھ تھی۔

”کون ہے بیٹا؟“

”تو آپ کو نہیں یاد ہے روشنی ہے، میں نے آپ سے کہا تھا، برابر والوں کے گھر میں ایک بچی ہے، یہ وہی ہے، روشنی۔ ابھی ہے نا۔ اس کی آنکھیں دیکھیں کریں، اس کے سہرے بال اچھے ہیں نا۔“

”وہ تو اچھے ہیں مگر تم اسے یہاں کیوں لے آئے۔ اس کی امی و جھوٹ رہی ہوں گی۔“

”جی نہیں۔ میں ان سے پوچھ کر لایا ہوں۔ میں ان کے گھر گیا تھا۔ آئی بھی بہت اچھی ہیں، میں نے ان سے کہا کہ روشنی کو اپنے گھر لے جاؤں، انہوں نے کہا لے جاؤ۔“

عمرانہ نے روشنی کو اپنے پاس بلایا۔ پانچ چھ سال کی یہ بچی بے پناہ خوبصورت تھی۔ اس میں بھی اتنی پیار سی کردہ تھی کہ عمرانہ کو بے اختیار پیار آ گیا۔ اس نے اسے گود میں اٹھالیا۔

”جھوڑے نا۔ مجھے فرزانے کے ساتھ کھیلتا ہے۔“

”فرزانہ نہیں، فرزانہ بھائی کہتے ہیں۔ وہ آپ سے بڑے ہیں نا۔“

”جی نہیں، گی۔“

”اچھا جاؤ کھیل فرزانے کے ساتھ۔“

فرزانے نے گرجھٹ پر چلا گیا۔ ایاز اپنے چہرے پر عبد الرحمن کے ساتھ سودا سلف لانے کا بازار لگا رہا تھا۔ عمرانہ کے پاس اب فرصت ہی فرصت تھی۔ گھر کیوں کے پر دے نکال لیے تھے، وہ ان پر استری کرتے گھڑی ہوگی۔ کوئی دروازہ زور زور سے بجا رہا تھا۔ شاید ایاز آگئے۔ وہ

دروازے پر مچی۔ ایک عورت دروازے پر کھڑی تھی۔ عمرانہ اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ روشنی کی ماں ہے، وہی مگر یہاں آنکھیں ویسے ہی سنہری بال۔

”میں معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کو ڈسرب کیا۔ میں آپ کے پردوں میں رہتی ہوں۔ راجہ میرا نام ہے۔“

”جی جی، میں سمجھتی تھی، آئیے اندر آئیے۔“

”میں اس وقت نہیں، میں پھر کبھی فرصت سے آؤں گی۔ اس وقت تو میں روشنی کا پوچھنے آئی تھی۔ آپ کے بیٹے کے ساتھ کھیلتی تھی۔“

”کیا سمجھوں اسے۔“

”میں کھیلنے دیں، میں تو بس پوچھنے آئی تھی کہ بچہ ہی تو ہیں کہیں اور تو نہیں نکل گئے۔ گھر میں ہیں تو کھیل ہے۔“

”راجہ! میں، معاف کرنا، ہم کل ہی تو آئے ہیں۔ کل سے اب تک فرصت ہی نہیں ملی جو آپ سے ملنے آئی، آؤں گی ضرور۔“

”ہم سے پہلے بچوں نے وہی کر لی۔“

”ہاں یہ تو ہے، میرا فرزانہ تو بچوں کا دیوانہ ہے۔“

”ایک ہی بیٹا ہے آپ کا؟“

”جی ہاں۔ اس کے بعد اللہ نے کوئی اولاد دی ہی نہیں۔ آٹھ سال کا ہو گیا ہے، ماشاء اللہ۔“

”اچھا بہن چلوں گی۔“

”فرزانے کا باپا بازار گئے ہوئے ہیں وہ آجائیں تو میں آپ کی طرف ضرور آؤں گی۔“

عمرانہ اتھیں کرنے اور سیر ملاب رکھنے کی شوقین تھی۔ یہاں آکر تو وہ ایک ہی دن میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ فحش غذا کا پوسٹن کھنے سے بھی زیادہ ہمت میں راجہ پہلی عورت تھی جس سے اس نے چند باتیں کی تھیں۔ ان باتوں نے تو اس کی پیاس اور بھی بڑھا دی تھی۔ وہ جلد سے جلد جاننا چاہتی تھی کہ راجہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے، اس کا میاں کیا کرتا ہے، میاں سے خوش بھی ہے یا نہیں۔ اس نے جلدی جلدی پردوں پر استری کی اور لپیٹ کر رکھ دیے۔ پہلے میں راجہ سے مل کر آؤں گی، اس کے بعد پردے لٹاؤں گی مگر کیا خاک جاؤں گی۔ ایاز تو آنے کا تم ہی نہیں لے رہے ہیں۔ وہ اوپر چلی گئی کہ دیکھوں دونوں بچے کیا کر رہے ہیں۔ وہ دونوں کھیلنے میں مگن تھے، اس طرف سے متوجہ نہ ہو کر وہ نیچے اتر آئی۔

اتنی دیر میں ایاز میرے گھر کا راشن لے کر آچکا تھا۔ عبد الرحمن نے سامان گھر میں رکھ دیا اور اجازت لے کر کمر چلا گیا۔ ایاز نے گھر میں کسی چیز کی محسوس کی۔ اسے خیال آیا

فرزانہ نہیں ہے۔

”فرزانہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ کہاں ہے؟“

”وہ ایک بلی پکڑ لایا ہے اس کے ساتھ کھیل رہا ہے چھت پر۔“

”بلی پکڑ لایا ہے؟ بلی کہاں سے مل گئی اسے؟“

”برابر والوں کی چھت پر مچی۔“

”جلاؤ اسے۔ اب وہ بلیوں سے کھیلے گا؟ کل میں اپنے ساتھ اسے اسکو لے کر جاؤں گا۔ داخل کراؤں گا اسے در اندہ اسے تو اب چھت مل گئی ہے دن دن پھر چھت پر بیٹھا رہے گا، جلاؤ اسے۔“

”ناراض کیوں ہوتے ہو، کوئی بلی ولی نہیں لایا ہے، برابر والوں کی بچی ہے روشنی۔ اس کے ساتھ کھیل رہا ہے۔“

”بلیاں ہوں یا لڑکیاں۔ دونوں ایک ہی ہوتی ہیں۔ ناخن دونوں کے بڑے تیز ہوتے ہیں۔“

”ایاز، ایسی خوبصورت بچی ہے کہ بے اختیار چومنے کو جی چاہتا ہے۔ ماشاء اللہ بہت ہی حسین ہے، جوان ہو کر فحش کی لٹکے گی، اگر فرزانے کے جوان ہونے تک ہم یہاں رہے تو فرزانہ کی ذہن بنا کر اسے اپنے گھر لے آؤں گی۔“

”خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ تو بالکل نہیں کھیلتا چاہیے۔ جلاؤ فرزانہ کو۔“

”اچھا ہاں جاتی ہوں۔“

وہ اوپر گئی اور دونوں کو نیچے لے آئی۔ ایاز نے بچی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ”واقعی عمرانہ بہت پیار کی بچی ہے۔ مجھے تو اشتیاق ہو گیا کہ اس کی ماں کو دیکھوں۔“

”آگئے اپنی ذلات پر۔ آپ گھر میں بیٹھیں میں برابر والوں کے ہوئے آئی ہوں۔ وہ بے جا رہی آئی بھی نہیں تو چلدی میں تھیں، دروازے سے ہو کر چلی گئیں۔“

ایاز کچھ نہیں سن رہا تھا۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا تھا۔ بچی بھی ایسی بے تکلف تھی کہ پڑ پڑ باتیں کیے جا رہی تھی۔

”آپ فرزانے کا پایا ہیں۔“

”ہاں بیٹا ہم فرزانے کا پایا ہیں۔“

”پھر تو آپ میرے پایا بھی ہوئے۔“

”کیوں آپ کے پایا کیوں ہوئے۔“

”کیونکہ آپ مجھے اچھے لگے ہو۔ میں آپ کو پایا کہا کر دی گئی۔“

”نیک ہے، تم آج سے میری بیٹی ہو۔“

”پھر مجھے کھانے کے گرجلو۔ وہ جو پایا ہوتے ہیں ان کو اپنے بچوں کو کھانے لے کر جاتے ہیں۔“

”اچھا کسی دن لے کر چلیں گے۔ ابھی تو تم آنی کے ساتھ آئے گھر جاؤ۔ تمہاری امی انتظار کر رہی ہوں گی۔“
”میں امی سے بھی کہوں گی، آپ بہت اچھے ہیں۔“
”اچھا کہہ دینا۔“

عمرانہ اسے لے کر اس کے گھر چلی گئی۔ فراز بھی اس کے ساتھ تھا۔ یازدوسو سالانہ لے کر آیا تھا۔ فراز فرصت کا فائدہ اٹھا کر باورچی خانے میں جھانکے لگا۔

اس کا دم سے فارغ ہونے کے بعد وہ گھر کے میں آ کر لیٹ گیا۔ اب کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اسے فضا آ رہا تھا کہ عمرانہ ابھی تک نہیں آئی۔ وہ ہوتی تو کچھ کھانے کا انتظام کرتی یا مجھ سے سبق میں بازار سے لے آتا۔ بھلا یہ کوئی وقت تھا کسی کے گھر جانے کا۔ اس سے سوچا وہ خود برابر والوں کے دروازے پر جانے اور عمرانہ کو بلا کر لے آئے۔ وہ سوچ ضرور رہا تھا لیکن بہت نہیں ہو رہی تھی۔ شاید بہت ہو چکی جانی لیکن اسی وقت عمارت آ گئی۔

”اوہ تمہارے پڑوسیوں نے تمہارے لیے کھانا بھیجا ہے۔“
”کتنی غلط بات ہے عمرانہ۔ وہ لوگ کب سوچیں گے، کیوں لے آئیں کھانا میں باؤڑ سے لے آتا۔“

”کوئی کچھ نہیں سوچے۔ پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں، کسی دن میں کوئی چیز پکاؤں گی تو میں دے آؤں گی۔“
وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو عمرانہ نے پڑوسیوں کا ذکر ایک مرتبہ پھر پھیر دیا۔

”مبارک ہو، آپ کے پڑوسی بھی آپ کی طرح کیلاش پور کے ہیں۔“

”کیلاش پور کے ہیں؟ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اپنے گھر کے ہیں اور اب پڑوسی بھی ہیں۔ کیا نام ہے اس عورت کے میاں کا اور یہاں قصبہ یہاڑی میں کیوں ہے۔ کیلاش پور سے کیوں چلا آیا۔“

”میں نے کہا وہ یوں بڑا پر فضا مقام ہے اور بے چارہ چلا آیا ہوگا۔“

”تم غلط کرنے سے باز مت آنا تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تمہاری فرمائشوں سے شک آکر، امی تنخواہ بڑھانے کے لیے یہاں آباہوں۔ مجھے شوق نہیں تھا کیلاش پور چھوڑنے کا۔“

”اس کی بھی کوئی مجبوری ہوگی۔“ عمرانہ نے کہا پھر ایک دم سے اداس ہو گئی۔ ”ویسے بے چاری ہے بہت دھبی عورت۔“

”کیوں، دیکھی کیوں ہے؟“
”آپ نے تو دیکھا نہیں ہے، بالکل جوان عورت

ہے، مجھ سے تو خیر بڑی ہوگی لیکن ہے جوان۔“
”تم سے تو خیر عورت بڑی ہوتی ہے۔“
”اب مذاق مت کریں، آگے تو سنیں۔ وہ خود تو جوان ہے مگر میاں بڑی عمر کا ہے۔ بے بھی بالکل چوڑا سا۔ ویلا پتلا۔“

”تم نے کہاں دیکھا کیا۔ کیا وہ گھر میں تھا؟“
”ارے نہیں، تو خود رکھا ہوا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا، میں نے پوچھا۔ یہ تمہارے والد کا فونو ہے۔ ہنسنے لگی۔ یہ تو میرے شوہر ہیں، میں پوچھنے والی کب تھی۔ میں نے کہہ دیا، یہ تو تم سے بہت بڑے ہیں۔ اس پر اس نے بتایا کہ یہ میرے دوسرے خاوند ہیں۔ پہلے خاوند کا انتقال ہو گیا تو اس سے شادی کر لی۔ یہ جو بیٹی ہے، پہلے شوہر سے ہے۔ ابھی تین سال پہلے ہی تو اس بڑے سے شادی ہوئی ہے۔“

”یہ کیلاش پور سے یہاں کیسے آئی۔“
”اس کا میاں پولیس میں ہے۔ ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا ہے۔“

”کیلاش پور کا ہے تو شاید میں اسے جانتا ہوں۔ نام کیا بتایا۔“
”میاں کا نام لے رہی تھی۔“

”اللہ چاہے تم عورتوں سے کتنی گھٹناؤں کوئی نہیں اور سارا کچھ چھٹا نکال کر لے آئیں۔ ویسے بے چاری بھروسہ کی لاتی ہے۔“

”اب زیادہ بھروسہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی کم ہی کم جا کر کروں گی۔ عورت مجھے تیر گئی ہے۔“

دوسرے دن کی صبح اس گھر میں عجیب طرح سے ظہور ہوئی۔ یازدو آج پہلے دن اسکول جانا تھا لیذا وہ علی الصبح اٹھ گیا۔ عمرانہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھی تھی۔ عمرانہ نے تو خیال بھی نہیں کیا تھا، ایاز کی نظر بڑی کفرانہ اپنے بستر پر نہیں ہے۔ اسے کفرانہ خیال اسی لیے اٹھ گیا تھا کہ کفرانہ اسکول میں داخلے کے لیے ساتھ لے جانا تھا۔ ورنہ وہ غور بھی نہ کرتا۔

”فرزاد صبح کہاں چلا گیا؟“ ایاز نے کہا۔
”جائے گا کہاں۔ اس گھر میں ئی تنی چھت ٹی ہے۔“

شوق پڑھا ہوا ہے، چھت پر گیا ہوگا، آپ تیار ہوں میں اسے لے کر آتی ہوں۔“

عمرانہ نے پہلے تو بیٹھے ہی سے آواز دی وہ لیکن جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ اوپر چلی گئی۔ چھت پر فرزاد تو کیا اس کی خوشبو بھی نہیں تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یا اللہ فرزاد کہاں چلا گیا۔ پھر اس کی نظر کھڑکی کے ایک تختے پر پڑی جس کا ایک سر اس کی چھت پر تھا دوسرا پڑوسیوں کی چھت کی

معد پر۔ اس نے دل تمام لیا۔ خرد و کوئی چور آیا ہے جو اس تختے کے ذریعے یا تو پڑوس کی چھت سے ادھر آیا ہے یا ادھر سے پڑوسیوں کی چھت پر گیا ہے۔ وہ خوفزدہ ہو کر ایاز کو آواز دی دینے والی کسی کفرانہ آواز آئی۔
”امی۔“

”ارے تم وہاں کیا کر رہے ہو، کیسے پہنچے وہاں۔“
”اس تختے کے ذریعے۔“

عمرانہ نے ذرا ایک کر دیکھا تو روشنی بھی وہاں تھی۔ اب عمرانہ کی ہنسنے میں آیا کہ فرزاد اس تختے کے ذریعے چھت پر پہنچا اور وہ اپنی اپنی جگہوں سے اوپر آگئی ہوگی۔ آف میرے خدا! ایسی بھی کیا ہو سکتی۔ تینتہ ذرا بھی ٹھک گیا ہوتا تو؟
”چلو گھر آؤ۔ بلا نے دیکھا یہ تو مارتے ہوئے لائیں گے۔“
”ابھی آتا ہوں امی۔“ فرزاد نے کہا اور تختے پر بیٹھ گیا۔
”ادھر سے مت آؤ۔ آنی سے کہنا وہ دروازہ کھول دیں گی۔ دروازے سے آؤ۔“

وہ ہنسنے ہی رہ گئی اور فرزاد اپنی چھت پر آ گیا۔ اس کی اس حرکت پر عمرانہ کا خون کھول اٹھا تھا لیکن اگر وہ اس وقت فرزاد کو سزا دیتی تو ایاز کو خبر ہو جاتی اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ فرزاد کے اس جرم سے واقف ہو۔ اس نے بے کام کسی اور وقت پر اٹھا رکھا۔ صرف اتنا کیا کہ فرزاد کا کان ہلنے سے سوڑ دیا اور اس کا ہاتھ ٹھکر کر پیچھے پلٹ آئی۔

”ادھر چھت پر تھا، نہ جانے کس وقت اٹھ کر چلا گیا۔ کہہ رہا تھا چھت پر چڑیاں بول رہی ہیں انہیں یاد کیسے آیا تھا۔“
”یہ ہے، نہ میرا بیٹا۔ قصبہ یہاڑی کا کچھ لطف تو یہ اٹھا رہا ہے۔ ایک ٹم ہو کہ بڑی سوئی رہتی ہو۔ یہاڑی جگہوں پر سورج نکلنے کا منظر ہی تو دلچسپ ہوتا ہے۔“

”اچھا اب کہہ چکے قصبے کی تعریف۔ میں فرزاد کو تیار کیے دیتی ہوں۔ اسے لے کر اسکول جاؤ۔ گھر مر رہے گا تو ہر وقت کھیل کود ہی میں گزار رہے گا۔“

ایاز فرزاد کو لے کر اسکول چلا گیا۔ اب عمرانہ سوچ رہی تھی خالی گھر میں کیا کرے۔ اسے کچھ دیر بعد ہی شہابی کا شدید احساس ہونے لگا تھا۔ اب کیلاش پور یاد آ رہا تھا۔ وہاں شہابی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ گھر سے باہر کا شور اٹا تھا کہ گھر بھر رہا تھا۔ یہاں تو باہر اٹا تھا تاکہ گھر میں بھی نہیں ہوگا۔ اس نے پورے گھر کی صفائی شروع کر دی حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے آئے ہوئے ابھی دو ہی دن تو ہوئے تھے۔

گھر کی جھان پوچھ بھی کر لی۔ گھڑی کی سوئی جہاں

گھڑی تھی وہیں گھڑی تھی۔ یا اللہ اب میں کیا کروں۔ اسے یاد آیا کھڑکیوں کے پرے اسٹری کیسے رکھے ہیں۔ وہ پردے ہانکنے لگتی ہوگی۔

دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ وہ خوش ہو گئی، شاید ایاز آگئے۔ ہیڈر ماسٹر نے جلدی چھٹی دیڈی ہو گئی کہ جیٹا شہر ہے، تمہاری بیوی اکیلے گھر میں پریشان ہو رہی ہوگی۔ تم گھر چلے جاؤ، وہ بھانجی ہوگی دروازے پر آئی اور پوچھے بغیر ہی دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر ایاز نہیں اس کی پڑوسنہ را حیلہ کھڑی تھی۔

”تمہارے میاں گھر پر نہیں ہیں؟“
”نہیں، وہ تو اسکول گئے۔ آجاء اندر آ جاؤ۔“
را حیلہ کے آنے سے وہ خوش ہو گئی تھی کہ چلو ہاتوں میں وقت کٹ جائے گا لیکن ایک خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ شاید را حیلہ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ فرزاد ان کی چھت پر آیا تھا۔ اس کی شکایت لے کر آئی ہوں لیکن دوسرے ہی گئے

اس کا خوف دور ہو گیا جب انہوں نے بتایا، میرے میاں ڈیوٹی پر چلے گئے۔ روشنی بھی اسکول میں ہے۔ میں گھر پر اکیلی تھی سوچا عمرانہ سے کب شب کر آؤں۔ ہم دونوں صبح کے وقت اکیلے ہوتے ہیں، ہم کو بتوئی آ جا یا کروں۔“

اسی ملاقات میں اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ روشنی بھی اسکول جاتی ہے۔ وہ بھی اسی اسکول میں جاتی ہوگی جہاں ایاز پڑھاتے ہیں لیکن جب اس کے پوچھنے پر یہ معلوم ہوا کہ اس قصبے میں ایک ہی اسکول نہیں ہے تو اسے اطمینان ہو گیا کہ فرزاد اور روشنی اپنی دروٹی الگ رہیں گے۔ اگر ایک ہی اسکول ہوتا تو فرزاد اس کی جان وہاں بھی نہیں چھوڑتا۔

را حیلہ بھی کم باتوں کی نہیں تھی۔ وہ دنوں عورتیں اس وقت تک دنیا و مافیہا سے بے خبر بائیں کرتی رہیں جب تک روشنی کے اسکول سے آئے کا وقت نہیں ہو گیا۔

”مجھے روشنی کو اسکول سے لاتا بھی ہوگا۔ میں چلتی ہوں۔“ را حیلہ نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
”یہ بھی آتی ہے ہوں گے۔ میں ہنر یا تو پڑھاؤں۔“

عمرانہ پھر اکیلی رہ گئی لیکن اب ایاز کے آنے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا اور پھر کھانا پکانے کی مصروفیت بھی تھی، وہ بچن میں مشغول ہو گئی۔

ایاز اور فرزاد گھر آ گئے تھے۔ فرزاد کا داخلہ اسکول میں ہو گیا تھا۔ کیلاش پور میں وہ بچن جماعت میں تھا، یہاں اسے پانچویں کلاس میں داخل کر دیا گیا۔

”ادخلہ تو خیر ویسے بھی ہو جاتا۔“ ایاز نے کہا۔ ”لیکن

میں نے سوچا ہیڈ ماسٹر صاحب کو جھڑپ میں ڈال ہی دوں۔
میں نے کتاب کا ایک صفحہ فراز کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے وہ
صفحہ دو دفعہ پڑھا اور پھر تم جانتی ہو وہی ہوا جو فراز کی
خصوصیت ہے۔ اس نے وہ صفحہ زبانی سنا دیا۔ ہیڈ ماسٹر
صاحب کو یقین ہی نہیں آیا۔ کہنے لگے ایاز صاحب، اپنے بیٹے
پر کٹ لگا دو۔
”آپ کسی دن میرے فراز کو نظر لگوائیں گے۔ میں تو
کہیں یہ مظاہرے نہیں کرتی پھرئی۔“
”مجھے یہاں ضروری تھا۔ ذرا عیب ڈالنا تھا۔“
”اب یہ بات اسکول میں پھیل جائے گی اور پھر ہر
بچہرا استخوان لیتا پھرے گا۔“
”ہاں یہ تو ہے، خیر دیکھا جائے گا۔“
فراز کی یہ عجیب و غریب صلاحیت تھی۔ دنیا میں ایسے
لوگ اور بھی کمزورے ہیں اور اب بھی ہوں گے کہ جن کی قوت
حافظہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ کوئی تحریر ایک مرتبہ پڑھ کر
سے انہیں زبانی یاد ہو جاتی ہے۔ فراز کا شمار ایسے ہی لوگوں
میں ہوتا تھا۔ وہ جس منظر، جس چہرے، جس راستے کو ایک
مرتبہ دیکھ لیتا، کبھی نہیں بھولتا تھا، یہ کوئی جادو نہیں تھا جس
حافظے کی قوت کا کمال تھا۔
شام ہوئی تو ایاز کو روشنی کا خیال آیا۔
”عمران، ذرا برابر سے جا کر روشنی کو بلا دیا فراز
سے کہہ دو جا کر بلا لے گا۔“
”خیر تو ہے، چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں بڑے
میاں سبحان اللہ۔ باپ بیٹے دونوں روشنی کے عاشق ہو گئے۔“
”بڑی پیاری چٹی ہے۔ بے اختیار پیارا آتا ہے اسے
دیکھ کر۔“
”وہ تو ہے مگر اس وقت کیوں ملا رہے ہیں؟“
”میں ذرا باہر جا رہا تھا سوچا اسے بھی سیر کر لادوں۔“
”یا اللہ! میں کیا کیا میز پر دیکھ رہی ہوں۔ آپ کو تو
لڑکیاں پسند ہی نہیں ہیں۔ پھر اب کیا ہو گیا۔“
”بعض بچے خود بخود دھانپنا لیتے ہیں۔ پتا ہے کیا کہہ
رہی تھی۔ کہہ رہی تھی آپ میرے باپا ہیں کیونکہ آپ مجھے
اتھنے لگتے ہیں۔ جب مجھے سے کہلو الیہ کہ میں اس کا پاپا ہوں تو
کہنے لگی پاپا تو وہ ہوتے ہیں جو میرے لیے لے کر جاتے ہیں،
ترغیب کہہ رہی تھیں، اگر ہم روشنی کے جوان ہونے تک
یہاں رہتے تو اسے اپنی بہو بنائیں گے۔ جس کمر میں جائے گی
وہی کروے گی۔“
فراز قریب ہی کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا۔ کسی کو معلوم بھی

نہ ہوا وہ کب گیا اور کب روشنی کو لے کر گیا۔ اس کے کپڑوں
سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی ماں نے اسے تیار کر کے بھیجا ہے۔
”جاؤ روشنی کی امی سے کہنا، ہم اسے اپنے ساتھ باہر
لے کر جا رہے ہیں۔“
”میں نے پہلے ہی پوچھ لیا ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں لے
جاؤ۔“ فراز نے کہا۔
عمران کو باہر جانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ باہر تھا بھی
کیا۔ محلے محلے جھاڑی لوگوں کو دیکھنے وہ کیا باہر جاتی۔ ایاز،
روشنی اور فراز کو لے کر چلا گیا۔
وہ واپس آیا تو روشنی کے ایک ہاتھ میں چالی سے چلنے
والا بھالو اور دوسرے ہاتھ میں سونے جاگنے والی گڑیا تھی۔
ایاز کے ہاتھ میں ایک ٹیکٹ ڈالا ہوا تھا۔
”اسے کھول کر دیکھو۔ روشنی کے لیے دفرائیں لایا ہوں۔“
”پرانی اولاد کے لیے آپ نے کتنے پیسے خرچ کر
دیے۔ آپ جب چائیں گے اس کو یہ سب دلائیں گے۔“
”اتنے پیارے کہہ رہی تھی۔ پاپا مجھے یہ چاہیے۔ میں
دلاتا چلا گیا۔“
”ہمیں کچھ پکانا بھی ہے۔ ہم اتنی دور جنگل میں اس
لے نہیں پڑے ہوئے ہیں کہ جو کچھ میں وہ لانا سے رہیں۔“
”عمران، اس بیٹی میں کوئی بات ضرور ہے۔ بے اختیار
دل اس کی طرف کھینچتا ہے، مجھے واقعی لڑکیاں پسند نہیں لیکن یہ
لڑکی نہیں روشنی ہے۔“
”اس کی ماں یہ سب چیزیں دیکھے گی تو دیکھنا وہ بھی
پسند نہیں کرے گی۔“
”کہنا ایاز نے اسے بیٹی بتایا ہے۔“
روشنی تو ایسی خوش تھی کہ پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے
تھے۔ وہ بے چین تھی کہ جلدی سے یہ چیزیں لے جائے اور
ماں کو جا کر دکھائے۔ عمران اس کی بے چینی دیکھ رہی تھی۔ اس
نے سب چیزیں اٹھا لیں اور روشنی کے ساتھ اس کی ماں کے
پاس چلی گئی۔
وہی ہوا جب وہ واپس آئی تو ایاز نے اچھے گی۔ ”میں
کہہ رہی تھی کہ روشنی کی ماں برا مانے گی۔ کہہ رہی تھی اگر
آپ اسی طرح چیزیں دلائے رہے تو وہ روشنی کو آپ کے
ساتھ آئندہ نہیں بھیجے گی۔“
”بھئی، بچے تو سب کے بچے ہوتے ہیں، عجیب
عورت ہے کیوں برا مان رہی ہے۔“
”کہہ رہی تھی، اس طرح بچوں کو غیر لوگوں سے
چیزیں لینے کی عادت پڑ جاتی ہے۔“

”اچھا بھائی، آئندہ کوئی چیز نہیں دلاؤں گا۔ یہی تمہارا
کر لے آیا کروں گا۔“
”ضرورت تو اس کی بھی نہیں۔ کسی کی اولاد کو اتنا مہر
چڑھانا۔“ عمران نے کہا اور بچوں میں چلی گئی۔ ایاز اسکول سے
بچوں کی کچھ کپیاں لے کر آیا تھا، انہیں دیکھنے بیٹھ گیا۔
جب گھر میں خاموشی ہو گئی اور فراز نے دیکھ لیا کہ
باپ اپنے کام میں مصروف ہو گئے ہیں تو وہ عمران کے پاس
آیا۔ اس کے چہرے سے شرافت عیاں تھی۔
”آنٹی نے تو کچھ نہیں کہا تھا۔ آپ نے اپنی طرف
سے باتیں کی ہیں ناں۔“
”مومن سی باتیں۔“ عمران نے تو سے پر روشنی ڈالتے
ہوئے کہا۔
”میں کدو روشنی کو چیزیں دلاتا ہوں۔“
”میں اپنی طرف سے کیوں کہنے کی تھی۔“
”اس لیے کہ ابو کے پیسے خرچ ہوں۔“
”پاگل ہو گیا ہے۔ روشنی کی ماں نے مجھ سے کہا تھا۔
ضروری ہے کہ ہر بات تمہارے سامنے کی جائے، تم اس
وقت وہاں نہیں تھے جب وہ یہ کہہ رہی تھیں۔“
”میں وہاں تھا۔“ فراز نے کہا اور ہنسا ہوا سا گیا۔
☆ ☆ ☆
عمران کو قریب جھاڑی میں رہتے ہوئے چھ مہینے ہو گئے
تھے۔ یہاں کوئی تفرق نہیں لگتا اس کا یہاں دل لگ
گیا تھا۔ پڑوس اچھا لگتا تھا اس لیے بھی دل لگا ہوا تھا۔
راہل بہت اچھی عادت کی عورت تھی۔ دوسرے تیسرے دن
ملنے بھی آ جاتی تھی۔ روشنی تو زیادہ وقت عمران کے ساتھ ہی
گزارتی تھی۔ فراز اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ اسکول
سے آنے کے بعد یہ مشکل دوپہر گزارتے تھے۔ پھر جو کھیل
میں لگتے تھے تو رات کی خبر لاتے تھے۔ ایاز اپنی کیفیت سمجھ
نہیں پا رہا تھا۔ وہ جب بھی روشنی کی طرف دیکھتا تھا بے اختیار
اس کو دل روشنی کی طرف کھینچ لگتا تھا۔ وہ اسے لے کر بازار
کی طرف نکل جاتا یا پھر اس کے پاس بیٹھ کر کھنڈل اس سے
باتیں کرتا رہتا۔
ایک روز راہل نے ہی مع عمران سے ملنے اس کے گھر
آگئی اور نہ جانے کیوں یہ عجیب سا مطالبہ کر دیا۔ ”عمران
تمہاری شادی کی اہم بھی تو ہوگی۔ تماری دوستی کو اتنے دن
گزر گئے، تم نے وہ اہم دکھائی ہی نہیں۔“
”تم نے بھی کہا، مجھی تو نہیں۔ اوپر ہی رکھی ہے ابھی
اکر دکھائی ہوں۔“

عمران اٹھ کر گئی اور اہم اٹھا کر لے آئی۔ راہل نے
بڑے اشتیاق سے اہم ہاتھ میں لی اور پیلٹا منڈالتے ہی عجیب
بے شکا سا سوال کر ڈالا جو ظاہر ہے غیر راہل کی طور پر اس کی
زبان سے ادا ہوا ہوگا۔
”یہ ہیں تمہارے میاں؟“
”میرے برابر بیٹھے ہیں۔ سہرا بھی بندھا ہوا ہے۔
ظاہر ہے یہی ہوں گے۔“
”ارے ہیں۔ میں بھی کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ تمہاری
شادی کی تصویریں دیکھ رہی ہوں اور پوچھ رہی ہوں۔ یہ ہے
تمہارا شوہر۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور ایک ایک کر کے
تصویریں دیکھنے لگی۔
جب وہ اہم دیکھ چکی تو عمران نے اس سے کہا۔ ”بھئی
میں تمہارے گھر آؤں تو مجھے اپنی اہم بھی دکھانا بلکہ ابھی جا کر
لے آؤں۔“
”بھئی آؤ گی تو دکھائی دے گی۔“
”راہل ایک بات پوچھوں۔ تمہاری پہلی شادی کی
بھی تو اہم ہوگی۔ مجھے تمہارے پہلے شوہر کی تصویریں دیکھنے کا
بہت شوق ہے۔“
”میرے ہوئے کی تصویریں کیا رکھتی۔ میں نے سب
جلا دیں۔“
”میرے والوں کی تصویریں ہی تو یادگار ہوتی ہیں۔“
”بات یہ ہے عمران کہ میرے والے سے میری یوں بھی
نہیں بنتی تھی۔ جب وہ مری گیا تو میں نے تصویریں بھی جلا
دیں۔ اب تو مجھے خود بھی یادیں کہ کون تھا کہاں چلا گیا۔“
”میں چائے بناتی ہوں۔ بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔
میں نے تمہیں اداس کر دیا۔“
”تم کیا اداس کرو گی۔ میری قسمت اداس کیسے رہتی
ہے۔ تمہارا شوہر مگر چاہے تو گھر جا کر بیویں گی۔“
”کیا ناراض ہوئی ہو۔“
”ناؤ انگلی میں تمہارے پہلے بہت احسان میں نے
لے لیے ہیں۔ اب جانے کی تکلیف کیا دوں۔“
عمران اسے روشنی روک لی لیکن وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔
عمران نے اہم اٹھا کر رکھی اور گھر کے کام کاج میں مشغول
ہو گئی۔ ایاز اور فراز اسکول سے آئے دالے تھے۔
☆ ☆ ☆
تین چار دن گزر گئے تھے۔ نہ تو راہل آئی تھی نہ اس
نے روشنی کو بھیجا تھا۔ عمران نے سوچا جا کر معلوم کیا کیا جائے۔
کیا خراس کی طبیعت خراب ہو۔ راہل نے بڑی بے ولی سے

”اس وقت میرے میاں گھر پر ہیں تم بعد میں آنا۔“
”تمہارے میاں مجھ سے عمر میں بہت بڑے ہیں۔
وہ بچے بھی میں پر وہ نہیں کرتی۔ میں تو تمہاری خیریت معلوم
کرتے آئی تھی۔“

”میں خیریت سے ہوں۔“ راحیلہ نے کہا۔ ”وہ بچے
معاف کرنا درود دہ پیتے پیتے تو تمہارے میاں بھی نہیں ہیں جو
میرے میاں کو بڑا کہہ رہی ہوں۔“
”تم نے روشنی کو بھی نہیں بھیجا۔“

”اس کی پڑھائی کا خرچ بہت ہوتا ہے۔ اچھا
خدا حافظ۔“ راحیلہ نے اتنی زور سے دروازہ بند کیا کہ عمران
گھر آکر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور پھر خود ہی مسکرا دی۔ میاں
سے لڑکھٹائی ہوئی۔ خسر اتر جائے گا تو خود ہی آئے گی۔

ایاز گھر آیا تو وہ یہ ذکر بیچترے بغیر نہ رہ سکی۔ ”عجیب
ہے یہ عورت۔“

”کون عورت۔“

”بہی ہماری بڑی بہن۔ روشنی کی ماں۔“

”کیا ہو گیا؟“

”خدا اور جن بہت ہے اس عورت میں۔ اس روز
اچھی خاصی آئی ہے میرے پاس۔ میں نے شادی کا الیم
دکھایا۔ اب بھلا بتاؤ، تیرا شوہر بوڑھا اور بد شکل ہے تو اس
میں میرا کیا قصور۔ اسی وقت منہ پھول گیا۔ اٹھ کر چلی گئی۔
میں نے کہا کبھی چلی گئی ہوگی۔ پھر آپ ہی آپ آتا چھوڑ دیا۔ میں
بے غیرت بن کر گئی بھی تو دروازے ہی پر گھڑے ہو کر باتیں
کر لیں اور وہ بھی چلی گئی، اس مصوم روشنی پر بھی پابندی لگا دی
ہے۔ نہیں آتی ہے تو نہ آئے، ہم کیا اس کے بغیر مرے
جارے ہیں۔“

”اسی لیے روشنی سنی دن سے نظر نہیں آتی۔ بچوں سے
کیا روشنی نکلتی۔ بہر حال اگر وہ نہیں آتی ہے تو تمہیں بھی
جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میری جانے جوتی۔ کبھی آئی تو میں بھی منہ نہیں
لگاؤں گی۔“

”اس کا شوہر بھی بد اخلاق ماں ہے۔ مجھے ایک دن ملا تھا۔“

”دیکھا آپ نے۔ آپ تو اس کے مقابلے میں بالکل

لڑکے ہیں، یہی جن سے راحیلہ کو۔“

”کیا کہا؟ راحیلہ نام ہے اس کا؟“

”آپ کو بھی نہیں معلوم؟“

”بھئی مجھے کیا معلوم۔“

دونوں گھر ایک دوسرے سے دور آباد ہو گئے تھے۔ آنا
جانا بالکل بند ہو گیا تھا۔ بچوں پر کوئی روک ٹوک نہ تھی کی
جائے تو بھی بڑوں کا موڈ دیکھ کر لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں۔
فراز سے کسی نے نہیں کیا تھا کہ وہ راحیلہ کے گھر نہ جائے لیکن
وہ اتنا سمجھدار ضرور تھا کہ اس نے اس سرد چنگ کو محسوس کر لیا
تھا۔ اس دن کے بعد سے اس نے بھی روشنی کا ذکر نہیں کیا
تھا۔ پھر تھا، اسے کسی نہ کسی کے ساتھ کھانا تو تھا۔ اب وہ باہر
نگھن کر دوسرے بچوں کے ساتھ کھینے لگا تھا۔ کبھی کبھی روشنی بھی
اگر باہر آ جاتی تو فراز سب بچوں کو چھوڑ کر اس کے پاس چلا
آتا تھا۔ ایک دن بہت کر کے فراز اسے گھر لے بھی آیا تو
عمران نے اسے پانچ منٹ بعد ہی بھیج دیا۔

”جاؤ روشنی تمہاری ماں ڈھونڈ رہی ہوں گی تمہیں۔“

یہاں مت آیا کرو۔ فراز کے ساتھ باہر ہی کھیل لیا کرو۔“

”اچھا آئی۔“ اس مصوم نے جواب دیا۔ ”آؤ فراز

ہم باہر کھینچے ہیں۔“

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ایک روز چلی میں مشورہ کیا۔

”راحیلہ کی آواز اس شور میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ کبھی

بھی روشنی کا نام بھی سنائی دے رہا تھا۔ عمران دروازے پر

گئی۔ مصوم باہر روشنی بہت دور سے غائب ہے۔ راحیلہ اسے

دیکھ کر کہیں سے گئی۔ ”روشنی کو تو نے تو نہیں پھیل کھا ہے۔“

عمران وہاں جمع مورتوں کے پاس پہنچ گئی۔ ”میں کیوں

چمپاؤں کی اس مصوم کو۔“

راحیلہ منے کے گھر میں دیکھ چکی تھی۔ روشنی کتنی بھی

نہیں تھی۔

ایاز اس وقت گھر ہی میں تھا۔ آواز سن کر وہ بھی

باہر نکل آیا۔ یہ ان چھ ماہ میں پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ راحیلہ کو

دیکھ رہا تھا۔ اس کی سانس جھال مچی وہیں رک گئی۔ تو یہ ہے

روشنی کی ماں راحیلہ۔ ہاں سنی تو ہے۔ راحیلہ اس کی آمد سے

بے خبر، عورتوں سے ہائیں کر رہی تھی۔ ایاز کا عجیب حال تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں سے کتنی بھاگ جائے یا

گھر میں جا کر کہیں چھپ جائے۔ اس سے پہلے کہ راحیلہ کی

نظر اس پر پڑتی، وہ گھر میں آ گیا۔ اس کے وجود میں سبز

آندھیاں چل رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھال

لیا۔ اسے روشنی کا خیال آیا۔ روشنی کہاں چلی گئی۔ بے چاری

راحیلہ کتنی پریشان ہے۔ وہ بھی میرے سامنے نہیں آئی

حالانکہ بڑا دفعہ آسکتی تھی۔ اس پریشانی میں اسے یہ بھی خیال

نہیں رہا کہ میں گھر پر ہوں، کبھی وقت باہر بھی آسکتا ہوں۔

اولا تو بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے فراز کا

خیال آیا۔ فراز بھی تو نہیں ہے۔ کہیں فراز ہی تو روشنی کو لے کر
نہیں نہیں چلا گیا۔ شاید۔ وہ ایک مرتبہ پھر باہر آیا۔ یہی وہ
وقت تھا جب تمام عورتیں ایک ساتھی تھیں۔ ”لٹی لٹی۔“
وہ دیکھو روشنی وہ آ رہی ہے۔ عمران کا بیٹا فراز بھی اس کے
ساتھ ہے۔“

ایاز نے دیکھا فراز اور روشنی باہر کی طرف سے چلے
آ رہے ہیں۔ روشنی کے ہاتھ میں ابھی تک آکس کریم دینی
ہوئی تھی جو اس نے باہر سے خریدی تھی۔

ایاز سمجھ رہا تھا کہ اب سارا الزام فراز پر ہی آ گیا کہ
وہی اسے لے کر گیا تھا۔ اب عمران جانے اور راحیلہ۔ وہ اندر
آ گیا کہ بچلو معاملہ نہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد عمران اندر آئی۔ فراز اس کے ساتھ تھا۔

اندر آتے ہی اس نے فراز کو بری طرح بیٹھا شروع کر دیا۔

”کم بنت، اس کا باپ پولیس والا ہے۔ تیری کھال

ادھیر کر رکھ دے گا۔“

”ابھی تو تم اس کی کھال ادھیڑ رہی ہو۔ اب چھوڑ بھی

دوا ہے۔“

”آپ تو آرام سے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کو

کیا معلوم باہر کیا ہو گیا۔ یہ روشنی کو لے کر کہیں چلا گیا تھا۔ اس

کی ماں کے صوفی رہی تھی۔“

”دونوں بیٹے ہیں، کبھی کو کیا کہا جائے۔ یہ بات روشنی

کی ماں کو بھی چوتھی جا رہی ہے۔“

”اب یہ اتنا بچہ بھی نہیں ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے

تھا کہ روشنی کی ماں اسے ڈھونڈ رہی۔“

ایاز کے بچاتے بچاتے فراز کی اچھی خاصی چٹائی

ہو گئی۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ خون دیکھتے ہی

عمران کا ہاتھ ہل گیا۔

”اے جیسے کو سمجھا لو کہ یہ روشنی کے ساتھ نہ کیلے ورنہ

میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ عمران نے فراز کو چھوڑا اور

کمرے میں گھر کر اندر سے کمر بند کر لیا۔

فراز باپ سے لپٹ گیا۔ ابھی تک وہ خاموشی سے بیٹ

رہا تھا لیکن ایاز سے لپٹتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسکی

دہائیں ماہر رہا تھا کہ ایاز کے لیے چپ کرنا مشکل ہو گیا۔ ایاز

نے اس کا خون صاف کیا۔ دو وہ گرم گرم کے چلایا اور بڑی دیر

تک اسے سمجھا تا رہا۔ فراز بے سہارہ ہو کر لٹ گیا۔

ایاز گھر سے نکل کر گئی میں آ گیا۔ اس کی نظر میں راحیلہ

کے مکان پر جمی ہوئی تھیں۔ کبھی میں کوئی نہیں تھا۔ اگر کوئی ہوتا

تو بھی جھٹکا کو کوئی پتہ ہے جو مکان کا جائزہ لے رہا ہے۔ یہ

عورت اب تک میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ سامنے نہ ہی آئی
ہوئی تو اچھا تھا۔ وہ پہلا ہوا گی کے موز تک گیا۔ اس نے ایک
سگریٹ خریدی اور سگڑا کر موزوں سے لگا لی۔ وہ زندگی میں
پہلی مرتبہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا
تھا، لوگ شراب کیوں پیتے ہیں۔ وہ پہلا ہوا پھر گلی میں آ گیا۔

اس کے قدموں نے پھر اسے راحیلہ کے مکان کے سامنے
پھونک دیا۔ عمران کا خیال درست تھا۔ اتنی خوبصورت عورت کو
بوڑھا اور بد شکل شوہر مل جائے تو وہ اہم دیکھ کر بیٹے کی نہیں تو

اور کیا کرے گی۔ اس کا پہلا شوہر چارواقی مر چکا ہے۔ اس
نے جھوٹ بولا ہے تو یہ بھی اس کی مجبوری ہوگی۔ اسی وقت گلی
کے اندر چرے میں گھولی داخل ہوا اور ایاز پہلے ہوا آگے بڑھ

گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ گلی میں آتے والا راحیلہ کے گھر

کے سامنے آ کر رک گیا تھا۔ پھر دروازہ کھلا اور وہ بو کوئی بھی

تھا اندر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اوہ تو یہ راحیلہ کا شوہر تھا۔

اب حسد کی آگ میں جلنے کی باری اس کی تھی۔ وہ راحیلہ کے

شوہر پر حسد کر رہا تھا۔ گھر کے اندر اور گھر کے باہر بہت فرق

ہوتا ہے۔ یہ فرق اس پر آج ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ

آہستہ چلتا ہوا آیا اور اپنے گھر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر اس

نے یہ فرق منادیا۔ وہ گھر کے اندر چلا آیا۔ اس کی بیوی نے

گھر کے کا دروازہ اندر سے کھول دیا تھا اور اس نے فراز کو بھی

اٹھا کر اس کے بستر پر لٹا دیا تھا۔ ایاز اپنے بیٹے کے بستر کے

قریب گیا۔ فراز سوتے ہوئے کسی فرشتے سے کم نہیں لگ رہا

تھا۔ اس نے فراز کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ میرے بچے! یہ کھیل

کبھی کو بھی راس نہیں آیا جو تو کھیل رہا ہے۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے۔“ اس کی بیوی نے نیند

میں ڈوبی آواز میں کہا۔

”باہر گئی تھی تھا۔ ان گھروں کو دیکھ رہا تھا جو باہر سے

بڑے پرسکون دکھائی دیتے ہیں۔“

اس کے بعد اس کی بیوی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔

شاید وہ بھی پوچھنے کے لیے جا چکی تھی۔ جواب مل گیا اور وہ سو

گئی آج اسے چرموٹے والا خوش نصیب لگ رہا تھا۔ کیونکہ خود

اس کی پینڈا ڈانڈ بھی اور یوں لگتا تھا جیسے اب وہ جب تک قصبہ

پہاڑی میں ہے سونے کی حسرت میں جاگتا رہے گا۔ اس نے

باری باری فراز اور عمران کی طرف دیکھا اور ان جیسا بیٹے کے

لیجے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا

تھا آج اسے یہ بے چینی کیوں ہے۔ اس لیے کہ اس نے فراز

کو چھپے ہوئے دیکھا ہے؟ اس لیے کہ روشنی کے بقیہ طور پر کم

ہو جانے پر عمران کو بہت باتیں سننے کوئی ہیں؟ اس لیے کہ آج

اسے کیا لاش پور بہت یاد آیا ہے یا اس لیے کہ اس کی نظر آج راحیلہ پر پڑی ہے؟ یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے بعد سے ہی دل میں ایک چور آکر بیٹھ گیا ہے۔ شاید یہی بات ٹھیک ہے لیکن مجھے خود پر قابو پانا چاہیے۔ اگر عمر اندھنے میری کیفیت کو بھانپ لیا اور عورت ہونے کے ہاتھ اس نے چٹنی کے سبب کی گھر کی تک پہنچ گئی تو میرے اعتماد کا کیا ہوگا۔ یہی تو وہ شے ہے جو رشتوں کو ہٹائے رکھتی ہے۔

اسے یوں لگا جیسے دیواروں کی آنکھیں کھل آئی ہیں۔ وہ تمام آنکھیں اندھیرے میں اسے تلاش کر رہی ہیں۔ وہ اگر پکڑا گیا تو ان آنکھوں پر میرا ہر راز عیاں ہو جائے گا۔ مردہ راز جو ابھی تک میں نے خود پر بھی عیاں نہیں کیا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ گیا۔ بلی کے قدموں کی طرح آواز کیے بغیر چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کا حلق پیاس کی شدت سے خشک رہا تھا جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آیا ہو۔ وہ صحن میں مٹکے پانی کے پٹلے کے قریب گیا اور اوپر نیچے دو گلاس خشک حلق کے حوالے کر دیے۔ بڑی دیر تک اسی دیوار کی طرف دیکھتا رہا جس کے دوسری جانب وہ عورت بھی تھی جسے اس نے شام کے وقت گلی میں دیکھا تھا جو روشنی کی ماں تھی جس کا نام راحیلہ تھا۔ اس عورت سے میرا کیا رشتہ ہے؟ میں اس کے لیے کیوں جاگ رہا ہوں۔ وہ خود کو عیادت کرنے لگا۔ کوئی اگر عمر اندھ کے لیے اس طرح جاگے اور مجھے معلوم ہو جائے تو میں اس کے بارے میں کیا سوچوں گا۔ میں عمر اندھ کی امانت ہوں۔ اس طرح کسی اور کے لیے جاگنا اس امانت میں خیانت ہے۔ وہ پھر کمرے میں چلا آیا۔ وہ پھر بستر پر تھا اور خیالوں کی پورگیں گھمائی۔ انہی خیالوں سے لڑتا ہوا وہ کسی وقت سو گیا۔

صبح اس کی بیوی نے اسے اسکول جانے کے لیے اٹھایا تو اس کا بدن بخار سے جھل رہا تھا۔ اس کی بیوی نے گھبرا کر اس کی گلائی چھوڑ دی۔

”ارے آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔ رات بہت تیز ہوا چل رہی تھی اور آپ گلی میں ٹھک گئے تھے۔ یہ بخار اسی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ لیٹے رہیے اسکول جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ڈراؤن نکل آئے تو ڈاکٹر سے دوا لے آئیے گا۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلی چلوں گی۔“

”نہیں عمر اندھ میں اسکول ضرور جاؤں گا۔ فرائز کو بھی تیار کر دو۔“

”ایک دن چھٹی کر لو گے تو اسکول بند نہیں ہو جائے گا۔“

”میں اسکول جا کر ڈاکٹر کو دکھا آؤں گا۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس لیٹے رہیے،“ عمر اندھ نے اٹھتے ہوئے ایاز کو دہرا دہرا دیا۔

”میں گھر میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے اسکول جانا ہے۔“ وہ اتنی زور سے چلا کہ کمرہ گونج گیا۔ فرائز بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”اب میرے ہوتے ہوتے بھی آپ کو گھر اچھا نہیں لگتا۔ کیے دیجیے فرائز کو تیار۔ طے جائے اسکول۔“ ایاز کو اتنی دھشت ہو رہی تھی اسے اتنی جلدی تھی کہ جی چاہتا تھا تیار ہوئے بغیر ہی اسکول چلا جائے۔ دلی میں ایک خوف سا بیٹھ گیا تھا کہ اگر وہ گھر میں رہا اور راحیلہ آئی تو پھر اس کا آتما سا مٹا ہو جائے گا۔

فراز تیار ہو چکا تھا۔ ایاز نے چپکے سے دروازہ کھولا اور گردن باہر نکال کر فرائز کا جائزہ لیا۔ راحیلہ کا دروازہ اچھی طرح دیکھا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ راحیلہ کا دروازہ بند ہے تو وہ باہر نکل آیا۔ فرائز اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا لیکن آج ایاز کی رفتار اتنی تیزی کی کہ اسے پاپ کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ اسکول سے واپس آیا تو فرائز کو اس طرح اپنے پاس لے کر لیٹ گیا جیسے مرنے اپنے چوڑوں کو چیل سے بچاتی ہے۔ شام ہوئی تو فرائز کو لے کر باہر نکل گیا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر فرائز گھر پر رہا تو نقصان روشنی کے گھر چلا جائے گا اور اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ روشنی کے ساتھ کھیلے۔

وہ گھر واپس آئے تو شام نے ابتدائی رات کا لباس پہن لیا تھا۔ اب اسے کوئی ذرا نہیں تھا کہ راحیلہ یا روشنی آئے گی لیکن پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ وہ فرائز کو پر حائلے بیٹھ گیا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ اسے اتنا مصروف کر دے کہ اسے کوئی روشنی کے ساتھ کھیلنے کا وقت ہی اس کے پاس نہ رہے۔

کتابیں بند ہونے اور دست خوان لپٹ جانے کے بعد صرف اتنا ہی وقت رہ گیا تھا کہ کچھ دیر گلی میں ٹھٹھکے کے بعد بستر پر دراز ہو جایا جائے۔

”آؤ پاور، ذرا گلی میں ٹھٹھک کر کھانا ہضم کرتے ہیں۔“ اس نے فرائز سے کہا۔

وہ فرائز کو لے کر گلی میں آ گیا تھا۔ گلی میں روز کی طرح گھٹ پھٹا ہوا تھا۔ وہ ٹھٹھا ہوا گلی کے آخری کنارے تک آ گیا۔ جب واپس ہونے لگا تو فرائز نے خاموشی توڑی۔

”ابو، ایک بات کہوں۔“
”کوئی بات نہ ہو۔“
”کیا ہم گلیاں پور واپس نہیں جاسکتے۔“
”کیوں نہیں جاسکتے۔“
”تو پھر واپس چلیں، یہاں رہنے کا کیا فائدہ جب میں

روشنی کے ساتھ کھیل بھی نہیں سکتا۔“
”نہیں معلوم ہے روشنی کی ماں نے تمہاری ماں کی کتنی بے عزتی کی ہے۔“

”اس میں روشنی کا کیا قصور۔ وہ کتنا رورہی ہوگی میرے ساتھ کھیلنے کے لیے۔“

ایاز کے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور اب گھر بھی نزدیک آ گیا تھا۔ اس نے فرائز کو موقع نہیں دیا تھا کہ وہ کوئی اور بات کرے۔

گھر میں آیا تو عمر اندھ کی قربان پر بھی یہی شکایت تھی کہ ایک پڑوس تھا، کچھ دل نہیں جاتا تھا اب میں اس سے بھی گئی۔ آپ نے بھی منع کر دیا ہے کہ میں راحیلہ سے رابطہ طیبہ نہ رکھوں ورنہ میں خود جا کر معافی مانگتی۔ اس کی بڑی رشتہ ہوں۔ اس سے تو ابھی میں کیلاش پور میں گئی۔ دل گھبراتا تھا تو کم از کم مارکٹ ہی کا ایک چکر لگا آیا کرتی تھی۔ یہاں تو عورتیں یا زار میں نکل بھی نہیں سکتیں۔ وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو کئی بڑے بڑے سوال اس کے سامنے تھے۔ ان میں سے ایک کا بھی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

وہ صبح سو کر اٹھا تو عمر اندھ ابھی جا ہی نہیں تھی حالانکہ وہ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی بیدار ہو چکی تھی۔ ناشتا وغیرہ بنانے کے بعد اسے بیدار کر دیتی تھی۔ ایاز نے گھر کی میں وقت دیکھا۔ وہ وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلا اور بے اختیار سیز جیالے طے کر کے چھت پر پہنچ گیا جیسے کسی نے اسے بلایا ہو۔ ارد گرد کے پہاڑوں پر نظر پڑی۔ پہاڑوں پر کبکری چادر پڑی ہوئی تھی۔ اچھی سورج نے ان پہاڑوں کی اوٹ سے چھانکنا شروع نہیں کیا تھا۔ اسے انہوں سے ہوا تھا کہ وہ ایسا منظر دیکھنے اس سے پہلے چھت پر کیوں نہیں آیا۔ پہاڑوں سے نظریں تو وہ راحیلہ کی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

اس وقت راحیلہ نہ جانے کیا کر رہی ہوگی۔ سو کر اٹھی بھی ہے یا نہیں۔ اٹھ تو گئی ہوگی۔ روشنی کو بھی تو لاسکول جانا ہوتا ہے۔ اگر وہ میرے اسکول میں پڑھتی ہوئی تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں اسے روز دیکھ لیا کرتا۔ شاید کسی کام سے راحیلہ چھت پر آجائے۔ میں اسے دیکھ لوں اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ وہ کتنی ہی دیر چھت پر ٹھٹھا رہا۔ ٹھٹھکے ٹھٹھکے وہ اس دیواری طرف چلا گیا جہاں چھت سے لگی نظر آتی ہے۔ کچھ پتے گھروں میں سے اسکول جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ وہ ان پھولوں کو دیکھتا رہا۔ شاید روشنی بھی اپنی ماں کے ساتھ گھر سے نکلے۔ اس نے گردن پر تھمبی کی اور اپنی آنکھیں راحیلہ کے دروازے پر رکھ دیں۔

وہ ٹھٹھک ہا کر وہاں سے ہٹے ہی والا تھا کہ راحیلہ کا دروازہ کھلا اور راحیلہ کا شہر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے راحیلہ بھی باہر آئی تھی۔ راحیلہ کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ کوئی اسے اوپر سے دیکھ رہا ہے۔ راحیلہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کر رہی تھی۔ ایاز کی آنکھیں نہ جانتے کیوں خود بخود جھک گئیں۔ اگر کچھ دیر اور میں یہاں کھڑا رہوں تو روشنی کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی تو اسکول کے لیے نکلے گی۔

”ابو، چلے نا شتا کر لیں۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔“ فرائز کی آواز اس کے کانوں میں آ گئی۔ اس نے سر ہل دیا۔ فرائز اسے بلانے چھت پر آ گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتا کر کے دیکھنے وہ یہاں کھڑا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چھت سے نیچے اتر آیا۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد فرائز کے ساتھ باہر نکلا تو آج پہلی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ عمر اندھ اسے رخصت کرنے کے دروازے پر آئے۔ وہ ٹھوڑی دیر دروازے پر رہا کبھی رہا لیکن عمر اندھ کا یہ معمول تھا ہی نہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن وہ جان بوجھ کر اسکول کے وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا۔ چڑوں کی طرح سے نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔ آج کھر اٹھا تھا کہ ہاتھ بھر کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کھر کے اس پار راحیلہ کی چھت پر کوئی آیا تھا۔ ایاز کا خون اس کی رگوں میں جھٹکے لگا۔ شاید راحیلہ بھی مجھے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں چھت پر آتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھنے آئی ہوگی۔ براہواس کھر کا کچھ نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔

دھوپ میں چلتا ہوا یہ سارے چھت کے ایک خاص حصے تک آیا۔ شاید اس دیوار تک جہاں کھرے ہو کر دوسری چھت کو دیکھا جاسکتا تھا۔ پھر وہ سایہ اسی دھوپ سے لڑتا ہوا واپس ہو گیا اور نیچے اترنے والے نئے تک چلا گیا۔

کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور سورج نکلنے کے انتظار میں اسکول کا وقت گزر جاتا۔ اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کھر کی چادر یہاں بھی چھپی ہوئی تھی۔ وہ واپس ہو کر چھت سے نیچے آ گیا۔ عمر اندھ کی بھی اور بچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ ایاز بے دلی سے تیار ہونے لگا۔

وہ اسی کھر میں گھر سے نکلا اور اسکول کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسکول تک پہنچے پہنچے کھر کم ہو گئی تھی لیکن اب وہ لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔

اچھے دن اسکول کی چھٹی تھی۔ اس نے ایک دن پہلے

ہی پروگرام بنایا تھا کہ وہ فراز اور عمران کو لے کر جیسے سے وہ میل دور وادع جھیل پر چائے گا۔ دن بھر وہاں گزار کر شام کو گھر آئے گا۔

اسے گھر سے دشت ہونے لگی تھی۔ عجیب سی نفسیات ہوئی تھی۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ راحیلہ اسے نظر آتی رہے اور یہ بھی چاہتا تھا کہ راحیلہ کو معلوم ہو کہ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ فراز روشنی کے ساتھ کھیلے۔ اسی لیے وہ فراز کو اپنے ساتھ لگے رکھتا تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔ اسے معلوم تھا راحیلہ دیر سے سوکر اٹھی گی۔ اس کا شور بھی شاید نہ جائے۔ وہ دروازے پر بھی نہیں آئے گی۔ اس لیے وہ چھت پر بھی نہیں گیا۔ دن چڑھنے سے پہلے وہ بیوی بچوں کو لے کر گھر سے نکل گیا۔ جھیل تک جانے کے لیے ٹیکساں چلی گئی تھی۔ اس نے بھی کبھی گری۔

عمران بے خبر جی کہ وہ کس سے بچ کر یہاں آیا ہے۔ وہ تو بس یہ سمجھ رہی تھی کہ کیا فراز کا کتنا خیال ہے۔ اسے شرف حق کے لیے جھیل پر لے آیا حالانکہ وہ چھٹی کے دن آرام بھی کر سکتا تھا۔ وہ جھیل بھی بھی اس جگہ کہ وہ خوش ہوگی۔ پتا بھی نہیں چلا کہ دن کب گزر گیا۔

ایاز کی بے یقینی روز بروز جاتی جاتی تھی۔ اب وہ بھی اسکول جانے سے پہلے باقاعدگی سے چھت پر چاہا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد بھی وہ پھر سے شام تک صدا بچکر لگا لیتا تھا۔ مگر سب اسے کامیابی بھی ہوئی۔ اسے راحیلہ کی ایک جھلک نظر آگئی۔ پھر اس نے اوپر کے کمرے میں ایک میز اور ایک کرسی ڈال لی کہ یہاں بیٹھ کر کچھ پڑھ لکھ لیا کروں گا۔

عمران اس کی ان بے تابوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ منہ پھٹ عورت تھی آخر ایک دروازہ چھ ہی لیا کہ وہ ہر وقت چھت پر رہنے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔ اس کے پوچھنے کا مفقہ یہ تھا کہ مجھ سے اسے بے زاریوں ہونے لگی۔ ایاز نے محسوس کیا کہ اسے اب راز کھلنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ عمران کسی دن راحیلہ کے پاس بھی پہنچ جائے گی اور اس سے کہے گی، میرا میاں تمہاری وجہ سے چھت پر آتا ہے۔ دو اپنی میز کرسی اٹھا کر نیچے لے آیا۔

اب اس نے چھت پر جانا چھوڑ دیا تھا لیکن یہاں سے یہاں سے دن میں کئی مرتبہ جھیل میں جھانک آتا تھا کہ کسی طرح راحیلہ کو دیکھ لے یا روشنی نظر آجائے لیکن راحیلہ نے روشنی کو نہ جانے کس غلاف میں چھپا لیا تھا کہ اس کی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ راحیلہ کو تو اس نے ایک مرتبہ سبزی خریدتے ہوئے دیکھ بھی لیا تھا لیکن روشنی اسے پھر بھی نظر نہ

آئی۔ وہ اسکول کب جاتی ہے وہ اس کب آتی ہے کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ راحیلہ نے اسے کسی دشتے دار کے پاس بھیج دیا ہے یا گھر میں ہی کہیں چھپا دیا ہے۔ ایک معاہدہ بچھنے کا نہ سمجھائے گا۔

وہ تلاش کی اس صوب چھاؤں سے جنگ آچکا تھا۔ عمران نے بھی اپنی چڑ چڑی ہوئی تھی کہ اس سے لڑی ہی رہتی تھی۔ وہ سوچنے لگا اگر وہ قصبہ پھاڑی میں مزید کچھ دن رہا تو باکل ہو جائے گا۔ پائل کب تک بھی ہوا تو کسی نہ کسی دن یہ راز تو کھل کر رہے گا۔ اسے فراز کی فکر بھی تھی۔ وہ اسے روشنی سے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ سال دو سال بعد فراز بڑا ہوا جائے گا تو پھر اسے روشنی سے دور رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ میں اگر کیکاش پور واپس چلا جاؤں تو یہ سب مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔ یہاں رہوں گا تو راحیلہ کی نقشش مجھے چھت پر رہے گی۔ اسے متناہس یاد آگیا۔ متناہس ایک خاص فاصلے سے لوے کو اپنی طرف پھینچنے سے لیکن اگر فاصلہ بڑھا دیا جائے تو اس کی نقشش بے کار ہو جاتی ہے۔ میں بھی راحیلہ سے بہت قریب آگیا ہوں مجھے دور ہو جانا چاہیے ورنہ وہ طوفان آسکتا ہے جو دو گھروں کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔

”عمران، میںا بڑے شوق سے یہاں آیا تھا مگر اب میرا دل چاہت ہو گیا ہے۔“ ایک دن ایاز نے عمران سے کہا۔ ”میں تو شوق سے بھی نہیں آئی تھی۔ مجھ سے تو پوچھو مجھ پر کیا گزر رہی ہوگی۔“

”سوچتا ہوں ٹرانسفر کر کے واپس چلا جاؤں۔“ ”مجھے تو اس قصبے میں آسپ معلوم ہوتا ہے، آپ بھی بدل گئے ہیں وہ نہیں رہے جو وہاں پر تھے۔ تنہائی کی قید ہے جو ہم دونوں کا رہ رہے ہیں۔“

”مجھ پر حکومت کی طرف سے یہ پابندی ہے کہ ایک سال سے پہلے ٹرانسفر نہیں کر سکتا ورنہ ہی سامان اٹھاؤں۔“ ”ایک سال میں دو مہینے تو کم رہ گئے ہیں۔ کچھ دن اور کانٹوں پر سوں کی۔ فراز کے امتحان بھی ہو جائیں گے۔“ ”یقینی کرو۔ اب یہاں رہنا پس جاتا۔“

عمران تو جیسے خوشی سے پاگل ہوگئی۔ جو بات وہ کہتا چاہتی تھی، ایاز نے خود کہہ دی تھی۔ ستا رہی کیا کرتی تھی، بس وہ دن کتنے میں لگی تھی کہ کب دو مہینے پورے ہوں اور کب وہ یہاں سے جائے۔

دن تو کبھی میں بندرت کی طرح ہوتے ہیں۔ ریت آہستہ آہستہ کہ ہوتی رہتی ہے وہ دن گزرتے دے تے ہیں وہ دن بھی کب رکھنے والے تھے۔

ایاز نے ٹرانسفر کی درخواست دیدی تھی۔ اس سلسلے میں اسے ایک آدھ مرتبہ کیکاش پور بھی جانا پڑا۔ یہاں سے ٹرانسفر ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔ ایاز نے یہ تک سوچ لیا تھا کہ اگر درخواست منظور نہیں ہوئی تو وہ اسے کتنی اب یہاں نہیں رہے گا۔ آخر سخت جدوجہد کے بعد اس کا ٹرانسفر ہو گیا۔

”عمران کل تو ہم جا رہے ہیں۔ تم جا کر اپنی پڑوس سے مل آؤ۔ کیا خراب ملنا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔“ ”اس عورت نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے اس کے بعد ملنے کو دل نہیں چاہتا کس آپ کہتے ہیں تو چلی جاتی ہوں۔“ ”فراز کو بھی چینی جاؤ۔“

ایاز یہ جانتا چاہتا تھا کہ ہمارے یہاں سے جانے پر راحیلہ کے تاثرات کیا ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس نے عمران کو اس سے ملنے کی اجازت دی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ آخری مرتبہ چھت پر گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے راحیلہ کے آنے کی امید تھی بلکہ اس لیے کہ وہ ماضی کی یادوں کے طور پر اس چھت کو اپنی آنکھوں کے خزانے میں بند کر لیتا چاہتا تھا۔ وہ بڑے دھڑکے سے ان دونوں چھتوں کو دیکھتا رہا اب یہاں کیا آنا ہوگا۔ کبھی راحیلہ کو دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اب شاید وہ کبھی دیکھنے کو نہ ملے۔ روشنی کے لیے میں کچھ نہیں کر سکا۔ مجھے وقت سے دیکھ لیں گا۔ کبھی میرے لیے بہت ہوگا۔ زبردستی نہیں مجبور ہوں کام تام ہے۔

عمران جب تک آپس کی وہ چھت پر ہی رہا۔ عمران کے آنے کے بعد وہ بھی اترا آیا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ راحیلہ کے تاثرات کیا تھے لیکن آغاز خود عمران نے نہ کر دیا۔ ”عجب پر اسرار عورت ہے، مجھ کو اس سے ڈر لگنے لگا ہے۔“ ”وہ کیا ہو گیا۔“

”یا تو ایسی فحاشی کہ بالکل ہی ہمارا پکاٹ کر دیا تھا یا مجھے گلے سے لگا کر ایسی روٹی کہ مجھے بھی رلا دیا۔“ ”ہاں پھرنے کا احساس ہوتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ ”کہہ رہی تھی بعض مجبور یاں ایسی تھیں کہ مجھے تم سے قطع تعلق کرنا پڑا۔ اس قطع تعلق میں میرا نہیں تمہارا فائدہ تھا۔ بھلا بناؤ تو میرا کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔“

”تم نے پوچھا نہیں وہ کیا مجبور تھی۔“ ”پوچھا تھا، کہنے لگی میرے عجیب شور سے میرا سبکی وعدہ تھا۔ بھلا بناؤ، یہ کوئی جواب ہوا البتہ ایک بات اس نے بڑی معقول کہی۔ کہنے لگی، آپ لوگ برابر میں تھے تو یہ احساس رہتا تھا کہ کوئی اپنا ہے۔ آپ لوگ چلے جائیں گے تو مجھ پر وہی تنہائی کوئی نہ کوئی یہاں آکر ضرور رہے گا مگر آپ کی

بات اور تھی۔“ ”روشنی کو لے آئیں۔ میں ایک نظر دیکھ تو لیتا۔“ ایاز نے کہا۔

”وہ سو رہی تھی۔“ ”یہاں کیا ہوگا۔“ ”نہیں، میں خود کچھ کر آئی تھی۔ وہ کمرے میں سو رہی تھی۔“ ”خیر، پرانی اولاد پر ہمارا کیا حق۔“

”آپ یہ کہہ رہے ہیں۔ میں نے جب کہا کہ ایاز، روشنی کو دیکھنا چاہتے ہیں تو اس نے کہا۔“ ”یہ ان کی بیٹی ہے، جیسے ہی سو کر اٹھے گی میں خود لے کر تمہارے پاس آؤں گی۔“ ”کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی شاید راحیلہ ہوگی۔ روشنی کو لے کر آئی ہوگی۔“

”اسے اندر مت بلانا۔“ ایاز نے کہا۔ ”صرف روشنی کو لے آنا۔“ ”وہ آگیا چاہے گی تو میں کیا منع کر دوں گی۔“ ”مجھ مجبور ہے۔“ ایاز نے کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا کہ اگر راحیلہ اندر آجائے تو اس سے سامنا نہ ہو۔

راحیلہ نے اندر آنے کو نہیں کہا صرف روشنی کو چھوڑ کر چلی گئی اور یہ بھی کہہ گئی کہ تم خود اسے چھوڑ جانا، میں لینے نہیں آؤں گی میری تمہاری ملاقات اب سچ ہی ہوگی۔

روشنی جیسے ہی اندر آئی ایاز نے اسے گود میں اٹھالیا۔ بے اختیار اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”بڑی پیاری بیٹی ہے کل کے بعد اس سے ملاقات کہاں ہوگی۔ خدا اس کا مقدر اچھا کرے۔“

ایاز اور فراز دونوں مل کر اس کے ساتھ کھیلے رہے۔ رات کا کھانا بھی روشنی نے ان کے ساتھ کھایا۔ اسے تو شاید یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ کل چلے جائیں گے۔ وہ اپنی باتوں سے سب کو ہنساتی رلاتی رہی۔ پھر کہنے لگی مجھے غنیمت آ رہی ہے مجھے میری امی کے پاس چھوڑ آؤ۔ عمران اسے اس کے گھر چھوڑ آئی۔

فراز اس دوران بالکل جب رہا تھا۔ اس نے روشنی کے ساتھ اکیلے میں کھیلنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ نظر یہ لگتا تھا کہ وہ اس سے تاراش ہے۔ اس کے جانے ہی وہ ہنسی پر اونٹھ سے منگر پڑا اور سسکیاں بھر بھر کے رونے لگا۔ عمران اندر گئی تو اسے روتے ہوئے دیکھا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کیوں روت رہا ہے۔ اس نے اس کا سراپا گود میں رکھ لیا۔

”بیٹا، ہمیں یہاں بیٹھ نہیں رہنا تھا۔ کبھی نہ کبھی تو یہاں سے جانا تھا۔ روٹی کو ہم ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ اسے بھول جاؤ ہم کیلاش پور جا رہے ہیں۔ وہاں تمہارے پرانے دوست ملیں گے۔ ان کے ساتھ خوب کھیلنا۔“

”آپ لوگوں نے مجھے روشنی کے ساتھ نہیں کھیلنے دیا۔ اب دیکھنا میں کسی کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ زندگی میں میرا کوئی دوست نہیں ہوگا۔“

”کیسا نہیں کہتے بیٹا۔ ابھی تمہیں خوب پڑھنا ہے۔ پڑھ کر بڑا آدمی بننا ہے۔“

وہ رات اسی طرح گزر گئی۔ ایاز یہاں سے جاتا بھی جاتا تھا اور اب اسے بچہ وہ کھنٹی ہو رہا تھا بالکل اسی طرح جیسے کسی کے گھر چوری ہو کر چور تھوڑا مال لے جائیں بہت سارا چھوڑ جائیں۔ اس چوری کا انفسوس بھی ہوگا اور خوشی بھی کہ بہت سارا مال بچ بھی تو گیا۔ اس نے یہاں آکر بہت کچھ گنوا دیا تھا مگر بہت کچھ بچا کر بھی لے جا رہا تھا۔ صبح ہوئی تو وہ دو تانگے لے کر آگیا۔ سامان زیادہ ہو گیا تھا لہذا ایک تانگے پر سامان رکھا گیا دوسرے میں عمرانہ، فراز اور وہ خود بیٹھا۔

جس وقت تانگے میں سامان رکھا جا رہا تھا اس نے دیکھا راجیل کے دروازے سے دو آنکھیں باہر جھانک رہی تھیں۔ یہ بیٹھنا راجیل بھی جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے رخصت کر رہی تھی۔ روشنی اسکول بھی ہوئی تھی۔ وہ جب آئی ہوگی تو اسے معلوم ہوا ہوگا کہ بیٹرا خالی پڑا ہے۔ پچھلی اڑ گیا۔

دو تانگے ایک ساتھ چلے۔ ایاز بڑی دیر تک آگے کا سفر جیسے کی طرف دیکھتا رہا۔ تانگے اسی بازار سے گزر رہے تھے جہاں سے کیلاش پور سے آتے ہوئے گزر رہے تھے۔ عمرانہ اب ان دو کانوں کو غور سے نہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کی حقیقت اس پر کل بجلی تھی۔ اب اسے سرو کے درختوں، پھولوں کی مہک اور چھتوں کی پلکار کا انتظار نہیں تھا۔ اب وہ کیلاش پور میں آباد اپنے ان رشتے داروں کو یاد کر رہی تھی جن کے گھر اسے اس وقت تک ٹھہرنا تھا جب تک کرایہ کا کوئی معقول گھر ایاز کو نہیں مل جاتا۔ انہی خیالوں میں وہ انجین تک پہنچ گئی۔ تانگے والوں نے وہ سامان پلیٹ فارم تک پہنچا دیا اور گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ ان سے کہی گئی ہوئی تھا کہ اس سامان کو گاڑی میں بھی رکھوا لیں گے۔

ایک سال میں کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی پلیٹ فارم تھا۔ وہی اکیلا پن تھا، وہی بوڑھا ہری جھنڈی دکھانے والا

پڑتا جس کا سامنا اسے اب کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے اساتذہ کو اس سے یہ شکایت نہیں تھی کہ وہ شرارتی ہے یا کسی کو اس کی ذات سے نقصان پہنچ رہا ہے لیکن یہ شکایتیں روز آتی تھیں کہ زندہ لوگوں کی طرح ہے ہی نہیں۔ ایک چلتی پھرتی روح ہے جو کلاس میں آکر بیٹھ جاتی ہے اور اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ ذہن ترین لڑکا نہایت سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس پر نہ کسی کی ڈانٹ کا اثر ہو رہا تھا نہ کسی کی مار کا۔ اس کا حافظہ اتنا زبردست تھا کہ مبینہ اگر ایک دفعہ بھی پڑھ لیتا تو زبانی یاد کر لیتا لیکن حافظہ بھی جب کام کرتا جب وہ کچھ پڑھتا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جان بوجھ کر کتنی بادی نہیں کر رہا ہے۔

استحان کے دن آئے۔ عمرانہ اور ایاز نے بہت سمجھا یا تو بے دلی سے کچھ پڑھ لیا۔ استحان بھی پاس ہو گیا لیکن ایسے فہر نہیں آئے جو اس جیسی ذہانت کے حامل لڑکے کا حق بننا تھا۔ وہ جس سطر، جس چرے کو دیکھ لیتا تھا، اس کے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا تھا۔ اس نے کچھ دن روشنی کے ساتھ گزارے تھے۔ یہ بچی اس کے ذہن میں محفوظ ہو گئی تھی۔ وہ اسے بھلا نہیں پا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بھی بیٹھ گئی تھی کہ اس کے ماں، باپ نے اسے روشنی سے دور کر دیا۔ پہلے تو اس کے ساتھ کھینچنے پر پابندی لگائی اور پھر اسے لے کر کیلاش پور آگئے۔ وہ دونوں کھنڈر وار کھنڈر تھا اور اپنی دانست میں دونوں سے بدلتے رہا تھا۔ جو کچھ میں لے جا رہا انہوں نے نہیں دیا۔ اب جو کچھ ہے چاہتے ہیں میں انہیں نہیں دوں گا۔ یہی سبب تھا کہ وہ بڑے بڑے برتویہ ہی نہیں دے رہا تھا۔ ایذا پسند ہو کر رہ گیا تھا۔ جو شخص ایذا پسند ہو جائے وہ خود کو اذیت پہنچا کر بھی خوش ہوتا ہے اور دوسروں کو اذیت میں مبتلا کر کے بھی خوش ہوتا ہے۔ فراز اپنے والدین کو اس اعزاز میں اذیت پہنچا رہا تھا کہ ان کی امیدوں پر پانی پھیرتا جا رہا تھا اور خود کو اس طرح اذیت پہنچا رہا تھا کہ اس عمر میں بھل کد سے دور ہو گیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور شاید خود کو قصبہ پہاڑی کے قلعے کو چوں میں لے جاتا۔

ایاز اسکول ماسٹر تھا۔ اگر دولت مند ہوتا تو کسی نفسیاتی ماہر ڈاکٹر سے فراز کا علاج کرایا جاسکتا تھا۔ یہ سیدھا سا نفسیاتی معاملہ تھا لیکن اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ بھی ہوگا تو ان ڈاکٹروں کی فیس کون دیتا۔

عمرانہ اپنے رشتے کے ایک بھائی کے گھر بھی ہوئی تھی۔ ان دنوں پریشانی تو تھی ہی وہاں فراز کا ذکر آیا تو ان باتوں کو چھپا نہ سکی جنہیں اب تک چھپائی رہی تھی۔ بھائی کے سامنے فراز کی حرکتوں کا ذکر کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”بھئی، تم میاں بیوی اب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو اور بچے کی یہ حالت ہوئی۔ اس پر تو کوئی اثر ہے۔ اگر نہ ہوا تو کسی جھپٹا پھونک کرنے والے کو دکھا کر دیکھ لو۔ اگر میری بات جھوٹ لگی تو اپنی تاک کٹوا لوں گا۔“

”بھائی، ہمارا کون ایسا دشمن ہے جو میرے بچے پر جادو کرانے لگا۔“

”صرف جادو ہی کچھ نہیں ہوتا۔ تم لوگ اس پہاڑی قصبے میں جا کر رہے تھے۔ وہ تو جنگل ہے، کسی کی پلیٹ میں آگیا ہے بچہ۔“

”مگر وہاں تو دھماکا خاصا تھا۔“

”ایک تو تم بحث بہت کرتی ہو۔ ایسی چیزوں کا اثر بہت بعد میں ہوتا ہے۔ جو بلا اس سے بچی ہے وہ اب اپنا اثر دکھا رہی ہے۔“

”بھائی صاحب، آپ ہی کچھ کریں۔ میں تو ایسے کسی معالج کو جانتی نہیں ہوں اور ایاز تو سرے سے تعویذ گنڈوں کے قائل ہی نہیں۔ میں کس سے کہوں کس کے پاس جاؤں۔“

”میری نظر میں ہیں دو ایک جن اتارنے والے لیکن اس کے لیے ہمیں ایاز بھائی کو تیار کرنا پڑے گا۔ لے لے میں جاؤں گا لیکن ان کا ہونا ضروری ہے۔ کئی کھان کو کوئی بات ہوگی تو بھائی پرانی اولاد کو معاملہ ہے۔“

”مائے میں کیا کروں۔ میرا بچہ تو گیا ہاتھوں سے، میرا ایک ہی تو بچہ ہے۔“

”بھئی، تم روٹی کیوں ہو۔ تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے۔ تم ایاز بھائی کو بھلاؤ۔ اگر وہ نہیں بھی مائے تو میں تمہیں لے چلوں گا۔ علاج تو بھر حال کرانا ہے۔“

عمرانہ روٹی دھوئی گھر آگئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایاز کے کانوں میں بات ڈالی۔ وہ پہلے تو بہت گھڑا۔ ان علاج کرنے والوں کو پرا بھلا بھی کہہ ڈالا لیکن وہ خود اتار پریشان ہو چکا تھا کہ بالآخر تیار ہو گیا مگر اس شرط پر کہ وہ خود نہیں جائے گا، عمرانہ کو اجازت دیدے گا۔ عمرانہ کے لیے اس کی اجازت یہ بہت تھی۔ اس نے اپنے بھائی سے کہا اور ان کے ساتھ فراز کو کسی بھائی سے وہاں لے گئی جہاں اس کے بھائی کے بقول روحانی علاج ہوتا تھا اور انہی کے بقول جو صاحب یہ کام کرتے ہیں۔ وہ بہت پیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے قبضے میں بہت سے موگل ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

عمرانہ کے بھائی کے ان جملے غیر صاحب سے بہت اچھے تعلقات تھے لہذا وہ ان سے اکیسے میں ملا اور انہیں بتایا کہ اس کی بہن اپنے بچے کی طرف سے بہت پریشان ہے۔

یہ لوگ قصبہ پہاڑی میں جا کر رہے تھے۔ وہیں سے کوئی بلا بچے کے پیچھے لگ گئی ہے۔ باقی باتیں آپ ان سے خود معلوم کر لیجئے گا۔

ضیافت الایقانہ عورتوں کا دلکش لگا ہوا تھا لیکن تعلقات کی بنا پر عمارت کو پہلے بلا لیا گیا۔ فراز بھی حیران پریشان ان کے ساتھ تھا۔

”آؤ آ جاؤ۔ مجھے معلوم تھا تم اپنے بچے کو لے کر یہاں ضرور آؤ گی۔ وقت پر آ گئیں ورنہ کھیل بگڑنے ہی والا تھا۔“ پھر صاحب نے عمران کو دیکھتے ہی کیا۔

عمران نے کچھ کہے کو نہ کھولا ہی تھا کہ اس جعلی حیر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا اور مزہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ عمران اس کے سامنے دم بخود بیٹھی تھی۔

”میرے موکل آ گئے ہیں، میں ان سے تمہارے بچے کے بارے میں پوچھتا ہوں۔ خبردار بیچ میں مت بولنا۔“ حیر نے کہا اور پھر اپنے موکل سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھو، یہ خاتون جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہیں ان کے بچے کو دیکھو اور بتاؤ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔“

پھر صاحب، اس طرح خود سے سننے لگے جیسے کوئی انہیں کچھ بتا رہا ہے۔ بیچ میں ہوں ہاں بھی کرتے جا رہے تھے۔ جب یہ گفتگو جسے ان کے علاوہ کوئی نہیں سن رہا تھا ختم ہوئی تو انہوں نے موکل کو طے جانے کا حکم دیا اور عمران سے مخاطب ہوئے۔

”بچے پر سفلی کرایا کیا گیا ہے۔ تم سال دو سال پہلے شہر سے باہر گئی تھیں؟“

”جی ہاں پھر صاحب، میرے میاں کا ٹرانسفر ہو گیا تھا۔“

”تصہ پہاڑی گئی تھیں۔“

”جی پھر صاحب، آپ پر تو سب روشن ہے۔“

”بچے پر سفلی وہیں کرایا گیا ہے اور بہت سخت ہے بچے کی جان بھی جا سکتی ہے۔“

”پھر صاحب، کون کراسکتا ہے۔ ہماری تو کسی سے دشمنی بھی نہیں۔“ عمران رونے لگی۔

”ہمیں نام بتانے کی اجازت نہیں صرف اشارہ دے دیتا ہوں، کرانے والی عورت ہے۔“

”میں کبھی۔ یہ اسی حرام زادی کا کام ہے۔“

”آپ جانیں۔“

”پھر صاحب، اس کا کوئی تو توبہ ہوگا۔“

”پانچ ہزار روپے لگیں گے۔“

”یہ تو بہت ہیں۔“

”میں اپنے لیے نہیں مانگ رہا ہوں، موکلوں میں تقسیم کرنے ہوتے ہیں۔“

”میں تو صرف دو ہزار لائی تھی۔“

”وہی نکالو، میں علاج تو شروع کروں۔ پندرہ دن کے تعویذ دے رہا ہوں۔ پندرہ دن بعد آؤ تو تین ہزار اور لے آنا۔“

پھر صاحب نے تعویذ لکھ کر دے دیے کھج تھار منہ پانی میں گھول کر پلا دینا اور بچے کی کوئی پینی ہوئی نہیں گھر کے اندر کی جگہ رکھ کر چلا دینا۔

عمران وہاں سے آئی تو غصے سے لال جلی ہو رہی تھی۔ اس کا شک را حیلہ پر تھا۔ اس نے آتی ہی را حیلہ کو گالیاں مٹی شروع کر دیں۔ درمیان میں روشنی کا نام بھی آتی جاتا تھا۔

ایاز اسے سمجھا رہا تھا ایسے جعلی حیر فراڈ ہوتے ہیں۔ ان کی باتوں پر اپنا خون مت جلاؤ لیکن وہ کہاں ماننے والی تھی۔ اس نے فراز کو باقاعدگی سے تعویذ پلانے شروع کر دیے تھے۔ اس کی ٹیٹھیں بھی جلا دی تھیں لیکن انھیں بیٹھے را حیلہ کو گالیاں بک رہی تھیں۔

فراز یہ سب کچھ سن رہا تھا اور اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ وہ روشنی کو کھول لیا تھا۔ دل ہی دل میں اسے یاد کرتا رہتا تھا۔ روشنی کے خالی سے را حیلہ بھی اسے مزید بھی۔ اسے یہ گالیاں نہ بھرگ رہی تھیں۔ اسے یان سے غرت ہونے لگی جو اس کی عزت پرستی کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ وہ ایک دن غصے سے پھٹ پڑا۔ اس نے مال کو منسوخ کیا اور جب وہ ٹیٹھیں مانی توئی وہی اٹھا کر زمین پر پٹ دیا۔ پکن کے برتن توڑ ڈالے۔ ایاز جب تک اسے کڑتا اس نے اچھا خاصا نقصان کر دیا۔

”دیکھا ہے سب سفلی کا اثر ہے۔ اس کا توڑ ہو رہا ہے تو جاؤ اپنا اثر دکھا رہا ہے۔“

”اس کے سامنے را حیلہ اور روشنی کو کیوں گالیاں مکتی ہو۔“

”میں تو بکوں گی۔ ابھی جانی ہوں پھر صاحب کے پاس۔ کرتی ہوں بند و بست۔“

وہ اسی وقت گھر سے نکلی، اپنے بھائی کو ساتھ لیا اور پھر صاحب کے پاس پہنچی گی۔ انہیں سارا احوال سنایا۔ انہوں نے پھر موکلوں کو بلایا۔ موکلوں سے گفتگو کی اور ایک شخصہندی سانس بھری۔

”تم نے اگر اس دن پورے پے دے دیے ہوتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ موکل تارا میں ہو گئے ہیں۔“

”پھر صاحب میں تمہیں ہزار لائی ہوں۔ یہ لیجئے۔“

”ہم کیا ہوا پانی دے رہا ہوں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد

بچے کے منہ اور سر پر اس پانی کے چھینٹے مارو، انشا اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب جاؤ تین دن بعد آنا۔“

عمران کی غیر موجودگی میں ایاز نے فراز کو پیار سے سمجھا دیا اور اس سے وعدہ لے لیا کہ آئندہ وہ نہ توڑ پھوڑ نہیں کرے گا۔ وہ کچھ گیا ابتدا عمران جب گھر آئی تو وہ پر سکون ہو چکا تھا۔ عمران نے پھر صاحب کے دیے ہوئے پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارے اور پھر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کو دوبارہ پانی دیا۔ وہ اس توڑ پھوڑ کے بعد اتنا ٹھیک چکا تھا کہ پڑ کر سو گیا۔

پھر صاحب نے یہی کہا تھا کہ پر سکون ہو کر سو جائے گا۔ یا اللہ میرے بچے کو چھپا کر دے۔“

”جب اللہ ہی سے مانگتا ہے تو اس جعلی حیر کے پتھر میں کیوں بڑی ہوئی ہو۔“

”تم ڈاکٹر کے پاس کیوں جاتے ہو پس اللہ سے شفا مانگ لیا کرو۔ کرتا تو اللہ ہی ہے مگر بعدوں کے ہاتھ میں بھی شفا ہوتی ہے۔ دیکھو فائدہ ہوا یا نہیں۔ آہستہ آہستہ پورا توڑ کر دیں گے۔“

دو دن تک فراز بالکل ٹھیک رہا۔ وہ جان بوجھ کر اس کے سامنے را حیلہ کو برا بھلا کہتی رہی لیکن فراز نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

”پتھر میں پھر صاحب کے پاس چلتا ہے۔ کل کے بعد میرا لعل بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

فراز نے خاموشی سے ماں کی بات سنی لیکن دل ہی دل میں وہ کچھ فائدہ سوچ رہا تھا۔ وہ رات میں کسی وقت اٹھا۔ ماں کے بخوے سے پیسے لکے اور گھر سے نکل گیا۔ رات کا ٹیٹھ بوجھ گئی لیکن بڑا شہر تھا۔ سڑکوں پر ہلکا چمک لڑ لڑ لک اب بھی چل رہا تھا۔ وہ پیدل ہی ایک طرف چل دیا۔ اس کی کوئی منزل نہیں تھی لیکن پیرا سٹیشن کی طرف جاتا تھا۔ وہ اسٹیشن پہنچ گیا۔ یہاں بیچ کر اس نے سوچا۔ قصبہ پہاڑی را حیلہ انہی کے پاس چلا جائے۔ وہاں روشنی بھی ہوگی۔ روشنی کا خیال آتے ہی اس کے امدادوں کو پروا نہ تھی۔ وہ افکار مری پر چلا گیا۔ معلوم ہوا قصبہ پہاڑی جیسے والی ٹرین منج نو بجے آئے گی۔ وہ وہیں ایک بیچ پر پڑ کر سو گیا کچھ سوئے کچھ جاگئے بیچ ہو گئی۔ اس نے قصبہ پہاڑی کا ٹکٹ خریدا اور گاڑی آنے کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی آتے ہی پلیٹ فارم پر بھگدڑ مچ گئی۔ وہ بھی اس بھگدڑ میں شامل ہو گیا اور ایک ڈبے میں جگہ بنائی۔

وہ قصبہ پہاڑی کے اسٹیشن پر اترا تو اسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ چھٹی مرتبہ یہاں آیا تھا۔ اس کی ماں سامان کی

رکھوالی کر رہی تھی اور وہ ریل کی پٹری پر پتھرا پھال رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ان دنوں کو یاد کرتا رہا اور پھر اسٹیشن سے باہر گیا۔ وہ بھی کوئی چیز بھول نہیں تھا۔ اسے روشنی کے گھر کا راستہ معلوم تھا۔ اس نے کوئی سواری کرنے کا تکلف نہیں کیا بلکہ پیدل ہی چل پڑا۔

وہ اس گھر کے سامنے کھڑا تھا جس میں کبھی اس نے ایک سال گزارا تھا۔ اس گھر کے برابر ہی روشنی کا گھر تھا۔ اسے لیوں لگا جیسے روشنی ابھی بھاگتی ہوئی آئی ہے اور کسے گی، فراز اٹھ آ گئے۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اب تو وہ بھی بڑی ہو گئی ہوگی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور دروازے پر دستک دیدی۔

”کیا بات ہے۔ یا ل آئی ہے یا چنگ۔ کیا چاہیے تمہیں۔“ ایک عورت دروازے پر آئی اور اس نے اسے سوال ایک ساتھ کر دیے۔

”مجھے را حیلہ آتی ہے ملنا ہے۔“

”کون را حیلہ آتی۔“

”وہی جو روشنی کی ماں ہیں۔ ان کے شو پر پولیس میں ہیں۔“

”اچھا۔ وہ تو اب یہاں نہیں رہتے۔“

”اب وہ کہاں رہتی ہیں؟“

”انہوں نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ وہ لوگ کیلاش پور جلا رہے ہیں۔“

”میں کیلاش پور ہی سے تو آیا ہوں۔“

”تمیں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں۔“ اس عورت نے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

اس نا کامی کے باوجود وہ خوش ہو گیا کہ روشنی، کیلاش پور میں ہے۔ کیلاش پور تو میرا پناہ شہر ہے۔ اسے وہاں کہیں نہ لگیں ڈھونڈ ہی لیں گا۔ وہ اگلے قدم اسٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ اس کی خوشی کتنی تھی کہ وہ ایسی ٹرین ایک کھٹے بعد آنے والی تھی اگر کل گئی ہوئی تو اسے اس اجاڑ اسٹیشن پر رات کا ٹیٹھ پڑتی۔ وہ اسٹیشن پر ایک بیچ پر بیٹھ گیا۔ یہ خیال ہی اس کے لیے خوش کن تھا کہ روشنی اس کے شہر میں ہے۔ ایک ایک اسے کیلاش پور آیا کھٹے لگا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی جاؤ کا پرندہ آئے اور اسے اپنے پروں پر بٹھا کر کیلاش پور پہنچا دے۔ جب جاؤ کا پرندہ ہوگا تو کیلاش پور تو کیا، وہ تو کسے اس گھر تک پہنچا دے گا جہاں روشنی رہتی ہے۔

اس پلیٹ فارم پر دو آدمی اور تھے اور تیسرا وہ تھا بہر حال ٹرین آئی اور دوسروں کے ساتھ وہ بھی سوار ہو گیا اور ٹرین کیلاش پور کی طرف دوڑنے لگی تھی۔

وہ کیلاش پور پہنچا تو اسے گھر کا خیال آیا۔ میں گھر چلا تو جاؤں لیکن اب تک تو میری ذمہ داری تھی ہوگی۔ میں کیا بتاؤں گا کہ میں کل سے کہاں تھا۔ پھر ایک خیال نے اس کی مشکل حل کر دی۔ یہاں تو ایسا سوچا ہے کہ نہ صرف میرا قصور معاف ہو جائے گا بلکہ پہلے سے بڑھ کر محبت بھی کی جائے گی۔

وہ بے خوف ہو کر گھر پہنچ گیا۔ اس کا گھر دھتے داروں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب خوشی سے پہنچنے لگے۔ عمران کی نظر اس پر پڑی تو دوڑتی ہوئی آئی اور اسے گلے لگا کر اتار دی کہ چپ کرنا مشکل ہو گیا۔

”کہاں چلا گیا تھا میرے بچے۔ تیری ماں تیرے فراق میں اتار دی کہ رات بھر میں آجی رہ گئی۔ دیکھ لے میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ کہاں چلا گیا تھا تو۔“

”میں سب کے سامنے نہیں بتاؤں گا۔“ وہ اسے کرنے میں لے گیا۔ ”امی، میں گھر میں سو رہا تھا کہ ایک آدمی جس کے بڑے بڑے سینک تھے مجھے اٹھا کر قصبہ پہاڑی لے گیا۔“

”قصبہ پہاڑی؟“

”ہاں امی۔ راجیلہ آئی کی چھت پر۔ کہنے لگا تم رات بھر بیٹھیں رہو، صبح راجیلہ آئی آئی کی۔“ میں رات بھر چھت پر رہا صبح جب راجیلہ آئی نہیں آئیں تو میں بیٹھے اتر۔ وہاں راجیلہ آئی تو نہیں تھیں کوئی اور عورت بھی تھی جو مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر مارنے کے لیے آئی۔ اسی وقت وہ سینکوں والا آدمی پھر آیا اور مجھے کیلاش پور لے آیا۔“

”یہ بات کسی کو بتانا مست۔“ عمران نے کہا۔ ”بہر صاحب نے مجھے تسلی دیدی تھی کہ تمہارا بیٹا مل جائے گا۔ ان پر سب روشن ہے۔ میں ابھی جا کر انہیں بتاتی ہوں بلکہ تو بھی میرے ساتھ چل۔“

”نہیں۔ مجھے اس سینکوں والے نے منع کر دیا ہے۔“

”اچھا تو پھر میں ایلی ہوئی ہوں۔ انہیں بتانا تو ضروری ہے۔“

عمران بھی گھر سے چلی گئی۔ مہمان بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تو اب انے فراز کو اپنے پاس بلا دیا اور کہا بتا دیا کہ اس کے سر پر ہاتھ بھیرا۔

”جی جی بتاؤ ہم کہاں گئے تھے۔“

”میں نے ابھی تو بتایا ہے کہ سینکوں والا آدمی مجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔“

”تمہاری ماں اس پر یقین کر سکتی ہے، میں نہیں

کر سکتا۔ مجھے جی جی بتاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“

”آپ امی سے کہہ دیں گے۔“ فراز بھٹکتے لگا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری امی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”امی مجھے یہ صاحب کے پاس لے جا رہی تھیں اس لیے میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اسٹیشن پر جا کر ہو گیا۔ امی کے پیسے چرائے تھے۔ دن بھر مجھ پر کھانا پھرنا۔ پھر سوچا گھر نہیں گیا تو کیا کروں گا۔ میں گھر چلا آیا۔“

اسے یہ بتانے کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ قصبہ پہاڑی چلا گیا تھا۔ ایاز نے اسے جیو لے کر شاہی دی اور اس سے کہا وہ ٹھک گیا ہوگا، جا کر سو جائے۔

عمران پھر صاحب کے پاس سے آئی تو بڑی خوش تھی۔

”بہر صاحب نے سینکوں والے جن کو بلایا تھا۔ اسے بتا دیا ہے کہ اگر اب وہ فراز کو نہیں لے کر گیا تو وہ اسے جلا کر خاک کر دیں گے۔“

”پیسے کتنے لیے ان بہر صاحب نے؟“

”پانچ سو لے کر میرے بچے سے بڑھ کر تھوڑی ہیں۔“

جبلی پھر کا جھوٹا کل گیا تھا۔ ایاز نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ عمران کو ان کے پاس نہیں جانے دے گا۔ فراز اپنی مرضی سے گیا تھا اور خود اٹھ گیا تھا۔ بہر صاحب نے سینکوں والے جن کو بلا کر بھیجی تھی دیدی۔

فراز کو معلوم ہو گیا تھا کہ روشنی کیلاش پور میں ہے۔ اس نے اسے ڈھونڈنے کا مسئلہ تھا۔ وہ دوسرے دن اسکول گیا ضرور لیکن انڈر ویل میں بھاگ گیا۔ کتابیں اس نے ایک جانتے والے دکاندار کے پاس رکھیں اور شام تک جتنا چل سکتا تھا چلتا رہا کہ شاید راجیلہ یا روشنی اسے سرراہ مل جائیں۔ اتفاق ایسے بھی تو ہوتے لیکن یہ اتفاق روز تو نہیں ہوتے۔ کسی چہرے نے اسے آواز نہیں دی کہ میں راجیلہ ہوں یا میں روشنی ہوں۔ وہ ٹھک ہار کے گھر پہنچا تو اس کی تلاش ایک مرتبہ پھر شروع ہو چکی تھی۔

”کہاں گئے تھے؟“ ایاز نے پوچھا۔

”میں کسی کو تلاش کر رہا تھا۔“

”پانچ سو نہیں ہو گئے ہو۔ کسے تلاش کر رہے تھے۔“

”میں نہیں بتا سکتا۔“

”اگر کل تم اسکول سے بھاگے تو میں تمہارا برا حشر کروں گا۔“

اس نے باپ کے اس چیلنج کو قبول کیا۔ وہ دوسرے دن اسکول گیا یہی نہیں۔ بیٹ کے درد کا بھانڈ کر کے گھر میں پڑا رہا۔ پھر صبح دیکھ کر ماں کے منہ سے سے پیسے لگے اور ایک

مرتبہ پھر گھر سے بھاگ گیا اور اس مرتبہ دوسرے دن وہاں نہیں آیا بلکہ پورے ایک ہفتے غائب رہا۔ اس تمام عرصے میں اس نے ایک ایک دروازے کو دیکھا، ایک ایک دکان میں جھانکا لیکن روشنی یا راجیلہ اسے نہیں ملی۔ دن بھر پاگلوں کی طرح اٹھیں ڈھونڈتا رہتا، رات کو کسی دکان کے آگے بڑھ کر سو جاتا۔ جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اتنے بڑے شہر میں کسی بے نشان کے بغیر کسی کو ڈھونڈنا ممکن نہیں۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ روشنی کے پاپا پولیس والے ہیں لیکن ان کا نام تک اسے معلوم نہیں تھا۔ ورنہ جیسے تھا تھے سب کو چھان چکا ہوتا۔ اب اس کے پاس گھر سے لانے ہوئے پیسے بھی ختم ہو چکے تھے۔ دو وقت ہو گئے تھے ایک کھیل اڑ کر منہ میں نہیں گئی تھی۔ اب اسے گھر کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ایک مرتبہ پھر گھر پہنچ گیا۔ اس حالت میں کہ اس کے کپڑے دھول اور مٹی میں اٹے ہوئے تھے، بال بکھرے ہوئے تھے، پاؤں سوچ گئے تھے۔ تقابہت ایسی تھی کہ گھر میں داخل ہوتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

دیکھاری ماں، بے بس باپ ہفتے بھر سے اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے، اسے اس حال میں دیکھا تو اسپتال لے کر بھاگے۔ ڈاکٹر نے دو تین کھنٹے ٹیکہ میں رکھا۔ ڈرپ لگا کر تب جا کے اس نے آنکھیں کھولیں۔

بچہ اس حال میں گھر پہنچا ہوا تو اس پر کیا تھی کی جاسکتی ہے۔ اس سے تو یہ پوچھتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ اسے غروں کے بستر پر سلا یا۔ شفقت کا پتہ کچھ جھلا۔ جب اس نے کچھ جان پکڑی تو باپ سمجھا نہ پتہ گیا۔ فراز کو بھی اب اچھی خاصی نصیحت ہو چکی تھی۔ اس نے باپ سے وعدہ کیا کہ اب وہ بھی گھر سے نہیں بھاگے گا۔

وہ روشنی کو بھولا نہیں تھا لیکن اس حقیقت سے بھی آشنا ہو چکا تھا کہ یوں ملتی پھرتے سے وہ نہیں ملے گی خود ہی سمجھی میرے سامنے آ جائے تو آ جائے۔ اس نے شکست نہیں مانی طریقہ جنگ بدل دیا۔ میں زندگی میں شامل رہ کر اسے تلاش کرتا رہوں گا۔ وہ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔

اس نے پھر اسکول جانا شروع کر دیا لیکن اب وہ روشنی کے ملنے تک زندگی سے خوش نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔ اس کے ذہن میں روشنی کی وہ تصویر تھی جو اس نے قصبہ پہاڑی کے قیام کے دوران دیکھی تھی۔ اب وہ تصویر ہی تصویر میں اس تصویر کو یاد کر کے دیکھ رہا تھا۔ اس کا جسم ایسا ہو گیا ہوگا، قد اتنا ہو گیا ہوگا، نقش و نگار میں یہ تبدیلی آئی ہوگی۔ اس کی نیلی آنکھوں پر چلوں کی جھلک بھی

ہوگی۔ ہفتے وقت اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے ہوں گے۔ اس کے سہرے بال اس کے کانوں میں پھونسلے گئے ہوں گے۔

یہ باتیں کوئی خطی ہی سوچ سکتا ہے۔ وہ واقعی ایک خطی کی زندگی گزار رہا تھا۔ چپ چاپ، خاموش، اکیلی زندگی۔ صبح کی کٹھانے بغیر اٹھ جاتا، تیار ہو کر اسکول چلا جاتا۔ واپسی میں ایک ایک چہرے کو سمجھتا ہوا واپس آ جاتا۔ کسی نے کوئی بات پوچھی تو جواب دے دیا ورنہ خاموش۔ نہ کسی سے کچھ طلب کرنا نہ کسی سے شکایت کرنا۔

کسی بھی ماں کے لیے اسے بچے کی یہ حالت تکلف وہ ہوتی ہے۔ عمران بھی اسے دیکھ دیکھ کر گڑبگڑتی رہتی تھی لیکن یہ سوچ کر تسو پوچھ بھی لیتی تھی کہ اب اس کا غصہ اور اشتعال تو کم ہو گیا ہے۔ اسکول بھی باقاعدگی سے جا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ حالت بھی جاتی رہے گی۔ بیرون، مزاروں کے چکر کاٹ کاٹ کر ٹھک چکی تھی مگر حوصلہ نہیں ہاری تھی۔ ایاز سمجھا سمجھا کر ٹھک چکا تھا۔ اب اس نے بھی سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت کے انتظار میں تھا جب فراز اپنی اصلاح خود کر لے۔ کوئی مجبور ہو جائے کہ وہ عام لڑکوں کی طرح زندگی کو نہیں بول کر گزارے گئے۔

وقت کا پہلا امید و تم کے راستے پر چلتا رہا۔ فراز نے ماں باپ کی لالچ دکھ لی۔ اس نے میٹرک کر لیا اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں۔ عمران وقت سے پہلے بوڑھی ہو چکی تھی لیکن اس خوش خبری کو سن کر وہ خود کو جوان محسوس کرنے لگی تھی۔ جس بچے کی زندگی کی امید نہ رہی ہو اس نے میٹرک کر لیا۔ سب خوش تھے لیکن فراز کا چہرہ جذبات سے عاری تھا جیسے کوئی قرض تھا جو اس نے چکا دیا تھا۔ اس میں خوشی یا افسوس کی کیا بات ہے۔ ماں کا سرخرو سے بلند ہو گیا تھا مگر وہ گھٹنوں میں سر دے بیٹھا تھا۔

”ہاں بھئی فراز، اب تو تم میٹرک پاس ہو گئے۔“

”جی۔“

”اب کیا کرنے کا خیال ہے۔ میری طرح لی۔ اسے کرو۔ ٹیچر ڈیپارٹمنٹ کر لو اور رھاٹ سے اسکول میں پڑھاؤ۔“

”ابھی میں نے کچھ سوچا نہیں۔“

”آرام سے سوچ لو۔ ابھی ناچ گانے میں دو تین ماہ ہیں۔“

باپ کی نصیحتیں اپنی جگہ مگر فراز تو یہ سوچ رہا تھا کہ روشنی کو ڈھونڈنے کا مزہ تو اب آئے گا۔ فرصت ہی فرصت ہے۔ نہ اسکول جانے کی فکر نہ اسکول سے بھاگنے کی فکر۔ یہ فکری سی بے فکری ہے۔

شام ہوئی تو اس نے کپڑے بدلے، صلیب سے بال
جماے کر اگر روشنی کہیں مل گئی تو مجھے دھتک کا تو نظر آتا
چاہے۔ وہ ایک ایسے محلے میں بیٹھ گیا جہاں وہ اس سے پہلے
بھی نہیں آیا تھا۔ یونہی ایک کنبی میں داخل ہوا اور دیکھیں گھوٹوں
گھوم کر وہ بارہ مرکزی سڑک پر نکل آیا۔ بے مقصد گھومتا رہا
اور پھر گھر آگیا۔

اب اس نے اپنا سبکی دستور بنایا تھا کسی بس میں لیڈر
پورشن سے لگ کر کھڑا ہو جاتا اور غولوں کو اترتے چڑھتے
دیکھتا رہتا کہ شاید کسی اسٹاپ سے روشنی سوار ہو۔ جہاں جی
چاہتا اتر جاتا۔ کچھ دیر اس علاقے میں گھومتا پھر پورا پسی کی
اس میں بیٹھ جاتا۔ ایک روز وہ پولیس لائن پہنچ گیا۔ راجیلہ کا
شوہر پولیس میں تھا اس لیے اس کا خیال تھا جگہ اسے یقین
ہو گیا تھا کہ راجیلہ اور روشنی بھی وہیں رہ رہی ہوں گی۔ یہاں
قلبت بنے ہوئے تھے۔ وہ اس علاقے میں دیر تک گھومتا رہا
پھر ایک بڑھیا کو دیکھ کر اس کی ہمت ہوئی۔

”لہاں، یہاں کوئی راجیلہ نام کی عورت رہتی ہے؟“
”تم جہاں کھڑے ہوئی تو اس کا قلیت ہے۔“ بڑھیا
نے کہا اور پھر خود ہی راجیلہ کو آواز دے کر بلا لیا۔ ”راجیلہ
تیرے گھر سہان آئے ہیں۔“

ایک عورت گود میں بچہ اٹھا لے باہر آئی اور فرار کو نور
سے دیکھنے لگی۔ ”کیا ہے؟ کس کو پوچھ رہا ہے۔“
”مجھے راجیلہ آگئی کا پوچھنا تھا جن کی بیٹی روشنی ہے۔“
”راجیلہ تو میں ہوں لیکن میری کوئی بیٹی نہیں ہے جسے
چھیڑنے تو یہاں تک آیا ہے۔“

”میں کسی کو چھیڑنے نہیں آیا۔“
”ابھی پتا چل جاتا ہے۔ یہ پولیس والوں کا علاقہ
ہے۔“ اس نے فرار کو نور کی دی اور اپنے میاں کو بلایا۔ وہ
شاید ابھی ابھی ڈیوٹی سے آیا تھا۔ وردی بھی نہیں اتاری تھی یا
ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ اس نے آتے ہی کسی
پوچھ بچھ کے بغیر فرار کو نور دروازہ کھینچ کر چڑھے۔
”سائے لڑکیوں کے گھروں کے چکر لگتا ہے اور وہ
بھی پولیس لائن میں آکر۔“

وہ اپنی بے گناہی جاننے لگا تو اس نے ایک چھیڑ اور لگا
دیا۔ شوہر سن کر اور پولیس والے بھی قلیوں سے نکل آئے۔
اب اس پولیس والے نے یہ کچھ شروع کر دیا کہ یہ لڑکا اس
کی بیوی کو چھیڑ رہا تھا۔ فرار ابھی تک اپنی بے گناہی ثابت
کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آوازیں آنے لگیں کہ اسے
تھانے لے جا کر بند کر دو۔ چھیڑ بڑیں کے تو سب اٹھ دے

گا کہ یہاں کس مقصد سے آیا تھا۔ ان میں دو جاڑ شریف
لوگ بھی تھے۔ انہوں نے فرار کی جان چھڑائی کر لڑکا شریف
معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں کسی کا پتا معلوم کرنے آیا
ہو۔ مختصر یہ کہ بڑی مشکل سے ان کی جان چھوٹی اور اس نے
عہد کر لیا کہ اب وہ کسی سے روشنی کے بارے میں نہیں پوچھے
گا۔ وہ خود ہی مل گئی تو ٹھیک ورنہ پوری زندگی اس کو یاد
کر کے گزار دے گا۔

فرار ایک سنیہا بال پر گئے قلمی پسنر کے سامنے کھڑا
تھا۔ اسے نہ تو قلموں سے کوئی دلچسپی تھی نہ ادا کاروں سے
سروکار جی کہ اس تصویر سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا جس کے
سامنے وہ پچھلے دس منٹ سے کھڑا تھا۔ یہ تصویر اسے ابھی بھی
نہیں لگی تھی۔ یہ کسی بہت بڑے آرٹسٹ کا بنایا ہوا شاہکار بھی
نہیں تھا۔ بس عجیب قسم کی ایک بھدی سی تصویر تھی جو اس قسم
کے پسنروں میں نظر آتی ہیں۔ اسے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ
یہ کس اداکارہ کی تصویر ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ اس تصویر
کے سامنے کیوں کھڑا تھا؟ اس کا جواب وہ خود ہی دے رہا
تھا۔ اگر اس تصویر بنانے کے فن سے واقف ہو جاؤں تو مجھے
روشنی کو تلاش کرنے دوہنہ جانا پڑے۔ میں اپنے تصور کی
روشنی کو کھنڈر پرانا راکھ پر دیواروں پر سٹالوں بڑے شہر سے
دنیا کو بتا سکوں کہ یہ ہے میری روشنی۔ میرے تصورات میں وہ
ہر جگہ موجود ہے لیکن میں اسے سامنے دیکھا کہ اس کی پرستش
نہیں کر سکتا۔ کاش اچھے مصوری آجائے۔ اس خیال کے
آتے ہی وہ چلنے کے بجائے دوڑنے لگا تھا۔ اسے گھر پہنچنے کی
جلدی تھی۔

”آپ نے کہا تھا، میں سوچ کر جواب دوں کہ مجھے کیا
کرتا ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے، میں مصور بننا چاہتا ہوں بلکہ
میں مصور ہوں۔ اپنے خیالوں میں تصویریں پینٹ کرتا ہوں۔
مجھے ایک ایسا شخص چاہیے جو ان تصویروں کو کھنڈر پر منتقل کرنے
کا ہنر مجھے سکھا دے۔“ اس نے گھر پہنچنے ہی اپنے ارادے
اپنے باب کے حوالے کر دیے۔

”کوئی بات ایسی نہ کرنا جس سے تمہارا باپ خوش ہو۔
کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ ابو آپ اسکول ماسٹر ہیں میں پرو فیسر
ہوں گا۔ اس کے برعکس یہ کہنے آئے ہو کہ رنگ اور مدد لے
کر دیواروں کو رنگین کرتے پھر دو گے۔“
”مجھے دی بنا چاہیے جو بننے کی مجھ میں صلاحیت
ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایک اچھا مصور بن سکتا ہوں۔“
”جب یقین ہے تو مجھ سے کیا پوچھتے آئے ہو۔ جودل

میں آئے کرو کیونکہ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔“
عمرانے نہ سنا تو اس نے بھی سمجھا یا کہ تصویریں بنانا
گناہ ہوتا ہے وہ اس گناہ کو اختیار نہ کرے۔ وہ یہ تو نہیں
چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا اسکول ماسٹر بنے لیکن یہ بھی نہیں چاہتی
تھی کہ مصور بن کر رہ جائے۔ وہ سمجھا ہی رہی لیکن فرار نے
اس کی بات بھی نہیں مانی۔

اب اسے جو کرنا تھا خود کرتا تھا۔ اس نے ایک آرٹ
اسکول میں داخلہ لے لیا۔ ایاز نے تو فرار کی یہ جرات بھی
برداشت کر لی اور یہ سوچ کر خوش ہو گیا کہ فرار کی قسمت میں
اگر پھر بننا ہی لکھا ہے تو وہ آرٹ پھر بن جائے گا لیکن عمرانہ
سے اس کی یہ بغاوت برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے فرار کے
لیے کیا کیا خواب دیکھے تھے، ایک بھی پورا نہیں ہوا۔ اس نے
بڑے صدمے اٹھائے تھے لیکن اس صدمے نے اسے بستر پر
ڈال دیا۔

فرار نورنگوں اور لکیروں سے کھینچے ہوئے ایک سال ہو
گیا تھا۔ ابھی وہ اپنے تصور کو کھنڈر پر منتقل کرنے کے لائق نہیں
ہوا تھا لیکن اس کے اساتذہ اس سے بہت پر امید تھے۔ وہ
دیکھ رہے تھے کہ اس نے دو سال کا کام ایک سال میں مکمل
کر لیا تھا۔ اس کی قدرتی صلاحیتیں پوری طرح بڑھنے کا ر
آ رہی تھیں۔ ان صلاحیتوں کو ابھارتے میں اس کا وہ جنون
بھی شامل تھا جو اس فن کو حاصل کرنے کے لیے اس کا معاون
ہو رہا تھا۔ وہ دنیا کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ
دن دن ہجر کا غدول پر لکیریں کھینچتا رہتا تھا۔

اس نے دو سال مکمل کر لیے تھے۔ اب اس کا امتحان
ہونے والا تھا۔ اس کے اساتذہ میں شرطیں لگ گئیں کہ وہ
پورے اسکول میں فرسٹ آئے گا۔ کوئی دوسرا طالب علم اس
کی ٹکر نہیں۔

امتحان کی نمرے میں ایک ماڈل کی تصاویر تمام طالب علموں
میں تقسیم کر دی گئیں۔ ایک ہی تصویر سب کو بنانی تھی۔ لیکن
کھینچنے بعد جب تمام طالب علموں کی بنائی ہوئی تصویریں جمع
کی گئیں تو اس نے ماڈل کے بجائے کوئی اور ہی تصویر بنا دی
تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے امتحان میں غالب کے بارے میں
لکھنے کو کہا جائے اور کوئی اقبال کے بارے میں لکھ کر آجائے۔
اس نے اقبال پر کتنا ہی اچھا لکھا ہوا ہے نمبر نہیں دیے
جاسکتے۔ فرار نے بھی یہی کیا تھا۔ یہ تصویر فی اعتبار سے اس
پائے کی تھی کہ بڑے سے بڑے مصور کے فن پاروں کے
ساتھ رکھی جاسکتی لیکن اس پر نمبر نہیں دیے جاسکتے تھے۔

اس کے پرنسپل نے یہ تصویر دیکھی تو اٹھ اٹھ کر اٹھا۔ یہ لڑکا
دنیا کے مصوری میں آفتاب بن کر کھٹکے گا۔ میں اس سے ملنا
چاہتا ہوں۔ اسے پرنسپل کے سامنے پیش کر دیا گیا۔
”تمہیں تو کوئی اور ماڈل دیا گیا تھا۔ تم نے یہ تصویر
کیوں بنادی؟“

”آپ کے دیے ہوئے ماڈل پر میرا تصور غالب آگیا۔
”میں جانتا ہوں ایک تخلیقی مصور کو اپنے خواب بہت
عزیز ہوتے ہیں لیکن تم تو امتحان دے رہے تھے۔“

”امتحان میرے فن کا ہونا چاہیے۔ یہ دیکھنا چاہیے
میرے خطوط و میرے رنگ، میری لکیریں کبھی ہیں؟“
”تمہاری بات سے اتفاق کرنے کے باوجود تمہیں نمبر
نہیں دیے جاسکتے۔ تمہیں اس اسکول میں ایک سال اور
گزارنا ہوگا یا میں یہ رعایت دے سکتا ہوں کہ تم ماڈل کی
تصویر بنا کر پیش کر دو۔“

”میں کوشش کروں گا۔“
اسے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ماڈل کی تصویر اسے
دے دی گئی۔ اس نے اچھا بنانا شروع کیا۔ جب تصویر مکمل
ہوئی تو یہ ماڈل کی تصویر نہیں تھی۔ یہ تو وہی تصویر بن گئی جو وہ
اس سے پہلے بنا چکا تھا۔

”تم نے تو پھر وہی تصویر بنا دی۔“
”میں کیا کروں، میرے خزانے میں یہی ہے۔“
”تمہارے تصور میں یہ ایک بچی ہی کیوں ہے۔ ماڈل
کی نہ کسی اور کی اور تصویر بنا دیتے۔ تم نے تو ایک مرتبہ پھر اس
بچی کی تصویر بنادی۔“

”اس بچی کے سوا دنیا میں اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔“
”عجب پاگل پن کی باتیں ہیں تمہاری۔ کیا زندگی بھر
ایک ہی تصویر بناتے رہو گے۔“

”نہیں، چہرہ یہی رہے گا مگر بڑھتی رہے گی۔ عمر کے
ساتھ ساتھ چہرے کے خطوط بھی بدلتے رہیں گے۔ یہ
تبدیلیاں ہی میرے آرٹ کی درآمدی ہوگی۔“
”لوگ آتا جائیں گے مسٹر فرار۔“
”آرٹ میں نے اپنی نیکیوں کے لیے سیکھا ہے
دوسروں کو خوش کرنے کے لیے نہیں۔“
”تمہاری مقبولیت؟“

”مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔ میں تو کسی کی تلاش میں
لگا ہوں۔ سبز کرنے والے کاغذ کی پروا نہیں کرتے۔“
فرار نے کہا اور کوئی حوصلہ شکنی کے بغیر اسکول سے باہر آگیا۔
ایک مہینہ پھر وہ زمانے کی گھوڑوں کی زبردستی تھا۔ اس کا

باب اس سے خفا تھا کہ اس نے اپنے دو سال ضائع کر دیے۔ کوئی شکیلیت تک حاصل نہ کر سکا کسی اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر ہی لگ جاتا۔ وہ خود بھی اس حقیقت کو تسلیم کر رہا تھا۔ مگر اس کی مجبوری کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس نے ماڈل کی تصویر بنائی چاہی تھی لیکن روشنی کا بچپن اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اس کے قلم نے روشنی کی تصویر بنادی اور وہ امتحان میں پاس نہ ہو سکا۔ اس نے گھر میں بیٹھ کر بھی کوشش کی لیکن بیٹھ بے خبر سا ہو جاتا اور ہوش آتا تو روشنی کا بچپن کاغذ پر اتر آتا۔ بھی کھلے بالوں کے ساتھ بھی دو چوٹیاں بندھی ہوئی، کبھی فراق سے بھی پیٹھ نہیں میں۔ اس نے قصبہ پٹاڑی میں رہ کر روشنی کے جتنے روپ دیکھے تھے وہ سب اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ وہ ان سب کو نگوں میں پینا دیا جاتا تھا لیکن اس کے پاس نہ رنگ تھے نہ برش نہ شیل بھی، نہ کاغذ۔ وہ خواب دیکھنے لگا تھا کہ اس کا اسٹوڈیو ہو، مصوری کا سامان وافر مقدار میں اس کے پاس ہوتا کہ وہ روشنی کا تعارف دنیا سے کرانے۔ دنیا کو بتا سکے کہ وہ روشنی کو تلاش نہیں کر سکا لیکن اسے امر تو کر سکتا ہے اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میری بنائی ہوئی کوئی تصویر روشنی کے گھر میں پہنچ جائے اور وہ مجھ سے ملنے چلی آئے۔ اسے معلوم تو ہو کہ میں اس کے ساتھ صرف کھینچ نہیں تھا، اس سے محبت بھی کرتا تھا۔

وہ پیسوں کے حصول کے لیے بیگوں کے چکر کاٹتا رہا کہ قرض مل جائے۔ ڈکٹوں پر گیا کہ مصوری کا سامان ادھار مل جائے۔ اپنے اسکول کے اساتذہ سے ملا کہ ان کے ذریعے کسی ایسے شخص سے تعارف ہو جائے جو آرٹ کا دلدادہ ہو اور اسے اسٹوڈیو کھول کر دے سکے۔ اس کی تمام کوششیں ہوا پر دو گئیں۔ لوگ آرٹ کی قدر دانی کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن عمل میں گورے تھے۔ اس کی کوششوں سے بے خبر اس کے والدین اس کی تنگ دود کو آوارہ گردی پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ دن کو کھتا ہے، رات گئے گھر آتا ہے۔ نہ جانتے کن آوارہ مجبوروں کا شکار ہو گیا ہے۔ نہ تیار ماں کا خیال ہے نہ باپ کے بڑھاپے کا۔ کہیں فکر ہو جاتا تو ہمارے بڑھاپے کا سہارا تو ہوتا۔

جب فراز ہر طرف سے مایوس ہو چکا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنا اسٹوڈیو کھولنے کے بجائے کسی بڑے مصور کے ساتھ مل کر فنکار ہو یا کمپنیز پر کام کرنے لگے۔ ایسے مصور کے انتخاب میں اسے دو چیں لگی۔ وہ جب آرٹ اسکول میں تھا تو اس نے کئی مصوروں کے نام سنے تھے اور ان کا کام دیکھنے کا موقع بھی ملا تھا۔ انہی میں ایک مصور یار تھے جن کے کام سے وہ

بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ ان کے اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ یہ اسے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن اکیلے کام کرتے ہیں۔ کسی کوشا کو نہیں بناتے نہ انہوں نے اپنا کوئی معاون رکھا ہوا ہے۔

”تم امتحان کیوں پاس نہیں کر سکتے؟“

”میں جب ان کے دیے ہوئے ماڈل کی تصویر بنانے لگا تو میرے تصور میں آپاڑی کی میرے سامنے آگئی۔ میں نے اس کی تصویر بنا دی۔ میرا استدلال یہ تھا کہ تمہیں کو میرا فن دیکھنا چاہیے میں کوئی بھی تصویر بناؤں۔“

”ان اسکول والوں کو کسی کے فن کی پروا نہیں ہوتی بلکہ ان میں اتنی اہلیت ہی نہیں ہوتی کہ اسے جانچ سکیں۔ تم ایسا کرو کہ مجھے اپنے تصور میں آپاڑی کی تصویر بنا کر دکھاؤ۔ میرا اسٹوڈیو کھلا ہوا ہے جتنے دن میں چاہو مکمل کرو۔“

یہ اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ مصور یار اسے اپنے قلم چھونے کی اجازت دے رہے تھے۔ وہ اسی وقت بیٹھ گیا۔ وہ رات کو گھر بھی نہیں گیا۔ دوسرے روز تصویر مکمل کر کے ان کے سامنے دکھ دی۔ ایک نئی ہیئت نگے میں ڈالے اسکول جانے کے لیے گھبرے نکل رہی تھی۔ مصور یار نے اس تصویر پر تنقیدی نظر سے دیکھا اور ایک طرف رکھ دیا۔

”اب اسی رنگ کی دوسری تصویر بناؤ۔“

”اس میں کوئی خامی رہ گئی ہے۔“

”جو کچا چار ہا ہے وہ کرو۔“

اس نے ڈیڑھ دن کی محنت کے بعد دوسری تصویر بنا دی۔ وہی چچی چھت پر کھڑی تھی اس کے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ آسمان پر ایک چنگ لکھائی گئی تھی۔

”میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ واقعی تمہارے تصور کی کرشمہ سازی ہے یا پہلی تصویر سے دوسری تصویر مختلف بنی ہے۔ اب یہ بتاؤ یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ نئی شخص خیالی ہے یا حقیقت۔“

فراز نے قصبہ پٹاڑی کے تمام واقعات اور پھر روشنی کی تلاش میں گزرے ہوئے شب و روز انہیں سنا دیے۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ روشنی کے بارے میں کسی سے بات کر رہا تھا۔

”یہ تمہاری محبت کی آگ ہے جو ان تصویروں کو روشن کر رہی ہے۔ اس آگ کو بجھنے مت دینا بلکہ میں تو دعا کروں گا کہ تمہاری روشنی تمہیں اس وقت ملے جب تم غروب کی جلدیوں کو چھو رہے ہو۔ ورنہ تمہارا سفر رک جائے گا۔ تمہارا کام غیر معمولی طور پر میرے کام سے ملتا ہے شاید تم لاشعوری طور پر مجھ سے متاثر ہوئے ہو۔ اسی لیے میں اجازت دیتا ہوں کہ تم میری تصویروں پر میرے ساتھ

کام کر سکتے ہو۔“

اس نے ان کے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھری لیکن مصور یار کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ ان کی تصویروں کو بگاڑ دے گا۔ اس کا قلم صرف روشنی کی تصویروں پر چلتا ہے۔ وہ کام کر رہا ہے لیکن بے دلی اس کی لکیروں سے ظاہر ہو رہی ہے۔ وہ چاہتے تو اس سے معذرت کر لیتے لیکن وہ اس کے اندر کے فنکار کو مارنا نہیں چاہتے تھے۔ سونے کی قدر جو بری کو ہوتی ہے۔ انہوں نے سوچا اگر اس فنکار کو مسموم دیا جائے تو انکھا مصور ثابت ہوگا۔ ایک ایسا مصور جس نے زندگی بھر ایک چہرے کو بنایا لیکن اس تنوع کے ساتھ کہ ہر تصویر میں ایک نئی بات نظر آتی ہے۔ انہوں نے اس سے کہا تم میرے کام کو چھوڑو اور اپنی تصویریں بناؤ، میں بہت جلد تمہاری نمائش کروں گا۔

فراز کو ایک سہارا مل گیا۔ اس نے قصبہ پٹاڑی میں اپنی ایک سالہ رہائش کو کاغذ پر منتقل کرنا شروع کر دیا۔ قصبہ پٹاڑی کے بازار، وہاں کی دکانیں، وہاں کے پہاڑی لوگ، پھر اپنا اسکول، اپنا گھر اور چھ سالہ روشنی کا بچپن اس نے ایک سال کی مدت میں یہ تصویریں مکمل کر لیں۔ مصور یار نے دیکھا تو بیچڑک اٹھے۔

”میرے بیٹے یہ اور خیال کام ہے۔ ہمارے ملک کے ایک حصے کی ثقافت اس میں جلوہ گر ہے۔ ان تصویروں کی نمائش ہوئی تو بڑی پذیرائی ہوگی۔“

مصور یار کی کوششوں سے اس کی تصویروں کی نمائش ہوئی۔ یہ اس کی پہلی نمائش تھی لیکن ان تصویروں نے دھوم مچا دی تھی اس مرحلے پر ایک اور مشکل آن کھڑی ہوئی۔ یہ اس کا بالکل پان ہی کہا جاتا تھا کہ وہ روشنی کی کسی تصویر کو جینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مصور یار اس کی ہر بات ماننے کو تیار تھے لیکن اس بات سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح اس کا نام دور دور پہنچے گا اور وہ مختصر سے عرصے میں دولت مند بھی ہو جائے گا۔ وہ پھر بھی انکار کرتا رہا کہ اتنی دولت کا وہ کیا کرے گا۔ پھر مصور یار نے اس کی کھنٹی رنگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”یہ تصویریں جب دوسروں تک پہنچیں گی تو ممکن ہے تمہاری روشنی کی نظر سے بھی کوئی تصویر گزرے اور وہ تم سے ملنے چلی آئے۔“

یہ بات فراز کی سمجھ میں آگئی۔ تین روز کی نمائش میں اس کی تمام تصویریں بیک گئیں۔ وہ بہت دن بعد اپنے گھر گیا تو اس کی جیبیں فٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایاز نے زندگی بھر اتنا نہیں کمایا تھا جتنا وہ لے آیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو

نہایت اچھے اسپتال میں داخل کرایا لیکن اب ان کی حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ کوشش کے باوجود وہ اہل نہیں بچا سکا۔ وہ اپنی دوسری نمائش کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنے تصور کو حرکت دی۔ دس سال کی عمر میں وہ کبھی ہوئی ہوگی۔ وہ کئی دن غور کرتا رہا اور بالآخر اس نے ایک تصویر بنائی۔ یہ تصویر چھ سال کی بچی میں خوش گوار تیرہلی کی کہانی تھی۔ مختلف ضرور ہوئی تھی لیکن دیکھنے میں روشنی ہی معلوم ہوتی تھی۔ ایسی بہت سی تصویریں اس نے بنائیں۔ ان تصویروں میں وہ ایسی بھی تھیں جن میں وہ فراز کی ماں یعنی عمراندہ کے ساتھ کھڑی ہے۔ اس عمر میں روشنی کی تلاش پورا ہو گئی تھی لہذا انہیں منظر میں کیلاش پور کی شافت نظر آرہی تھی۔ اس نمائش کو پہلے سے بھی زیادہ پذیرائی ملی۔ حکومت نے بھی اسے اپوارڈ اور انعامات سے نوازا۔ اب وہ رئیس ترین مصور بنی گیا تھا۔ اس کی ایک ایک تصویر لاکھوں میں خریدی جا رہی تھی۔

اس نمائش کے بعد مصور یار کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ اس اسٹوڈیو میں نہیں رہ سکتا تھا۔ مصور یار کے بیٹوں کا آرٹ سے کوئی شغف نہیں تھا۔ انہوں نے فراز سے یہ اسٹوڈیو خالی کر لیا۔ اب فراز کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ ایسے کئی اسٹوڈیو کھول سکتا تھا۔ اس نے ایک شاندار دو منزلہ عمارت خرید لی۔ اوپر کا حصہ باپ کو رہائش کے لیے دے دیا، نیچے اسٹوڈیو کھول لیا۔ اسی میں اپنا سفر لگا لیا۔

☆☆☆

”مس روشنی، وزیر اعظم صاحب نے کل ساڑھے چار بجے ہوش کراؤں میں پریس کانفرنس رکھی ہے۔“

”جی ہاں، مجھے معلوم ہوا تھا۔“

”ہمارے اخبار کی طرف سے نمائندگی آپ کریں گی۔“

”میں۔۔۔ سر میں۔۔۔ میرا مطلب ہے مجھے تو ابھی ایک سال ہوا ہے، جو بڑے لوگ ہیں انہیں احترام ملے گا۔“

”وہ دیکھ لوں گا۔ آپ انہی طرح اسٹیڈی کریں، کچھ سوال بنائیں اور کل چار بجے ہوش پہنچ جائیں۔ دفتر کی گاڑی چاہیں تو وہ بھی مل جائے گی۔“

”تھیں سر، میں پہنچ جاؤں گی۔“

”یہ ہوش میں داخلے کا کارڈ ہے۔“

وہ چیف ایڈیٹر کے کمرے سے لگی گھبراہٹ اور خوشی سے اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ چھٹی کا وقت ہو گیا تھا لہذا گھر چلی گئی۔ دوسرے دن وقت مقررہ پر ہوش پہنچ گئی۔ وہ پریس کانفرنس کے بعد باہر آ رہی تھی کہ اس نے

لائی میں ایک بچی کی تصویر لگی دیکھی۔ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ یہ تو میری تصویر ہے۔ میرے بچپن کی تصویر۔ ایسی ہی ایک تصویر تو میں نے گھر میں لگائی ہوئی ہے۔ یہ فرار کبھی وہی ہے، جوتے بھی وہی ہیں جو میرے گھر میں لگی تصویر میں ہیں۔ میری تصویر یہاں کیسے آگئی۔ وہ اس تصویر کو منسلک دیکھے جارہی تھی۔ یہ بنائی کس نے ہے۔ وہ تصویر کے اور قریب ہوئی۔ مصور کا نام لکھا تھا۔ ”فرار“۔ اس مصور کا نام تو میں نے سن رکھا ہے لیکن اس کی کوئی پینٹنگ نظر سے نہیں گزری۔ ویسے یہ تصویر بنائی کمال کی ہے۔ اس سے تو ملنا چاہیے۔ معلوم تو ہو کہ میری تصویر اس نے کہاں سے جس سے یہ تصویر اس نے بنائی ہے۔ یہ تصویر اس نے ہماری قیمت پر فروخت کی ہوگی۔ میں تو اس پر مقدمہ کر سکتی ہوں کہ میری اجازت کے بغیر اس نے میری تصویر بنائی کیسے۔ یہ خیالی تصویر تو ہرگز نہیں ہے۔

دوسرے دن اس نے گھر میں رکھی ہوئی اپنے بچپن کی تصویر پر جس میں رکھی اور فرار کے اسٹوڈیو لگائی تھی۔ مجھے فرار صاحب سے ملتا ہے۔ ”اس نے فرار کے ملازم سے کہا۔“

”کیا نام بتا دوں؟“
”ان سے کہیے روشنی آئی ہے۔ میں اخبار کی طرف سے آئی ہوں ان کا اشترو پور کرتا ہے۔“
وہ ملازم کے آنے کا انتظار کر رہی تھی مگر اس نے دیکھا کہ ایک چوبیس چوبیس سال کا لڑکا ہاتھ میں برش جکڑے دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔ اس نے سوچا، مصور فرار کا کوئی شاگرد ہوگا۔
”آپ ہیں مس روشنی؟“
”جی۔“

”آئیے۔“ اس نے کہا اور اسے لے کر ایک کمرے میں لے گیا۔

”روشنی تم نے مجھے پہچانا؟“
”میں فرار صاحب سے ملنے آئی ہوں۔“
”میں ہی ہوں فرار۔ مجھے پہچانو روشنی۔ میں کہاں کہاں تمہیں ڈھونڈتا رہا ہوں۔ تم کہاں چلی گئی تھیں اور آج اچانک کہاں سے آگئیں۔“ وہ منسلک بولے چلا جا رہا تھا۔
”آپ بولنا بند کریں تو میں کچھ بولوں۔ جناب، میں روشنی ضرور ہوں لیکن وہ نہیں جو آپ مجھ رہے ہیں۔ میں تو یہ پوچھنے آئی ہوں کہ آپ نے میرے بچپن کی تصویر میری اجازت کے بغیر کیسے بنائی؟“
”میں نے تو آپ کی جوانی کی تصویر بھی بنائی ہے جبکہ

میں نے آپ کو صرف بچپن میں دیکھا تھا۔“
وہ دوڑتا ہوا گیا اور ایک تصویر اٹھا کر لے آیا۔ روشنی نے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ یہ اسی کی تصویر تھی۔ بس فرق اتنا تھا کہ اس نے اپنے سنہری بال کٹوا لیے تھے اور تصویر میں اس کے شانوں پر جھول رہے تھے۔ اس کا بدن تصویر میں ذرا بھاری تھا، وہ بہت دلی ہوئی تھی۔

”یہ ایک اور ثبوت ہے۔ میں آپ پر مقدمہ کروں گی۔ آپ میری اجازت کے بغیر میری تصویریں کیسے بنا رہے ہیں۔“
”تم کہیں لی ہی نہیں روشنی تو میں اجازت کیسے لیتا۔“
”مجھے آپ کی ذہنی حالت پر شک ہو رہا ہے۔“
”روشنی، میں فرار ہوں تمہارا فرار۔ بچپن میں ہم ایک ساتھ کھیلے رہے ہیں۔“

”کھیلے ہوں گے۔ اب کی بات کرو۔“
”روشنی، کیا تمہیں قصہ پہاڑی یاد ہے۔“
”مجھے تو یاد نہیں لیکن اسی بتاتی ہیں، ہم وہاں بھی رہے تھے۔“

”میرے پاپا کا وہاں فرانسفر ہو گیا تھا۔“
”تمہیں فرار یاد نہیں جو تمہارے برادر والے گھر میں رہتا تھا۔ عمو آئی کا بیٹا، ہم لوگ چھت پر کھیلے تھے۔ یاد ہے ایک مرتبہ میں تھک کر تمہاری چھت پر چلا گیا تھا۔ تم نے جی دہی کھیں مگر گرجاؤ گے۔“
”بچپن کی بھینس یا تھیں ایسی ہوتی ہیں جو دھن پر منتقل ہو جاتی ہیں۔ روشنی کو بھی یہ واقعہ کچھ یاد آئے گا تھا۔ یہ یادیں اتنی غیر متوقع تھیں کہ اس کا سر پکڑانے لگا۔ اس نے دووں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”اٹ میرے خدا مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا۔ مجھے عمرات آئی بھی یاد آ رہی ہیں۔ تمہارے پاپا ایک روز مجھے اپنے ساتھ بازار لے کر گئے تھے۔ تم فرار ہو۔ وہی فرار۔“

”ہاں روشنی، میں وہی فرار ہوں۔ تم تو بچپن کے ساتھ مجھے بھی بھول گئیں لیکن میں بدقسمت کچھ نہ بھول سکا۔ میں نے تمہیں یاد رکھا۔ میں تمہیں ڈھونڈتے گھر سے بھاگ کر قصہ پہاڑی بھی گیا تھا مگر وہ گھر چھوڑ چکی تھیں۔ میں کیلاش پور کے ایک ایک گھر میں تمہیں ڈھونڈتا رہا۔ پھر میں نے تمہیں اپنے دل میں تلاش کر لیا۔ اپنے تصور میں آباہ کر لیا۔ تم ہر وقت میرے سامنے رہتی تھیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ساتھ بڑھتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ میں مصور بن گیا اور پھر تمہارے سوا کسی کی تصویر میں نے آج تک نہیں بنائی۔ ہر تصویر تمہاری اجازت کے بغیر بنائی۔ اب چاہو تو مجھ پر مقدمہ کرو۔“

”فرار تم کتنے عظیم مصور ہو۔“ اس نے فرار کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ”میں اسی کو جا کر بتاؤں گی کہ تم مجھے دوبارہ مل گئے ہو۔“

”میں بھی اب سے کہوں گا کہ وہ راجہ آئی سے ملیں اور تمہیں میرے لیے مانگ لیں۔ اسی تو اب اس دنیا میں نہیں رہتا وہ تمہاری اسی کے پاس جاتیں۔“
”میں کل پھر آؤں گی۔ اس وقت مجھے آفس کے لیے دیر ہو رہی ہے۔“

وہ اسٹوڈیو سے نکلی تو اس قابل نہیں تھی کہ آفس جاتی۔ اسے بہت سی وہ باتیں یاد آنے لگی تھیں جو کچھ وہ پہلے تک اس کے ذہن سے گزرتی تھیں۔ وہ جلد سے جلد ماں کو بتا دینا چاہتی تھی کہ میرے بچپن کا سہمی فرار مجھے ملا تھا۔

اس نے گھر پہنچتے ہی ماں کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ خوشی سے پاگل ہوئی جاری تھی۔ پھر اس نے ماں کو گود سے اتارا اور فرار سے ملاقات کا پورا احوال سنا دیا۔ وہ کچھ بھی نہیں اس کی ماں کو بھی اتنی ہی خوشی ہوئی لیکن ان کے چہرے سے فحش غائب ہوئی۔

”ایک مرتبہ تو مل لی ہے لیکن آئندہ ملی تو اپنی ماں کو زندہ نہیں دیکھ سکی۔“

”اسی وہ بہت اچھا ہے۔ بچپن سے اب تک مجھے ڈھونڈتا رہا ہے۔“

”میں نے کہہ دیا تو ان لوگوں سے نہیں ملے گی۔“
”اسی آخر اس کا تصور کیا ہے؟“
”یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی تو مجھ سے وعدہ کر کہ تو اس سے نہیں ملے گی۔“

”وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“
”یہ شادی ہوئی تو آسمان زمین پر گر پڑے گا۔ میری بچی تو اپنی ماں کی بچہداری سمجھ۔ میں تجھے سب کچھ بتا دوں گی۔ بس اتنا وعدہ کر کہ تو فرار کے قریب نہیں جائے گی۔“

”اسی مت رو نہیں۔ مجھ سے آپ کے آئینہ نہیں دیکھے جاتے۔ آپ کہتی ہیں تو میں اس سے نہیں ملوں گی لیکن آپ بھی وعدہ کریں کہ مجھ سے آئندہ شادی کے لیے نہیں کہیں گی۔“
”میری بچی۔“ ماں نے اسے لپٹا لیا اور دیر تک دونوں رو رہی رہیں۔

☆☆☆

”ابو، ایک بہت بڑی خوش خبری لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔“
”کیا بات ہے بہت خوش ہو۔ کوئی نماز ہوئے والی ہے؟“

”مجھے روشنی ملی تھی۔“
”کون روشنی؟“
”قصہ پہاڑی میں آپ کو یاد ہے ہمارے پڑوس میں راجہ آئی رہتی تھیں۔ ان کی ایک بہت چھاری بیٹی تھی روشنی۔ وہ ملی تھی۔“

”وہ کہاں مل گئی تھی؟“
”بس مل گئی۔ مجھے پہچان بھی گئی۔ آپ کو اس کے گھر جانا ہے میرا رشتہ لے کر۔ آپ نے اور اسی نے نہ جانے کیوں ہمیشہ اسے مجھ سے دور رکھا ہے لیکن اب آپ میری شادی اس سے کرائیں۔“

”اس وقت تمہارا بچپن تھا۔ تمہاری پڑھائی پر اثر پڑتا تھا اس لیے کہیلے سے منع کرتے تھے۔ تم اس کا پتا دو میں اس کی ماں سے جا کر بات کرتا ہوں۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آئی سے میں بھی تو ملوں۔“

”تمہیں پتا، پہلے میں ان سے مل لوں۔ کوئی بات بنی تو تم بھی چلنا یہی طریقہ ہوتا ہے۔“

”نہیک ہے تو میں ڈرائیو کو بتا بھادوں گا، وہ آپ کو لے جائے گا۔“

ایاز نے اپنے اثاثات فرار پر نظر نہیں ہونے دیے تھے لیکن اسے معلوم تھا کیا بات کرتی ہے۔ وہ پوری رات جاگتا رہا تھا۔ صبح کچھ دیر کے لیے سو یا اور پھر ڈرائیو کے ساتھ راجہ کے گھر چلا گیا۔ وہ بھی جیسے انتظار ہی میں تھی۔
”آئیے ایاز احمد۔ مجھے ناخوش غور سے آپ کو کیا کام پڑ گیا۔ میں اسی دن کے انتظار میں تھی۔“

”کام تم بھی جانتی ہو۔ میرا پتا تمہاری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”تو شہر لے کر آئے ہو۔“
”نہیں۔ یہ سمجھانے آیا ہوں کہ کسی طرح یہ شادی نہ ہونے پائے۔“

”کیوں اس میں حرج کیا ہے۔“
”یہ دونوں بہن بھائی ہیں۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم۔“

”یہ تو میں آپ کے منہ سے سن رہی ہوں۔ آپ ہی نے کہا تھا میرے پیٹ میں کسی اور کا خون بہا رہا ہے۔ روشنی آپ کی اولاد کب ہے۔“

”مجھے اب اور شرمندہ مت کرو۔ تم سے بہتر کون جانتا ہے روشنی کس کی بیٹی ہے۔“

”بہن بات میں نے آپ سے برسوں پہلے بھی کہی

اب اس سے کہے کہ شاہ پور چلتے ہیں۔
ایاز سے جو اس نے اپنی باتیں کی تھیں وہ محض اپنے
دل کا غبار نکالنے کے لیے کی تھیں اور اس لیے بھی کہ جن
مشکلوں سے وہ گزری ہے، ایاز بھی تو ان کا مزہ چکے۔ اس
کے بچے کو بھی تو معلوم ہو کہ اس کا باپ کیا تھا۔
ایاز گھر پہنچا تو فرماز اس کے انتظار تھا۔

”کیا ہوا ابو۔“

”وہ مان گئی ہے۔ کل چھوڑ کر پرسوں میں تمہیں ان
کے گھر لے کر چلوں گا۔“

”اوہ، آپ کتنے اچھے ہیں۔ آج انی ہوئیں تو کتنی
خوش ہوتیں۔“

”اب تم اپنا کام کرو، میں تھک گیا ہوں۔“

”ہاں آپ آرام کریں۔“

اس کے جانے کے بعد اس نے خود کو ان طوفانوں
کے سپرد کر دیا جو اس کے اندر شور مچا رہے تھے۔ ایاز احمد ڈرو
اس وقت سے جب روشنی کو بہو کے روپ میں دیکھو گے۔
اس پائل عورت سے کچھ بعید نہیں۔ وہ مجھ سے انتقام لے
رہی ہے وہ یہ شادی ہونے وے گی۔ میں فراز کو حقیقت بتا
دوں؟ ہرگز نہیں۔ میری پارسیائی کا غلاف تار تار ہو جائے
گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ اسے جھوٹ سمجھے۔ یہ سمجھے کہ میں
اسے روشنی سے دور رکھنے کے لیے من گھڑت کہانی سنارہا
ہوں۔ وہ شادی پھر بھی کر لے گا اور میں اس کی نظر میں ہمیشہ
کے لیے جھوٹا بن جاؤں گا۔ میری عزت خاک میں مل جائے
گی۔ تو پھر میں؟ انہیں نہیں میرا ایک ہی تو بیٹا ہے۔ تو کیا میں
بھی؟ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ راجیلہ، میں تیرے عزائم کو پورے
نہیں ہونے دوں گا۔ معاف کرنا میرے بچے۔ میں مجھ سے
کہتا تھا، روشنی کے ساتھ مت کیل مگر تو نہیں مانا۔ اب اس
کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ روشنی کا فیصلہ اندھیرے میں ہوتا
ہے۔ شاید آج رات۔

دوسرے دن اخبارات اس خبر سے بھرے ہوئے تھے۔
”مشہور مصور فراز احمد کے اسٹوڈیو میں پراسرار آتش
زدگی۔ فراز احمد اور اس کے والد کے علاوہ ہزاروں فن پارے
اور لاکھوں روپے کا سامان جل کر خاکستر ہو سکا ہے۔ یہ آگ
شارت سرکٹ سے لگی ہو۔ تحقیقات جاری ہیں۔“

روشنی اپنی ماں سے پہلے یہ کہہ چکی تھی کہ میں اس شرط
پر فراز سے ملنا چھوڑوں گی کہ آئندہ آپ مجھ سے شادی کے
لیے نہیں کہیں گی۔

تھی لیکن آپ نے مجھ سے کچھ چھڑانے کے لیے مجھ پر
بہتان دھرا تھا۔ ایاز احمد آپ نے مجھے سزا باغ دکھائے۔ میں
آپ کے برکاؤے میں آگئی۔ مجھ سے بھول ہو گئی اور جب
میں نے تمہیں بتایا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو تم نے صاف
کہہ دیا، میں شادی شدہ ہوں۔ میں تمہاری دوسری بیوی
بننے کو بھی تیار تھی لیکن تم ایک بے بس لڑکی کو کھنور میں چھوڑ کر
چلے گئے۔ تم اسی شہر میں تھے لیکن ہم غریب لوگ تمہارا کچھ
بھی نہ بگاڑ سکے۔ تمہاری وجہ سے میری شادی ایک بوڑھے
پر شکل انسان سے ہوئی جو ظالم بھی تھا۔ میں سب سے یہی
کہتی رہی۔ میرا شوہر مر گیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے اس
بدنامی کا حصہ تم بھی سمیٹو۔ اپنے بچے کو تباہ کر دینی تمہاری
ناجائز بیٹی ہے ورنہ میں یہ شادی ہونے دوں گی۔ ایک گناہ
اور یہی۔“

”میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

”میں نے بھی ایک دن ہاتھ جوڑے تھے۔“

”تم روشنی کو کسی طرح بچھاؤ۔“

”تم فراز کو کیوں نہیں سمجھاتے۔ اسی لیے تاکہ وہ سب
پوچھے گا۔ ایاز احمد خدا کی لاشی بے آواز ہوئی ہے۔ تم کیلاش
پورا اسی لیے چھوڑ کر گئے تھے کہ تمہارا خیر نہیں چھوڑتا رہتا
تھا۔ تم مجھ سے دور بھاگنا چاہتے تھے مگر قدرت نے تمہیں
قصبہ پہاڑی پہنچا دیا تاکہ تم مسلسل اذیت کا شکار نہ رہو۔ اب
روشنی کو بہو کے روپ میں دیکھ کر کیلاش لگاے گا۔“

”یہ نکال نہیں ہوگا۔“

”تم نے مجھ سے کون سا نکاح کیا تھا۔ جیسا باپ و سکی
بیٹی۔ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس سے پہلے
کہ روشنی آجائے اور اپنے باپ کے کربوت سن لے۔ تم
جاسکتے ہو۔“

اس سے پہلے کہ ایاز کچھ اور کہتا وہ کمرے سے اٹھ کر
چلی گئی۔ ایاز کچھ دیر بت بنا وہاں بیٹھا رہا پھر ایک جھٹکے سے
اٹھا اور باہر نکل گیا۔

راجیلہ خود سمجھتی تھی کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی اسی لیے اس
نے روشنی کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ فراز سے نہ ملے۔ اس
سے آگے بھی اس نے سوچ نہ رکھا تھا کہ وہ روشنی سے کہے گی یہ
شہر چھوڑ دے۔ وہ کیلاش پور آئی تھی اپنے شوہر کے انتقال
کے بعد تھی یعنی صرف دو سال پہلے۔ قصبہ پہاڑی سے اس
کے شوہر کا زراستہ ٹریک شہر شاہ پور میں ہوا تھا۔ زراستہ منٹ کے
بعد بھی وہ وہیں رہا۔ روشنی کی تعلیم بھی اسی شہر میں ہوئی۔ وہ
وہیں رہتا جانتی تھی لیکن راجیلہ اسے کیلاش پور لے آئی۔ وہ

